

خانم و محبتِ حدیث



مولانا محمد محترم، شمیم عثمانی



دالاکتب

لاہور

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ ہی کی اطاعت کی

# حفاظت و حجیت حدیث

جس میں

حدیث کی حفاظت اور اس کی حجیت سے متعلق تمام شکوک و  
شہات کا نہایت اطمینان بخش جواب دیا گیا ہے۔

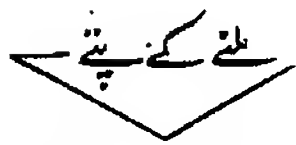
از

مولانا محمد محترم، سید عثماني

دارالکتب

مسجد مقدس ڈھوبی مسٹری پرائی انارکلی لاہور

بار اول	دسمبر ۱۹۷۹ء
باہتمام	چوہدری محمد عیسیٰ
کتابت	کفایت اللہ خوشنویس
طباعت	مترکبت پرنٹنگ پریس لاہور
ناشر	دارالکتب مسجد مقدس صوبی منڈی پرائی انارکلی لاہور
تعداد	ایک ہزار
قیمت	آئسٹ مجلد - / ۱۰ روپے



- ۱۔ دارالکتب مسجد مقدس صوبی منڈی پرائی  
انارکلی لاہور۔
- ۲۔ ادارہ اسلامیات ۱۹۰۔ انارکلی لاہور۔
- ۳۔ المکتبۃ العلمیہ لیک روڈ لاہور۔
- ۴۔ مکتبہ عزیزہ ۱۳۔ اردو بازار لاہور۔
- ۵۔ دارالاشاعت اردو بازار کراچی نمبر ۱

# فہرست مضامین

صفحہ	مضامین	صفحہ	مضامین
۵۴	حفاظت سید نبویؐ تک	۱۱	عرض ناشر
۵۶	حفاظت صحابہؓ تک	۱۲	حزبِ اولیٰ از مولف
۵۸	حفاظت تا قیامت		جزو اول حفاظت حدیث
۶۰	حدیث کے بغیر قرآن فہمی	۲۱	حدیث کا انکار اور منکرین حدیث
۶۰	قرآن فہمی اور پھر انسانی	۲۲	رسوالی
۶۳	قرآن فہمی اور پیغمبر	۲۴	مناقت
۶۶	قرآن اور اسوۂ نبوی	۲۵	اتمام حجت
۶۸	حدیث کے بغیر قرآن فہمی	۲۷	انکار حدیث کی اصل وجہ
۷۳	فقہ طلب آیات اور احادیث	۲۹	خواہشات نفس کی پیروی
۷۶	حدیث کے بغیر دین نامکمل ہے	۳۰	شیطان کی باواسطہ مدد
۷۶	ارکان دین احمد حدیث	۳۱	دشمنان اسلام کو تقویت
۷۸	انکار حدیث ابطال دین کے مترادف ہے	۳۲	اصل روپ
۸۰	انکار حدیث اور حلال و حرام کی تمیز	۳۴	حدیث کی حفاظت میں شک کا اظہار
۸۵	حفظ حدیث اور صحابہؓ	۳۷	حدیث اور حفاظت خداوندی
۸۷	اعتماد کی بنیاد	۳۷	قرآن اور حدیث دونوں اللہ کی حفاظت میں
۸۸	تحریر اور اعتماد	۳۸	چند سوال
۹۰	قوتِ حافظہ	۴۰	قرآن صرف الفاظ کا نام نہیں
۹۱	حفظ حدیث کا اہتمام	۴۲	حدیث نبویؐ قرآن کا بیان ہے
۹۵	لقائے محبت	۴۶	قرآن کے الفاظ اور معانی دونوں منجانب اللہ
۹۹	لقائے عنایت	۴۷	قرآن فہمی کے لیے صرف زبانِ دلی کافی نہیں
۱۰۲	صحابہ کی غیر معمولی قوتِ حافظہ	۵۱	حدیث کے بغیر قرآن کی حفاظت کا تصور
۱۰۴	قوتِ حافظہ اور عرب	۵۳	حفاظت کے تین مرحلے



۱۰۷	حکیم نبوی	۱۷۵	حضرت عائشہ رضی کی مرویات کا مکتوب ذخیرہ
۱۱۱	نشانے الہی	۱۷۶	حضرت عبداللہ بن عمر رضی کی مرویات کے تحسیری نسخے
۱۱۳	حفظ حدیث کے عوامل اور اعتماد کی بنیاد	۱۷۸	حضرت جابر رضی کے صحیفے
۱۱۴	حفظ حدیث میں صحابہ کا ضعف	۱۸۰	حضرت انس رضی کا تحریری مجموعہ
۱۲۳	حدیث کی زندہ کتابیں	۱۸۲	صحیفۃ الصادق
۱۲۵	لاکھوں زندہ کتابیں	۱۸۵	صحیفۃ حضرت علی رضی
۱۲۹	ذخیرۃ حدیث اور تاریخی مواد	۱۸۶	صحیفۃ حضرت سعد بن عبادہ رضی
۱۳۰	کاغذی کتابوں کی ضرورت	۱۸۷	صحیفۃ سمرة بن جندب رضی
۱۳۵	کتابت حدیث اور صحابہ رضی	۱۸۸	صحیفۃ دآل بن حجر رضی
۱۳۶	فن کتابت اور عرب باشندے	۱۸۸	صحیفۃ اہل یمن
۱۳۹	آلات کتابت کی دستیابی	۱۸۸	کتاب الصدق
۱۴۰	فن کتابت سے واقف صحابہ رضی	۱۸۹	صحیفۃ ابوشاہ مہنی رضی
۱۴۱	کتابت سکھانے کا خصوصی اہتمام	۱۸۹	دیگر چھوٹی بڑی تحریریں
۱۴۲	حدیث کی عام کتابت	۱۹۰	خطوط و وثائق
۱۴۵	کاتبین حدیث	۱۹۲	حضرت ابوبکر و عمر رضی کی طرف انکار حدیث کی نسبت
۱۴۸	کتابت حدیث کی ممانعت پر مبنی روایات	۱۹۳	منکرین حدیث کا الزام
۱۵۰	منکرین حدیث کا غیر منطقی طرز عمل	۱۹۳	حجیت حدیث اور حضرت ابوبکر رضی
۱۵۱	احادیث قلم بند کرنے کی ہدایت	۱۹۴	پہلا خطبہ
۱۵۳	ممانعت کتابت سے غلط استدلال	۱۹۵	عام دستور العمل
۱۵۷	ممانعت کتابت کی اصل وجہ	۱۹۸	احادیث کی تلاش و جستجو
۱۵۸	قرآن اور حدیث میں امتیاز		روایت حدیث سے ممانعت اور
۱۶۵	مکثرین صحابہ رضی کے مکتوب ذخیرے	۱۹۹	حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ
۱۶۵	حضرت ابوسہرہ رضی کا تحریری ذخیرہ	۲۰۱	ابوبکر رضی اور روایت حدیث
۱۶۸	احادیث کی صحیح تعداد	۲۰۲	ممانعت کی اصل وجہ و رفع اختلاف
۱۶۹	دو ہستیادی باتیں	۲۰۵	مجموعہ حدیث کو نذر آتش کر دینا
۱۶۹	توابع و شواہد	۲۰۵	پورا واقعہ
۱۷۲	حضرت عبداللہ بن عباس رضی کا کتابی مجموعہ		

۲۴۰	مزید اطمینان کی ایک تدبیر	۲۰۶	واقعہ کا محرک
۲۴۰	حفاظتِ حدیث اور حضرت عمرؓ	۲۰۷	دین کی سہولت پسندانہ خصوصیت کی حفاظت
۲۴۱	کثرتِ روایت میں احتیاط	۲۱۰	حضرت عمرؓ اور منکرینِ حدیث کا الزام
۲۴۲	تحقیقِ حدیث کے لیے تاخیر مزید کا مطالبہ	۲۱۰	منکرینِ حدیث کی علمی خیانت
۲۴۴	حفاظتِ حدیث اور حضرت عثمانؓ	۲۱۱	حضرت عمرؓ اور روایتِ حدیث
۲۴۷	حفاظتِ حدیث اور حضرت علیؓ	۲۱۲	عمال کو تعلیمِ حدیث کا حکم
۲۴۹	روایتِ حدیث کے طرزِ عمل میں تبدیلی	۲۱۳	عدالتی فیصلوں کی بنیاد
۲۵۲	طرزِ عمل کی تبدیلی کا پس منظر	۲۱۴	نبی کی راستے وحی الہی ہے
۲۵۵	جھوٹی حدیثوں کا سید باب	۲۱۵	منکرینِ حدیث کے دعوے کا اصل مدار
۲۵۶	روایتِ حدیث پر قسم کا مطالبہ	۲۱۵	روایت سے منع کرنا
۲۵۷	طرزِ عمل میں تبدیلی کے دیگر عوامل	۲۱۷	روایت میں کمی کا مشورہ
۲۵۹	مکتوبِ مجموعوں کی تیاری	۲۲۰	کثرتِ روایت سے روکنے کی وجہ
۲۶۱	حفاظتِ حدیث اور تابعین و تبع تابعین	۲۲۱	دین کے بینائی اور غیر بینائی خصوصاً بینائیاں
۲۶۱	حفظِ حدیث کا اہتمام	۲۲۲	کذب سے حفاظت
۲۶۳	مذاکرۃِ حدیث	۲۲۳	روایت میں احتیاط
۲۶۶	قرآن ہی کی طرح حدیث کے بھی حفظ کا اہتمام	۲۲۵	روایتِ حدیث پر سزا
۲۶۸	کتابتِ حدیث میں شغف کا عالم	۲۲۸	مکتوبِ ذخیرے جلانا
۲۷۱	مکتوبِ مجموعے	۲۲۸	منکرینِ حدیث کا استدلال
۲۷۱	صحیفہ ہمام ابن منبہ	۲۲۹	حدیث کی مخالفت نہیں حمایت
۲۷۲	حضرت عمر بن عبدالعزیزؓ کی مساعی	۲۳۰	قرآن اور حدیث میں امتیاز
	جزء دوم۔ تجلیتِ حدیث	۲۳۲	صحابہؓ سے مشورہ
۲۸۱	قرآن کی جامعیت	۲۳۵	حفاظتِ حدیث اور خلفائے راشدین
۲۸۱	منکرینِ حدیث کا دعویٰ اور دلائل	۲۳۵	حفاظتِ حدیث اور حضرت ابوبکرؓ
۲۸۳	قرآن مفصل ہے	۲۳۵	رفع اختلاف
۲۸۷	قرآن نے کچھ نہیں چھوڑا	۲۳۶	دین کے بینائی و غیر بینائی اصول کا امتیاز
۲۸۹	قرآن کافی ہے	۲۳۷	اصولِ شہادت کی بنیاد
۲۹۰	حدیث کی مشغولیت گراہی ہے ؟	۲۳۹	شہادت کی اصل حقیقت

۳۳۲	اطاعتیں دو گروہ مطاع ایک	۲۹۳	قرآن کی جامعیت کا اصل مفہوم
۳۳۳	رسول کے لفظ سے قرآن مراد لینا	۲۹۴	حدیث رسول کی احتیاج
۳۳۴	اطاعت کو موافقت کے معنی میں لینا	۲۹۵	بعثت کے تین اہم مقاصد
۳۳۴	اطاعت رسول کو اطاعت اللہ کی {	۲۹۶	تعلیم و ترویج قرآن
۳۳۴	تفسیر قرار دینا	۲۹۸	مجلات کی تفصیل
۳۳۵	اطاعت رسول کے لیے حیات نبوی کی شرط	۳۰۲	جہات کی توفیح
۳۳۶	اقوال کی اطاعت	۳۰۲	مشکلات کی تفسیر
۳۳۸	اطاعت رسول کی مستقل حیثیت اور قرآن	۳۰۳	اشارات کی تشریح
۳۴۰	رسول کا ہر عمل وحی الہی کی اتباع میں ہے	۳۰۴	متقابلین میں تخصیص
۳۴۰	وحی متلو و غیر متلو	۳۰۵	قیاسی ملحقات کی تعیین
۳۴۰	قرآن کے علاوہ وحی کا نزول	۳۰۶	جامعیت قرآن کی مزید وضاحت
۳۴۱	حکمت کا صحیح مفہوم	۳۰۷	متن اور شرح کی نسبت
۳۴۳	وحی کے نزول کی تین صورتیں	۳۰۸	قرآنی احکام کے لیے تفصیل
۳۴۴	صرف ایک قسم کی وحی قرآن ہے	۳۱۱	حدیث کی مستقل حیثیت
۳۴۵	عام انسانوں سے اللہ کی ہم کلامی اور وحی	۳۱۳	قرآن کی جامعیت اور اسوۂ رسول
۳۴۷	قرآن کے علاوہ وحی کے نزول پر قرآنی شہادتیں	۳۱۶	حدیث کی تشریحی حیثیت
۳۵۲	وحی پر ہمارے ایمان کی اصل بنیاد	۳۱۶	احادیث کی تین قسمیں
۳۵۶	محابرہ کے درمیان حدیث کی تشریحی حیثیت	۳۱۸	مزید قرآن احادیث کی حجیت
۳۵۹	عبدالرسالت کے فیصلوں میں رد و بدل کا الزام	۳۱۸	موضع قرآن احادیث کی حجیت
۳۶۰	جیش اسامہ کی روانگی	۳۱۸	مرادات قرآنی کا صحیح تعلق ابہم
۳۶۲	طلاق ثلاثہ کے مسئلے میں حضرت عمرؓ کا فیصلہ	۳۲۰	بیان قرآن کی ذمہ داری اور رسول
۳۶۳	مفتوحہ اراضی کی تقسیم	۳۲۳	بیان قرآن بھی منزل من اللہ ہے
۳۶۴	مولفہ القلوب اور حضرت عمرؓ کا استدلال	۳۲۵	بیان قرآن کے نزول کی صورت
۳۶۷	خبر واحد کی حجیت	۳۲۶	مستقل تشریحی حیثیت کی حامل احادیث
۳۶۸	اصولی غلطی	۳۲۷	رسول کا حکم قرآن ہی کا حکم ہے
۳۶۸	یقینیات کی شرط اور دنیوی معاملات	۳۳۰	اطاعت رسول کے وجوب کی مستقل حیثیت
۳۷۱	یقینیات کی شرط اور مذہبی معاملات	۳۳۱	مرجع نزاع

۴۶۰	جہلی اور وہی علم	۳۷۳	خبر واحد کی حجیت اور قرآن کریم
۴۶۲	بلند ترین اخلاقی صفات	۳۸۱	خبر واحد کی حجیت اور عہد رسالت
۴۶۳	غلطیوں اور لغزشوں سے حفاظت	۳۸۷	خبر واحد کی حجیت اور عہد صحابہ
۴۶۶	منصب رسالت اور حیات طیبہ	۳۹۴	خبر واحد کی حجیت عہد صحابہ کے بعد
۴۶۸	اطاعت رسول اور حجیت امامت	۳۹۶	منکرین حدیث کے دلائل
۴۶۹	ایمان کی حقیقت سمجھنے میں غلطی	۳۹۷	ظن کے صحیح مفہوم کی تحقیق
۴۷۳	قرآنی صدائوں کا انکار	۴۰۷	ظن کی حجیت
	اطاعت رسول کا قرآنی حکم اور امام وقت		زوالیدین کی بات تسلیم کرنے میں
۴۷۳	یا مرکز ملت -	۴۱۲	نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا تاقی
۴۷۴	اطاعت کے لیے حیات جہانی کی قید	۴۱۵	بعض صحابہ کے طرز عمل سے غلط استدلال
۴۷۹	مرکزیت کی طرف حق اطاعت کی منتقلی	۴۲۱	منصب رسالت اور مرکز ملت کا تصور
	کیا اللہ و رسول کی اطاعت سے		کی منصب رسالت صرف قرآن پہنچانے
۴۸۰	ایام وقت کی اطاعت مراد ہے	۴۲۳	تک عہد و رہے -
	رسول کی اطاعت اور امام کی	۴۲۴	تبلیغ کتاب اور تعلیم دہریت افراد
۴۸۱	اطاعت میں بنیادی فرق	۴۲۶	توضیح و تشریح کتاب
	اطاعت رسول کے خصائص مرکزیت	۴۲۷	عملی نمونہ
۴۸۳	کی اطاعت پر صادق نہیں آتے	۴۲۸	حاکم و فرماں روا
	اطاعت رسول سے امام وقت یا مرکز	۴۳۰	حکم اور فیصل
۴۸۸	ملت کی اطاعت مراد لینے کے لازمی نتائج	۴۳۶	شخصی اور پیغمبرانہ حیثیت کا فرق
۴۹۱	چند بے بنیاد اعتراضات اور ان کا تجزیہ	۴۳۳	منکرین حدیث کے موقف کا جائزہ
۴۹۱	بے بنیاد اعتراضات	۴۳۵	رسالت و امامت کی تفریق
	۱: جو منوع احادیث کی موجودگی سے غلط	۴۴۲	اجتہاد لغزشوں سے غلط استدلال
۴۹۳	استدلال	۴۴۷	فرائض نبوت کی انجام دہی اور غلطیوں کا سد
۴۹۵	نقد روایت حدیث	۴۵۰	حضور کی بشریت سے غلط استدلال
۴۹۸	تنقیح متن حدیث	۴۵۲	قیام دین سے متعلق اشکالات اور ان کا تجزیہ
۴۹۹	خدا واد صلاحیت	۴۵۷	رسالت و نبوت کی حقیقت
۵۰۳	محمدین کی مساعی کے ثمرات	۴۵۹	نبی کی پیدائش سے پہلے ہی نبوت کیلئے اسکا انتخاب



۵۶۴	کھب کی خاصیت	۵۰۵	وضع حدیث اور عہد رسالت
۵۶۶	۱۵۔ باہم متعارض روایات	۵۰۸	عجیب استدلال
۵۶۸	۱۶۔ روایت بالمعنی	۵۰۹	مختلف مرویات کا جائزہ
	۱۷۔ حضرت ابو ہریرہؓ اور صحابہؓ	۵۱۴	کذب علی النبی سے متعلق ایک واقعہ
۵۷۱	کی تنقید	۵۱۷	وضع حدیث کا اصل نقطہ آغاز
۵۷۳	حضرت ابو ہریرہؓ صحابہ کی نظر میں	۵۲۰	وضع حدیث کے سدباب میں صحابہؓ
۵۷۶	منکرین حدیث کا استدلال	۵۲۵	کی احتیاطی تدابیر
۵۷۷	بدگمانی نہیں اظہارِ تعجب		امام بخاریؒ کی چھ لاکھ حدیثوں کی اصل حقیقت
۵۷۸	کثرتِ روایت کا ایک ادب		۲۔ خلاصہ عقل و روایت روایات
۵۷۹	ایک اور حقیقت		کی اصل حقیقت
	۸۔ امام ابو حنیفہؒ پر حدیث	۵۳۳	سورج کی سجدہ ریزی
۵۸۴	سے بے نیازی کا الزام	۵۳۷	سردی دگرگی اور وزخ کی رد پھونکیں
۵۸۵	امام ابو حنیفہؒ کا سرمایہ حدیث	۵۳۹	گرگشت کی پھونکیں
۵۸۷	استنباط کا مبنی احادیث	۵۴۱	۳۔ احادیث نبوی اور عریاں مضامین
۵۸۸	امام صاحبؒ کا مسلک	۵۴۱	چند بنیادی باتیں
		۵۴۳	نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا زبردست ایثار
		۵۴۵	چند مرویات کا جائزہ
		۵۴۹	بوسہ ناقص و ضرر نہیں
		۵۴۹	غسل کے لیے کتنا پانی کافی ہے؟
		۵۵۰	عورتوں سے مخصوص ایک شرعی حکم
			جنابت اور حیض کے بارے میں قدیم تعصبات
		۵۵۱	کا ازالہ ۔
		۵۵۵	متعہ کے مختلف پہلو
		۵۵۶	حج و عمرہ سے متعلق ایک غلط فہمی کا ازالہ
		۵۵۸	۴۔ خلاصہ علم و تجربہ روایات
		۵۵۹	تین سو سال بعد دنیا کا خاتمہ
		۵۶۲	عجوبہ کھجور کی تاثیر

## انتساب

اپنے والد ماجد حضرت مولانا محمد مسلم عثمانی قدس اللہ تبارک  
کے نام

کہ وہ میرے والد ہی نہیں میرے ارشاد و معلم، شیخ و مربی اور  
ہادی و رہنما بھی کچھ تھے۔ میں جو کچھ ہوں سب انہی کی بدولت ہیں۔



## عرضِ ناشر

اس کتاب کے مؤلف و مصنف مولانا محمد محترم فہیم عثمانی کا نام علمی دنیا میں محتاجِ تعارف نہیں۔ اس سے پہلے مولانا کی متعدد کتابیں دادِ تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ مولانا کا اسلوبِ نگارش محققانہ اور عالمانہ ہونے کے ساتھ ساتھ جذب و تاثیر میں اپنی مثال آپ ہوتا ہے مگر شاید کم ہی لوگوں کو یہ بات معلوم ہو کہ مولانا ایک بلند پایہ مصنف ہی نہیں ایک قادر الکلام خلیب بھی ہیں۔ دراصل حفاظت و حجیتِ حدیث کا یہ موضوع مولانا نے ابتداءً اپنے جمعہ کے خطبات میں ہی شروع کیا تھا۔ مگر دو چار تقریروں کے بعد ہی اس کی افاریت کے پیشِ نظر مولانا کے مدِ امین کی طرف سے یہ اصرار شروع ہو گیا کہ اسے کتابی صورت میں شائع کیا جائے۔

اس کی طباعت و اشاعت کو بردستے کار لانے کی ذمہ داری خوش قسمتی سے میرے حصے میں آئی اس سے پہلے مولانا کی چند تقریروں کا مجموعہ میں شائع بھی کر چکا تھا۔ مولانا نے اس موضوع پر اپنی تقریروں کو صرف ”حفاظتِ حدیث“ تک ہی محدود رکھا تھا مگر جب ٹیپ ریکارڈ سے صفحہ قرطاس پر منتقل کر کے مولانا کو یہ تقریریں نظر ثانی کے لیے دی گئیں تو سمجھا ہی یہ درخواست بھی کہ دی گئی کہ حجیتِ حدیث کے موضوع کا اس میں اضافہ کر دیا جائے مولانا نے کمال مہربانی سے یہ درخواست بھی منظور کر لی اور اس طرح یہ کتاب دو حصوں میں حفاظت و حجیتِ حدیث کے نام سے مرتب ہو گئی اور اب کتابت و طباعت کے مراحل سے گزر کر قارئین کے ہاتھوں میں ہے۔ میں اللہ تعالیٰ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ مولانا کی اس کتاب کو زیرِ طبع سے آراستہ کرنے کی جو ذمہ داری میں نے اپنی خوشی سے قبول کی تھی اس کو باحسن و جود پورا کرنے کی توفیق اس نے مجھے عطا فرمائی۔ مجھے یقین ہے اس کی بارگاہ میں میری یہ حقیر خدمت دینِ شرف قبولیت سے ہم کنار ہوگی۔

محمد اسحاق 463 شادمان کالونی لاہور



## حسراول

یہ بات قہرسم کے شک و شبہ سے بالاتر ہے کہ اسلام کی صحیح تصویر قرآن اور حدیث دونوں سے مل کر ہی تیار ہوتی ہے اسلام کی صحیح تعلیمات کا علم قرآن اور حدیث کی باہمی توسیق و تطبیق ہی کی بنیاد پر حاصل کیا جاسکتا ہے۔ جو لوگ یہ چاہتے ہیں کہ ان دونوں کو ایک دوسرے سے الگ کر دیں ایک کومانیں اور ایک کانکار کریں وہ صراطِ مستقیم سے دور ہیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ اسلام میں جتنے گمراہ فرقے پیدا ہوئے وہ وہی ہیں جنہوں نے قرآن کو حدیث سے یا حدیث کو قرآن سے علیحدہ کرنا چاہا۔ خوارج کی گمراہی کی وجہ اس کے علاوہ کچھ نہ تھی کہ انہوں نے قرآن کو مانا اور حدیث سے انحراف کیا جبکہ ان کے مقابل فرقے نے قرآن کو محرف بنا کر چھوڑا اور صرف اپنے ناموں کی سنت کی پیروی کا دعویٰ کیا، اسی طرح معتزلہ نے قرآن کی آیات میں دو راہ کار باویلات کا سہارا لے کر احادیث سے اعتراض کیا نتیجتاً دونوں گمراہیوں کے اندھیروں میں بھٹکتے رہے۔

تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے جو کچھ پہلے ہوا تھا آج بھی ہوتا ہے۔ دین حق عقل کے اندھوں کا تختہ مشق بنا ہوا ہے جو خیزان کی عقل کے خود ساختہ معیار پر پوری نہیں اترتی اسے بے کی تاویلات کے بھینٹ چڑھا دیا جاتا ہے حدیث سے انکار کر کے اپنے زعم میں اسلام کے چہرے سے خلاف عقل ہونے کا داغ مٹانا چاہتے ہیں لیکن ہو یہ رہا ہے کہ داغ سمجھ سمجھ کر اسلام کی صحیح تصویر کے اصل نقوش مٹاتے چلے جا رہے ہیں۔

حدیث کے بغیر قرآن فہمی کے یہ دعویٰ درجہ قرآن پاک کو ہر ضرورت، ہر حکم اور ہر مسئلے کا حامل سمجھتے ہیں اور اپنی عقل و فہم کو قرآن کی تفسیر و تشریح کیلئے کافی خیال کرتے ہیں دراصل چاہتے ہیں کہ احادیث اور فقہ کا سارا دفتر مٹ جائے اور ان کی جگہ ان کے خود ساختہ اجتہادات اور بے بنیاد استنباطات قرآن پاک کا حقیقی ایڈیشن اور اسلام کی تعلیمات کا مستند مخزن قرار پاجائیں۔ افسوس تو زیادہ اس بات کا ہے کہ یہ سب کچھ دشمنان اسلام کی پیروی میں ہو رہا ہے مستشرقین یورپ کے سفیہانہ اعتراضات کی اندھا دھند تقلید سے زیادہ کچھ نہیں۔ یہ ٹھہاتی سو برس بعد احادیث کے قلم بند ہونے کی باتیں اور اس طرح حدیث کے ذخیرے کو باقطل الاعتبار ثابت کرنے کی سکیمیں، یہ رجال حدیث کی ثقاہت پر اعتراضات اور یہ عقلی حیثیت سے احادیث پر شکوک و شبہات کا اظہار یہ سب کچھ مستشرقین یورپ کے آثار میں جن کو منکرین حدیث بہن بہن کر اتراتے ہیں۔ ان کے گروہ میں سے ہر کوئی اس قدر بے باک ہو گیا ہے کہ جس کا جہاں تک بس چلتا ہے دین کا حلیہ بگاڑنے میں مصروف ہے، کوئی نماز کے اوقات کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھانا چاہتا ہے تو کوئی نماز کے ارکان میں کتبہ بیعت کرنے پر تلا ہوا ہے، کوئی روزوں کی تعداد کم کرنے کے واسطے تو کوئی حج کے مناسک پر قنچی چلا رہا ہے، کوئی قربانی کے پیچھے پڑا ہوا ہے اور اسے سرے سے ہی حذف کر دینا چاہتا ہے، کچھ لوگ ہیں جو سمت قبلہ ہی کو تبدیل کرنے پر مصر ہیں کچھ ہیں جو وضو کو غیر ضروری خیال کرتے ہیں، مسلمانوں کے اصول وراثت میں رد و بدل ہو رہا ہے غرض یہ منکرین حدیث کا گروہ لوگوں کو ایک نئے اسلام کی دعوت دینا چاہتا ہے اور اس کے لئے حدیث کا انکار ان کی مجبوری بن گیا ہے۔

تاہم انکار حدیث کا یہ فتنہ جس قدر پرانا ہے اسی قدر قدیم ان مساعی کی داستان ہے جو علمی سطح پر اس فتنے کا سد باب کرنے کے لئے علامتے حق نے اپنے اپنے زمانے

میں انجام دیں اس سلسلے میں سب سے پہلے امام شافعیؒ نے اپنی تالیف ”الرسالۃ“ میں اور اس کے بعد کتاب الامہ کی ساتویں جلد میں ان لوگوں کے خیالات کا بڑے ہی پرزور انداز میں رد کیا جو اپنے فساد مزاج کی بنا پر اخبار متواترہ کے سوا بقیہ تمام احادیث کا سرے ہی سے انکار کرتے تھے اور بہت سی قرآنی آیات میں اپنے مذاق کے مطابق تاویلیں کرتے تھے یہ لوگ معتزلہ تھے جن کے دماغوں پر عقل کا غلبہ تھا۔ انکار حدیث کی ابتدا دراصل انہی لوگوں سے ہوئی ان لوگوں نے حشر و نشر رویت باری تعالیٰ، صراطِ میزان، جنت و جہنم اور اسی قسم کی دیگر احادیث کو ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ امام شافعیؒ نے سب سے پہلے ان لوگوں کے خیالات کی اپنی تالیفات میں تردید کی۔ ان کے بعد امام احمدؒ نے بھی اطاعتِ رسول کے اثبات میں ایک مستقل جزو تصنیف کیا جس کا ایک حصہ حافظ ابن قیمؒ نے اپنی کتاب اعلام الموقعین میں نقل کیا ہے کچھ عرصہ بعد امام غزالیؒ، ابن حزمؒ اور حافظ محمد بن ابراہیم میدان میں آئے اور انکار حدیث کے خلاف انتہائی پر مغز اور مدلی مقالات لکھے۔ متاخرین میں علامہ سیوطیؒ نے بھی اس موضوع پر ایک مستقل جزو تصنیف کیا۔ قریب کے دور میں ڈاکٹر مصطفیٰ سباعیؒ نے ”السنة ومكانتها في التشريع الاسلامي“ لکھ کر اور ڈاکٹر صبحی صالحؒ نے ”علوم الحديث ومصطلحاتها“ ترتیب دیکر اس موضوع پر کام کرنے کا حق ادا کر دیا۔ اردو زبان میں بھی موجودہ دور کے علماء نے انکار حدیث کے رد میں بڑا قابلِ قدر کام کیا ہے اس سلسلے میں مولانا محمد ارسینؒ کا ندھلوی کی تصنیف ”حجیت حدیث“، مولانا مناظر حسن گیلانی کی تالیف ”تدوین حد“ نیز مولانا بدر عالم کی کتاب ”ترجمان السنۃ“ اور مولانا عبد الصمد صادم کی ”تاریخ الحدیث“ کے نام سرفہرست ہیں۔ رسائل میں ”ترجمان القرآن“ کا منصب رسالت نمبر مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے قلم سے اور ”الاعتصام“ کا حجیت حدیث نمبر مولانا سید محمد داؤد غزنوی کے قلم سے قابلِ ذکر ہیں۔

غرض ہر دور کے علماء نے اپنے اپنے انداز میں انکار حدیث کے فتنے کا خوب خوب مقابلہ کیا اور علمی سطح پر منکرین حدیث کو لا جواب کر کے رکھ دیا دلائل سے بھرپور ایسے مسکیت جوابات دیئے کہ ان کی زبانیں گنگ ہو کر رہ گئیں اور ان کے قلم ہا کارہ نظر آنے لگے۔ اس لحاظ سے ضرورت تو نہ تھی کہ اس موضوع پر گفتگو کی جائے لیکن حال بھی میں منکرین حدیث کی سرگرمیاں از سر نو کچھ زیادہ ہی بڑھ گئی ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ علمی بساط پر مات کھانے کے بعد اب نئی چالیں چلنے لگے ہیں اور اپنی چابکدستی کا مظاہرہ کرنے کے لئے سادہ لوح نادان مسلمانوں کو نشانہ بناتے ہوئے ہیں وہ مسلمان جو بے چارے دین سے پوری طرح واقف نہ ہونے کی بنا پر ان کے سطحی اعتراضات کو سمجھ نہیں پاتے اور ان کے فریب کا آسانی شکار ہو جاتے ہیں۔

لاہور میں بھی بعض دوستوں سے ان کی فتنہ سامانیوں کا حال معلوم ہوا سوچ ہی رہا تھا کہ کسی بسوط تحریر کی مدد سے ان لوگوں کا سید باب کروں اسی اثنا میں میرے ایک دوست حج کی غرض سے کراچی کچھ روز ٹھہرے واپسی پر ان کی زبانی ان لوگوں کی سرگرمیوں کا مزید انکشاف ہوا انھوں نے اپنے بعض سرکردہ رہنماؤں کی تقاریر ٹیپ ریکارڈ کر کے ملک کے مختلف علاقوں میں تقسیم کر دی ہیں فارغ وقت میں یہ لوگ پارکوں، تقریح گاہوں اور ہوٹلوں جیسی عام آمدورفت کی جگہوں پر حلقے بنا بنا کر بیٹھ جاتے ہیں اور ان تقریروں کی ٹیپ چلا دیتے ہیں۔ عام سادہ لوح مسلمان وقت گزاری کے لئے ہی ان کے گرد جمع ہو جاتے ہیں۔ علم دین سے چونکہ پوری طرح واقفیت نہیں ہوتی، اس لئے ان کی پرفریب باتیں سن سن کر بے چارے عجیب قسم کی ذہنی الجھن میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ عام لوگوں کے سامنے علمی بحثیں تو چل نہیں سکتیں ان کی سمجھ سے ہی بالاتر ہوتی ہیں یوں بھی علمی بحثوں کے لئے اب ان کے پاس رہا بھی کچھ



نہیں جیسا کہ میں نے شروع میں عرض کیا کہ علماء نے ان کو خاموش کر کے رکھ دیا ہے اس لئے ان ٹیپ ریکارڈ کی ہوتی تقریروں میں یہ لوگ زیادہ زور اسی بات پر دیتے ہیں کہ احادیث چونکہ محفوظ نہیں رہ سکیں اس لئے ان پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا اور قرآن چونکہ محفوظ ہے اور اس کے ساتھ ہی اپنے مضامین میں جامع بھی ہے اس لئے قرآن اکیلا ہی کافی ہے۔ عام لوگ ان کے اس دھوکے میں آجاتے ہیں اور قسم قسم کے شکوک و شبہات میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

اس صورت حال کے پیش نظر میں نے اس کام میں مزید تاخیر مناسب نہ سمجھی اور اللہ کا نام لے کر اس موضوع پر کام کا آغاز کر دیا۔ ابتداءً ارادہ یہ تھا کہ چونکہ منکرین حدیث حفاظت حدیث ہی کو شکوک بنا کر حقیقت حال سے بے خبر لوگوں کو گمراہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں اس لئے صرف حدیث کی حفاظت کے موضوع تک کام کو محدود رکھا جائے مگر آغاز کار میں ہی محسوس ہونے لگا کہ جب تک حفاظت کے ساتھ ساتھ حجیت حدیث پر بھی تفصیلی بحث نہ کی جائے کام ادھورا ہی رہیگا جوں جوں اس موضوع پر کام کرتا ہوا آگے بڑھتا گیا یہ ضرورت قوی سے قوی تر ہوتی گئی بالآخر مجھے اپنا ارادہ تبدیل کرنا پڑا چنانچہ میں نے اپنے کام کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا پہلا حصہ حفاظت حدیث ہی کے ساتھ مختص رہا جبکہ دوسرے حصے کو میں نے حجیت حدیث کی بحث کے لئے خالص کر دیا۔

میری گفتگو کا محور زیادہ تر وہ اعتراضات رہے ہیں جو منکرین حدیث کی جانب سے حفاظت حدیث کو مشکوک بنانے اور حجیت حدیث کو مضمحل کرنے کی خاطر بڑے شد و مد سے پیش کئے جاتے ہیں میرے پیش نظر زیادہ تر یہ رہا ہے کہ علمی بساط پر علمائے حق کے ہاتھوں مات کھانے کے بعد منکرین حدیث عام سادہ لوح ناواقف مسلمانوں کو گمراہ کرنے کے لئے جو نئی چالیں چلنے لگے ہیں ان کی اصل حقیقت

حال واضح کر دو تاکہ وہ لوگ جو بے چارے دین سے پوری طرح واقف نہ ہونے کی بنا پر ان کی چالوں کو سمجھ نہیں پاتے ان کے فریب کا شکار ہونے سے بچ جائیں۔  
 میں نے اس کام میں جہاں تک ہو سکا اصل مآخذ کو دیکھنے کی کوشش کی ہے مگر کہیں کہیں باہر مجبوری ثانوی مآخذ پر بھی انحصار کرنا پڑا اس دوران جو کتابیں میرے زیر مطالعہ رہیں ان کی ایک مختصر فہرست اس کتاب کے آخر میں میں نے دے دی ہے تاہم جن کتابوں سے مجھے اس کام میں بہت زیادہ مدد ملی وہ حافظ ابن حجر عسقلانی کی تہذیب التہذیب، حافظ ابن قیم کی اعلام الموقعین اور حافظ ابن عبد البر کی جامع بیان العلم، نیز محمد عجاج الخطیب کی ”السنة قبل التدوین“ اور شیخ طاہر الجزائری کی توجیہ النظر ہیں۔ علامہ ذہبی کی تذکرۃ الحفاظ، حافظ ابن حجر کی لسان المیزان اور حافظ سیوطی کی تدریب الراوی سے بھی میں نے بھرپور استفادہ کیا۔ قریب کے فضلاء میں سے میں نے ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی کی تصنیف ”السنة ومكانتها في التشريع الاسلامي“ اور ڈاکٹر صبحی صالح کی تالیف ”علوم الحديث ومصطلحہ“ سے بہت فائدہ اٹھایا۔ اردو زبان میں بھی مولانا مناظر حسن گیلانی کی ”تدوین حدیث“ اور مولانا بدر عالم کی ”ترجمان السنة“ نے میری بڑی رہنمائی کی۔

میں مولانا محمود اشرف عثمانی صاحب کا شکر گزار ہوں جن کے توسط سے مجھے جامعہ اشرفیہ مسلم ٹاؤن لاہور کے کتب خانے تک رسائی حاصل ہوئی اور مہتمم جامعہ حضرت مولانا عبید اللہ زید مجدہ نے کمال ہربانی سے مجھے اس سے استفادہ کرنے کی اجازت مرحمت فرمادی۔ نیز مک غلام علی صاحب منصورہ لاہور کا بھی ممنون ہوں کہ وہ حوالوں کی تلاش میں وقتاً فوقتاً میری مدد فرماتے رہے اور ضروری مصادر و مآخذ کی بہم رسانی میں مجھے ان کا مکمل تعاون حاصل رہا۔

مجھے حاجی محمد عاشق صاحب شادمان کالونی کا بھی شکریہ ادا کرنا ہے جنہوں

نے اس کام میں میرے ساتھ ہمہ جہتی تعاون کیا حقیقت یہ ہے کہ اس کتاب کا وجود انہی کے ذوق و شوق اور انہی کی کوششوں کا رین منت ہے اللہ تعالیٰ نے خدمتِ دین کے جس جذبے سے انھیں نوازا ہے وہ قابلِ مد تعریف ہے میری دعا ہے کہ انھیں خدمتِ دین کی بیش از بیش توفیق نصیب ہو اور اس سلسلے میں ان کی تمام مناسی مقبول بارگاہِ الہی ہوں۔

آخر میں ربِ کریم سے دستِ بدعا ہوں کہ وہ میری اس حقیر کاوش کو شرفِ قبولیت بخشے آمین! دَمَا تَوْفِیْقُ إِلَّا بِاللّٰهِ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَ  
الْکَیْدُ اَرْمِیْبُ

محتاج دعا

محمد محترم فہیم عثمانی

۳ ربیع الثانی ۱۳۹۹ھ

۳ ربیع ۱۹۷۹ء

جُزْوَاقُل

حَفَاطِثُ حَدِيثِ



إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ

وَإِنَّا لَمُحْفِظُونَ ۝

(الحجر: ٩)

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

## حدیث کا انکار اور منکرین حدیث

انکار حدیث کا فتنہ اگرچہ بہت پُرانا ہے لیکن پُرانے منکرین حدیث اور موجدہ منکرین حدیث کے طرزِ عمل میں بڑا ہی بین اور نمایاں فرق ہے وہ یہ کہ وہ لوگ احادیث نبوی کے منکر ضرور تھے مگر ان کا تمسخر نہ اڑاتے تھے، فلسفے کی بھول بھلیوں سے مرعوب ہو کر حدیث کا انکار تو کرنے لگے تھے لیکن احادیث نبوی کا مذاق اڑانے کی جرأت انہیں نہ ہوئی تھی۔ ان کے برعکس موجودہ منکرین حدیث احادیث نبوی کا مضحکہ اڑاتے ہیں، تمسخر کرتے ہیں، نہ صرف احادیث کا بلکہ حدیث کا بلیش بہا ذخیرہ ہم تک پہنچانے والے تمام صحابہ کرام کا، محدثین کا مفسرین کا سب کا مذاق اڑاتے ہیں۔ حیرت ہے ان لوگوں کی شرم و حیا کو کیا ہوا، یہ لوگ ایسے علماء ایسے فقہاء اور ایسے فضلاء کو اپنے استہزاء کا نشانہ بناتے ہیں جو علم کی تاریخ میں اپنا ثانی نہیں رکھتے اپنی نظیر نہیں رکھتے، یہ لوگ امام بخاری امام مسلم اور امام مالک جیسے بلند پایہ محدثین کا مذاق اڑاتے ہیں۔ ضرور اڑائیں مگر اللہ کی گرفت سے بے خبر نہ ہوں۔

مہ چوں خدا خواہد کہ پردہ کس زرد میلش اندر نہ طعنہ پا کاں نہ ند  
جب اللہ کسی کی پردہ دری کرنا چاہتا ہے کسی کو ذیل و رسوا کرنا چاہتا ہے تو اس  
کے دل میں یہ رغبت پیدا کر دیتا ہے کہ وہ پاک لوگوں پر یعنی اللہ کے نیک بندوں  
پر طعنہ زنی کرنے لگتا ہے پھر تا یہ ہے کہ اللہ کے نیک بندوں کا دامن اس کے بے جا  
طعنوں کے باوجود پاک و صاف ہی رہتا ہے نتیجتاً وہ خود ہی رسوا ہو کر رہ جاتا ہے۔

حلم حق با او مومنا ہا کند چوں بہ حدش بگزد رسوا کند  
اللہ کی بردباری اسے ڈھیل دیتی رہتی ہے وہ سمجھتا ہے کہ اس دریدہ دیہتی پر کوئی  
گرفت ہی نہیں ہے لیکن جب وہ حد سے گزر جاتا ہے تو پھر اللہ اسے رسوا کر ڈالتا ہے۔  
اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ نے منکرین حدیث کو رسوا کر کے رکھ دیا  
رسوائی ہے یہ محدثین کرام پر زبان طعن دراز کرنے والے یہ احادیث بنوی کا مذاق  
اڑانے والے فی الحقیقت رسوا ہو کر رہ گئے ہیں۔ یہ اپنی رسوائی کو سمجھ نہ پائیں تو علیحدہ بات  
ہے۔ اللہ نے ان کے دلوں پر مہر لگادی ہے ان کی عقلوں پر پردے پڑ گئے ہیں ورنہ ذرا  
سوچیں تو سہی یہ لوگ کن لوگوں کی صف میں کھڑے ہیں۔

یہ منکرین حدیث یہ ارشادات نبوی سے منہ موڑنے والے یہ جناب  
رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کی باتوں کا مذاق اڑانے والے یہ لوگ جو کہتے ہیں ہمیں  
حدیث کی ضرورت نہیں جو لوگوں کو ترغیب دلاتے پھرتے ہیں کہ حدیثوں پر اعتماد نہ  
کرو حدیثوں کو نہ سنو حدیثوں کو نہ پڑھو حدیثوں پر عمل نہ کرو احادیث بنوی کے  
خلافت یہ باتا عہد تحریریں چلانے والے خدا را غور تو کریں اپنے آپ کو کن لوگوں کی صف میں کھڑا پاتے ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کے خلافت یوں محاذ بنانے والے  
کون لوگ تھے۔ بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی باتوں کو نہ سننے کی ترغیب دینے والا سب  
پہلا ابولہب تھا جو مکہ کی کلیوں میں کتا پھرتا تھا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی کوئی بات نہ سنو۔

اللہ کی لعنت ہو اس پر وہی تھا جو رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر بات کا مذاق اڑاتا تھا اسی مذاق اور اسی تمسخری نے تو ابولہب کی گردن میں ابدی لعنت کا طوق ڈلوادیا

تَبَّتْ يَدَا ابْنِ لَهَبٍ وَتَبَّ (لہب: ۱) | ترجمہ: ابولہب کے ہاتھ ٹوٹ جائیں اور وہ تباہ و برباد ہو جائے۔

آج منکرینِ حدیث کا بھی یہی کام ہے وہ بھی گلی گلی کہتے پھر رہے ہیں کہ احادیثِ نبوی قابلِ اعتماد نہیں انہیں نہ سنو کہ دین پر عمل کرنے کے لیے ان کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہ بھی ارشاداتِ نبوی کا مذاق اڑاتے ہیں تو سنیں غور سے سنیں ارشاداتِ نبوی کا مذاق اڑانے والوں کے لیے اللہ نے ابدی لعنت لکھ دی ہے۔

ان منکرینِ حدیث کی اس سے بڑھ کر رسوائی اور کیا ہوگی کہ یہ لوگ اور ابولہب جیسا قابلِ نفرت دین ایک ہی صفت میں کھرے نظر آتے ہیں۔

آج سے چودہ سو سال پہلے ابولہب کہتا تھا کہ ”اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) میں آپ کو جھوٹا نہیں کہتا مگر آپ کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں“۔ آج کا منکر حدیث بھی بالکل یہی بات کہہ رہا ہے مگر خوبصورت لفظوں کے پردوں میں پیٹ کر۔ وہ کہتا ہے کہ عقل کی کسوٹی پر ہم پرکھتے ہیں تو احادیثِ پوری نہیں اترتیں اس لیے ہم احادیث کو نہیں مانتے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث ابولہب کی سمجھ میں بھی نہیں آتی تھیں اب ان کی سمجھ میں بھی نہیں آتیں۔ سمجھ میں آئیں بھی کیسے قبولِ حق کی صلاحیت سے محروم افراد کی سمجھ میں حق آیا ہی نہیں کرتا اور قبولِ حق کی صلاحیت ابی وقت تک نصیب نہیں ہوتی جب تک آئینہ دل سے تعصب کے پردے نہ ہٹائے جائیں جب تک چشم

بیتا سے اغراضِ نفسانی کی عینک نہ اتاری جائے جب تک نورِ حق کی کرنوں کے داخلے کے لیے دماغ کی ساری کھرٹکیاں کھلی نہ رکھی جائیں۔ بے چارے منکرینِ حدیث کی ایک مشکل یہ بھی ہے کہ ان کو علمِ حدیث پر مکمل عبور حاصل نہیں۔ احادیث کی مختلف اقسام و انواع اور راویانِ حدیث سے متعلق فنِ تنقید و تحقیق سے یہ لوگ قطعاً نا بلد ہیں۔

تطبیق آیات و احادیث ایک مستقل فن ہے جس کی ابجد تک سے یہ بے چارے بے خبر ہیں۔ علوم حدیث کا حاصل کرنا کوئی آسان کام نہیں، برسوں علماء و مشائخ کے سامنے زانوئے تلمذ طے کرنا پڑتا ہے اس کے بعد بھی مدتوں مسلسل اور عمیق مطالعہ کی ضرورت ہے تب کہیں ہر اکرا حدیث نبوی کی صحیح عظمت و افادیت اور سنت نبویہ کے صحیح مقام کا عرفان حاصل ہوتا ہے۔

**منافقت** | حکمرین حدیث کی سمجھ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کے اسرار و رموز نہیں آتے تو صاف کہیں کہ ہم عقل و فراست کی روشنی سے محروم

ہیں۔ مشرکین عرب سب کچھ تھے، ان میں ہر قسم کی بُرائیاں موجود تھیں مگر وہ

HYPOCRATES (دوغے، منافق) نہ تھے HYPOCRISY سے انہیں نفرت تھی۔

دوغے پہ کوہ گالی سمجھتے تھے جو ان کے دل میں ہوتا تھا وہی زبان پر ہوتا تھا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں ان کی سمجھ میں نہیں آتی تھیں تو وہ سیدھے سادے

لفظوں میں اس کا اظہار کر دیتے تھے کہ آپ کی باتیں ہماری سمجھ میں نہیں آتیں

مگر حکمرین حدیث سیدھی طرح اپنی عقل کے عجز کا اظہار کرتے ہوئے شرماتے ہیں کیسے

کہہ دیں کہ ارشادات نبوی کے اسرار و رموز ہماری عقل کی رسائی سے باہر ہیں،

یہ مردہ درہ جو ہوتی ہے۔ دنیا کو پتہ ہو لگ جاتا ہے کہ ان کے علم کی گہرائی کہاں تک

ہے۔ حکمرین حدیث کی اس کمزوری کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی دور بین نگاہوں نے آج

سے تیرہ چودہ سو سال پہلے ہی بھانپ لیا تھا۔ حافظ ابن قیمؒ اپنی کتاب اعلام الموقعین میں

نقل کرتے ہیں کہ اِنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ كَانَ يَقُولُ اَصْحَابُ الرَّأْيِ اَعْدَاءُ السُّنَنِ

اَعْيَتْهُمْ الْاَحَادِيثُ اَنْ يَحْفَظُوْهَا وَتَفَلَّتْ مِنْهُمْ اَنْ يَعُوْهَا وَاسْتَحْيَوْا حِيْنَ

سُئِلُوْا اَنْ يَقُوْلُوْا لَا نَعْلَمُ فَحَارَضُوْا السُّنَنَ بِرَالِهَمُ فَاَيَاكُمْ وَاَيَا اَئِمَّةِ اَہْلِ بَيْتِہٖ

فرمایا کرتے تھے کہ عقل کی اتباع کرنے والے حدیث کے دشمن ہوا کرتے ہیں حدیثیں یاد کرنے کی

انہیں توفیق نہیں ہوتی اور جب ان سے سوال کیا جاتا ہے تو یہ کہتے ہوئے شرماتے ہیں کہ ہمیں

علم نہیں لہذا اپنی رائے سے جواب دیتے ہیں اور احادیث کا عقل سے مقابلہ کرنے لگتے ہیں،

تم ایسے لوگوں سے بچتے رہنا۔

**اتمام حجت** | غرض منکرینِ حدیث کے لیے لمحہ فکرمہ ہے وہ سوچیں کہ ان کی رسوائی کیا شکل اختیار کر چکی ہے وہ کن لوگوں کی صف میں کھڑے ہیں ان کا طرزِ عمل کن لوگوں کے طرزِ عمل کا غماز ہے۔ ابوہب اور ابوہل کون تھے، احادیثِ بنوی کے بارے میں ان کی سوچ کا کیا اندازہ تھا اور پھر اپنی سوچ کے رخ کو بھی پہچانیں کہیں ان کی سوچ کا رخ بھی اسی جانب تو نہیں جس جانب ابوہب اور ابوہل کی سوچ کا تھا۔ لعصب بالاتر ہو کر سوچیں اگر سوچ کا رخ غلط ہے تو اسے درست کر لیں، ابھی وقت ہے ان لوگوں کی صفوں میں شامل ہوں جو قرآن کے ساتھ ساتھ حدیث کو بھی حجت مانتے ہیں۔ جو جانتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ وحی الہی ہے اور اسی لیے واجب الاتباع ہے۔

ترجمہ: اور وہ اپنی خواہش سے باتیں نہیں بناتے | وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ ۚ اِنْ هُوَ اِلَّا  
(ان کا کلام تو) تمام تر وحی ہی ہے جو ان پر بھیجی جاتی ہے | وَحْيٌ يُّوْحٰی (النجم: ۳-۲)  
یہ قرآن کی آیت ہے اسی قرآن کی جسے منکرینِ حدیث حجت مانتے ہیں وہی قرآن کہہ رہا ہے کہ آپ اپنی طرف سے تو کچھ بھی نہیں کہتے وہی کہتے ہیں جو وحی کی جاتی ہے۔ آپ کی زبان مبارک سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ وحی ہے پھر ہی کے حجت نہ ہونے کا کیا مطلب! خدارا ذرا غور کیجئے، پلٹ آئیے اسی قرآن ہی کی طرف پلٹ آئیے جس کے بارے میں آپ کہتے ہیں کہ بس ہمیں قرآن ہی کافی ہے۔ وہی قرآن پکار پکار کر کہہ رہا ہے وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ ۚ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰی۔

سے گفتہ او گفتہ اللہ لود | گمراہی از حلقوم عبد اللہ بود  
آئیے باطل کی ظلمتوں سے نکلی آئیے، بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ بابرکات آفتابِ نبوت و رسالت ہے۔ آنکھیں کھولیں دیکھئے قرآن کیا کہہ رہا ہے۔

ترجمہ: اور نہیں بھیجا ہم نے کوئی رسول مگر اس لیے | وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُولٍ اِلَّا لِيُطَاعَ  
کہ اس کی اطاعت کی جائے اسی طرح اللہ کا حکم ہے۔ | بِاِذْنِ اللّٰهِ (النساء - ۶۴)

رسول بھیجا ہی اسی لیے جاتا ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے، اس کے ہر فرمان پر لبیک کہا جائے اس کے ہر فعل کی تقلید کی جائے اس کی ہر ہر ادا کی پیروی کو موجب نجات سمجھا جائے اس لیے کہ وہ جو کچھ کہتا ہے اور جو کچھ کرتا ہے وحی الہی کے تحت ہوتا ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ اس کی اطاعت کو اپنی اطاعت سے تعبیر کرتا ہے۔

مَنْ يُطِيعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ | ترجمہ: جو رسول کی اطاعت کرے اس نے  
(النساء: ۸۹) | درحقیقت اللہ ہی کی اطاعت کی۔

ان قرآنی آیات کو بار بار پڑھیے ان کے معانی پر خوب غور کیجئے اور پھر ذرا اپنے اس دعوے پر نظر ڈالئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی قول اور کوئی فعل ہمارے لیے حجت اور واجب العمل نہیں ہمارے لیے اللہ کی کتاب کافی ہے آپ اللہ کی کتاب ہم تک پہنچانے کے لیے آئے تھے وہ فریضہ ادا ہو چکا اب ہم جانیں اور ہمارا خدا جلنے۔ ذرا غور تو کیجئے محمولہ بالا آیات قرآنی کی روشنی میں آپ کا یہ دعویٰ کس قدر غیر محقول ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ محاذ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت محض ایک قاصد اور لدا کئے کی سی ہے، آپ سمجھتے ہیں کہ اللہ کا پیغام پہنچا دینے کے بعد نبی کو لوگوں سے کچھ کہنے سننے کا حق باقی نہیں رہتا، پیغام پہنچا دینے کے بعد نبی کی حیثیت عام انسان کی سی ہو جاتی ہے؟ خدا کے لیے ذرا سوچئے یہ کن لوگوں کے الفاظ ہیں جو آپ کی زبان سے نکل رہے ہیں کفار ہمیشہ انبیاء کرام علیہم السلام کے بارے میں یہی کہتے آئے

قَالُوا مَا آتَيْنَاكَ إِلَّا بَشَرًا مِثْلَنَا | ترجمہ: (کفار نے) کہا کہ تم تو ہیں ہماری ہی طرح کے انسان ہو۔

د (ابراہیم: ۱۰) | یعنی ہم تمہاری کیوں نہیں اور کیوں اطاعت کریں۔ کتنے تعجب کی بات ہے دعویٰ ایمانی کے باوجود آپ کی سوجھ بوجھ کا انداز کفار سے ملتا جلتا ہے۔ باہر نکل آئیے ان کی صفوں سے اور مل جائیے ان لوگوں کے ساتھ جو رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات کو تمام عالم کے لیے رحمت سمجھتے ہیں اور آپ کی حدیث و سنت کو امت کے لیے حجت اور مشعل ہدایت مانتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کا

اتباع کھمپائے سعادت اور کلیدِ جنت ہے نیز آپ کا عشق اولہ آپ کی محبت آخرت میں موجبِ شفاعت اور حریت میں باعثِ رفیع درجات ہے۔ آئیے ان لوگوں کے ساتھ شامل ہو جائیے جنہوں نے اتباعِ سنتِ نبوی کے سہارے اللہ کے ان محبوب بندوں کی فرست میں اپنا نام لکھوا لیا جن پر اللہ نے خاصِ العام فرمایا ہے

وَمَنْ يَطِيعِ اللَّهَ وَالرَّسُولَ فَأُولَٰئِكَ  
مَعَ الَّذِينَ أَعَدَّ اللَّهُ لَهُمْ مِنَ النَّبِيِّينَ  
وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَاءِ وَالْقَالِينَ  
حَسَنَ أَوْلِيَّكَ رَفِيقًا (النساء-۶۹)

ترجمہ: اور جو اللہ کی اور رسول کی اطاعت کرے تو ایسے لوگ ان حضرات کے ساتھ ہونگے جن پر اللہ نے العام فرمایا یعنی انبیاء صدیقین، شہداء اور صالح اور یہ حضرات بہت ہی اچھے ساتھی ہیں۔

واقعی انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین کی رفاقت سے بڑھ کر کوئی نعمت نہیں مگر یہ نعمت رسول کی اطاعت کے بغیر حاصل نہیں ہوتی۔ آئیے رسول کی اطاعت کا عہد کریں تاکہ اس نعمت سے محرومی نہ رہے۔

**انکارِ حدیث کی اصل وجہ** | منکرینِ حدیث کو یہ دعوت اتمامِ حجت کے لیے ہے ورنہ ہمیں معلوم ہے کہ ہمارے یہ پکارا ان کے لیے صد الجحرا سے زیادہ نہیں۔ ان لوگوں کے انکارِ حدیث کی وجہ کوئی علمی مخالفت نہیں ہے کہ اس کے دور ہونے کے بعد ان کو شرحِ صدر ہو جائے گا اور وہ اپنی غلطی سے رجوع کر لیں گے اگر یہ بات ہوتی تو علماء حق ان کے شرحِ صدر کا کافی سامان مہیا کر چکے ہیں اب تک انہیں اپنی غلطی کا احساس ہو چکا ہوتا۔ لیکن یہ ابھی تک انکارِ حدیث کے موقف کو بدستور حذرِ جاں بنائے ہوئے ہیں تو اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ اس کے بغیر ان کی گارڈی نہیں چلتی۔ دراصل دین کی پابندی ان کے نفس کی برداشت سے باہر ہے۔ احادیثِ نبویہ اور سنتِ محمدیہ قدم قدم پر شہواتِ نفس میں مزاحم ہیں۔ احادیث کو مانتے ہیں تو آزادی جاتی ہے۔ نفسِ یورپ کی بے حیا تہذیب اور بے لگام تمدن پر فریفتہ ہے۔ یہی فریفتگی انہیں انبیاء و مرسلین کے تہذیب و تمدن سے متنفر اور ہیزارہ کیے ہوئے ہے۔ اتنی اخلاقی جرأت



نہیں کہ صاف برائت کا اعلان کر دیں اس لیے ان منکرین حدیث نے درمیان کی راہ نکال لی ہے کہ حدیث کا انکار کر دیا جو ان کی آزادی میں اصل سدا راہ بھٹی اور مسلمان کہلانے کے لیے قرآن کریم کا اقرار کر لیا کیونکہ قرآن کریم کی حیثیت ایک اصولی اور قانونی کتاب کی ہے وہ ایک دستور اساسی ہے جو زیادہ تر اصول اور کلیات پر مشتمل ہے جن میں ایجاز و اختصار کی بنا پر تاویل کی گنجائش نکل آتی ہے جبکہ احادیث بنویہ ان اصول اور کلیات کی شرح اور تفصیل ہیں ان میں تاویل کی کوئی گنجائش نہیں۔ اب یہ بے چارے احادیث کا انکار نہ کریں تو کیا کریں؟ آخر انہیں قرآن کریم کے مجملات اور موجز کلمات میں ایسی من مانی تاویلات کرنی ہیں جس سے ان کے اسلام اور ان کے نفس کی بے قید عیش پرستی میں کوئی منافات نہ رہے۔

اسی لیے تو یہ کہنا بالکل درست ہے کہ انکار حدیث کے بغیر ان بے چاروں کی کٹاری نہیں چلتی، انکار حدیث ان کی مجبوری ہے۔ جس عیش پرستی کے یہ لوگ عادی ہو چکے ہیں حدیث کو حجت ماننے کی صورت میں اس عیش و آرام کو انہیں خیر باد کہنا پڑتا ہے۔ صادق و مصدوق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اس فتنے کی خبر دی تو ان کی اس کمزوری کی طرف بھی اسی وقت اشارہ فرما دیا تھا کہ انکار حدیث کے فتنے کی اصل وجہ عیش پسندی ہوگی۔ دیگر فتن کی طرح فتنہ انکار حدیث کی خبر دیتے ہوئے حضور پر نور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

ترجمہ : میں تم میں سے کسی کو اپنی منڈوں پر سہارا لگائے ہوئے (اس حالت میں) نہ پاؤں کہ جب میرا حکم اس کے پاس پہنچے جس میں کسی کام کے کرنے کو میں نے کہا ہو یا کسی کام سے روکا ہو تو (بکرا اور نخوت سے) یہ کہہ کر میں نہیں جانتا یہ کیا حکم ہے ہم تو جو قرآن میں پائیں گے فقط اس کی پیروی کریں گے۔

لَا الْفَيْنَ أَحَدَكُمْ مُتَكَبِّرًا عَلَىٰ رَيْكِهِ  
يَأْتِيهِ الْأَمْرُ مِنْ أَمْرِي فَمَا أَمَرْتُ  
بِهِ أَوْ نَهَيْتُ عَنْهُ فَيَقُولُ لَا أَدْرِي  
مَا وَجَدْنَا فِي كِتَابِ اللَّهِ اتَّبِعْنَا  
(البدو، ترمذی، ابن ماجہ)

دیکھ لیجئے بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ پیشگوئی کیسی حریف بہ حریف منکرین حدیث پر صادق آتی ہے۔ آج اپنی آنکھوں مشاہدہ کر لیجئے۔ حدیث کا انکار کرنے والے یہی لوگ ہیں۔ سپرنگ دار صوفیوں پر متکبرانہ شان سے بیٹھنے والے قوم کے بٹے ہوئے نرم نرم بستروں پر آرام کرنے والے۔ یہ سپرنگ دار صوفی اور یہ نرم نرم بستر ہی ان کی اصل کمزوری ہیں۔ اس راحت و آرام کی عادت نے ان کی طبیعتوں کو آزاد بنا دیا ہے۔

حدیث کا انکار اس لیے نہیں ہے کہ وہ علمی بنیادوں پر اسے حق سمجھتے ہیں بلکہ اس لیے ہے کہ جس قسم کی آزاد زندگی وہ گزارنا چاہتے ہیں احادیث کا ذخیرہ ان کو اس طرح کی زندگی گزارنے نہیں دیتا۔ احادیث قرآن کریم کی ایک ایک آیت کے معانی و مفہم کو متعین کر دیتی ہیں اور اس طرح ان کو پابند بنا دیتی ہیں کہ شریعت کی منشا کے مطابق زندگی گزاریں اور یہی ان کے لیے محال ہے۔ ان کی آزاد طبیعت کا تقاضا یہ ہے کہ قرآنی آیات کی من مانی تاویلیں کریں۔ احادیث ان کے اس مقصد میں مزاحم ہیں اس لیے اس کے سوا چارہ نہیں کہ احادیث سے بیچھا چھڑا لیا جائے۔

**خواہشاتِ نفس کی پیروی** | احادیث ان کی آزادی میں کس طرح مزاحم ہیں۔  
آئیے ذرا اس کا جائزہ لیں طوالت سے بچنے کے لیے صرف ایک دو مثالیں ہی کافی رہیں گی۔

پانچ وقت کی نماز ان کے نفس پر بڑی شاق ہے۔ کتنی عجیب پابندی ہے یہ کہ صبح صبح نرم و گرم بستروں کو چھوڑ کر مسجد کا رخ کیا جائے یا شبیعہ محفلوں سے اٹھ کر بجائے نماز پڑھا کر باندھ کر کھڑا ہوا جائے، دن میں بھی ہر دو ڈھائی گھنٹے بعد دنیا کے اہم ترین امور سے منہ موڑ کر بار بار نماز کے لیے دوڑا جائے۔ نفس اس پابندی سے گلو خلاصی چاہتا ہے۔ اس کے پیہم تقاضوں سے مجبور ہو کر انہوں نے کہا کہ قرآن نے جہاں جہاں صلوٰۃ کا حکم دیا ہے اس سے یہ معروف نماز مراد لینا درست نہیں صلوٰۃ کے معنی نعت آہیں دعا کے ہیں اس لیے جہاں کہیں بھی اور جس طرح بھی دعا کر لی جائے اقبوا الصلوٰۃ کے حکم کی تعمیل ہو جائے گی۔ قرآن نے تو صلوٰۃ کے قائم کرنے کا مجمل

حکم دے کر اس کی تمام تر تفصیل احادیث پر چھوڑ دی تھیں۔ احادیث ہی نے بتلایا کہ صلوٰۃ کسے کہتے ہیں۔ صلوٰۃ کے لغوی معنی کیا ہیں اور شریعت کی اصطلاح میں صلوٰۃ سے کیا مراد ہے وہ کس طرح ادا کی جاتی ہے اسکے اوقات کیا ہیں ہر نماز کتنی رکعات پر مشتمل ہے۔ اس کے ارکان اس کی شرائط اور اس کے فرائض و واجبات سب حدیث نے متعین کیے ہیں۔ اب منکرین حدیث کی مشکل یہ ہے کہ احادیث کو مانتے ہیں تو نماز اپنی پوری کیفیت کے ساتھ ادا کرنی پڑتی ہے اور یہ ان کی آزادی پسند طبیعت کسی طرح قبول کرنے پر تیار نہیں ہوتی۔ اس مشکل کا آسان حل ان بے چاروں کو یہی نظر آیا کہ احادیث کی حجیت سے ہی انکار کر دیا جائے۔

اسی طرح قرآن نے ایثار و زکوٰۃ کا حکم دیا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی شرح و تفسیر بیان فرمائی کہ زکوٰۃ کس مال پر ہے، وہ کتنی مالیت کا ہو، اس پر کتنی مدت گزرے گی، ہو پھر اس کی ادائیگی کس شرح سے ہو غرض آپ نے اس کی ساری متعلقہ تفصیلات بیان فرمائیں۔ اب احادیث کے ماننے کی صورت میں زکوٰۃ کو اس کی تمام تر تفصیلات کے ساتھ قبول کرنا پڑے گا جو نفسانی اغراض کے پورا کرنے میں نہ ہر دست رکاوٹ ہے۔ اس رکاوٹ کو دور کرنے اور زکوٰۃ کے قرآنی حکم کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھالنے کا سب سے آسان راستہ یہی تھا کہ احادیث کا انکار کر دیا جائے۔

انہی دو مثالوں پر شریعت کے دیگر احکام کو بھی قیاس کر لیجئے۔ قرآن کریم تو ہے ہی ایک اصولی کتاب جو زیادہ تر کلیات پر مشتمل ہے احادیث بنو یہ ان کلیات کی شرح اور تفصیل ہیں۔ قرآن کے اصولی احکام کو ان کی شرح و تفسیر سے الگ کر لیجئے پھر قرآن کے الفاظ کو جو معانی جی ملیں ایسے پہنا دیجئے کہ نفس کی خواہشات بھی پوری ہوتی رہیں گی اور آپ اپنے آپ کو عامل بالقرآن بھی کہہ سکیں گے۔

شہیدان کی بالواسطہ مدد | منکرین حدیث نے یہی کچھ کیا۔ دراصل ان لوگوں نے شیطان کا کام بڑا آسان کر دیا، شیطان کو بڑی درد سہی کرنی پڑتی تھی ہر ہر نیک کام کے لیے فرداً فرداً ہر ایک کو روکنا پڑتا تھا، کبھی نماز سے روک رہا ہے کبھی زکوٰۃ سے جان بچانے کے حربے سکھار رہا ہے کبھی صدقہ و خیرات

سے جی چرانے کے لیے فقر و عسرت کے ڈراوے دیتا پھر رہا ہے غرض جتنے نیک کام ہیں سب سے روکنے کے لیے اسے علیحدہ علیحدہ محنت کرنی پڑتی تھی اسی طرح ہر بُرائی کی طرف رغبت دلانے کے لیے اسے ہر بار جدوجہد کرنا پڑتی تھی، اپنی ذریت کی پوری فوج اس نے لگائی ہوئی تھی۔ اس کے باوجود بھی شیطان بے چارے کی مشکل یہ تھی کہ ایک انسان نے اس کے ہکانے پر ایک بار نماز نہ پڑھی دو بار نہ پڑھی لیکن کبھی نہ کبھی اسے خیال آ ہی جاتا تھا کہ آخر مسلمان ہوں آخرت پر یقین رکھتا ہوں اللہ کے سامنے جوابدہی کا وقت آئے گا تو کیا کروں گا وہ پھر نماز شروع کر دیتا تھا شیطان کو پھر از سر نو اسے ہکانا پڑتا تھا۔ بڑی مشکل میں پھنسا ہوا تھا۔ بے چارہ منکرین حدیث نے اس کی مشکل حل کر دی۔ انہوں نے اس درخت کو ہی جڑ سے اکھڑ پھینکا جس سے نماز روزے زکوٰۃ اور دیگر شرعی احکام کی شاخیں پھوٹتی تھیں۔

ع۔ وہ شاخ ہی نہ رہی جس پہ آشیانہ تھا

انہوں نے احادیث کا انکار کر دیا جو قرآنی کلیات کی تفصیلات کو بیان کرتی تھیں جو قرآن کے مجمل احکام کی تفسیر تھیں جو قرآن کے ایجاز و اجمال کی شرح تھیں جو قرآنی آیات کے صحیح صحیح معانی کی تبیین کرتی تھیں جو احکام الہی کی تعبیل کا طریقہ بتلاتی تھیں جو دین کے اصولی و امر و نہی کا مکمل ڈھانچہ تشکیل دیتی تھیں انکار حدیث کے بعد اب دین موم کی گڑیا بن گیا جس طرح چاہا اپنی مرضی کے مطابق ڈھال لیا شریعت کی ساری پابندیوں سے چشمِ ندون میں جان چھوٹ گئی شیطان کا کام آسان ہو گیا اب ہر ہر کام کے لیے علیحدہ علیحدہ محنت کی ضرورت نہ رہی جس کو دین سے ہٹانا مقصود ہوا اسے ورنہ اب ہر کام منکرین حدیث کے پیچھے لگا دو بس پھر کام ختم۔

دُشمنانِ اسلام کو تقویت | انکار حدیث کا سب سے زیادہ فائدہ دشمنانِ اسلام کو پہونچا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ امت مسلمہ کے لیے ایک نقطہ اتحاد کی حیثیت رکھتا ہے، یہ الیا محور و مرکز ہے کہ ہر قسم کے اختلافات یہاں پہونچ کر دم توڑ دیتے ہیں اور اس حقیقت میں کسی شک کی گنجائش نہیں کہ

ملتِ اسلام کی قوت کا راز اسی نقطہ اتحاد اور اسی محور و مرکز میں منحصر ہے۔ انکارِ حدیث سے اس نقطہ اتحاد پر زبردست ضرب لگی انتشار کی راہیں کھل گئیں دین کا عملی نمونہ ہی سامنے نہ رہے تو دین کی جو تعبیر چاہے کر دو۔ مرکز و محور سے ہٹنے کے بعد انتشار ہی انتشار اور افتراق ہی افتراق باقی رہ جاتا ہے اور دشمنانِ اسلام اسی کے خواہاں ہیں منکرینِ حدیث نے ان کی یہ خواہش پوری کر دی۔ یہ اتحاد ہی تھا جس کی قوت کے سہارے امتِ مسلمہ نے دشمنانِ اسلام کو کبھی سر اٹھانے کا موقع نہ دیا۔ دشمن اگر کسی چیز سے خائف رہتے تھے تو صرف اس امت کے جذبہ اتحاد سے وہ تو خدا سے چاہتے تھے کہ کسی طریقے سے یہ امت انتشار کا شکار ہو جائے جو کام دشمنانِ اسلام سے صدیوں میں نہ ہو سکا وہ ان منکرینِ حدیث نے ان کے لیے انجام دے دیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جب ایک قاصد اور ڈاکے کی حیثیت دے دی گئی تو پھر وہ کیا گیا۔

بہر حال گفتگو اس پر تھی کہ انکارِ حدیث سے ان منکرینِ حدیث کا مقصد و قرآنِ کریم کا اتباع نہیں ہے جیسا کہ یہ دعویٰ کرتے ہیں بلکہ ان کا مقصد محض مذہب کی گرفت ڈھیلی کرنا ہے تاکہ یہ من مانی کر سکیں اور کوئی اعتراض کی انگلی تک ان کی طرف نہ اٹھا سکے۔

علمی سطح پر تو اللہ تعالیٰ نے علمائے حق کے ہاتھوں ان لوگوں کو ایسا رسوا کیا کہ یہ کہیں بھی منہ دکھانے کے قابل نہ رہے لیکن ان لوگوں نے اب دوسرا راستہ اختیار کیا ہے۔ اب ان کا نشانہ دین سے ناواقف سادہ لوح مسلمان ہیں۔ اپنے ذہنوں کی گندگی یہ لوگ خوبصورت الفاظ کے ریشمی رومالوں میں پلپٹ پلپٹ کر پیش کرتے ہیں سادہ لوح مسلمان بے چارے چونکہ پوری طرح دین سے واقفیت نہیں رکھتے آسانی سے ان کے دھوکے میں آ جاتے ہیں :-

اصل روپ | کہتے ہیں کہ ہم سے زیادہ تو قرآن پر عمل کرنے والا کوئی ہے ہی نہیں ، ہم سب کچھ بس قرآن کو سمجھتے ہیں جو قرآن کہہ دے بس وہی درست ہے قرآن کے ہوتے ہوئے ہمیں کسی دوسری چیز کی ضرورت ہی نہیں قرآن ایک جامع کتاب ہے۔ ظاہر نظر میں یہ باتیں بڑی حسین نظر آتی ہیں عام آدمی کے سامنے جب یہ باتیں

خطیبانہ انداز میں کہی جاتی ہیں تو فوراً ان کے دل دماغ کو متاثر کرتی ہیں کون مسلمان ایسا ہے جو یہ کہے گا کہ قرآن ایک جامع کتاب نہیں یا قرآن جو کہتا ہے وہ غلط بھی ہو سکتا ہے لیکن ایک سادہ لوح عام مسلمان بے چارے کو کیا پتہ کہ ان خوبصورت الفاظ کی تہ میں ان منکرین حدیث نے خود تراشیدہ معانی و مظاہیم کا کیسا زہر گھولا ہوا ہے۔ انہیں کیا معلوم کہ ان الفاظ کے پردے میں دراصل یہ لوگ کہنا یہ چاہتے ہیں کہ قرآن کے الفاظ کو لے کر جیسے چاہو اپنے معانی پہناؤ، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آیات قرآنی کی تفسیر میں جو کچھ فرمایا، احکام قرآنی پر جس طرح عمل کر کے دکھایا، قرآنی نظام پر مبنی جس طرح ایک مکمل معاشرہ قائم کر کے دکھایا ان سب کو ایک طرف رکھ دو قرآن کو سمجھنے کے لیے یہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات کی کوئی ضرورت نہیں، ہم مہبط وحی صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد سے بغیر ہی قرآن کو سمجھ سکتے ہیں جس طرح رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کو اپنی زندگی پر منطبق کر کے دکھایا اسی طرح ہم بھی اپنی سمجھ اور عقل کے مطابق موجودہ زندگی پر قرآن کو منطبق کر سکتے ہیں، ان احمقوں کے ذہن میں اتنی بات بھی نہ آسکی کہ رسول برحق کا انطباق وحی الہی کی روشنی میں تھا جس میں خطا کا کوئی امکان ہی نہیں اور تمہارا انطباق تمہاری اپنا ہی عقل کے مطابق ہوگا جو ازل سے قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتی چلی آ رہی ہے۔ کہتے ہیں اور ایسا کہتے ہوئے ان عامل بالقرآن کا دعویٰ کرنے والوں کو بشرم بھی نہیں آتی کہ معاذ اللہ تم معاذ اللہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت محض ایک قاصد اور ڈاکے کی ہے، جس طرح ڈاکے اور قاصد کا کام مکتوب الیہ تک خط کا پہونچا دینا ہے اور پس، اسی طرح اللہ کا پیغام پہونچا دینے کے بعد نبی کا کام ختم ہو جاتا ہے اس کے بعد اسے لوگوں سے کچھ کہنے سننے کا حق باقی نہیں رہتا۔ اللہ تعالیٰ کا پیغام پہونچا دینے کے بعد نبی کی حیثیت ایک عام انسان کی ہوتی ہے گویا نبی اور امتی سب برابر ہو جاتے ہیں۔

ایجاد باللہ یہ منصب نبوت کے ساتھ کیسا دیدہ دلیرانہ استہزا اور کس قدر احمقانہ تمسخر ہے کہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی تو تسلیم کریں مگر آپ کے اقوال اور آپ کے افعال کو حجت نہ تسلیم کریں۔ یہ تو ایسا ہی ہے جیسا کہ کہہ رہے ہوں کہ ہم آپ کو اپنا مقتدا اور پیشوا تو

مانتے ہیں مگر آپ کی کوئی بات ماننے کو ہم تیار نہیں آپ اللہ کی کتاب ہم تک پہنچانے  
 آئے تھے وہ فریضہ ادا ہو چکا اب آپ کا ہم سے کوئی واسطہ نہیں۔ قرآن کو سمجھنے کے لیے  
 بھی ہمیں آپ کی مدد کی ضرورت نہیں ہمیں بھی اللہ نے عقل دی ہے ہم خود سمجھ لیں گے۔  
 کیسا رکیک دعویٰ ہے، کتنا بدیہی البطلان منسوب ہے۔

منصب نبوت کے ساتھ یہ یقیناً کھلا ہوا استہزاء اور تمسخر ہے مگر عام سادہ لوح  
 مسلمانوں کے سامنے اپنے اس دعوے کو اگر حقائق و لفظوں میں کہیں تو قبول کرنا تو بہت دور  
 کی بات ہے ان کے لعن طعن کا نشانہ بننا پڑتا ہے اس لیے ان کے سامنے وہی کچھ کہتے ہیں جو  
 تفصیل کے ساتھ ابھی بتلایا جا چکا ہے کہ قرآن کے بعد ہمیں کسی چیز کی ضرورت نہیں وغیرہ وغیرہ۔  
 اسی طرح یہ منکرین حدیث عام سادہ لوح

**حدیث کی حفاظت میں شک کا اظہار** | مسلمانوں کو کبھی یہ کہہ کر دھوکہ دینے کی کوشش

کرتے ہیں کہ احادیث محفوظ نہیں ہیں اس لیے قابل اعتماد نہیں رہیں مقصود اس کہنے سے بھی ان  
 کا وہی ہے کہنا تو دراصل یہ چاہتے ہیں کہ دین کا وہ مکمل نقشہ جو قرآن اور حدیث کی روشنی میں  
 تیار ہوتا ہے اس پر عمل کرنا ہمارے بس کی بات نہیں، ہم آزادی کے دلدادہ ہیں اور قرآن  
 حدیث کے ساتھ مل کر ہمیں ہا بند بنانا ہے، ہم موجودہ دور کے ہیکلے تقاضوں سے مرعوب ہیں  
 اور ہم میں اتنی صلاحیت نہیں کہ ان تقاضوں کو اسلام کے سانچے میں ڈھال سکیں اس لیے ہم اسلام  
 کو ان تقاضوں کے مطابق بدل دینا چاہتے ہیں۔ کہنا تو فی الحقیقت یہی سب کچھ چاہتے ہیں، یہ  
 اور اسی قسم کے دیگر مزخرفات، مگر کھلم کھلا کیے کہیں، اتنی جرأت کہاں سے لائیں کہ اس قسم کی  
 باتیں کر کے لوگوں سے گالیاں کھائیں اور چند روز میں اپنی موت آپ مر جائیں لہذا پھر  
 پھیر کر کہتے یہ ہیں کہ احادیث کتابی صورت میں ایک عرصہ دراز کے بعد مدون ہوئیں  
 اس سے پہلے عہد نبوی میں اور صحابہ کے دور میں محض زبانی طور پر نقل در نقل کا سلسلہ  
 رہا اور ظاہر ہے زبانی نقل در نقل کے ذریعے الفاظ حدیث کا بعینہ محفوظ رہنا فطرۃ  
 اور عادیۃً محال ہے اور جب الفاظ محفوظ نہیں تو معانی کیسے محفوظ رہ سکتے ہیں اس لیے  
 احادیث کے ذخیرہ پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا اور ناقابل اعتماد مواد پر دین کی بنیاد نہیں

رکھی جاسکتی نتیجۂ حدیث کا سارا ذخیرہ مسترد۔

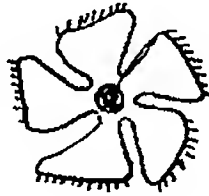
دیکھا آپ نے کیسا خوبصورت طرز استدلال ہے سیدھے سادے مسلمان بے چارے  
 کیا جانیں کہ یہ سب لفاظی ہے خلافت واقعہ ہے اور محض خود فریبی اور دھوکہ دہی ہے۔  
 حیرت کی بات ہے کہ تاریخ کے ذخائر اور مختلف فنون سے متعلق تجربات و تحقیقات تو  
 ان کے لیے قابل اعتماد ہیں جو ناقص ترین ذرائع اور کمزور ترین وسائل کے ذریعے ان  
 تک پہنچے ہیں لیکن فخر و جہاں سرور کون و مکان کے وہ فرمودات اور وہ اعمال و افعال  
 ان کے نزدیک اتنا قابل اعتماد نہیں جن کو قرآن اپنی زبان میں اسوۂ حسنہ کے الفاظ سے  
 تعبیر کرتا ہے جن پر بے قیل و قال عمل کرنا صحابہ باعث فخر سمجھتے رہے ہیں جن کو چودہ سو  
 سال سے پوری امت مسلمہ حرز جاں بنائے ہوئے ہے جن کا عملی نمونہ بڑے بڑے اولیاء  
 امت، مجتہدین، مفسرین اور بزرگان دین کی زندگیوں کی شکل میں ہر دور میں موجود رہا  
 ہے کتنی عجیب بات ہے کہ رطب دیا بس کا وہ مجموعہ تو ان کے نزدیک معتد لھڑے جو کسی  
 مورخ نے سنی سنائی باتوں اور قیاسات پر مبنی شہادتوں کی بنیاد پر صدیوں بعد صفحہ قرطاس  
 پر منتقل کیا ہو اور احادیث کا وہ ذخیرہ غیر معتد قرار پائے جو ایسے طریقوں اور ایسے  
 راستوں سے ہم تک پہنچا ہو انتہائی ثقہ اور قابل اعتماد ہیں جو نقد و جرح کی ایسی  
 چھلنیوں سے چھن کر ہمارے ہاتھوں تک آیا ہو کہ اس سے بہتر نقد و جرح کا کوئی معیار  
 مقرر کرنے سے انسانی فکر عاجز ہے جس کو ہر زمانے میں ایسی جماعت روایت کرتی چلی  
 آئی ہو جن کا عقلاً بھی جھوٹ پر متفق ہونا محال ہے۔

ع۔ بریں عقل و دانش بباید گر لبیت

انتہائی لغو ہے منکر بن حدیث کا یہ دعویٰ کہ احادیث کا ذخیرہ محفوظ نہیں رہا۔ عام  
 سیدھے سادے مسلمانوں کو دھوکہ دینے کے سوا اس کی کوئی حیثیت نہیں۔ احادیث بھی  
 الحمد للہ حجیت دین کے اعتبار سے اسی طرح محفوظ ہیں جس طرح قرآن محفوظ ہے۔ اللہ تعالیٰ  
 نے جس طرح قرآن کریم کی حفاظت فوق العقل طریقہ سے کی اسی طرح احادیث کی  
 حفاظت کا بھی اللہ تعالیٰ نے ہی ایسا اہتمام فرمایا جو فی الواقع عقل کے لیے انتہائی حیران کن



ہے۔ اس کے بعد بھی جو شخص حفاظتِ حدیث میں شک کرتا ہے اس کی عقل میں کلام ہے  
حفاظتِ حدیث کا انکار فی الحقیقت حفاظتِ قرآن کا انکار ہے اور حفاظتِ قرآن کا منکر وعدہ الہیہ  
کا منکر ہے کیوں کہ اللہ کا وعدہ ہے: **إِنَّا نَحْنُ نُحَافِظُ الْقُرْآنَ وَانْتَفِظُونَ**  
(ہم ہی نے ذکرِ انوارِ قدیم میں یہ ملاحظہ ہیں) اور ذکر کے مفہوم میں قرآن کے ساتھ ساتھ حدیث بھی  
شامل ہے جہاں یہ آیت قرآنِ کریم کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ کی ذمہ داری کو بیان کرتی ہے وہاں یہ  
آیت یہ بھی ثابت کرتی ہے کہ احادیثِ نبوی کی حفاظت کو بھی اللہ نے اپنی ذمہ داری میں لیا ہوا ہے جیسا کہ  
النَّشْرُ اللّٰہی بھی ثابت ہوا جاتا ہے۔ آئندہ صفحات میں گفتگو کی ابتدا حفاظتِ حدیث ہی کے  
موضوع پر ہونے لگی ہے مناسب یہی ہے کہ سب سے پہلے حفاظتِ حدیث کا یقینی ہونا واضح کر دیا  
جائے حدیث کے بارے میں دیگر تمام شکوک و شبہات کا تفصیلی جائزہ انشاء اللہ بعد میں لیا  
جائے گا۔



قرآن اور حدیث دونوں اللہ کی حفاظت میں | اس میں کسی کو اختلاف نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد

انا نحن نزلنا الذكر وانالہ لحفظون میں الذکر کے معنی قرآن کے ہیں یعنی اللہ تعالیٰ کا ارشاد یہ ہے کہ ہم نے ہی قرآن کو نازل کیا اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔ الذکر کو قرآن کے معنی میں لینے پر ان لوگوں کا بھی اتفاق ہے جو حدیث کے منکر ہیں، اختلاف یہاں اگر

ہوتا ہے کہ ہم کہتے ہیں الذکر کے مفہوم میں حدیث بھی شامل ہے کیونکہ قرآن کی حفاظت اس وقت تک ممکن ہی نہیں جب تک حدیث کی حفاظت نہ ہو اس لیے جب قرآن یہ کہتا ہے کہ قرآن کی حفاظت اللہ کے ذمہ ہے تو فی الحقیقت یہ کہتا ہے کہ قرآن اور حدیث دونوں کی حفاظت اللہ کے ذمے ہے۔ منکرین حدیث اس کے برعکس یہ کہتے ہیں کہ الذکر سے مراد صرف قرآن ہے اور صرف اسی کی حفاظت کا ذمہ اللہ نے لیا ہے چنانچہ وہ ہم تک محفوظ پہنچ گیا حدیث کی حفاظت کا ذمہ ہی اللہ نے نہیں لیا اس لیے وہ محفوظ نہ رہ سکی۔

اب ہمیں ثابت یہ کرنا ہے کہ الذکر کے مفہوم میں قرآن اور حدیث دونوں کی ایک ساتھ حفاظت شامل ہے۔ اس پر تفصیلی گفتگو کرنے سے پہلے منکرین حدیث ذرا چند

سوالوں کا جواب دیں :

**چند سوال** | سب سے پہلے منکرین حدیث یہ بتائیں کہ احادیث تو غیر محفوظ ہونے کی بنا پر قابلِ اعتماد نہیں رہیں تو پھر آپ کو یہ یقین کس ذریعے سے حاصل ہوا کہ قرآن محفوظ ہے بلکہ اس سے بھی پہلے یہ بتائیے کہ آپ کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ قرآن اللہ کا کلام ہے۔ ذرا سوچیے آپ کے پاس ان دونوں سوالوں کا اس کے سوا کیا جواب ہے کہ حدیث کے ذریعے سے معلوم ہوا مگر حدیث تو آپ کے نزدیک قابلِ اعتبار نہیں تو کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ قرآن بھی قابلِ اعتماد نہیں؟ خدا را کچھ تو سوچیے آپ حدیث کو نہیں مانتے گے تو قرآن کو کیسے مانتے گے۔

بلکہ اس موقع پر بعض منکرین حدیث غلو ترا اور غیر متواتر کی بحث میں پناہ لینے کی کوشش کیا کرتے ہیں مگر انشاء اللہ اس پناہ گاہ سے بھی انہیں راہ فرار اختیار کرنا پڑے گی ہم حجیت حدیث کے موضوع کے تحت اس پر بھی انشاء اللہ تفصیلی روشنی ڈالیں گے اور ان کے اس فریب کا پردہ بھی ہٹا کر دیں گے۔

ذرا یہ بھی بتلائیے کہ قرآن کریم جس صورت اور جس شکل میں اس وقت میرے  
 اور آپ کے ہاتھ میں نظر آرہا ہے کیا آسمان سے یہ اسی کتابی صورت میں نازل ہوا  
 تھا؟ ظاہر ہے آپ کہیں گے ”نہیں“ ہم بھی کہتے ہیں ”نہیں“ تو یہ ”نہیں“ کس علم کی بنیاد  
 پر ہے۔ یہ بات آپ کس علم کے ذریعے سے بتاتے ہیں کہ قرآن اس کتابی صورت  
 میں آسمان سے نازل نہیں ہوا تھا بلکہ قصور و تقصیر کے نتیجے میں سال کی مدت میں  
 نازل ہوا۔ یہ تیس سال میں نزول قرآن کی تکمیل کی مدت کس آیت قرآنی سے معلوم  
 ہوئی، اس مدت کا ذکر اور نزول کی اس کیفیت کا بیان قرآن میں کس جگہ ہے۔ کیا یہ  
 حقیقت نہیں کہ یہ سب کچھ ہمیں، آپ کو اور پوری دنیا کو احادیث سے اور صرف  
 احادیث سے پتہ لگا پھر احادیث کو محفوظ و معتمد ماننے بجز ان باتوں کی صحت کا  
 یقین آپ کہاں سے حاصل کریں گے۔ اسی طرح ذرا سوچئے کیا قرآنی آیات اسی ترتیب  
 سے آسمان سے نازل ہوئی تھیں جس ترتیب سے اب تلاوت کی جاتی ہیں اور کتاب اللہ  
 میں ہمیں ملتی ہیں، یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ قرآنی آیات کی نزولی ترتیب یہ نہ تھی  
 قرآن کی سورتوں اور قرآن کی آیتوں کی موجودہ ترتیب بعد میں نبی کریم صلی اللہ علیہ  
 وسلم کے حکم سے قائم کی گئی آپ کے اس عمل کا پتہ کس ذریعے سے لگا آپ کو کیسے  
 معلوم ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر جو وحی بھی نازل ہوتی آپ اسے کا تبین و وحی  
 کے ذریعے لکھوا لیا کرتے، آپ نے کیسے جانا کہ وہ کا تبین و وحی کون کون لوگ تھے، آپ  
 کے علم میں یہ بات کس طرح آئی کہ قرآن کریم ابتدا میں متفرق اجزاء پر لکھا ہوا تھا،  
 پتھر کے ٹکڑوں پر درختوں کے پتوں پر جانوروں کی ہڈیوں پر اور سوکھی ہوئی کھالوں کے  
 قطعات پر۔ یہ سب باتیں آپ کو کس واسطے سے پہونچیں، اگر یہ واسطہ حدیث کا  
 نہیں تھا جس کو آپ غیر محفوظ سمجھتے ہیں تو ذرا بتلایا جائے پھر وہ کونسا واسطہ تھا جو  
 آپ نے نزدیک حدیث کے مقابلے میں زیادہ محفوظ ہے۔

یہ تمام سوال ہمارے اس دعوے کے ثبوت کے لیے کافی ہیں کہ احادیث کی حفاظت کے بغیر قرآن کی حفاظت کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا تاہم اصل بحث کی طرف لوٹتے ہوئے ہم یہ ثابت کرنے لگے ہیں کہ قرآن کی حفاظت کے ساتھ ساتھ اللہ نے حدیث کی حفاظت کا ذمہ بھی خود ہی لیا ہے ۛ

**قرآن صرف الفاظ کا نام نہیں** | محولہ بالا آیت میں الذکر سے مراد قرآن ہے تو آیت

ذرا اس کا جائزہ لیں کہ قرآن کسے کہتے ہیں کیا قرآن صرف الفاظ کا نام ہے یا الفاظ اور معانی کے مجموعے کا نام قرآن ہے۔ تمام اہل علم اس پر متفق ہیں کہ قرآن نہ صرف الفاظ قرآنی کا نام ہے اور نہ صرف معانی قرآنی کا بلکہ دونوں کے مجموعے کو قرآن کہا جاتا ہے۔ آپ خود ہی سوچئے اگر کوئی شخص قرآن کریم کے متفرق الفاظ اور جملے لے کر ایک مقالہ یا رسالہ یا کوئی کتاب اپنے کسی پسندیدہ موضوع پر لکھ دے مثلاً سیاست پر تاریخ پر فلسفہ پر یا کسی بھی مذہبی یا غیر مذہبی موضوع پر کوئی تحریر مرتب کرے اور اس میں یہ اہتمام کرے کہ اپنا مطلب واضح کرنے کے لیے الفاظ تمام کے تمام

لگے رہتے ہیں (ۛ) ہمارے نزدیک بھی حجت ہو سکتی ہے تو ہم عرض کریں گے کہ یہ یا تو تاریخی امور ہونے کے باوجود اس قدر بنیادی ہیں کہ ان کی صحت و عدم صحت کا فیصلہ کیے بغیر خود قرآن کی صحت و عدم صحت کا فیصلہ ممکن نہیں جو صرف تاریخی امور ہی کا نہیں تمام احکام دین کا منبع ہے۔ اس کے علاوہ ہمارا اصل سوال تو یہ ہے کہ یہ احادیث بھی انہی اسانید کے ذریعے سے ہم تک پہنچی ہیں جن کے ذریعے سے ہم تک وہ احادیث پہنچی ہیں جو حلال و حرام والی آیات قرآنی کی تفسیر و تشریح کرتی ہیں اگر یہ اسانید قابل اعتماد نہیں تو دونوں جگہ انہیں قابل اعتماد نہ ہونا چاہیئے اور اگر یہ اسانید قابل اعتماد ہیں تو ان کے ذریعے سے پہنچی ہوئی بعض احادیث کو غیر محفوظ کہنے کا کیا مطلب ؟

وہ استعمال کرے جو قرآن نے استعمال کیے ہیں کوئی ایک لفظ بھی قرآن سے باہر کا نہ آنے دے تو ایسے کسی مقالے یا رسالے کو یا کسی کتاب کو کیا آپ قرآن کہنے پر تیار ہوں گے؟ یا اسی طرح کسی ایسی کتاب کو کیا آپ قرآن کہہ سکیں گے جو تمام ترجمانین قرآنہ پر مشتمل ہو لیکن اس کے الفاظ اور ان کی ترتیب بتا دے اس کتاب کی اپنی ہو جیسا کہ اسلامی تصانیف کی ان میں عموماً معانی اور مضامین قرآن ہی کے بیان کیے جاتے ہیں۔ صاف ظاہر ہے کہ پہلی قسم کی کتاب قرآن کہلائی جاسکتی ہے نہ دوسری قسم کی تصانیف کو ہم قرآن کہہ سکتے ہیں۔ کیوں؟ صرف اس لیے کہ قرآن نہ صرف الفاظ کا نام ہے نہ صرف معانی کا، قرآن نام ہے اس مصحف ربانی کا جو الفاظ اور معانی دونوں کا مجموعہ ہے۔

فقہاء جب فقہ کے ماتخذ بیان کرتے ہوئے قرآن پر بطور ماتخذ فقہ بحث کرتے ہیں تو قرآن کی تعریف بتلاتے ہوئے یہی کہتے ہیں کہ قرآن نظم اور معنی دونوں کے مجموعے کا نام ہے۔ مسائل فقہ کا استنباط کرنے کے لیے قرآن کے نظم اور معنی یعنی قرآن کے الفاظ اور ان کے معانی دونوں کا لحاظ رکھنا لازمی ہے اس کے بغیر مسائل کا استنباط ممکن ہی نہیں۔

اس کے علاوہ ذرا اس پر بھی غور کیجئے کہ الذکر کا لفظ جس سے ہم قرآن مراد لے رہے ہیں لغت میں کن معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ لغت پر منکرین حدیث کو بہت زیادہ اعتماد ہے۔ اسی لغت کی طرف ذرا رجوع کیجئے، الذکر کے لغوی معنی نصیحت کے بھی ہیں۔ قرآن میں بھی جا بجا یہ لفظ نصیحت کے معنی میں استعمال ہوا ہے مثلاً وَهَذَا إِذْ كُنَّا مُبَارِكًا اُنْزِلْنَاهُ (۲۱-۵۰) اور یہ مبارک نصیحت ہے جسے ہم نے نازل کیا یا سورہ ص کی پہلی آیت ہے ص وَالْفُؤَادِ ذِي الْذِكْرِ قسم ہے اس قرآن کی جو نصیحت دینے والا ہے اسی طرح ایک اور مقام پر ارشاد ربانی ہے وَارْتَدَّ لَذِكْرِكَ لَوَفَّيْمًا یہ قرآن تمہارے اور تمہاری قوم کے لیے نصیحت ہے۔

اب یہ بتلائیے کہ کیا الفاظ کے کسی ایسے مجموعے سے نصیحت حاصل کی جاسکتی ہے جس کے کوئی معنی نہ ہوں۔ معمولی سے معمولی عقل رکھنے والا بھی یہ بات سمجھ سکتا ہے کہ نصیحت کا حصول انہی الفاظ سے ممکن ہے جو معانی رکھتے ہوں، انہی الفاظ حصول نصیحت کے لیے مفید نہیں۔ اگر یہ بات درست ہے اور یقیناً درست ہے تو اللہ تعالیٰ کا قرآن کو ذکر کے لفظ سے تعبیر کرنا

خود بتلا رہا ہے کہ قرآن الفاظ اور معانی دونوں کے مجموعے کا نام ہے یہ تو ایک حقیقت ہے جس پر دلائل قائم کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔ ایک عام آدمی بھی اتنی بات سمجھتا ہے کہ محض الفاظ کوئی حقیقت نہیں رکھتے، الفاظ اور معانی کا پھولی دامن کا ساتھ ہے، الفاظ اور معانی جسم اور جان کی طرح ہیں۔ جس طرح روح کے بغیر جسم بیکا ہے اور جسم کے بغیر روح کا وجود متصور نہیں ہو سکتا اسی طرح معانی کے بغیر الفاظ بے کار ہیں اور الفاظ کے بغیر معانی کا کوئی وجود نہیں۔ لہذا ثابت ہوا کہ الفاظ اور معانی قرآن کے دو رکن ہیں اور ایسے لازم و ملزوم دو رکن کہ ایک کے بغیر دوسرے کا وجود ہی باقی نہیں رہتا۔

یہ حقیقت سمجھ لینے کے بعد کہ قرآن الفاظ اور معانی دونوں کے مجموعے کا نام ہے اتنی بات اور ذہن نشین رکھیے کہ قرآن کے معانی الفاظ قرآنی سے جدا ایک علیحدہ حیثیت کے بھی حامل ہیں وہ اس طرح کہ قرآن کے معانی سمجھانے کے لیے ظاہر یہ منکلم کو ایسے نئے الفاظ استعمال کرنا پڑیں گے جو الفاظ قرآنی کے علاوہ ہوں یہ ناممکن ہے کہ قرآنی الفاظ کے معانی سمجھانے کے لیے آپ پھر انہی الفاظ کو دہرا دیں اور آپ کا مخاطب معانی پر مطلع ہو جائے مثال کے طور پر کوئی شخص کہتا ہے کہ سورہ فاتحہ کی آیت اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ کے معانی بتلائیے تو آپ اس شخص کے جواب میں اسی آیت کو دہرا کر دو بارہ تلاوت کر کے مخاطب کو مطمئن نہیں کر سکتے آپ یہ دعویٰ نہیں کر سکتے کہ آپ نے آیت کے معانی بتلا دیئے جب تک کہ آپ اس مقصد کے لیے قرآنی آیت کے علاوہ کوئی اور کلام نہ کریں اور اپنے الفاظ میں آیت کے معانی اپنے مخاطب کو نہ سمجھائیں۔

**حدیث نبوی قرآن کا بیان ہے** | ان دو مقدمات کو ذہن نشین کرنے کے بعد کہ قرآن الفاظ و معانی کے مجموعے کا نام ہے اور

قرآنی الفاظ کے معانی بیان کرنے کے لیے منکلم کو اپنے الفاظ کی ضرورت ہے اس مسئلہ حقیقت کو ذہن میں آ جا کر کیجیے کہ حدیث نبوی قرآنی الفاظ کے معانی ہی کا نام ہے، حدیث نبوی قرآن کا بیان ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ اقوال و افعال اور وہ تقریرات جن کو محدثین کی

اصطلاح میں حدیث یا سنت کے نام سے یاد کیا جاتا ہے دراصل مجملات قرآنی کی تفصیل  
ہیں۔ حدیث بنوی یا سنت بنوی فی الحقیقت مبہمات قرآنی کی وضاحت ہے، مشکلات  
قرآنی کی تفسیر ہے، مخفیات قرآنی کے لیے اظہار کے مقام پر ہے اور کفایات قرآنی کے لیے  
تصریح کا کام دیتی ہے۔

ان وضاحتوں کے بعد ہمارے اس دعوے کی حقانیت پوری طرح واضح ہو جاتی ہے  
کہ اللہ نے قرآن کے ساتھ ساتھ حدیث کی حفاظت کا ذمہ بھی لیا ہے۔ معانی قرآنی کی حفاظت  
کے بغیر الفاظ قرآنی کی حفاظت بے معنی ہے یعنی حدیث کی حفاظت کے بغیر قرآن کی حفاظت  
ممکن ہی نہیں۔ اس لیے جب ہمیں یہ خبر دی جاتی ہے کہ قرآن کی حفاظت اللہ کے ذمے ہے  
تو اس کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں کہ قرآنی الفاظ اپنے معانی سمیت اللہ کی حفاظت میں  
ہیں یعنی قرآن احادیث بنوی سمیت اللہ کی زیر حفاظت ہے۔

اب اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ قرآن تو محفوظ ہے مگر حدیث محفوظ نہیں تو گویا وہ یہ کہتا  
ہے کہ قرآن کے الفاظ تو محفوظ ہیں اس کے معانی محفوظ نہیں اور الفاظ کی حفاظت معانی کے  
بغیر بے کار ہے تو قرآن محفوظ کہاں رہا اسی لیے ابتدا میں جو کہا گیا تھا وہ بالکل درست تھا کہ  
حدیث کی حفاظت کا انکار کرنے والا دراصل قرآن کی حفاظت کا انکار کرتا ہے اور جو شخص حفاظت  
قرآن کا انکار کرتا ہے وہ فی الحقیقت ان آیات قرآنی کا منکر ہے جن میں یہ خبر دی گئی ہے کہ  
قرآن کی حفاظت اللہ کے ذمے ہے۔

کیا منکرین حدیث کو اب بھی اس حقیقت میں کوئی شبہ ہے کہ قرآن کی طرح حدیث  
بھی اللہ ہی کے زیر حفاظت ہے۔ ممکن ہے منکرین حدیث اب بھی اس پر اصرار کریں کہ آپ

(گذشتہ باب سے پیوستہ)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ اپنی زبان مبارک سے ارشاد فرمایا اس کی روایت حدیث قوی  
کہانی، جو کچھ امت کے سامنے آپؐ نے کر کے دکھایا اس کی روایت کو حدیث فعلی سے تعبیر کیا گیا اور  
آپ کے سامنے صحابہ نے کوئی عمل کیا اور اس پر آپؐ نے متعین نہیں فرمایا تو اس واقعہ کی روایت  
کہ محدثین نے حدیث تقریری کا نام دیا۔



کی یہ ساری بحث تو اس بنیاد پر ہے کہ الذکر سے قرآن اور حدیث دونوں مراد ہیں جب کہ ہم اس بنیادی بات ہی کو نہیں مانتے ہمارے نزدیک تو الذکر سے مراد قرآن ہے اور اللہ نے صرف اسی کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے۔ اس اصرار کے جواب میں منکرین حدیث کو ہم قرآن کی وہ آیات یاد دلانا چاہتے ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے قرآن اور شرح و بیان قرآن یعنی حدیث دونوں کو مجداً جدا ذکر کر کے یہ بتلایا کہ ان دونوں کی حفاظت ہمارے ذمے ہے۔ ذرا سورۃ القیامت کی سواویں سے بے کرانیسویں تک کی آیات کو ذہن میں تازہ کیجئے۔ ارشاد ربانی ہے :

ترجمہ : (اے پیغمبر) اس (قرآن) کو لینے کے لیے اپنی زبان نہ ہلاؤ جلدی نہ کرو ہمارے ذمے ہے اس قرآن کا (آپ کے سینے میں) جمع کر دینا اور آپ کی زبان سے اسے پڑھوانا۔ جب ہم اس قرآن کو پڑھیں تو آپ صرف سننے دے بیٹھے پھر ہم اسے ہی دیتے اس قرآن کا بیان بھی ہے۔

لَا تَحْرُكْ بِهِ لِسَانَكَ لِتُحْضِلَ بِهِ  
إِنْ عَلَيْنَا جُمُعَةٌ وَنُفِرَ إِلَيْهِ فَاِذَا  
نُفِرَ إِلَيْهِ فَاَتَّبِعْ قُرْآنَهُ ثُمَّ انْ  
عَلَيْنَا بَيَانَهُ

(القیمة : ۱۶ - ۱۹)

ابتدائے زمانہ نبوت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت شریفہ یہ تھی کہ نزول وحی کے وقت وحی الہی کے الفاظ کو یاد رکھنے کے لیے بار بار زبان مبارک سے رٹتے جاتے اور تکرار فرماتے جاتے تاکہ ذہن میں الفاظ وحی جم جائیں اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس مشقت سے بچانے کے لیے پہلے تو فرمایا کہ اس تکرار سانی سے کام نہ لیجئے پھر تسلی دیتے ہوئے فرمایا کہ اس کلام کا آپ کے ذہن میں محفوظ کر دینا اور پھر آپ کی زبان پر اس کو جاری کر دینا یہ ہمارے ذمے ہے آپ اس فکر میں نہ پڑیے کہ کہیں کوئی لفظ یاد سے محو نہ ہو جائے آپ تو بس اطمینان سے سنا کیجئے۔

یہاں تک تو الفاظ وحی کے بارے میں اطمینان دلایا گیا کہ ان کو بلا کم و کاست سینہ نبوت میں اتار دینا اور محفوظ کر لینا اللہ کی ذمہ داری میں ہے ظاہر ہے پیغمبر کو حرکت زبان سے منع کرنا حق تعالیٰ کا قرأت قرآن کو اپنی طرف منسوب کرنا اور پیغمبر کا اسے سننے رہنا ان تمام باتوں کا تعلق الفاظ ہی سے ہو سکتا ہے معنی اسے نہیں، معنی نہ رٹتے کی چیز ہے نہ قرأت کی اور نہ سننے کی۔



الفاظ کے سنا دینے کو بیان نہیں کہتے قرأت کہتے ہیں جس کی حفاظت کی ذمہ داری پہلے ہی ملحدہ بیان کر دی گئی ہے۔ میان تو کسی پوشیدہ بات کے کھول دینے یا کسی مبہم بات کی وضاحت کر دینے یا کسی غیر معلوم بات کو علم میں لے آنے کا نام ہے اور الفاظ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے علم میں پہلے ہی آچکے جیسا کہ سابقہ آیات میں بتلادیا گیا اس کے بعد الفاظ کے معانی اور ان کی مرادات ہی ہیں جو الفاظ سن لینے کے بعد مخفی رہ سکتے ہیں۔ لہذا یہ ماننے بیخبر چارہ نہیں کہ بیان کا لفظ معانی و مطالب کے لیے لایا گیا ہے جیسا کہ لغتاً اور محاورتاً بھی یہ معانی ہی کے لیے وضع کیا گیا ہے۔ حاصل یہی نکلا کہ الفاظ قرآنی کے ساتھ ساتھ ان کے معانی و بیان کی حفاظت کا ذمہ بھی اللہ تعالیٰ نے ہی لیا ہے اور الفاظ قرآنی کے معانی و بیان ہی کا نام حدیث یا سنت ہے۔

**قرآن کے الفاظ اور معانی دونوں من جانب اللہ** | ان صریح آیات کے بعد بھی اگر منکرین حدیث

اپنے اس اصرار پر تھے رہیں کہ اللہ تعالیٰ صرف قرآن کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے حدیث کا نہیں تو ہر ذی عقل اسے ضد بے جا سے زیادہ کوئی اہمیت نہ دے گا۔ بیان قرآنی کو اپنی ذمہ داری میں لینے کی خبر دے کر اللہ تعالیٰ نے ایک اور اہم حقیقت پر اپنے بندوں کو مطلع فرمایا کہ یہ کہ قرآن کے الفاظ اور اس کے معانی دونوں من جانب اللہ ہیں، جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم الفاظ قرآنی کے صرف نقل کرنے والے ہیں اسی طرح معانی قرآنی کے بھی آپ صرف ناقل ہی ہیں نہ قرآن کے الفاظ آپ کے اپنے ہیں نہ ان الفاظ کے معانی آپ نے اپنی طرف سے متعین کر لیے، الفاظ کا نزول بھی اللہ تعالیٰ ہی کی جانب سے ہوا اور معانی و مطالب کی تعیین بھی اللہ تعالیٰ ہی نے فرمائی۔ چنانچہ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ آپ آیات قرآنی کو سامنے رکھ کر غور فرماتے ہوں کہ اس آیت کے کتنے مطالب محتمل ہیں اور ان میں سے کونسا مطلب الفاظ پر زیادہ چسپاں ہے اس لیے یہی مراد خداوندی ہو گا بلکہ قرآن کے مجملات کی تفصیل، مبہمات کی تفسیر اور مشکلات کی تیسیر سب کچھ وحی الہی کی مدد سے از خود زبان نبوی پر جاری ہو جاتا اسی موہبتہ رحمانی کو

قرآن وَمَا يَنْسُطُ عَنْ اَهْوَىٰ هٗ اِنْ هُوَ اِلَّا وُحْيٌ يُوحٰى (وہ اپنی خواہش سے باتیں نہیں کرتے ان کا کلام تو تمام ترویج ہے جو ان پر بھیجی جاتی ہے) اسے تعبیر کرتا ہے :

**قرآن فہمی کے لیے صرف زبان دانی کافی نہیں** | اس سلسلہ میں یہ گمان کرنا کہ قرآن کے اولین مخاطب

عرب تھے جو خود اہل زبان تھے اور اس لیے قرآن فہمی کے لیے انہیں علیحدہ سے کسی بیان رسول کی ضرورت نہ تھی بنیادی طور پر یہی غلط ہے اس لیے کہ اول تو کسی کتاب کی مراد سمجھنے کے لیے صرف زبان دانی کافی نہیں ہوتی، ایسا اوقات مصنف کی مراد محاورات کی وسعتوں، اشتراک و تراکب کے حجابوں اور مجاز و کنایات کے پردوں میں پوشیدہ رہ جاتی ہے بلکہ جتنی بلند پایہ کتاب ہوتی ہے اتنی ہی زیادہ شرح و تفسیر کی متقاضی ہوتی ہے اس کے علاوہ سب انسان یکساں فہم و فراست اور مساوی علم و قابلیت کے مالک نہیں ہوتے، سب کی ضرورتیں بھی ایک جیسی نہیں ہوتیں اس لیے یہ ناممکن ہے کہ کلام الہی کی ہر ہر آیت کو سنتے ہی ہر ایک صحابی اس آیت کے کلی جزئی تمام احکام سے باخبر ہو جاتا ہو اور اسے قطعاً کسی فہم و بیان اور کسی وضاحت و تفسیر کی ضرورت نہ ہوتی ہو۔

کتب حدیث میں ایسے بہت سے واقعات ملتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کرام کو بھی قرآن فہمی میں شبہات پیش آ جاتے تھے مثال کے طور پر ان میں سے چند ایک کا تذکرہ کر دیتا مناسب رہے گا، اگرچہ منکرین حدیث کے سامنے احادیث سے کوئی بات ثابت کرنا یہ سود ہے مگر ان مثالوں سے غرض ان احکام کا اثبات نہیں جو ان میں مذکور ہیں بلکہ صرف تاریخی حیثیت سے یہ بتلانا منظور ہے کہ صحابہ کرام اہل زبان ہونے کے باوجود قرآن کریم کی صحیح مراد سمجھنے میں شبہات پیش آتے تھے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے الفاظ میں ان شبہات کو حل فرماتے تھے۔

قرآن فہمی کے سلسلہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے درمیان جو سوال جواب ہوئے ان کی کثیر تعداد کا اندازہ اس بات سے لگا لیجئے کہ حافظ ابن قیمؒ نے اپنی کتاب اعلام الموقعین میں ان کا جو ذکر کیا ہے وہ پورے ایک سو دس صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ کہیں

صحابہ کرام کو کسی قرآنی آیت کی نفس مراد ہی سمجھنے میں دقت پیش آگئی ہے کہیں صحابہ کو یہ مشکل درپیش ہے کہ قرآن نے ایک بات مجمل طور پر کہی ہے جب تک اس کی تفصیل نہ معلوم ہو اس مجمل آیت کا مفہوم پوری طرح واضح نہیں ہوتا کبھی صحابہ فروعی مسائل میں بعض الجھنوں سے دوچار ہیں عرض صحابہ کو قرآن فہمی میں مختلف قسم کے شبہات پیش آتے ہیں وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طریقت رجوع کرتے ہیں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم وحی الہی کی رہنمائی میں ان سب شبہات کا تشفی بخش جواب ارشاد فرماتے ہیں۔ تمام سوال و جواب کا احاطہ کرنے کی قوت نہ نظر محترم میں نہ ضرورت ہے نہ مقصود۔ صرف یہ ثابت کرنے کے لیے کہ صحابہ کو بھی اہل زبان ہونے کے باوجود قرآن فہمی میں شبہات پیش آتے تھے چند ایک مثالیں پیش خدمت ہیں :

(۱) سورہ نساء کی ایک آیت **مَنْ لَّحَلَ سَوْءً بِعَذَابٍ** جو شخص کوئی بُرائی کرے گا اس کا بدلہ اس کو دیا جائے گا۔ (النساء: ۱۲۳) کی نفس مراد سمجھنے میں بعض صحابہ

کو یہ شبہ پیش آگیا کہ ایسا تو کوئی انسان بھی نہیں جس سے کبھی بھی کوئی قصور نہ ہوا ہو لہذا اس آیت کی رو سے تو ہر شخص کا عذاب میں گرفتار ہونا ضروری ہے بڑی فکر لاحق ہوئی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو علم ہوا تو فرمایا کہ یہاں بدلے کو جہنم کے عذاب میں منحصر سمجھنا صحیح نہیں بلکہ ہر وہ تکلیف جو انسان کو اس دُنیا میں پہنچتی ہے وہ بھی اس کی برائی کا بدلہ بن جاتی ہے (ترمذی)

(۲) جب یہ آیت نازل ہوئی **وَالَّذِينَ يَكْتُمُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يَفْقَهُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَبَشِّرْهُم بِعَذَابٍ أَلِيمٍ** (جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں اور اس کو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے ان کو دردناک عذاب کا خوشخبری سنا دیجئے۔ (برآۃ: ۳۴))

تو بعض صحابہ نے سمجھا کہ اس آیت نے مطلقاً مال جمع کرنے کو حرام قرار دے دیا ہے۔ صحابہ کی اکثریت اگرچہ غریب تھی مگر کچھ لوگ مالدار بھی تھے ان کے پاس سونا چاندی جمع بھی رہتا تھا وہ یہ آیت سن کر بڑے فکر مند ہوئے۔ آپ سے استفسار کیا گیا تو آپ نے فرمایا آیت کا وہ مطلب نہیں ہے جو تم سمجھے ہو سونا

چاندی جمع کرنا اس وقت صادق آتا ہے جب زکوٰۃ ادا نہ کی جائے۔ جن مال کی زکوٰۃ دے دی جائے وہ کمتر اور خیر ائے کی تعریف میں نہیں آتا صحابہ چونکہ پریشان تھے اسی لیے ان کی پریشانی دود کرنے کے لیے تسلی آمیز انداز میں فرمایا :-

إِنَّ اللَّهَ لَمْ يَفْضِ الزَّكَاةَ إِلَّا  
لِيُطِيبَ بِهَا مَا لِقِيَ مِنْ أَمْوَالِكُمْ ط | اللہ تعالیٰ نے تم پر زکوٰۃ اسی لیے ترک لازم کی ہے تاکہ تمہارا باقی مال پاک مہات ہو جائے۔

یہ سن کر صحابہ کرام کا شبہ حل ہو گیا اور مال جمع کرنے کی حدود کا انہیں علم ہو گیا۔

(۳) عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ کا واقعہ تو بڑا مشہور ہے جب روزے کے احکام کے بارے میں سورہ بقرہ کی یہ آیت نازل ہوئی حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ (کھاتے پیتے رہو یہاں تک کہ سیاہ و سفید دھاتے میں ہمیں فرق معلوم ہوے لگے۔ بقرہ: ۱۸۷)۔ نو عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ نے دودھا گے (بک سیاہ اور ایک سفید) کے اپنے تکیہ میں رکھ لیے اور سحری ختم ہونے کے وقت ان دھاگوں کو قریب قریب رکھ کر دیکھتے رہے جب دونوں دھاگوں کا رنگ الگ الگ واضح نظر آنے لگا تو کھانا پینا بند کر دیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت عدیؓ کے اس عمل کا حال معلوم ہوا تو آپؐ نے ازراہ مزاح فرمایا اے عدی تمہارا تکیہ بڑا لمبا چوڑا معلوم ہوتا ہے جس میں رات اور دن دونوں سما جاتے ہیں اور پھر اس آیت کی اصل مراد سمجھاتے ہوئے فرمایا یہاں سیاہ اور سفید دھاگے مراد نہیں بلکہ رات کی تاریکی کی سیاہی اور دن کی روشنی کی سفیدی مراد ہے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی جانب سے مزید وضاحت کے لیے آیت کے آخر میں مِنَ الْفَجْرِ کے الفاظ اور نازل ہو گئے (بخاری)

(۴) سورہ الشقاق کی آیت فَأَمَّا مَنْ أُوتِيَ كِتَابًا بِرَبِّهِمْ فَسَوْفَ يُحَاسِبُ حَسَابًا يَسِيرًا (جس شخص کا اعمال نامہ دلائل ہاتھ میں دیا جائے گا اس کا حساب نہایت نرمی سے ہوگا۔

انشقان: ۷-۸) کا صحیح مفہوم سمجھنے میں ایک مرتبہ حضرت عائشہؓ جیسی فقیہہ کو

مخالطہ لگ گیا۔ ہوا یوں کہ ایک بار نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قیامت کی ہولناکیوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ قیامت کے دن جس کا بھی حساب لیا گیا سمجھ لو کہ بس وہ ہلاک

ہو گیا حضرت عائشہ نے محولہ بالا آیت کے حوالے سے عرض کیا کہ اس آیت سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ جس کو نامہ اعمال درپن یا تھر میں دیا گیا وہ ہلاک نہ ہو گا اس کا حساب نہایت نرمی سے ہو گا، آپ نے جواب میں ارشاد فرمایا کہ یہ حساب یسیر بہاں عرض یعنی پیش کرنے کے معنی میں ہے مطلب یہ ہے کہ اعمال نامہ ان کے سامنے رکھ کر صرف ان کو جتلا دیا جائے گا کہ تم نے فلاں فلاں عمل کیا ہے مگر اس پر ان سے ہانہ پھر س نہ ہو گی اس کے علاوہ اگر کسی سے یہ سوال کر لیا گیا کہ یہ کام کیوں کیا تھا تو بے شک اس کی نیر نہیں وہ یقیناً ہلاک ہو گیا (بخاری)

(۵) بعض صحابہ کرام سورہ انعام کی آیت **الَّذِينَ آمَنُوا وَلَمْ يَلْبِسُوا إِيمَانَهُمْ بِظُلْمٍ أُولَٰئِكَ لَهُمُ الْأَمَنُ وَهُمْ مُّهْتَدُونَ** (جو لوگ ایمان لائے پھر انہوں نے اپنے اپنے ایمانوں میں کوئی ظلم شامل نہیں کیا یہی لوگ ہیں جن کو امن ملے گا اور یہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں۔

انعام: ۸۲) سن کر پریشان ہو گئے اور دربار رسالت میں عرض کیا کہ ہم میں سے کون شخص ایسا ہے جس نے ایمان لائے کے بعد کوئی ظلم اور محصیت نہ کی ہو اس آیت کے تحت تو ہم میں سے کوئی بھی مستحق امن و سلامتی اور ہدایت یافتہ نہیں رہتا آپ نے فرمایا یہاں ظلم سے محصیت مراد نہیں ہے بلکہ خاص شرک مراد ہے جیسا کہ دوسری آیت میں ظلم کو شرک ہی سے تعبیر کیا گیا ہے **إِنَّ الشِّرْكَ نَظْمٌ عَظِيمٌ** (شرک بہت بڑا ظلم ہے)۔

یہ چند مثالیں جو آپ کے سامنے پیش کی گئی ہیں ان پر ذرا دوبارہ نظر ڈالیے اور دیکھئے کہ صحابہ کرام کو اہل زبان ہونے کے باوجود الفاظ قرآنی کے صحیح معانی اور ان کا اصل مفہوم متعین کرنے میں کیسی کیسی مشکلات پیش آتی رہی ہیں ان میں ایسے سوال بھی ہیں جن کا تعلق عقائد سے ہے ایسے بھی ہیں جن کا تعلق آخرت سے ہے اور ایسے سوال بھی ہیں جو عبادات سے متعلق ہیں اور یہاں یہ جتلانے کی تو شاید ضرورت نہیں کہ یہ تمام امور اتنے اہم ہیں کہ نجات اور عدم نجات کا ان پر مدار ہے۔

بہر حال یہ خیال کرنا کسی طرح بھی درست نہیں کہ صحابہ چونکہ اہل زبان تھے اس لیے انہیں قرآن فہمی کے لیے کسی بیان رسول کی ضرورت ہی نہ تھی۔ طوالت کے خوف کی وجہ

سے صرف چند مثالوں پر اکتفا کیا گیا ہے ورنہ جیسا کہ ابتدا میں عرض کیا جا چکا ہے اس قسم کی مثالیں کثیر تعداد میں ہیں۔

ان مثالوں میں صحابہ کی جانب سے کیے گئے سوالات پر ذرا اس حیثیت سے بھی نظر ڈالیے کہ کیا ان سوالات کے جواب میں انہی متعلقہ آیات کا دوبارہ تلاوت کر دینا کافی ہوتا اور کیا انہی آیات کو بار بار سنا دینے سے صحابہ کی تشفی ممکن تھی؟ ان مثالوں پر اس نقطہ نظر سے بھی غور کیجئے کہ کیا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ بھی کوئی اور شخص ان سوالات کے وہی جواب دے سکتا تھا جو آپ نے دئے۔ کیا کوئی شخص صرف زبان عربی کی مدد سے یہ متعین کر سکتا ہے کہ سوال اول میں جزا سے دنیوی تکالیف مراد ہیں یا چوتھے سوال میں حساب لیبر کے معنی اعمال نامہ سامنے رکھ دینے کے ہیں یا اسی طرح صرف زبان دانی کی بنیاد پر کوئی یہ سمجھ سکتا ہے کہ پانچویں سوال میں ظلم سے شرک مراد ہے۔

**حدیث کے بغیر قرآن کی حفاظت کا تصور** اگر یہ امر واقعہ ہے کہ صحابہ کرام کو بھی اہل زبان ہونے کے باوجود

قرآن انہی میں مشکلات پیش آتی رہی ہیں اور اگر یہ درست ہے کہ قرآن انہی میں پیش آمدہ مشکلات کے حل کے لیے متعلقہ آیات کا دوبارہ تلاوت کر دینا کافی نہیں ہے نیز اگر یہ بات بھی مسلمہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کوئی بھی شخص قرآنی آیات کا صحیح مفہوم ربانی متعین کرنے کا اہل نہیں تو پھر اس حقیقت سے بھی مجال انکار نہیں ہو سکتا کہ احادیث نبوی کی حفاظت کے بغیر قرآن کی حفاظت کا تصور بے معنی ہے اور اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے قرآن کی حفاظت کے ساتھ ساتھ قرآن کی شرح و تفسیر یعنی حدیث کی حفاظت کا بھی ذمہ لیا ہے۔ یہ آیات دوبارہ پڑھیے :

اِنَّمَا هُوَ ذِكْرٌ لَّكَ اِنَّكَ اَنْتَ الْغَافِلُ (۱۹ - ۱۸)

جمع کر دینا اور (اپنی زبان سے) اسکا پڑھنا واجب ہے۔  
اس قرآن کو پڑھیں تو دے پیغمبر! آپ صرف سنتے رہیں۔  
پھر ہمارے ہی ذمہ اس قرآن کا بیان بھی ہے۔

اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ ۝  
فَاِذَا قُرِئَتْ فَاحْتَسِبْ قُرْآنَهُ ۝ ثُمَّ  
اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ ۝  
(القيمة : ۱۷ - ۱۹)



اور غور کیجئے یہ قرآن ہی تو ہے جو حدیث کے محفوظ من اللہ ہونے کا دعویٰ کر رہا ہے۔ جو شخص عامل بالقرآن ہونے کا دعویٰ کرتا ہے وہ اگر اپنے دعوے میں پچاسہ تو ان صریح آیات قرآنی کے بعد اس کے لیے الزام حدیث کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ ان آیات کے مفہوم پر بار بار غور کریں یہ آیات کیسے واشکاف انداز میں اس حقیقت کا اظہار کر رہی ہیں کہ قرآن کو بیان کی ضرورت ہے اس لیے کہ بیان کے بغیر مرادات خداوندی کا علم ممکن نہیں۔ یہ آیات کتنی صراحت کے ساتھ اس بات کی اطلاع دے رہی ہیں کہ قرآن کی حفاظت کا حق صرف اس کے الفاظ کی حفاظت سے ادا نہیں ہو سکتا بلکہ قرآن صحیح بیان ہی کی حفاظت سے ادا ہو سکتا ہے۔ قرأت اور بیان کو علیحدہ علیحدہ ذکر کر کے یہ آیات پکار پکار کر کہہ رہی ہیں کہ قرآن کریم میں ایک درجہ الفاظ و تعبیرات کا ہے جس کا تعلق قرأت خداوندی کی اتباع میں قرات نبوی سے ہے اور ایک درجہ معانی و مطالب اور مرادات ربانی کا ہے جس کا تعلق بیان خداوندی کی پیروی میں بیان نبوی سے ہے پس قرآن کے محفوظ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے الفاظ و تعبیرات بھی محفوظ ہیں اور معانی و مرادات بھی محفوظ ہیں اگر الفاظ کی حفاظت ہو جاتی ہے اور معانی و مطالب کی حفاظت نہیں ہوتی تو ہمیں ماننا پڑے گا کہ نصف قرآن کی حفاظت ہوئی اور نصف غیر محفوظ رہ گیا۔ اسی طرح اگر معانی و مطالب محفوظ ہوں اور الفاظ محفوظ نہ ہوں تب بھی نصف قرآن کی حفاظت ہوئی نصف کی نہیں ہوئی۔ اگر قرآن کے صرف الفاظ ہی محفوظ ہوں تو ہر ملحد و زندیق اپنی اغراض نفسانی کے تحت جو معنی چاہے انہیں پہنارے اور اگر صرف معانی محفوظ ہوں تو امتشار معانی کو سمیٹنے کا کوئی قلعی درجہ باقی نہ رہے۔ پورا قرآن اسی وقت محفوظ سمجھا جائے گا جب الفاظ و معانی دونوں محفوظ ہوں الفاظ کی گرفت سے معنی باہر نہ جاسکیں اور معنی کے لحاظ سے الفاظ میں رد و بدل نہ ہو سکے۔ محض الفاظ کی حفاظت سے قرآن کی حفاظت کا وعدہ خداوندی پورا نہیں ہوتا اتنی حفاظت تو شاید تورات و انجیل کو بھی کسی حد تک حاصل رہی لیکن کیا محض الفاظ کی حفاظت سے یہودیت و نصرانیت محفوظ رہ گئیں؟ کیا اجبار و رہبان نے تحریف مخفی کر کے دین کو

کچھ سے کچھ نہیں بنا دیا؟ اگر راجح قول کے مطابق یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ تورات و انجیل میں لفظی تحریف بھی ہوئی ہے تو پھر بھی حقیقت ناقابل انکار ہے کہ تحریف معنوی تحریف لفظی سے زیادہ خطرناک اثرات کی حامل ہوتی ہے پس قرآن کے الفاظ کو محفوظ کر لے دین کی حفاظت کا دعویٰ کیسے کیا جاسکتا ہے۔ غرض قرآن کے الفاظ اور معانی دونوں لازم و ملزوم ہیں اس لیے قرآن کی حفاظت کو مکمل صرف اسی صورت میں سمجھا جاسکتا ہے جب الفاظ اور معانی یعنی قرآن و بیان دونوں محفوظ مانے جائیں۔ الفاظ محفوظ ہوں بیان محفوظ نہ ہو تب بھی قرآن کی حفاظت ناقص اور بیان محفوظ ہو الفاظ محفوظ نہ ہوں تب بھی ناقص۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دونوں ہی کی حفاظت کا ذمہ لیا کہ ایک کے بغیر دوسرے کا محفوظ رہنا ممکن ہی نہ تھا۔

**حفاظت کے تین مرحلے** | اب یہی یہ بات کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کے الفاظ و تعبیرات اور اس کے معانی و مطالب دونوں کی حفاظت

کس طور پر پوری فرمائی تو اس کی تفصیل میں جانے سے پہلے اتنی بات ذہن میں رکھیے کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے قرآن اور بیان دونوں کی حفاظت کے تین مرحلے ہیں : پہلے مرحلے میں حق تعالیٰ شانہ نے اپنے کلام کے الفاظ اور اس کی مرادات کو اپنی حفاظت کے ساتھ سینہ نبوت میں آنا کر جمع اور محفوظ کیا۔

دوسرے مرحلے میں اس کے رسول نے اسی حفاظت خداوندی کی مدد سے قرآن کے الفاظ کو تلاوت کے ذریعے اور اس کے بیان کو اپنے اقوال اپنے افعال اور اپنی تقریرات کی مدد سے صحابہ کی طرف منتقل فرمایا۔ اور پھر

تیسرے مرحلے میں اسی حفاظت خداوندی کے تحت قرآن اور اس کا بیان دونوں صحابہ سے تابعین کی طرف تابعین سے تبع تابعین تک اور پھر تبع تابعین سے آئمہ اہل بیت کی جانب سینہ بہ سینہ اور سفینہ بہ سفینہ منتقل ہوتے ہوئے ہم تک پہنچے اتنی بات سمجھ لینے کے بعد اب آئیے ہم ان تینوں مرحلوں کا سلسلہ وار جائزہ لیں کہ قرآن اور اس کے بیان کی یہ رہائی حفاظت کس طرح وقوع پذیر ہوئی ؟

جہاں تک پہلے مرحلے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کا تعلق ہے تو اس کے لیے آپ کی

## حفاظت سیدہ نبوی تک

توجہ سورہ قیامت کی اتنی آیات کی طرف دوبارہ مبذول کرانا ضروری ہے جن کا ابھی کچھ دیر پہلے حوالہ دیا گیا ہے۔ ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے قرآن اور بیان دونوں چیزوں کی حفاظت کی ذمہ داری عیثاً کے کلمہ سے فرمائی ہے جو لوگ عربی زبان سے واقف ہیں وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ عیثاً کا کلمہ اپنے اوپر لازم کر لینے کے معنی میں آتا ہے۔ اب آپ دیکھیں کہ جب قرآن کے الفاظ کی حفاظت کا ذکر کیا جا رہا ہے تب بھی عیثاً کا لفظ استعمال ہوا ہے اور جب قرآن کے بیان کی حفاظت کا ذکر ہوا تب بھی عیثاً ہی لایا گیا گو یا اللہ تعالیٰ نے دونوں کی حفاظت اپنے اوپر لازم کر لی ہے۔ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ سے قرآن کے الفاظ کی حفاظت کا وعدہ ہوا قرآن کے معنی ہیں پڑھے جانے کی چیز اور پڑھے جانے کی چیز ظاہر ہے الفاظ ہی ہیں معنی نہیں ہو سکتے پھر ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا نَبْيَانَهُ فرما کر قرآنی الفاظ کے معانی و مطالب کھول دینے کا وعدہ فرمایا کیونکہ بیان کے معنی کھول دیتے اور واضح کر دینے کے ہیں اور وضاحت معانی ہی کی ہوا کرتی ہے جو الفاظ کے بہ دوں میں چھپے ہوئے اور لپٹے ہوئے ہوتے ہیں۔ اس سلسلے میں عربی زبان حضرات ایک اور اہم نکتہ کی طرف توجہ فرمائیں دونوں آیتوں کے درمیان ثُمَّ کا لفظ کیا بتلا رہا ہے؟ ثُمَّ کا لفظ اس امر کی دلیل ہے کہ الفاظ قرآن کی حفاظت کی ذمہ داری اور بیان قرآن کی حفاظت کی ذمہ داری دونوں علیحدہ علیحدہ حیثیتوں کی حامل ہیں۔ ایک ذمہ داری کا دوسری سے کوئی تعلق نہیں اگر یہ بات نہ ہو تو پھر ثُمَّ کا لانا بھی بے کار مٹھرے گا عیثاً کی تکرار بھی عبث ہوگی اور ان دو آیتوں کے درمیان فصل بھی بلا ضرورت قرار پائے گا اور یہ کلام الہی میں محال ہے لہذا ماننا پڑے گا کہ یہ دو علیحدہ علیحدہ ذمہ داریاں ہیں ایک الفاظ قرآن کی حفاظت کی اور ایک بیان قرآن کی حفاظت کی۔

قرآن کے الفاظ تَوْفَاذِ الْقُرْآنِ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ کی صورت میں سیدہ نبوی میں

ڈالے گئے رہا وہ بیان جو قرآن کی مرادات کے بارے میں سینہ نبوی میں ڈالا گیا اس کے ڈالے جانے کی کیفیت سے ہمیں بحث نہیں وہ خواہ کسی طرح بھی ڈالا گیا ہو اتنی بات یقینی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سینہ مبارک میں اس نے بالآخر کسی لفظ ہی کی شکل اختیار کی ہو گی، بیان کی یہ آخری شکل ہی حدیث نبوی ہے جس کا مضمون تو اللہ کی جانب سے ہے اور الفاظ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے۔  
 ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ کہہ کر اسی بیان کو جس کی آخری شکل حدیث نبوی ہے سینہ نبوی میں محفوظ کر دینے کی ذمہ داری حق تعالیٰ نے فرمائی ہے پس اگر قرآن اپنے الفاظ کی صورت میں اللہ کی حفاظت میں ہے ضائع نہیں ہو سکتا تو قرآن اپنے بیان یعنی حدیث کی صورت میں بھی اللہ کی حفاظت میں ہے ضائع نہیں ہو سکتا۔

بسیا کہ ابھی عرض کیا گیا قرآن کے الفاظ تو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول تکذیب قرآنہ پر نچائے چنانچہ کہیں مَاذَا قَرَأْتَ فَرَأَىٰ كُفْرًا کہ اپنے کو پڑھنے والا بتلایا اور کہیں تَشْكُرُوا عَلَيَّ ارشاد فرما کر خود کو تلاوت کرنے والا ظاہر فرمایا۔ دوسری چیز یعنی معانی و مرادات قرآنی کا بیان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک بذریعہ تعلیم پہنچایا گیا اتنی بات تو ظاہر ہی ہے کہ علم الفاظ کے پہنچانے کو نہیں کہتے بلکہ الفاظ کے معانی و مطالب سمجھنے کو کہتے ہیں اور معانی و مطالب کا سمجھنا ہی تعلیم ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اسی تعلیم کی بابت ارشاد فرمایا

وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ وَكَانَ فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكَ عَظِيمًا (النساء: ۱۱۳)

اور ہم نے تم کو وہ باتیں تعلیم کیں جو تم نہیں جانتے تھے اور تم پر اللہ کا بڑا فضل تھا۔  
 گویا اللہ تعالیٰ الفاظ قرآن کے لیے تباری ہے تو بیان قرآن کے لیے معلّم رسول بھی ہے اسی تعلیم کو ایک مقام پر ہدایت کے لفظ سے تعبیر فرمایا اور ہدایت کا تعلق بھی ظاہر ہے الفاظ سے نہیں معانی ہی سے ہے۔ ارشاد ہے۔

مَا كُنْتُ تَدْرِئِي مَا الْكِتَابُ وَلَا الْإِيمَانُ وَلَكِنْ جَعَلْنَاهُ نُورًا تَهْدِي بِهِ

آپ کو یہ خبر نہ تھی کہ کتاب کیا چیز ہے نہ یہ خبر تھی کہ ایمان کیا چیز ہے لیکن ہم نے اس

من لشار من عبادنا ط / (شوری: ۵۲) | قرآن کو ایک نور بنایا جس کے ذریعے سے ہم اپنے بندوں میں سے جس کو چاہیں ہدایت کرتے ہیں۔ اسی طرح ایک مقام پر الفاظ قرآن کو کتاب کے لفظ سے تعبیر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے بیان قرآن کو حکمت کے لفظ سے تعبیر فرمایا اور دونوں کا منزل من اللہ ہونا بتلایا۔ فرمایا

وَأَنْزَلَ اللَّهُ عَلَيْكَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ (نبار: ۱۱۳) | اور اللہ نے تجھ پر کتاب اور حکمت نازل کی۔

اسی حکمت کے ذریعے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے زندگی کی راہوں میں صحیح اور غلط کا فرق واضح کیا، اسی کی مدد سے آپ نے انسانی زندگی کے تمام مسائل حل کیے اور اسی کی روشنی میں کام کر کے آپ نے اخلاق و روحانیت تہذیب و تمدن، معیشت و معاشرت اور قانون و سیاست کی دنیا میں انقلاب عظیم برپا کر دیا۔ یہی ہے وہ بیان قرآن جس کو ہم حدیث نبوی اور سنت نبوی سے تعبیر کرتے ہیں اور اس بیان قرآن کو بھی اللہ تعالیٰ نے سینہ نبوی میں اسی طرح محفوظ فرمایا جس طرح الفاظ قرآن کو حجج اور محفوظ فرمایا۔ غرض نبی کریم صلی اللہ کی ذات کی حد تک الفاظ قرآنی تلاوت خداوندی کے ذریعے اور معانی و مرادات قرآن تعلیم خداوندی اور ہدایت ربانی کے ذریعے بحفاظت تمام پہنچ گئے اور اس طرح قرآن اور اس کے بیان کی حفاظت کا پہلا مرحلہ پورا ہو گیا۔

**حفاظت صحابہ تک** | ان دونوں کی حفاظت کا دوسرا مرحلہ وہ ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن اور اس کے بیان کو بحکم خداوندی پوری حفاظت کے ساتھ صحابہ کی طرف منتقل فرمایا۔

اتنی بات تو مسلمہ ہے کہ قرآن اتارنے کا مقصد قیامت تک کے انسانوں کی ہدایت ہے اس لیے محض سینہ نبوت میں قرآن کے الفاظ اور اس کا بیان محفوظ کر دینے سے یہ عظیم مقصد پورا نہیں ہو سکتا تھا جب تک یہ دونوں چیزیں ساری امت تک اسی حفاظت سے نہ پہنچ جائیں جس حفاظت سے رسول تک پہنچیں۔ چنانچہ حق تعالیٰ نے ان دونوں کو امت تک یہ حفاظت پہنچانے کا ذمہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سر عائد فرمایا کہ وہ

امت کے لیے تلاوت آیات بھی کریں تاکہ الفاظ قرآنی امت تک پہنچ جائیں اور تعلیم و ہدایت کا سلسلہ بھی قائم فرمائیں تاکہ معانی و مرادات قرآنی بھی امت تک بہ حفاظت پہنچ جائیں اور اس طرح قرآن اور اس کے بیان کا آگے تک بہ حفاظت پہنچتے رہنے کا سلسلہ قائم ہو جائے چنانچہ ارشاد ہوا

اللہ نے مومنین پر احسان فرمایا جب میں انہی میں سے ایک رسول بھیجا جو ان پر اللہ کی آیات تلاوت کرتا ہے ان کو پاکیزہ بناتا ہے اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے اگرچہ وہ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے۔

لَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِنْ أَهْلِ بَيْتِهِمْ يَعْلَمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَرَأَى كَانُوا مِنْ قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُبِينٍ (ال عمران: ۴۴)

اس آیت کے الفاظ میں غور فرمائیں اس میں تلاوت آیات اور تعلیم آیات دونوں کو علیحدہ علیحدہ بیان کیا جا رہا ہے اور تہلایا جا رہا ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تلاوت آیات اور تعلیم آیات فرمائی اسی طرح اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے امتیوں کے لیے تلاوت اور تعلیم فرمائیں گے۔ اسی طرح ایک اور مقام پر دونوں چیزوں کو جدا جدا بیان کر کے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآنی الفاظ کے معانی و مطالب کھول کر بیان کر دینے کی ذمہ داری تفویض فرمائی۔ ارشاد ہے

وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ (النحل: ۴۴) | اور آپ پر ہم نے یہ قرآن اتارا تاکہ جو مضامین آپ پر اتارے گئے آپ انہیں کھول کھول کر بیان کریں۔

چنانچہ آپؐ نے اپنے اقوال اپنے افعال اور اپنی تقریرات سے منزل من اللہ مضامین کو واقعی کھول کھول بیان فرما دیا۔ آپؐ نے ہر ہر آیت کی وہ مراد متعین فرمادی جو مقصود خداوندی تھی۔ آپؐ نے اگر قرآن کے الفاظ بلا کم و کاست تلاوت کے ذریعے صحابہ کی طرف منتقل کیے تو ان الفاظ کے معانی و مطالب بھی بلا کم و کاست صحابہ کی امانت میں دے دیے کبھی اپنے ارشادات کے ذریعے کبھی اپنی زندگی کے ایک لمحے کو قرآنی سانچے میں ڈھال کر اور کبھی اپنی نگرانی میں صحابہ کے ایک ایک عمل کی جانچ پڑتال کر کے۔ آپؐ ایک

طرف قرآنی آیات کی تلاوت کا فریضہ انجام دیتے ہوئے نظر آتے ہیں تو دوسری طرف ان آیات کا عملی نمونہ خود پیش کرنے اور صحابہ کی شکل میں ہزاروں عملی نمونے ڈھلنے میں مصروف دکھائی دیتے ہیں۔ کبھی کسی آیت کے مختلف محتملات میں سے کسی ایک صحیح محتمل کو متعین فرما رہے ہیں، کبھی کسی آیت کے مبہم حکم کو مشخص فرما رہے ہیں اور کبھی کسی آیت کے اجمال کی تفصیل بیان فرمائی جا رہی ہے۔ کبھی اس پر کلام ہو رہا ہے کہ فلاں آیت کے حکم کی کیا توجیہ ہے اور کبھی اس کا بیان ہے کہ فلاں آیت کی کئی ہیں کون کونسا جزئیہ شامل ہے، کبھی کسی آیت کے حکم کی علت سے بحث ہے تو کبھی کسی قرآنی حکم کے خواص و آثار کا ذکر ہے کبھی صحابہ کرام کو کسی قرآنی آیت کی نفس مراد سمجھنے میں کوئی دشواری پیش آگئی ہے، اس کو دور کیا جا رہا ہے تو کبھی صحابہ کے ان سوالات کا جواب دیا جا رہا ہے جو قرآن کی بعض تفصیلات کے متعلق آپ سے کیے گئے ہیں کبھی بعض فروعی مسائل سے متعلق سوالات کے جواب میں صحابہ کی تشفی کا سامان ہے اور کبھی قرآنی اشارات کی وضاحت کا اہتمام۔

غرض نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن اور اس کے بیان کو تیسرا صحابہ تک پہنچایا اس طرح ان دونوں کی حفاظت کا دوسرا مرحلہ بھی پورا ہو گیا۔

**حفاظت تاقیامت** | قرآن اور اس کے بیان کی حفاظت کا تیسرا مرحلہ وہ ہے جس میں یہ دونوں چیزیں صحابہ سے ہم تک منتقل ہوتی ہوئی پہنچیں۔ یہ تیسرا مرحلہ اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ منکرین حدیث کو حفاظت حدیث کے سلسلہ میں زیادہ تر کلام اسی مرحلے میں ہے۔ قرآن کا اپنے الفاظ کی نسبت سے محفوظ رہنے کا جہاں تک تعلق ہے چونکہ اس میں منکرین حدیث کا بھی کوئی اختلاف نہیں ہے اس لیے اس تیسرے مرحلے میں ہماری تمام تر گفتگو صرف قرآنی بیان یعنی حدیث کی حفاظت تک منحصر رہے گی مگر اس گفتگو کی ابتدا کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم ذرا اس بات کا جائزہ لیتے چلیں کہ اس تیسرے مرحلے میں حفاظت حدیث کی ضرورت تھی بھی یا نہیں۔ کیونکہ منکرین حدیث کا یہ دعویٰ بھی ہے کہ قرآن کے معانی و مطالبہ جی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانے اور حالات کے مطابق سمجھے اور صحابہ کو سمجھائے اسی طرح یہ

اب ہمارا فرض ہے کہ ہم قرآن کے معانی و مطالب اپنے زمانے اور اپنے حالات کی روشنی میں سمجھیں اور سمجھائیں۔ اسی لیے ان کا دعویٰ ہے کہ حدیث کی حفاظت کی ضرورت ہی نہ تھی اور اسی لیے اللہ نے اسے محفوظ رکھا بھی نہیں ۛ





# حدیث کے بغیر قرآن فہمی

آئیے اب ہم اس بات کا جائزہ لیں کہ کیا حدیث کی مدد کے بغیر قرآن فہمی ممکن ہے نیز یہ کہ کیا منکرین حدیث کے اس دعویٰ میں کوئی وزن ہے کہ قرآن کے معانی و مطالب جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانے اور اپنے حالات کے مطابق سمجھے اور سمجھائے اسی طرح آنے والے زمانوں میں آنے والے لوگوں کا فرض ہے کہ وہ اپنے اپنے زمانوں اور اپنے حالات کی روشنی میں قرآن کے معانی و مطالب کو سمجھیں اور اس کے مطابق اپنی اپنی زندگیوں کے لیے مخصوص لائحہ عمل مرتب کریں۔ منکرین حدیث کے اس دعوے کا جو نکتہ لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ قرآن کی صحیح مرادات متعین کرنے میں ایک عام آدمی اور نبی برابر ہوتا ہے اس لیے لازماً ہمیں پہلے اس امر کا جائزہ لینا ہوگا کہ کیا وحی آسمانی کی مدد کے بغیر جو صرف ایک نبی ہی پر نازل ہوتی ہے قرآن کی صحیح مرادات تک پہنچنا ممکن ہے؟

**قرآن فہمی اور عجز انسانی** | یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ قرآن اسلام کا صرف بنیادی قانون، دستور اساسی اور

مجموعہ ہدایت ہی نہیں اپنی ذات میں ایک معجزہ بھی ہے جو اپنے الفاظ اور معانی دونوں ہی کے لحاظ سے اعجازی شان رکھتا ہے جس طرح مخلوق اس بات سے عاجز ہے کہ الفاظ کی تراکیب اجزائے کلام کی ترتیب اور انداز بیان کی فصاحت کے لحاظ سے قرآن کی مثل لاسکے اسی طرح مخلوق کے لیے یہ بھی ناممکن ہے کہ ہدایت کے کمال، احکام کی جامعیت علوم و معارف کی گہرائی اور مضامین کی ہمہ گیری کی نسبت سے قرآن کی نظیر بنا سکے۔ چنانچہ دنیا جانتی ہے کہ

آج چودہ سو سال گزر جانے کے باوجود قرآن کی ایک چھوٹی سے چھوٹی آیت کا بھی مثل وجود میں نہ آسکا قرآن کی معنوی و معنویات اور ہمہ گیر گہرائیوں نے دنیا کو تھکا دیا کہ وہ اس جیسی جامع علوم و معارف اور حاوی احکام و اصول کتاب یا اس کے کسی جزو جیسا کوئی جزو پیش کر سکے۔

اس مسئلہ حقیقت کو سامنے رکھ کر ذرا سوچئے کہ آخر قرآن جیسا کلام جن انسانوں پر نازل کیا گیا ہے ان کے فہم و عقل اور ان کے علم و ادراک میں وہ لامحدودیت اور ہمہ گیری نہیں ہے جو ایسے اعجازی کلام کے لیے درکار ہے جس فہم و عقل میں اسی لامحدودیت اور ہمہ گیری کے فقدان کی بنا پر ان میں یہ سکت بھی نہیں ہے کہ وہ قرآن کے بحر و احوال اور کلی جملوں سے نکلنے والے فوائد و حقائق کا ادراک بلا کسی رہنمائی کے انہ خود کر سکیں قرآنی کلمات کی ایک ایک تہ اور ایک ایک ٹکڑی میں صد ہا علوم پھیلے ہوئے ہیں جو چودہ سو سال سے مسلسل نکلنے چلے آ رہے ہیں اور ہنوز ان کی انتہا کا کوئی پتہ نہیں ظاہر ہے اتنے بے شمار علوم اور لفظ لفظ میں سموئے ہوئے معارف کا قرآنی کلمات میں سے نکال لانا نبوت کی رہنمائی کے بغیر ناممکن تھا۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن ایک سلا نازل نہیں فرمایا بلکہ اس کے ساتھ ایک نبی بھی بھیجا جو وحی الہی کی روشنی میں قرآنی علوم و معارف لوگوں کو سمجھا سکے۔

اسی حقیقت کو ہم دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات و صفات میں لامحدود ہے جبکہ انسان ہر لحاظ سے محدود و متناہی ہے۔ انسان کے لیے یہ ناممکن تھا کہ وہ محدود رہتے ہوئے لامحدود ذات و صفات والے کو پہچان سکے اور اس سے صادر ہونے والے کلام کے رموز و اسرار کو جان سکے اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے اور بندوں کے درمیان ایک ایسا طبقہ پیدا فرمایا جو ایک لحاظ سے ذات حق سے قریب تر تھا اور ایک لحاظ سے بندوں میں شامل تھا یہ طبقہ انبیاء علیہم السلام کا تھا جنہوں نے لامحدود ذات و صفات کی حامل ہستی کو پہچان کر کے

کلام کے علوم و معارف پر اطلاع پائی اور پھر وحی الہی کی روشنی میں عامہ خلافت کو اس سے بہرہ ور کیا۔

نبی کا واسطہ درمیان میں نہ ہو تو ایک عام آدمی کے بس کی یہ بات ہی نہیں کہ وہ قرآنی علوم پر اطلاع پاسکے اور یہ ایک بالکل فطری بات ہے اگر یہ درست ہے کہ عالم کی عالمانہ بحثیں ایک علم آشنا ہی سمجھ سکتا ہے اگر یہ صحیح ہے کہ عاشق کی مرتبہ صغر عشق آشنا ہی جان سکتا ہے تو پھر یہ بھی ایک کھلی حقیقت ہے کہ کلام رب کی صحیح مراد صرف رب آشنا ہی پاسکتا ہے۔ ایسا کلام جو انتہائی ہمہ گیر اعلیٰ درجہ کا جامع اور بے مثال وسیع العلم ہو جو ماضی کی خبروں، مستقبل کی اطلاعیوں اور حال کے احکام کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہو اس کی صحیح مراد امت تک پہنچنا خدا کی نعمت ہی نہیں۔

قرآن کی ہمہ گیری جامعیت اور وسعت علم کا اندازہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے جس کو حضرت علی نے ایک بار ایک ساتھی کے جواب میں نقل فرمایا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر تمسک بالقرآن کی تاکید کے ضمن میں کتاب اللہ کی صفات گنتائے ہوئے فرمایا :

اس میں تم سے پہلوں کی باتیں ہیں اور پیچلوں کی خبریں ہیں اور درمیانی حال کے احکام ہیں وہ یقینی چیز ہے مذاق نہیں پس منکر نے اسے چھوٹا خدا نے اس کی گردن توڑ دی اور جس نے اسے علاوہ ہدایت دھندلی اس کو خدا نے گمراہ کر دیا وہ اللہ کی مضبوط رسی ہے وہ حکمانہ یادداشت ہے وہ میدان راستہ ہے وہ وہ چیز ہے کہ اس سے دلوں کے میلانات ٹیڑھے نہیں ہوتے اور زبانیں مشتبہ نہیں ہوتیں اور

فِيهِ نَبَأٌ مَا قَبْلَكُمْ وَخَيْرٌ مَّا بَعْدَكُمْ وَحُكْمٌ نَّابِيَتُكُمْ وَهُوَ الْفَصْلُ الْكَيِّسُ بِالْهَزْلِ مَنْ تَرَكَهُ مِنْ جَبَّارٍ قَصَمَهُ اللَّهُ وَمَنْ ابْتَغَى الْهَدْيَ فِي غَيْرِهِ أَضَلَّهُ اللَّهُ وَهُوَ حَبْلُ اللَّهِ الْمَتِينُ وَهُوَ الذِّكْرُ الْحَكِيمُ وَهُوَ الصِّرَاطُ الْمُسْتَقِيمُ وَهُوَ الَّذِي لَا يَزِلُّ بِهِ الْأَهْوَاءُ وَلَا تَلِيْسُ بِهِ الْأَلْسِنَةُ وَلَا يَشْبَعُ مِنْهُ الْعُلَمَاءُ وَلَا يَخْلُقُ

اس سے علماء کبھی سیر نہیں ہوتے وہ کثرت تلاوت سے

پہرانا نہیں پہنتا اس کے عجائبات کبھی ختم نہیں ہو سکتے وہی ہے کہ جب جنات نے اسے سنا تو انہیں ہی کہتے بن پڑا کہ ہم نے عجیب کلام سنا ہے جو بزرگی کی طرف لے جاتا ہے ہم تو اس پر ایمان لے آئے (حقیقت یہ ہے کہ جو اسے زبان پر لایا اس نے سچ کہا جس نے اس پر عمل کیا اسے اجر ملا جس نے اس کے ساتھ حکم کیا اس نے انصاف کیا اور جس نے اس کی طرف بلایا اسے سیدھے راستے کی ہدایت ہوئی۔

مِنْ كَثْرَةِ الرَّدِّ وَلَا تَنْقُضِي  
عَجَابَهُ هُوَ الَّذِي كَذَّبَتْهُ الْجِنَّ  
إِذْ سَمِعَتْهُ حَتَّىٰ قَالُوا إِنَّا سَمِعْنَا  
قَرَأْنَا عَجَبًا يَهْدِي إِلَى الرُّشْدِ  
فَأَمْنًا بِهِ مَنْ قَالَ بِهِ صَدَقَ وَمَنْ  
عَمِلَ بِهِ أَجَرَ وَمَنْ حَكَمَ بِهِ عَدْلٌ  
وَمَنْ دَعَا إِلَيْهِ هَدَىٰ إِلَى صِرَاطٍ  
مُسْتَقِيمٍ

(ترمذی: فضل القرآن)۔

اس حدیث پاک کو بار بار پڑھیے اور سوچیے کہ جس کلام کا یہ عالم ہو کہ وہ ماضی کی خبروں، مستقبل کی اطلاعوں اور حال کے احکام کا احاطہ کیے ہوئے ہو جس کے علوم علماء کبھی سیر نہ ہوتے ہوں جس کے عجائبات لامتناہی ہوں جس کے الفاظ کو زبان سے ادا کرنا مجسم سچائی کی تعبیر لیے ہوئے ہو جس پر عمل کرنا باعث اجر ہو جس کی روشنی میں کیا ہوا فیصلہ عین عدل کہلائے اور جس کی طرف دعوت دینا ہدایت ہی ہدایت بن جائے ایسے ہمہ گیر اور اتنے جامع کلام کی صحیح صحیح مرادات کو پالینا کیا خدائی رہنمائی کے بغیر ممکن ہے؟ جو ذرا سی بھی عقل سلیم کا مالک ہو گا وہ بے اختیار کہہ اٹھے گا کہ نبی کے واسطے کے بغیر جو مؤید من اللہ ہے کلام الہی کی اصل مرادات کو پالینا ناممکن ہے؟ کیا یہ ایک مسلمہ حقیقت نہیں کہ قرآن ایک ایسی کتاب ہے جس کی تعبیرات اصولیت اور کلیت کی انتہا کو پہنچی ہوئی ہیں جس کے لفظ لفظ سے متعلق و معارف کے دریا بہہ رہے ہیں جس کے ایک

قرآن فہمی اور پیغمبر

ایک اشارے میں محاورات الہیہ پوشیدہ ہیں جس کا ایک ایک لفظ اعجازی فصاحت و بلاغت کا اعلیٰ نمونہ ہے جس کی آیات کا حال یہ ہے کہ ان میں کوئی سخی ہے کوئی مجمل ہے کوئی مشکل ہے اور کوئی کنایہ کا پہلو لیے ہوئے ہے اس کتاب کے مضامین میں تنوع کا یہ عالم ہے کہ دینیات کا کوئی گوشہ اس سے باہر نہیں مگر اس کے ساتھ ہی وہ سیاست، معیشت، معاشرت، معاملات، اخلاق اور نفسیات کے علوم کو بھی حاوی ہے اور ان سب کے پہلو یہ پہلو اس میں باطنی کیفیات کے تمام سامان بھی موجود ہیں۔ ایسی محیر العقول کتاب اور ایسے اعجازی کلام کے معانی معلوم کرنا، مطالب اخذ کرنا اور اس کی مرادات کو معلوم کرنا حق یہ ہے کہ صرف نبی ہی کا کام ہے۔ کوئی دوسرا شخص وہ خواہ کتنا ہی بڑا عالم کیوں نہ ہو کلام الہی کی مرادات تک صرف اپنے فہم اور اپنی عقل و دانش کے سہارے نہیں پہنچ سکتا۔

یہ بات تو اس قدر واضح ہے کہ کسی دلیل کی بھی محتاج نہیں۔ قرآن تو پھر کلام الہی ہے، فانی اور محدود العقل انسانوں کی لکھی ہوئی کتابوں کی مرادات سمجھنے میں ایسا وقت است محاورات، مجازات اور کنایات سدرہ بن جاتے ہیں۔ جتنی بلند پایہ کتاب ہوتی ہے اسی قدر شرح و تفصیل کی زیادہ محتاج سمجھی جاتی ہے۔ کسی کتاب کی مرادات سمجھنے کے لیے صرف زبان دانی ہی کافی نہیں ہوتی۔

دیوان غالب ایک فانی انسان کے کہے ہوئے اشارات کا مجموعہ ہے، غالب جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں کوئی بہت بڑا عالم یا کوئی عظیم فلسفی بھی نہ تھا البتہ شعراء کی سب سے پہلی صف میں اس کا شمار ضرور ہے۔ دیوان بھی کسی اجنبی زبان میں نہیں اردو زبان میں ہے جس کی معنوی باریکیوں سے ہم سب اسی طرح باخبر ہیں جس طرح کوئی عربی زبان کی باریکیوں سے ہو سکتا ہے۔ غالب کی صحیح مراد اپنے اشارے سے کیا تھی وہ تو غالب ہی کو معلوم ہو گا لیکن دُنیا سے اس کے رخصت ہو جانے کے بعد اس کے دیوان کی شرح لکھنے والوں نے کیسی یکسری طبع آزمائی کی ہے، ہر ایک نے اپنے مزاج کے مطابق اس کے دیوان کی شرح لکھی۔ جو صوفی منش تھا اس نے چن چن کر غالب کے اشارات میں تصوف بھر دیا جو رند طبع تھا

اسے شراب کی مستی و کیف کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔ عاشق مزاج نے اس کے دیوان کو عشق و محبت کی داستان بنا دیا اور فلسفی نے اس کے اشعار سے فلسفیانہ مسائل کا استنباط کیا۔ ایسا کیوں ہوا؟ صرف اس لیے کہ غالب نے اپنے دیوان کی خود کوئی شرح نہیں لکھی اور نہ ہی اپنے کسی قابل شاگرد کو اپنے اشعار کی اصل مراد کا پتہ دیا۔

اس مثال کو سامنے رکھ کر غور کیجئے کہ جب ایک فانی اور محدود العقل انسان کے کلام کا یہ حال ہے تو اس ہستی کے کلام کا کیا حال ہو گا جو اپنی ذات میں بھی لا محدود اور اپنی صفات کمال میں بھی لا محدود ہے؟ ایسی ہستی کا کلام بھی یقیناً لا محدود و حقائق لا محدود، معارف اور لا محدود مطالب کا حامل ہو گا، ان لا محدود و حقائق و معارف اور ان لا محدود و معانی و مطالب پر خود صاحب کلام کے بنائے بغیر اطلاع پانا کیسے ممکن ہے۔ ذرا سوچئے تو سہی اگر قرآن کو بھی انسانی تالیفات کی طرح لوگوں کی طبع آزمائی کا میدان بنا دیا جلتے تو اس کا کیا حشر ہو۔ قرآن کا اعجاز صرف اس کے الفاظ تک محدود نہیں اس کے معانی میں بھی موجود ہے وہ ہمارے پاس ایسے علوم بے کر آیا ہے جو قبل انسانی کو آخری معراج تک پہنچانے کے ضامن ہیں ہمارے ہر قسم کے نزاعات میں اس کی حیثیت حکم کی ہے گویا ہماری سیاست، معیشت، معاشرت، معاملات، اخلاق، دین، مذہب، غرض ہماری زندگی کا ہر گوشہ براہ راست اسی کی روشنی کا محتاج ہے۔ ایسی صدرت میں ہر صاحب عقل خود فیصلہ کر سکتا ہے کہ کیا قرآن کو صرف زبان دانی اور عام انسانی فہم پر چھوڑا جا سکتا ہے۔ رسول کی ذات درمیان سے علیحدہ کر لی جائے تو کیا کوئی شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی صحیح مراد کو پہنچنے کا اہل ہے؟ حدیث کی مدد کے بغیر اللہ تعالیٰ کی صحیح مراد تک پہنچنے کا واحد راستہ ہے کیا کوئی یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ راہ ہدایت صحیح طور پر اس کے ہاتھ آگئی۔ دیوان غالب والی مثال میں غالب کے اشعار کی شرحیں اگر مختلف ہوئیں تو غالب کو مزید داد ملی مگر قرآن کا اگر یہی حال بنا دیا جائے تو انصاف سے بتائیے قرآن محض اہامات کا ایک مجموعہ بن کر نہ رہ جائے؟ کلام الہی شاعری نہیں جو نازک خیالیوں اور بمانہ آمیزوں کا مجموعہ ہوتا ہے، کتاب اللہ تو حقیقت اور ٹھیک ٹھیک حقیقت کا پتہ دینے آئی ہے، جو معاشرت و معاشیات کی مقنن بن کر نازل ہوئی ہے، مبداء و

معاذ کی منجرت ہے اسرار غیب اور روحانی حقائق کی معلّم ہے۔ اگر ایسی کتاب بھی محض رائے ذہنی اور دماغی مشاق کا میدان بنادی جائے تو حقیقت کا سراغ لگنا کتنا ناممکن بن جائے۔ اللہ کا دین جیسا پہلے مجھول تھا کتاب اللہ کے نزول کے بعد اس سے زیادہ مجھول بن جائے اور کوئی شخص بھی یہ نہ بتلا سکے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات سے متعلق کیا عقائد لے کر تشریف لائے تھے عبادات کا کونسا نظام آپ نے ترتیب دیا تھا تمدن و معاشرت کن اصولوں پر قائم فرمائی تھی اور معیشت و سیاست کے کیا اصول مقرر فرمائے تھے غرض یہ دین جس کو قرآن نے کامل کہا ہے ناقص ترین دین ہو کر رہ جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہم پر بڑا احسان کیا ہے کہ اپنے کلام کی مرادات کی تلاشی ہمارے ذمے نہیں ڈالی بلکہ ہم میں اپنا ایک رسول بھیج دیا جس سے اس کلام کو پہلے صاحب کلام سے خود پڑھا اس کے معانی و مطالب کو صاحب کلام سے خود سمجھا اور پھر صاحب کلام ہی کی خاص ہدایت اور خاص حفاظت میں وہ کلام اپنے امتیوں کو پڑھایا، سمجھایا اس کی مرادات کو متعین کیا اور اس کے احکام پر عمل کر کے دکھلایا۔ اگر اللہ تعالیٰ اس طرح اپنے رسول کے ذریعے ہماری تعلیم و ہدایت کا سامان نہ کرتا تو ہم یقیناً "مدت العمر قرآن کی صحیح مراد حاصل نہ کر پاتے اگر قرآن کی مراد کی تعیین عام انسانی عقل پر چھوڑ دی جاتی تو یہ کتاب جو خالصتاً عمل کرنے کے لیے نازل ہوئی تھی صرف دماغی کہو کاوش کا مشغلہ بن کر رہ جاتی اور اللہ کی مخلوق جہل کی ظلمتوں سے کبھی باہر نہ نکل سکتی۔

**قرآن اور اسوۂ نبوی** | اس کے علاوہ یہ بھی نو دیکھنا چاہیے کہ قرآن حکیم صرف ایک علمی کتاب ہی تو نہیں جس کا مقصد صرف

علمی طور پر اس کو حل کر لینا ہو قرآن نبی نوع انسان کے لیے ایک دستور العمل بھی ہے جو زندگی کے ہر ہر شعبے کے لیے مکمل ضابطہ حیات لے کر آیا ہے اس لیے قرآن کے معانی و مطالب سمجھ لینے کے بعد بھی ایک اہم ضرورت اور باقی رہتی ہے اور وہ ہے ان معانی و مطالب کی روشنی میں عملی زندگی کے راستے متعین کرنا اور زندگی کے ہر ہر شعبے میں ان معانی و مطالب کو رو بہ عمل لانا اور یہ کام کسی معلّم کی تعلیم کے بغیر ممکن نہیں۔ یہ

تو بالکل ہمارے مشاہدے کی بات ہے، دنیوی علوم میں بھی بہت سے علم ایسے ہیں جو عملی تجربوں کے بغیر سمجھ ہی میں نہیں آتے مثلاً طب اور ڈاکٹری کا علم انجینئرنگ کا فن یا دیگر سائنسی علوم و فنون کہ ان کے مضائق علمی طور پر بھی پوری طرح اس وقت تک سمجھ میں نہیں آتے جب تک کہ عملی طور پر ان کو استعمال ہوتا ہوا نہ دیکھا جائے بلکہ خود ان کو عمل میں لا کر تجربہ نہ کر لیا جائے صرف ان کا پڑھ لینا ان کی پوری حقیقت سمجھنے کے لیے قطعاً کافی ہے۔ عملی تجربے کے بغیر اول تو یہ علوم و فنون سمجھ ہی میں نہیں آتے اور اگر سمجھ میں آ بھی جائیں تو اس وقت تک ان کو صحیح طور پر عمل میں نہیں لایا جاسکتا جب تک ان کا عملی نقشہ سامنے نہ ہو۔ اب آپ خود ہی فیصلہ کیجئے کہ جب انسانی علوم کا یہ حال ہے تو ربانی علوم تو پھر ربانی علوم ہیں ان کی دقتیں اور نزاکتیں اپنی تمام تر انواع اقسام کے ساتھ کسی ربانی معلم کی تعلیم کے بغیر کیسے سمجھ میں آ سکتی ہیں۔

اس لحاظ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرما کر اللہ تعالیٰ نے ہماری انتہائی اہم ضرورت کو پورا کیا ہے اگر ہماری یہ ضرورت پوری نہ کی جاتی تو کفر کی ظلمتوں سے باہر نکلنا محال تھا اور اسلام کے پاکیزہ عقائد اور خالص اعمال سے ہمارا مزین ہونا ناممکن تھا۔ قرآن بھیجا تو اس کو سمجھانے اور اس پر عمل کرانے کے لیے ایک معلم بھی بھیجا اور اس کو قرآن کی مجسم تفسیر بنادیا اور ہمیں بتادیا کہ اس عملی تفسیر کی روشنی میں قرآن کو سمجھتے اور اس کے احکام پر عمل کرتے چلے جاؤ۔

اَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ  
اَسْوَا حَسَنَةٍ (الاحزاب: ۲۱)۔

تمہارے لیے اللہ کا رسول بہترین نمونہ ہے۔

کہ اس نمونے کو سامنے رکھ کر کارگاہ حیات میں اپنے اعمال کو ڈھالتے چلے جاؤ۔ جہاں کہیں کوئی عملی الجھن پیش آئے اس عمل نقشہ عمل کو دیکھ کر دور کر لو۔ اسی لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کو صرف کسی خاص شعبہ حیات کا ہی نمونہ نہیں بنایا گیا بلکہ جو کچھ قرآن میں کہا گیا وہ سب آپ کی زندگی میں دکھلا دیا گیا۔ کسی نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا آپ کے اخلاق کیا تھے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے



جو آپ میں فرمایا تھا کہ **خَلَقَ الْقُرْآنَ** یہ قرآن ہی آپ کا خلق تھا، خلق میں سب کچھ آگیا اقوال، افعال، تقریرات۔ مطلب یہ کہ آپ کا کوئی قول کوئی فعل ایسا نہ تھا جو قرآن سے باہر ہو۔ آپ کے اسی خلق کو پورے عالم کے لیے اسوۂ حسنہ کہا گیا، اسی خلق کا نام حدیث ہے، اسی خلق نبوی کو ہم سنت نبوی کے نام سے جانتے ہیں اس خلق نبوی کی مدد کے بغیر ہم قرآن کو نہ سمجھ سکتے ہیں نہ اسکی مرادات پر صحیح صحیح عمل کر سکتے ہیں۔

**حدیث کے بغیر قرآن فہمی** | کتنے کوتاہ فہم ہیں وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ حدیث کی مدد کے بغیر بھی قرآن کی مرادات معلوم کی جاسکتی ہیں حدیث کے بغیر قرآن فہمی کا دعویٰ کرنے والوں کے سامنے ہم چند آیات قرآنی پیش کرتے ہیں وہ ہمیں حدیث کے ذخیرے سے مدد لیے بغیر ان آیات کا صحیح صحیح مطلب سمجھا کر دکھائیں۔

قرآن کریم کی ایک آیت ہے

وَلَقَدْ آتَيْنَاكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِ | ہم نے آپ کو سبع مثانی مرحمت فرمائیں اور قرآن عظیم دیا۔

وَالْقُرْآنَ الْعَظِيمَ (الحجر: ۸۷)

حدیث کے بغیر قرآن فہمی کا دعویٰ کرنے والے ذرا بتلائیں کہ اس آیت میں سبع مثانی سے کیا مراد ہے کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے علاوہ بھی کوئی ذریعہ ہے جس کی مدد سے آپ یہ بتلا سکیں کہ بار بار دہرائی جانے والی یہ سات چیزیں کیا ہیں کیا صرف اپنی عقل کی مدد سے کوئی شخص اس آیت کی صحیح مراد متعین کر سکتا ہے؟ یہ حدیث ہی تو ہے جس نے ہمیں بتایا کہ سبع مثانی سے قرآن کی سات آیات مراد ہیں پھر ان سات آیات کی تعبیر بھی ہمیں حدیث ہی سے معلوم ہوئی کہ یہ وہ سات آیات ہیں جن پر سورۃ فاتحہ مشتمل ہے۔

اب ذرا تھوڑی دیر کے لیے تصور بن لائیے کہ حدیث کو علیحدہ کر کے اگر اس آیت کی مراد متعین کرنے کی کوشش کی جائے تو کیا حال ہو۔ ہر شخص کی سوچ مختلف ہوتی ہے

جیسی سوچ ہوتی ہے سبح شانی کی مراد بھی اسی طرح کی متعین کی جاتی کیا یہ حقیقت نہیں کہ جتنے مہنت ہوتے اتنی ہی اس سلسلے میں باتیں کی جاتیں؟ کوئی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فیضانِ ہدایت پر نظر کرتے ہوئے سات حکمتیں بیان کرتا تو کوئی آپ کی جنگی فتوحات کو دیکھتے ہوئے سات بڑے بڑے غزوات گنوتا ممکن تھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت عامہ کو سامنے رکھتے ہوئے سبح شانی کی تشریح کرتے ہوئے سات عالم تلاش کیے جاتے یا بعد کے زمانے میں سبح شانی کی تفسیر میں صحابہ کے دور کے سات مفتوحہ ممالک شمار کر لئے جاتے۔ یہ سب اور اسی قسم کی لاتعداد خیالات آرائیاں عین ممکن تھیں پھر ان سب کو درست قرار دینے کے لیے نہ معلوم کتنی مزید حاشیہ آرائیاں ہوتیں؟ مثانی کے لفظ کی جو تکرار کے معنی میں ہے نہ جانے ان تمام خیالات آرائیوں کے ضمن میں کیا کیا تو جہات پیش کی جاتیں۔ پھر ہر کوئی اپنی بہان کی ہوئی مراد اپنی پیش کی ہوئی تشریح و تفسیر اور اپنی اختیار کی ہوئی توجیہ کو درست قرار دینے پر اصرار کرتا اور کوئی ذریعہ ہمارے پاس ایسا نہ ہوتا جس سے ہم کسی ایک کو صحیح یا غلط قرار دے سکتے۔ خوش قسمتی سے اگر سبح شانی سے سات قرآنی آیتیں مراد لے بھی لی جاتیں تو پھر یہ جھگڑا چلتا کہ یہ سات آیتیں کونسی ہیں اور پھر اس بارے میں خیالات آرائیاں ہوتیں حاشیہ لگائے جاتے غرض تشریحات و توجیہات کا انبار ہوتا اور ہم پھر اس کو ملگو کی حالت میں ہوتے کہ کس کو صحیح جانیں اور کس کو غلط سمجھیں۔

ذرا غور تو کیجئے کہ حدیث کی مذکور کے بغیر صرف ایک لفظ کی تفسیر میں کیسی ہزاروں انسان تیار ہوتی اور قرآن کی اصل مراد ان داستانوں میں ایسی دفن ہوئی کہ قیامت تک سراغ نہ ملتا۔

اسی طرح قرآن کریم کی ایک اور آیت کے ضمن میں اس حقیقت کو بولتا ہوا دیکھئے کہ حدیث کے بغیر قرآنی آیات کی صحیح مراد کا متعین ہونا ممکن ہی نہیں۔ ارشادِ ربانی ہے :

وَكَذَلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا  
لَّتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ  
الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا (بقرہ: ۱۴۳)

ایسا ہی ہم نے تم کو امت وسط بنایا ہے تاکہ تم لوگوں پر گواہ رہو اور تمہارا رسول تمہارے لیے گواہی دے۔

اس آیت کے الفاظ سے اول تو یہی پتہ نہیں لگتا کہ یہ گواہی کا واقعہ کب اور کہاں واقع ہوگا، حدیث کی مدد کے بغیر اس کی قیاس میں جو کچھ خیال آرائیاں و توہینیں آسکتی ہیں ان کا اندازہ کچھ مشکل نہیں دے سکتے بالعرض والمحال بغیر کسی اختلاف کے یہ متعین کر بھی لیا جائے کہ یہ گواہی قیامت میں واقع ہوگی اگرچہ اس کا کوئی امکان نہیں کہ اختلاف کے بغیر ایسی کوئی قیاس وجود میں آجائے تاہم کچھ دیر کے لیے فرض کیے جاتے ہیں کہ اس پر سب متفق ہو گئے کہ یہ گواہی حشر کے روز ہوگی تو حدیث کی مدد کے بغیر یہ کیسے معلوم ہوگا کہ اس گواہی کی نوعیت کیا ہوگی، امتی کس بات کی گواہی دیں گے اور ہم پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کس سلسلے میں گواہ ہوں گے۔ اس کے علاوہ الناس کا لفظ یہ بتا رہا ہے کہ یہ گواہی پوری مخلوق انسانی کے لیے ہوگی۔ ایک نبی کا پوری مخلوق انسانی کے لیے گواہ ہونا تو کچھ سمجھ میں آجی سکتا ہے مگر ایک عام مسلمان ایسے لوگوں پر کیسے گواہ بن سکتا ہے جن کو اس نے نہیں پایا۔ یہ گتھی ذرا حدیث کی مدد کے بغیر کوئی سلجھا کر تو دکھائے۔ حدیث کی مدد کے بغیر قرآن فہمی کا دعویٰ کرنے والے اپنی عقل بنتے جتنے گھوڑے و ڈرائیو گے دھول ہی دھول اڑائیں گے منزل مقصود تک قیامت تک نہ پہنچ سکیں گے۔

اس گتھی کو اگر کسی نے سلجھایا ہے تو صرف حدیث نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام نے حدیث نے ہمیں بتایا کہ میدان حشر میں جب تمام انبیاء علیہم السلام کی امتیں اپنے اپنے انبیاء کی ہدایت و تبلیغ سے مکر جائیں گی اور ان کو جھٹلا کر یہ کہیں گی کہ ہمارے پاس نہ کوئی کتاب آئی اور نہ کوئی نبی ہی ہمارے پاس کوئی ہدایت لے کر آیا تو رسولوں سے پوچھا جائے گا کہ تمہارا کوئی گواہ ہے وہ کہیں گے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی امت۔ اس وقت پہلے امت محمدیہ انبیاء علیہم السلام کی طرف سے گواہی میں پیش ہوگی اور یہ شہادت دے گی کہ بلاشبہ انبیاء علیہم السلام نے ہر زمانے میں اللہ کی طرف سے لائی ہوئی ہدایت ان کو پہنچائی تھیں۔

یہاں تک تو حدیث سے یہ معلوم ہوا ہے کہ متذکرہ گواہی کا واقعہ میدان حشر میں ہوگا مگر ابھی اس گتھی کا سلجھنا باقی ہے کہ ایک عام مسلمان ان لوگوں کے بارے میں کیسے گواہی

دے سکتا ہے جو اس سے پہلے گزر چکے ہیں، یہ گتھی بھی حدیث ہی سلجھاتی ہے،  
سنئے!

حدیث ہمیں بتاتی ہے کہ امت محمدیہ کی جانب سے کوئی دے جانے پر دوسری  
آئیں جرح کریں گی کہ ان لوگوں کا تو ہمارے زمانے میں وجود بھی نہ تھا ان کی گواہی  
ہمارے مقابلے میں کیسے قبول کی جا سکتی ہے، اس جرح کے جواب میں امت محمدیہ  
کہے گی کہ ہمیں ایک صادق مصدق رسول نے یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر  
دی تھی، ان کی خبر کو ہم معائنے اور مشاہدے سے زیادہ سچا جانتے ہیں اس لیے  
ہم حق بجانب اور سچے ہیں اس پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی امت کے اس  
قول کی توثیق کریں گے اور گواہی دیں گے کہ بے شک انہوں نے درست کہا ہے۔  
دیکھ لیجئے وہ گتھی جس کو عقل سلجھانے سے عاجز تھی، حدیث کی مدد سے  
کیسی آسانی سے سلجھ گئی۔ محشر کے اس واقعے کی تفصیل پر صحیح بخاری، ترمذی، نسائی اور  
مسند احمد کی متعدد احادیث میں مجملًا اور مفصلًا مذکور ہے۔

اس قسم کی بہت سی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں مثلاً شی حق کو تو یہ دو بھی بہت  
کافی ہیں تاہم معاندین کی تسلی کے لیے ایک دو مثالیں اور پیش کی جاتی ہیں۔ قرآن کریم  
نے قیامت کا ذکر کرتے ہوئے کہا۔

يَوْمَ نَبْدَلُ الْأَرْضَ عَنْ غَيْرِ الْأَرْضِ  
وَالسَّمَوَاتِ (ابراہیم: ۴۸)

اس روز جس روز زمین اپنی حالت سے بدل دی  
جلئے گی اور آسمان بھی۔

یا اسی طرح سورہ زمر میں ہے  
وَالْأَرْضُ جَمِيعًا قَبْضَتُهُ يَوْمَ الْقِيَمَةِ  
وَالسَّمَوَاتُ مَطْوِيَّاتٌ بِيَمِينٍ (الزمر: ۶۷)

اور قیامت کے دن ساری زمین اس کی مٹھی میں  
ہوگی اور آسمان اس کے داہنے ہاتھ میں پٹے ہوئے۔

ان آیات کے مفہوم پر نظر کرتے ہوئے تو ہمیں یہ سوال ابھرتا ہے کہ قیامت کے روز  
جب آسمان اور زمین دونوں اپنی حالت پر نہ ہوں گے، ایک طرف زمین اپنی موجودہ  
حالت سے بدل دی جائے گی اور اللہ کی مٹھی میں ہوگی دوسری طرف آسمان بھی پیٹ

دئے جائیں گے تو یہ ساری مخلوق آخر اس وقت کہاں ہوگی۔

حدیث کے بغیر قرآن نہی کے مدعی ذہن میں آجھرنے والے اس فطری سوال کا جواب دیں یہ بہانہ قابل تسلیم نہ ہوگا کہ اس قسم کے سوالوں کے جوابات معلوم کرنے کی ہمیں ضرورت ہی کیا ہے۔ اسی لیے کہ اول تو یہ سوال معاد سے متعلق ہے اور معاد سے متعلق سوال بھی اگر غیر ضروری ہے تو پھر ضروری کسے کہیں گے علاوہ ازیں قرآن نہی کے سلسلے میں پیدا ہونے والے سوالات خواہ وہ کسی قبیل سے ہوں ہر حالت میں جواب کے متقاضی ہیں ورنہ قرآن نہی ناقص ٹھہرتی ہے۔

حدیث کے بغیر اس سوال کا جو جواب بھی دیا جائے گا اس کی ثبوت اندھیرے میں پھینکے جاتے دالے تیر سے زیادہ نہ ہوگی۔ یقینی جواب یقیناً ہے تو حدیث کا رُخ کیے بغیر چارہ نہیں۔ حدیث ہی ہمیں بتلاتی ہے کہ اسی قسم کی آیات کے سلسلے میں صحابہ نے ایک بار نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ ایسی صورت میں جب زمین و آسمان پیٹ دئے جائیں گے تو مخلوق خدا کہاں ہوگی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا پل صراط پر۔ انصابت سے کہیے یہ جواب محض عقل کی بنیاد پر دیا جانا ممکن ہے یہ یقین و اذعان سے بھرا ہوا جواب یقیناً منزل من اللہ ہے، ایسا جواب صرف ایسی ہستی ہی کی زبان سے نکل سکتا ہے جو مؤید من اللہ ہو۔

حدیث کے بغیر قرآن کو سمجھنے والوں سے آخرت ہی سے متعلق ایک اور سوال ہے اپنی عقل و دانش پر ناز نہ کرتے والے ذرا حدیث کے بغیر اس سوال کا جواب دے کر دکھائیں۔ قرآن کہتا ہے کہ قیامت میں حق تعالیٰ کا دیدار ہوگا۔

وَجُوهٌ يُّوْهَىٰ نَاضِرَةٌ اِلَى سَاطِئِهَا  
نَاطِرَةٌ (القيمة: ۲۲-۲۳)

اس دن بہت (لوگوں کے) آمنہ تر و تازہ ٹکٹکی لگائے اپنے رب کی طرف دیکھ رہے ہوں گے۔

قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کا دیدار ہونے میں تو کوئی شبہ نہیں مگر یہ دیدار کس طور پر ہوگا اس کی تفصیل سمجھنے میں وقت پیش آتی ہے کیونکہ دنیا میں ہمارا مشاہدہ ہے کہ اجتماع کے وقت کسی ایک شخص کو اطمینان سے دیکھنا ممکن نہیں ہوتا تو قیامت کے میدان میں جہاں

اولین و آخرین کا اتنا بڑا اجتماع ہوگا کہ جمع ہونے والوں کی تعداد حد شمار سے باہر ہوگی وہاں ایک خدا کا دیدار باطمینان کیلئے ممکن ہوگا کیا یہ لا تعداد انسانوں کا اجتماع ایک دوسرے کی گردنیں پھلانگتا پھرے گا کیا دیدار الہی کی کوشش میں وہاں ابوبوں انسانوں کے کاندھے سے ایک دوسرے سے چھل رہے ہوں گے اور اس پر بھی کیا یقین سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ سب اہل محشر دیدار الہی سے فیض یاب ہو سکیں گے؟ یہ تخیلات یہ سوالات ہر اس مومن کے ذہن میں پیدا ہو سکتے ہیں جو عشق کے جذبے سے دیدار الہی کا مشتاق ہے۔

عقل کے سہارے جو جواب بھی ان تفصیلات کا دیا جائے گا قیاس سے زیادہ اس کی کوئی یقینیت نہ ہوگی لیکن زبان بنوی سے اس کا جواب سنتے ہی آپ کی تشفی ہو جائے گی صحابہ کے ایسے ہی ایک سوال کے جواب میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دیکھو آفتاب اور چاند تمہارے سامنے ہیں جس طرح بغیر کسی رکاوٹ کے بیک وقت کروڑوں انسان ان دونوں کو دیکھا کرتے ہیں اس سے زیادہ صفائی اور اطمینان کے ساتھ تم اپنے رب کو محشر میں دیکھو گے۔ دیکھنے بجھنے اس جواب سے تخیلات کے بادل کیسے ہٹوا دیں اڑ گئے، محض عقل پر چھوڑ دیا جاتا تو یہ بادل گہرے سے گہرے ہوتے جاتے اور گھٹا ٹوپ اندھیروں کے سوا کچھ ہاتھ نہ آتا۔ کہاں تک مثالیں دی جائیں جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا اس ضمن میں قرآن سے بڑی مثالیں دی جاسکتی ہیں مگر یہ مثالیں اسی پر اثر کریں گی جو حق کا تسلاشی ہو۔ جس نے حق کو جان کر بھی نہ ماننے کی قسم کھائی ہوئی ہو اس کا اطمینان تو کسی طرح ممکن ہی نہیں۔ ہاں خدا ہی ہدایت عطا فرما دے تو الگ بات ہے۔ بہر حال ہمارا کام پہونچا دینا ہے اسی لیے

علاہم نیک و بد حضور کو سمجھائے جاتے ہیں

**قصہ طلب آیات اور احادیث** | حدیث کی مدد کے بغیر قرآن کو سمجھنے کا دعویٰ کرنے والوں سے ایک اور بات دریافت

طلب ہے۔ قرآن کریم میں ایسی بہت سی آیات ہیں جن میں کسی نہ کسی خاص قصہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اکثر و بیشتر ان واقعات کا متعلقہ آیات قرآنی سے اس قدر گرا تعلق ہے کہ جب تک وہ پورا واقعہ معلوم نہ ہو ان آیات کا پورا مفہوم ہی سمجھ میں نہیں آتا، احادیث میں

ان قصوں کی پوری تفصیل موجود ہے۔ اگر احادیث سے مدد لیتے ہیں منکرینِ حدیث کو عار آتی ہے تو وہ اپنی عقل سے ان آیات کا پورا پورا صحیح مفہوم واضح کر کے دکھائیں۔ ہم ان آیات میں سے چند ایک صرف نمونے کے طور پر پیش کیے دیتے ہیں شاید منکرینِ حدیث اپنی غلطی کی حقیقت سمجھ کر سیدھے راستے پر لوٹ آئیں سورۃ توبہ میں ہے۔

وَعَلَى الثَّلَاثَةِ الَّذِينَ خَلَفُوا النِّخْرَ | اور ان تینوں پر بھی (توبہ فرمائی) جن کا معاملہ ملتوی رکھا گیا تھا (توبہ: ۱۱۸)

حدیث سے مدد لے بغیر ذرا اس آیت کا پورا پورا مفہوم سمجھا کر دکھلائیے۔ یہ بتلائیے کہ یہ تین شخص کون ہیں جن کا اس آیت میں ذکر ہوا ہے ان کا کیا قصہ تھا ان کے معاملے کو ملتوی کیوں رکھا گیا۔ اسی آیت میں آگے آتا ہے کہ ان پر زمین باوجود کشادگی کے تنگ ہو گئی تھی، حدیث کے بغیر یہ مجسمہ حل کیجئے کہ ان پر ایسی کیا مصیبت آپڑی تھی جس کی وجہ سے اللہ کی اتنی وسیع زمین انہیں تنگ نظر نہ لگی؟

اس آیت کا مفہوم سمجھنے کے لیے ان تمام سوالوں کا جواب ضروری ہے اور وہ حدیث سے مدد لے بغیر ممکن نہیں۔ یہ آیت کو اسی طرح تشنہ چھوڑ دیجئے یا ہر کہ و مہ کی رائے پر چھوڑ دیجئے وہ جو چاہے ان سوالوں کے جواب میں اپنے طور پر قرار دے لے یا پھر مانئے کہ حدیث کی مدد کے بغیر قرآن فہمی ممکن نہیں۔ بتلائیے ان میں سے کونسی بات قرینِ عقل اور تقاضائے انصاف ہے؟ یقیناً آخری بات ملنے بغیر چارہ نہیں کہ حدیث کے بغیر قرآن کا سمجھنا ناممکن ہے۔

ممکن ہے منکرینِ حدیث کہیں کہ اس قسم کی آیات کی تفسیر کی حد تک تو ہم حدیث کی اہمیت کو مانتے ہیں تو ہم کہیں گے کہ ان آیات سے متعلقہ احادیث بھی انہی سندوں اور انہی طریقوں سے روایت ہو کر ہم تک پہنچی ہیں جن سے وہ دیگر احادیث روایت ہوئی ہیں جن کو ماننے میں ان کو اعراض ہے اگر یہ سندیں صحیح ہیں تو ان کو دونوں جگہ درست مانئے اور اگر غلط ہیں تو دونوں جگہ غلط قرار دیجئے۔ یہ دو رنگی کیسی ابھراں اپنا مطلب پورا ہوتا نظر آئے اقرار کر لیا اور جہاں مطلب برآ رہا نہ ہو انکار کر دیا۔ کچھ تو انصاف سے کام لیجئے۔

اسی طرح قرآن پاک کی ایک اور آیت کا حوالہ پیش خدمت ہے۔ منکرینِ حدیث احادیث کے ذخیرے سے مدد لیے بغیر اس آیت کا پورا مفہوم واضح کر کے دکھائیں۔  
سورۃ الاحزاب میں ہے۔

اور جن اہل کتاب نے ان کی عہد کا تھی (اللہ نے)  
انہیں ان کے قلعوں سے اتار دیا اور ان کے دلوں  
میں (تمہارا) رعب بٹھا دیا (پھر) بعض کو قتل کرنے  
لگے اور بعض کو قید کر لیا اور تمہیں مالک بنادیا ان کی  
زمین کا اور ان کے گھر لے کر ان کے اموال کا  
اور اس زمین کا بھی جس پر تم نے (ابھی تک) قدم  
نہیں رکھا ہے۔

وَأَنزَلَ الَّذِينَ ظَاهَرُوا مِنْهُمْ مِنْ  
أَهْلِ الْكِتَابِ مِنْ صَيَاصِيهِمْ وَقَذَفَ  
فِي قُلُوبِهِمُ الرُّعْبَ فَرِيقًا تَقْتُلُونَ  
وَأَسْرُونَ فَرِيقًا وَ أَوْسَرْتُمْ  
أَرْضَهُمْ وَيَاوَدَّهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ  
وَأَرْضَانَهُمْ لَظْوَعًا (الاحزاب: ۲۷-۲۸)

حدیث کے بغیر اگر قرآن کو سمجھا جاسکتا ہے تو پھر ذرا بتلائیے یہ مدد کرنے والے کون لوگ تھے  
انہوں نے دشمنانِ اسلام کی مدد کس طور پر کی تھی؟ وہ قلعے کہاں تھے جہاں سے ان مدد کرنے  
والوں کو اللہ نے نکالی باہر کیا؟ ان کے قتل اور قید کیے جانے کی تفصیلات کیا ہیں وہ زمین  
اور وہ جائداد کہاں تھی جس کو مسلمانوں کے قبضے میں دے دیا گیا نیز ان دوسری زمینوں کا  
اتہ پتہ بھی بتائیے جہاں اس وقت تک مسلمانوں کے قدم نہیں پہنچے تھے مگر ان کے  
وارث بنادے گئے۔

انصاف سے بتلائیے احادیث سے قطع نظر کر کے کیا ان تمام باتوں کا جواب  
دیا جاسکتا ہے؟ کیا احادیث سے انکار کر کے اس آیت قرآنی اور اس قسم کی لاتعداد  
آیات قرآنی کا واضح اور متین مفہوم سمجھنا ممکن ہے؟ کیا صرف قرآن سے ان سوالات  
کا جواب مل سکتا ہے؟ کیا احادیث کی طرف رجوع کے علاوہ کوئی دوسری صورت بھی  
ان تمام باتوں کے معلوم کرنے کی ہے؟ جو شخص بھی جویلے حق اور طالبِ ہدایت ہوگا  
وہ بر ملا کہہ اٹھے گا کہ صرف اور صرف احادیث ہی وہ ذریعہ ہیں جو اس سلسلے  
میں ہماری رہنمائی کر سکتی ہیں۔



منکرین حدیث کو اگر ذرا بھی حق کی طلب ہے تو ان چند مثالوں سے ہی انہیں اپنے اس دعوے کی غیر معقولیت کا اندازہ ہو جانا چاہیے کہ حدیث کے بغیر قرآن بھی ممکن ہے۔ اس قسم کی مثالیں قرآن مجید سے اور بھی بہت سی پیش کی جاسکتی ہیں مگر ہمارا مقصود ان مثالوں کا احاطہ کرنا نہیں ہے بلکہ اس حقیقت کا اظہار کرنا مقصود ہے کہ حدیث کے بغیر قرآن کو سمجھنا ناممکن ہے اور یہ مقصود ان چند مثالوں سے بھی پورا ہو جاتا ہے۔

**حدیث کے بغیر دین نامکمل ہے** | حدیث درحقیقت چونکہ قرآن ہی کی دوسری ایک مفصل شکل ہے، جیسا کہ ہم نے ابتدا

میں عرض کیا وہ قرآن کے جملات کی تفصیل، اس کی مشکلات کا بیان اور اس کے مختصر اشارات کی شرح ہے اس لیے صرف اتنا ہی نہیں کہ حدیث کے بغیر قرآن کی چند آیات کا مفہوم سمجھ میں نہ آتا ہو بلکہ حقیقت یہ ہے کہ حدیث کے بغیر دین کا پورا خاکہ ہی تیار نہیں ہو سکتا اور اس لحاظ سے حدیث کے بغیر دین ہی نامکمل رہتا ہے۔

حدیث کا انکار کرنے والے اگر سمجھتے ہیں کہ حدیث سے مدد لیے بغیر دین کی تکمیل ممکن ہے تو ہم ان کو دعوت دیتے ہیں آگے بڑھیں اور فقط قرآن کریم سے دین اسلام کے عقائد و عبادات، حلال و حرام کے احکام، معاشیات و معاشرت کی تفصیلات، نکاح و طلاق کے مسائل، تجارت و سیاست کے ضابطے اور احکام بھاد و خراج وغیرہ کا مکمل نقشہ تیار کر کے دکھائیں۔ دین کا مکمل نقشہ تو بہت دور کی بات ہے وہ نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ ان چار ارکان دین ہی کے تفصیلی احکام صرف قرآن سے متعین کر کے دکھادیں۔

**ارکان دین اور حدیث** | مثال کے طور پر قرآن نے جا بجا نماز قائم کرنے کا حکم دیا ہے۔ حدیث کے ذخیرے سے مدد لیے بغیر ذرا بتلایئے

تو سہی کہ نماز ادا کرنے کا طریقہ کیا ہے اللہ کے اس تاکید حکم کی تعمیل آخر کس طریقہ پر کی جائے ایسا تاکید حکم کہ قرآن میں ستر سے زیادہ مقامات پر اس کا کسی نہ کسی پیرائے میں

ذکر کیا گیا ہو۔ ذرا بتلائیے، صرف قرآن کی مدد سے بتلائیے کہ نماز پڑھنے والا نماز کے لیے ابتدا میں ہاتھ اٹھاتے تو کس طرح، ہتھیلیوں کا رخ کس جانب ہو، ہاتھ کہاں تک اٹھائے اٹھاتے وقت کیا کہے، پھر ہاتھ چھوڑ دے یا ہاندھ لے، ہاندھنے تو کیسے اور کہاں، کھڑے ہونے کی حالت میں کیا پڑھے، رکوع میں کیا کہے، رکوع ایک کرے کہ دو سجودے میں کیا پڑھے، سجودوں کی تعداد کتنی ہو، نماز میں رکوع پہلے ہے کہ سجدہ، قیام پہلے ہے کہ قعود، قعود میں کیا دعائیں پڑھے، نماز سے باہر کسی طرح آئے، سلام پھیرے تو پہلے دائیں طرف پھیرے کہ بائیں طرف، یہ اور اسی قسم کی تمام تفصیلات قرآن نے تو کہیں بیان نہیں کیں، قرآن نے یہ بھی نہیں بتایا کہ نمازوں کے اوقات کی صحیح تعیین کیا ہے، کونسی نماز کا وقت کس وقت شروع ہوتا ہے اور کس وقت ختم ہو جاتا ہے، قرآن نے رکعات نماز بھی متعین کر کے کہیں نہیں بتلائی۔ قرآن سے آپ کو یہ بھی نہیں معلوم ہو سکے گا کہ نماز میں بھول ہو جائے تو کیا کیا جائے، کن کن صورتوں میں نماز فاسد ہو جاتی ہے، نماز کا وقت قصتا ہو جائے تو کیا کرے کن کن اوقات میں نماز پڑھنا مکروہ ہے اور کن اوقات میں حرام۔ یہ تمام تفصیلات آپ کو حدیث ہی کے ذخیرے سے ملیں گی۔ اسی طرح روزے کے تفصیلی احکام محض قرآن سے معلوم نہیں کیے جاسکتے کیونکہ صرف قرآن سے کوئی بتا سکتا ہے کہ کن کن حالات میں روزہ فاسد ہو جاتا ہے اور کن صورتوں میں کفارہ لازم آتا ہے۔ کیا حدیث کی مدد کے بغیر یہ معلوم کیا جاسکتا ہے کہ کن لوگوں کے لیے روزہ رکھنے کے بجائے قدیہ دے دینے کی اجازت ہے، وہ کیا وجوہات ہیں جن کی بنا پر روزہ نہ رکھنا جائز ہے وہ کونسی صورتیں ہیں جن میں رکھا ہو اور روزہ توڑ دینے کی اجازت ہے؟ اسی قسم کی جتنی تفصیلات روزے سے متعلق ہیں وہ قرآن نے تو کہیں بیان نہیں کیں۔

نماز اور روزے ہی پر آپ دو دوسرے ارکان حج اور زکوٰۃ کو بھی قیاس کرتے لیجئے۔ حج اور زکوٰۃ کا حکم تو آپ کو قرآن میں مل جائے گا مگر مناسک حج اور مسائل زکوٰۃ معلوم کرنے کے لیے آپ کو حدیث ہی سے رجوع کرنا پڑے گا۔ قرآن آپ کو یہ نہیں بتائے گا کہ

حج ادا کرنے کے کتنے طریقے ہیں، احرام میں کتنے کپڑے ہوتے ہیں حدود و میقات کیا کیا ہیں، مناسک حج کس ترتیب سے ادا کیے جاتے ہیں، طواف میں کتنے چکر ہیں اور سعی کتنے شوط کی ہے، رمل کسے کہتے ہیں اور کس طرح کیا جاتا ہے، رمی کرنے کا طریقہ کیا ہے، قربانی کب اور کس طرح دینی ہے، حج کی بنیاد کیا کیا ہیں۔ غرض حج سے متعلقہ تفصیلی احکام قرآن میں آپ کو کہیں نہیں ملیں گے۔ اسی طرح قرآن میں زکوٰۃ کا حکم تو ملے گا مگر زکوٰۃ کا نصاب، اس کی شرح اور اس کی مدت وغیرہ معلوم کرنے کے لیے حدیث سے رجوع کیے بغیر چارہ نہیں۔ صرت قرآن کی مدد سے کوئی نہیں بتا سکتا کہ مختلف قسم کے اموال پر زکوٰۃ کسے مختلف نصاب کیا کیا ہیں اور ہر ایک مال پر زکوٰۃ کس کس شرح سے ادا کی جاتی ہے، حیوانات کی کیا زکوٰۃ ہے اور زمین کے پیداوار کی کیا ہے عشر اور خراج کے مسائل کیا ہیں۔ ان تمام تفصیلات کے لیے حدیث کا ذخیرہ ہی ہماری رہنمائی کرتا ہے۔

ان ارکانِ دین نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ ہی پر موقوف نہیں حدیث کی مدد کے بغیر دین کا کوئی شعبہ بھی مکمل نہیں ہوتا، معاشرت ہو یا معیشت، سیاست کے امور ہوں یا تجارت کے معاملات، اخلاق کی بات ہو یا حقوق و فرائض کی دین کے ہر ہر شعبے کا پورا نقشہ مکمل تیار کرنے کے لیے ہم حدیث کے محتاج ہیں۔

حدیث کا انکار کرنے والوں سے کوئی پوچھے کہ حدیث کو چھوڑ کر آپ دین کو آخر کیا شکل دینا چاہتے ہیں کیا آپ یہ جانتے ہیں کہ نماز نماز نہ رہے اور روزہ روزہ نہ آملے سکے حج اور زکوٰۃ اپنا وجود کھو بیٹھیں، دین کا پورا نظام درہم برہم ہو کر رہ جائے۔ کیا آپ کا مقصد یہ ہے کہ ملتِ اسلامیہ منتشر ہو کر رہ جائے۔ ہر شخص قرآن کی ایک الگ تفسیر آوردین کا ایک علیحدہ دھانچہ لیے پھرے اور کوئی کسی کو غلط یا درست کہنے والا نہ رہے۔

**انکار حدیث ابطال دین کے مترادف ہے** | حدیث سے قطع نظر کہنے کا یہ لازمی نتیجہ ہے۔ حدیث کا

انکار کر کے قرآن کی تفسیر قرآن کی تخریف بن جائے گی۔ ہر شخص اپنی سوچ کے مطابق قرآن

کی مرادات متعین کرے گا اور پھر اس پر اصرار کرے گا کہ جو کچھ اس نے سمجھا ہے وہی درست ہے،  
دین ایک کھیل بن جائے گا۔

ان منکرین حدیث نے دین کو واقعی ایک کھلونا سمجھا ہوا ہے۔ حدیث کے پیروان کی قرآن نہیں  
کا ایک شاہکار ملاحظہ کیجئے۔ دیکھئے اور عبرت پکڑ لیتے۔

شیخ عبداللہ چکڑالوی صاحب نے جن کو منکرین حدیث کے یہاں امام کا درجہ حاصل ہے  
ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے ”برہان القرآن علی صلوٰۃ القرآن“ یہ کتاب تقریباً چار سو صفحات پر  
مشتمل ہے اس کتاب میں شیخ صاحب نے حدیث کی مدد کے بغیر نماز کے تفصیلی احکام متعین کرنے کی  
کوشش کی ہے۔ شیخ صاحب کی اس کوشش کا سب سے مزیداد پہلو یہ ہے کہ اپنی متعین  
کردہ نماز کی جس کو وہ صلوٰۃ القرآن کہتے ہیں جو ترکیب انہوں نے لکھی ہے وہ اس کو قرآن سے  
ثابت نہیں کر سکے، پہلے ہی قدم پر حدیث کی احتیاج کا شوق دیدہ عبرت نگاہ سے بہرہ ور ہوتے۔  
اس کے علاوہ اپنی نماز میں انہوں نے بجائے تیسرات کے آیات قرآنیہ رکھی ہیں مثلاً وہ کہتے ہیں کہ  
”بکیر اولیٰ کی جگہ وان اللہ صواہلی الکیور پڑھا جائے، مثلاً یعنی سبحانک کی بجائے ائی و جہت  
وجہی للہ ذی الخ پڑھیں، اسی طرح ہر موقع پر انہوں نے مختلف آیات قرآنی تجویز کی ہیں مگر  
مزے کی بات یہ ہے کہ یہ نہ بتلا سکے کہ ان آیات کا تعلق انہوں نے قرآن کی کس آیت کے حکم  
کے تحت کیا ہے۔ پھر صرف ایک نماز ہی کے معاملے میں ان کے آپس کے اختلافات کا عالم  
دیکھئے۔ شیخ چکڑالوی صاحب کو قرآن سے باپنا وقت کی نماز ثابت ہوتی ہے جبکہ ان کے شاگردوں  
کو قرآن میں صرف دو وقت کی نماز نظر آتی ہے، شیخ صاحب کے نزدیک رکعات نماز کی تعداد دو بھی  
ہے تین بھی اور چار بھی مگر شیخ صاحب کے مریدین مصر ہیں کہ قرآن سے تعداد رکعات صرف دو  
ثابت ہوتی ہیں۔ اذان کے سلسلے میں بھی ان کے اختلافات کی بولچہ اس سے زیادہ ہی ہے۔ شیخ  
عبداللہ چکڑالوی صاحب اذان کے منکر تھے اس کو کفر و شرک خیال کرتے تھے لیکن ان کے خلیفہ  
شیخ حشمت علی نے اپنے شیخ کے علی الرغم ایک اذان اپنی طرف سے ترتیب دے لی اس کے لیے انہوں  
نے چند آیات قرآنی سَبَّأْنَا سَمْعًا مَّأَدِيَا فَيُنَادِي دَرِيْرًا جَمْعًا اور ان کو ایک خاص ترتیب  
سے یکجا کر کے اس مجموعہ کا نام اذان رکھ دیا مگر وہ بے چارے بھی یہ نہ بتلا سکے کہ مختلف آیات کا

یہ تعین اور یہ ترتیب قرآن کی کس آیت سے ثابت ہوتی ہے۔ جب آیات کے تعلق اور ترتیب کے لیے کوئی دلیل ہی نہیں تو عین ممکن ہے کل کلام کو شیخ حثمت علی صاحب کے خلیفہ اٹھیں اور اذان کے لیے کسی دوسری آیات کا انتخاب کریں اور اپنی مرضی کی ترتیب انہیں عطا فرمائیں۔ خود فرمایا آپ نے حدیث سے قطع نظر کرتے کے بعد قرآن کی تفسیر کا یہ حال ہوتا ہے قرآن کے صرف دو لفظوں کی تفسیر میں اس قدر اختلافات رہتا ہو گئے اور وہ بھی اُستاد اور شاگرد کے درمیان آگے آگے دیکھتے ہوتا ہے کیا۔ اس کے ساتھ ہی ان کے ذرا اس دعوے پر بھی غور کیجئے کہتے ہیں کہ قرآن میں سب کچھ ہے قرآن کو مزید کسی تشریح کی ضرورت ہی نہیں۔ اُقیموا الصلوٰۃ کا نذر نہ کرتے کرتے تو شیخ چکر لادی صاحب اس کی تشریح میں چار سو صفحات لکھ گئے اور دعویٰ یہ کہ قرآن کو کسی تشریح کی ضرورت نہیں؟ قرآن کے صرف ایک فقرے کو سمجھانے کے لیے چار سو صفحات پر مشتمل ایک ضخیم کتاب تیار کرنی پڑی کیا اسی طرح قرآن میں سب کچھ موجود ہے؟ اگر ان احادیث کو جمع کیا جائے جو نماز سے متعلق ہیں تو اس سے نصف ضخامت کی کتاب بھی مرتب نہ ہو۔ کاش منکرین حدیث کچھ تو عقل سے کام لیتے مگر نہیں! یہ لوگ عقل ہی سے تو کام لے کر اپنی اغراض نفسانی پورا کرنے کی راہیں نکال رہے ہیں۔ کاش ان کو عقل سلیم نصیب ہوتی جو وحی کی روشنی میں چکا چوند ہونے کے بجائے اور چمک اٹھتی اور ان کے لیے مشعل راہ کا کام دے سکتی :

**انکار حدیث اور حلال و حرام کی تمیز** | اس میں کوئی شبہ نہیں کہ منکرین حدیث اندھیروں میں بھٹک رہے ہیں ان کو اتنا

بھی احساس نہیں کہ حدیث کو درمیان سے نکال دیا جائے تو دین کا وجود ہی اپنی اصلی حالت پر قائم نہیں رہتا حدیث کو ماخذ دین نہ مانا جائے تو نہ معتقدات اپنی جگہ پر برقرار رہتے ہیں نہ عبادات نہ معاملات دین کا سارا نظام ٹپٹ ہو کر رہ جاتا ہے اور پھر اغراض کے بندوں کے ہاتھوں دین کا ایسا حلیہ بگڑتا ہے کہ اکثر حالات میں حلال و حرام تک کی تمیز باقی نہیں رہ سکتی۔ ہم نہیں سمجھتے کہ منکرین حدیث اس قدر جاہل ہوں گے کہ اتنی بات بھی نہ سمجھیں۔ یہ امر واقعہ ہے کہ ماخذ دین ہونے کی حیثیت سے حدیث کا انکار کر دیا جائے تو بیشتر حالات میں حلال و حرام غلط ملط ہو کر رہ جائیں۔ اس سلسلے میں بھی چند مثالیں ملاحظہ کرتے چلیے :

(۱) ذرا بتلائیے! دین اسلام میں پھوپھی بھتیجی یا خالہ بھانجی کو ایک نکاح میں جمع کرنا حلال ہے یا حرام؟ ہر کوئی کہے گا کہ حرام ہے، ایک بیوی کے ہوتے ہوئے اگر کوئی شخص دوسرا نکاح کرنا چاہے تو وہ اپنی موجودہ بیوی کی بھتیجی یا اس کی بھانجی سے نکاح نہیں کر سکتا، شریعت نے ان دونوں کو ایک نکاح میں جمع کرنا حرام قرار دیا ہے مگر حدیث کو دین کا ماخذ نہ ماننے والوں سے آپ پوچھیں گے تو انہیں یہی کہتے ہیں پڑے گی کہ حلال ہے۔ آپ تعجب کا اظہار نہ کریں یہ بالکل درست ہے، مگر حدیث کو یہ اقرار کیے بغیر چارہ نہیں کہ پھوپھی بھتیجی اور خالہ بھانجی کو ایک ساتھ اپنے نکاح میں رکھا جاسکتا ہے۔ کیونکہ قرآن میں کوئی آیت ایسی نہیں ہے جس میں ان دونوں کو ایک نکاح میں جمع کرنا حرام بنا گیا ہو قرآن نے تو صرف دو بہنوں کو ایک نکاح میں جمع کرنا حرام قرار دیا ہے۔

بھتیجے بھتیجی بھائی بھائی ایک حرام چیز حلال ہو گئی۔ قصہ دراصل یہ ہے کہ قرآن کریم نے تو واقعی دو بہنوں کو ہی ایک نکاح میں جمع کرنا حرام قرار دیا ہے مگر اس کی علت یہ ہے کہ اس وجہ سے ان میں زنا بت کا جذبہ بیدار ہو گا اور فطری طور پر ان دونوں کے درمیان قطع رحمی پیدا ہو جائے گی جبکہ شرعاً دونوں بہنوں کے درمیان صلہ رحمی واجب تھی۔ حدیث نے اس علت کے پیش نظر ان رشتوں کا بھی اسی حکم میں داخل ہونا بتلا دیا جن میں اس صلہ رحمی کے قطع ہونے کا خطرہ تھا یعنی جہاں کہیں بھی وہ علت موجود تھی جو دو بہنوں کو ایک نکاح میں جمع کرنے کی حرمت کی اصل وجہ تھی حدیث نے وہاں وہاں ہی ان رشتوں کو یکجا جمع کرنا حرام قرار دے دیا۔ گویا جمع بین الاختین کی حرمت کا حکم دے کر قرآن نے ایک اصول بتلایا اور حدیث نے اس اصول کا اطلاق ہمیں سکھایا اور واضح کیا کہ خدا کی مراد صرف یہ دو ہی رشتے نہیں بلکہ اس قسم کے اور رشتے بھی جہاں قطع رحمی کا خطرہ ہو یہی حکم رکھتے ہیں۔

(۲) اسی طرح شیر بھڑیا، بچہ وغیرہ تمام درندے حرام ہیں، شکاری پرندے باز شکرہ وغیرہ کو بھی شریعت نے حرام قرار دیا ہے۔ کسی جاہل سے جاہل مسلمان سے بھی آپ پوچھیں گے تو وہ ان جانوروں کا گوشت کھانے کو حرام ہی کہے گا مگر حدیث کا انکار کرنے والوں سے پوچھئے انہیں ان حرام جانوروں کو بھی حلال ماننا پڑتا ہے۔ حدیث سے قطع نظر کرتے کا یہی نتیجہ ہوتا ہے۔ دراصل قرآن

نے حلال اور حرام سے متعلق ایک قاعدہ کلیہ بتلادیا ہے کہ جو چیزیں طہبات ہیں وہ حلال ہیں اور جو خبائث ہیں وہ حرام ہیں۔

مُحَمَّدٌ لَكُمْ لَطِيفٌ وَفِيكُمْ عَلِيمٌ (النَّبَاتِ رِا عِصْرَات : ۵۷) اور ان کے یہ پاکیزہ چیزیں جائز بنانا ہے اور ان پر گندی چیزیں حرام رکھنا ہے لیکن اب درندوں اور شکاردی پرندوں کے بارے میں قطعی فیصلہ نہیں کیا جاسکتا کہ ان کو طہبات میں داخل سمجھا جائے یا خبائث میں شامل گنا جائے۔ حدیث نے اس تذبذب کو رفع کیا اور قرآن کے اس حکم کی تشریح کی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ذِی نَابٍ مِّنَ السَّبَاعِ (کچلیاں رکھنے والے درندے) اور ذِی مَخْلَبٍ مِّنَ الطَّيْرِ (بچوں والے شکاردی پرندے) کے الفاظ سے درندوں اور شکاردی پرندوں کا خبائث کے حکم میں درج ہونا بتلایا لیکن منکرین حدیث کو تو حدیث سے مدد لینا باعث عار ہے اس لیے ان کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ وہ درندوں اور شکاردی پرندوں کو حلال جانیں یا پھر حدیث کا اقرار کریں اس مثال میں آپ اس حیثیت سے بھی غور کریں کہ اگر طہبات اور خبائث کی تشریح کو منکرین حدیث کی خواہش کے مطابق صرف عقل کے سپرد کر دیا جائے تو بات صرف درندوں اور شکاردی پرندوں کے حلال ہو جائے تک ہی محدود نہیں رہتی۔ حرام کھانے کے عادی لوگ تمام خبائث کو طہبات کہہ کہہ کر حلال بنا ڈالیں اور کوئی بھی ان کا ہاتھ پکڑنے والا نہ ہو۔

(۳) ایک اور مثال پیش خدمت ہے شاید منکرین حدیث پر اپنی غلطی واضح ہو جائے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ شراب اور اسی قسم کی دوسری نشہ آور چیزیں حرام ہیں ان میں تھوڑی اور زیادہ کا بھی کوئی فرق نہیں شراب کا جس طرح ایک پیگ یا ایک بوتل پینا حرام ہے اسی طرح ایک گھونٹ پینا بھی حرام ہے خواہ اس گھونٹ سے نشہ بھی نہ ہوتا ہو شراب نجس جو سورۃ بقرہ کے الفاظ ہیں اَلْمَاءُ الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنْصَابُ وَالْأَنرَکَ مَرْجِسٌ (شراب و خمر و انصاف و آنرک مریضہ اور انصاف اور انصاف سب نجس ہیں) تو نجس چیز تھوڑی ہو یا زیادہ نجس ہی ہوتی ہے۔ پیشاب کا ایک قطرہ بھی ناپاک ہی ہوتا ہے غرض نشہ آور چیزوں میں تھوڑی اور زیادہ کا کوئی فرق نہیں لیکن قرآن نے اس امر کی وضاحت کہیں نہیں کی۔ اللہ تعالیٰ نے جو چیزیں نشہ آور نہیں وہ حلال فرمائی ہیں اور جو نشہ آور ہیں وہ حرام کی ہیں یہ وضاحت

کہ جو چیزیں زیادہ مقدار میں استعمال کرنے سے نشہ پیدا کرتی ہیں ان کو تھوڑی مقدار میں استعمال کرنا بھی حرام ہے صرف حدیث نے کی ہے۔ بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا  
 مَا شَكَرَ كَثِيرَةً فَقَلِيلُهُ حَرَامٌ (جن کی زیادہ مقدار نشہ لاتے وہ تھوڑی بھی حرام ہیں)  
 حدیث سے قطع نظر کی جائے تو یہ وضاحت نہیں ملے گی اور شراب کے رسیا گھونٹ گھونٹ کر  
 کر کے شراب کو حلال قرار دیتے رہیں گے۔ آپ خود بھی دیکھ رہے ہیں موجودہ دور میں  
 شراب کو حلال ہی نہیں مفید صحت قرار دیا جا رہا ہے اور منکرین حدیث ان کی تقویت کا  
 باعث بن رہے ہیں۔

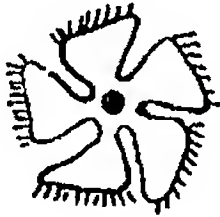
غرض حدیث کے بغیر قرآن بھی انتہائی نامعقول بات ہے اور اس سے زیادہ غیر معقول  
 یہ دعویٰ ہے کہ ہر شخص اپنے اپنے زمانے میں اپنے اپنے حالات کی روشنی میں تہمیدان کے  
 معانی و مطالب سمجھ سکتا ہے۔ حق یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بڑا احسان کیا ہے کہ اپنے کلام کی مرادات  
 کی تلاش عقل انسانی کے ذمے نہیں ڈالی بلکہ ہم میں اپنا ایک رسول بھیج دیا جس نے وحی الہی کی  
 روشنی میں کلام الہی کی مرادات متعین کر کے ہمیں بتلا دیں نہ صرف بتلا دیں بلکہ ان پر عمل  
 کر کے ان کا عملی نمونہ ہم پہنچا دیا۔ اگر اللہ تعالیٰ اس طرح اپنے رسول کے ذریعے ہماری  
 تعلیم و ہدایت کا سامان نہ کرتا اور مرادات قرآنی کی تعیین کر ہماری عقل پر چھوڑ دیتا تو ہم یقیناً  
 مدت العرقرآن کی صحیح مراد حاصل نہ کر پاتے امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ نے بالکل صحیح فرمایا  
 کہ لَوْلَا السُّنَّةُ مَا فَهِمْنَا أَحَدٌ مِّنَّا الْقُرْآنَ (اگر حدیث نہ ہوتی تو ہم میں سے  
 کوئی بھی قرآن کو نہ سمجھتا) حدیث کے بغیر نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ ہی کے احکام و مسائل  
 مستور و مجہول نہ رہتے بلکہ نکاح، خلع، طلاق، بھاد و قتال اور صلح و جنگ وغیرہ کی حقیقت  
 بھی ہم پر کبھی منکشف نہ ہو سکتی اور دین ایک کھلونا بن کر رہ جاتا بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ  
 وہ قرآن جو ہدایت انسانی کے لیے نازل ہوا تھا بنی نوع انسان کی گمراہی کا سبب بن جاتا۔

مگر اللہ کو تو اپنے بندوں کی ہدایت منظور ہے وہ ان کو گمراہی کے اندھیروں میں بھٹکتا  
 کیے چھوڑ دیتا اس نے قرآن کی اس طرح مخالفت کی کہ اس کے الفاظ کو بھی محفوظ رکھا اور  
 اس کے معانی و مطالب اور اس کی مرادات کی بھی مخالفت کی اور یہی ہے وہ مخالفت جس کا



قرآن میں وعدہ کیا گیا تھا۔ صرف الفاظ محفوظ ہوتے تو یہ وعدہ پورا نہ ہوتا اسی طرح صرف معانی کی حفاظت سے اس وعدے کا ایسا صادق نہ آتا۔

غرض منکرینِ حدیث کے اس دعوے میں کوئی وزن نہیں کہ حدیث کے بغیر قرآن فہمی ممکن ہے۔ تاریکین پر بخوبی واضح ہو گیا ہوگا کہ حدیث کے بغیر صرف یہی نہیں کہ قرآن فہمی ناممکن ہے بلکہ حدیث کے بغیر قرآن ہدایت کے بجائے گمراہی کا سبب بن جاتا ہے اسلام کی صحیح تصویر قرآن اور حدیث سے مل کر تیار ہوتی ہے، اسلام کی بحرح تعلیم قرآن اور حدیث کی باہمی توفیق و تطبیق سے معلوم ہوتی ہے۔ قرآن پاک اور حدیث دونوں مل کر ہی سہر حتمہ ہدایت ہیں جو یہ چاہتے ہیں کہ ان دونوں کو ایک دوسرے سے الگ کر دیں ایک کو مانیں اور ایک کا انکار کریں وہ صراحتاً مستقیم سے دور ہیں ❖



## حفظ حدیث اور صحابہ

گذشتہ گفتگو کے نتیجے میں یہ بات پوری طرح واضح ہو گئی ہے کہ حدیث کے بغیر قرآن  
نہی ناممکن ہے۔ صرف قرآن ہی ناممکن نہیں بلکہ حدیث کے بغیر دین ناممکن ہے اسلام کی پوری  
تصویر قرآن اور حدیث دونوں سے مل کر ہی تیار ہوتی ہے جو شخص قرآن کی اس آیت پر یقین  
رکھتا ہے کہ

اَلْيَوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَانْتَمَتَتْ  
عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ  
دِينًا (المائدہ: ۳)۔

آج میں نے تمہارے لیے دین کو کامل کر دیا اور  
تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمہارے لیے اسلام  
کو بطور دین کے پسند کر لیا۔

اور یہ ماننا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر دین کا نلی کر دیا اس کو یہ ماننے بغیر  
چارہ نہیں کہ انکار حدیث ابطال دین کے مترادف ہے اور اسی طرح جو شخص قرآن حکیم کی  
اس آیت پر ایمان رکھتا ہے کہ

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ  
وَلَكِن سُرَّ سُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيِّیْنَ  
(الاحزاب: ۴۰)

محمد تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں  
البتہ اللہ کے رسول ہیں اور (سب) انبیوں کے ختم  
پر ہیں۔

اور یہ یقین رکھتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سب سے آخری نبی ہیں اب دوسرا کوئی نبی آنے  
والا نہیں آئے پر نبوت ختم ہو گئی قیامت تک یہی نبوت قائم رہے گی تو اسے یہ بھی ماننا پڑے  
گا کہ حدیث کی حفاظت اتنی ہی ضروری ہے جتنی قرآن کی۔ اگر حدیث کی حفاظت نہ ہو تو دین غیر  
محفوظ قرار پاتا ہے اور دین کا قیامت تک کے لیے محفوظ رہنا ضروری ہے کیونکہ اب نبوت کا  
دروازہ تو بند ہو گیا کہ ایک نبوت کے ختم ہونے اور ایک شریعت کے کم ہو جانے پر نئی  
نبوت اور نئی شریعت اس کے قائم مقام ہو جائے۔

حدیث کی ضرورت ثابت ہو جانے کے بعد اب ہم پھر اپنے موضوع کی طرف لوٹتے ہیں اور اس امر کا جائزہ لیتے ہیں کہ حدیث کی حفاظت کا تیسرا مرحلہ اللہ تعالیٰ نے کس طرح انجام دیا۔ آپ کو یاد ہو گا ابتر میں عرض کیا گیا تھا کہ حفاظت کا یہ تیسرا مرحلہ جس میں احادیث نبوی صحابہ سے چل کر تابعین، تبع تابعین اور پھر بعد کے آنے والے محدثین کے واسطوں سے ہوتی ہوئی ہم تک پہنچی ہیں اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ منکرین حدیث کو حفاظت حدیث کے سلسلے میں زیادہ تر کلام اسی مرحلے میں ہے۔

حفاظت حدیث کے سلسلے میں منکرین حدیث کا سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ احادیث نبوی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں تو قلم بند ہوئیں نہیں بلکہ صحابہ کے عہد میں بھی ان کو قید تحریر میں نہیں لایا گیا محض زبانی طور پر نقل در نقل کا سلسلہ جاری رہا۔ کتابی شکل میں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث عہد نبوی سے تقریباً دو سو سال بعد مدون ہوئیں اب جو چیز اس قدر عرصہ دراز کے بعد تحریر میں آئی ہو اس کا محفوظ رہنا فطرۃً اور عادتاً محال ہے لہذا احادیث کے ذخیرے کو محفوظ تصور نہیں کیا جاسکتا اور اس لیے اس پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔ منکرین حدیث کے اس اعتراض کا ہمیں درحقیقتوں سے جائزہ لینا ہے اول یہ کہ کیا یہ امر واقعہ ہے کہ احادیث عہد نبوی کے دو سو سال بعد تحریر میں آئیں یا یہ محض افتراء پر بازی ہے دوم یہ کہ کیا احادیث کو غیر مستند قرار دینے کے لیے بس اتنی ہی دلیل کافی ہے کہ وہ ایک عرصہ دراز کے بعد قلم بند ہوئیں کیا کتابت و تحریر کے علاوہ دوسرا کوئی ذریعہ نہیں جو حفاظت حدیث کا ضامن ہو سکے۔ کیا حفظ کے راستے سے احادیث کی سیئہ بہ سیئہ منتقلی ان کی حفاظت سچی ضمانت نہیں بن سکتی؟

جہاں تک احادیث کے قید تحریر میں آنے کا تعلق ہے منکرین حدیث کے اس دعوے میں قطعاً کوئی دزن نہیں کہ عہد نبوی اور عہد صحابہ میں احادیث کو تحریر کی شکل میں محفوظ نہیں کیا گیا تھا حقیقت یہ ہے کہ احادیث کے موجودہ ذخیرے کا غالب ترین حصہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کے عہد میں ہی قید تحریر میں آچکا تھا جیسا کہ انشاء اللہ دلائل کی روشنی میں یہ بات پوری طرح کھل کر سامنے آجائے گی مگر یہ موضوع چونکہ ذرا تفصیل طلب ہے اس لیے

اس کو زیر بحث لانے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم ان قرآن کا جائزہ لیں جو حقائق  
حدیث کے سلسلے میں کتابت و تحریر سے زیادہ اہم ہیں اور جن کو اگر نظر میں رکھا جائے تو اس بات  
کی کوئی اہمیت ہی باقی نہیں رہتی کہ احادیث کتابی شکل میں کب مدون ہوئیں :-

اعتماد کی بنیاد | ان کے نزدیک یہ اصول مسلمہ ہے کہ ہر لکھی ہوئی چیز محفوظ اور قابل

اعتماد ہوتی ہے اور ہر وہ چیز جو تحریر میں نہ آئی ہو غیر محفوظ اور ناقابل اعتماد ہوتی ہے۔ فرض کیجئے  
راہ چلتے کوئی تحریر آپ کو زمین پر پڑی ہوئی مل جاتی ہے جو کسی خبر یا کسی اطلاع پر مشتمل ہے تو کیا  
آپ اس خبر اور اس اطلاع پر صرف اس لیے یقین کر لیں گے کہ وہ لکھی ہوئی ہے یا اس ذریعے  
کا پتہ لگانے کی کوشش کریں گے جس نے اس خبر اور اس اطلاع کو ہم پہنچایا ہے تاکہ  
اس کے ثقہ یا غیر ثقہ ہونے کا فیصلہ آپ کر سکیں ظاہر ہے اگر آپ عقل کی دولت سے بہرہ ور ہیں  
تو آپ دوسرا راستہ اختیار کریں گے صرف اس بنا پر اس خبر کی سچائی کو آپ کبھی بھی قبول کرنے کو  
تیار نہ ہوں گے کہ وہ آپ کو تحریر کی صورت میں ملی ہے کسی اطلاع کو آپ اس وقت تک سچ نہ  
مانیں گے جب تک آپ کو یہ یقین نہ ہو جائے کہ اس اطلاع کا ہم پہنچانے والا سچا ہے۔ اخبار یا  
دُنیا ہی کی مثال لے لیجئے کوئی خبر اس وقت تک قابل اعتماد نہیں سمجھی جاتی جب تک کسی معتد علیہ شہور یا محضی  
نے اسے جاری نہ کیا ہو معلوم ہوا محض تحریر شدہ ہوتے کی بنا پر کسی خبر کے بارے میں اعتماد یا عدم  
اعتماد کا فیصلہ نہیں کیا جاسکتا بلکہ اعتماد کے لیے ضروری شرط یہ ہے کہ خبر کے ذرائع قابل اعتماد ہوں۔  
یہ ایک ایسا مسلمہ اصول ہے کہ جو شخص اس میں شک کرے گا اس کی عقل کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھا  
جائے گا تو پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ حدیث کے بارے میں منکرین حدیث کو محض تحریر کی شرط پر اصرار  
کیوں ہے اگر یہ ثابت ہو جائے کہ احادیث جن ذریعوں سے ہم تک پہنچی ہیں وہ انتہائی قابل اعتماد  
ہیں تو پھر اس بات کی کوئی اہمیت نہیں رہتی کہ احادیث قلم بند کب ہوئیں اگر یہ معلوم ہو جائے کہ  
حدیث کی حفاظت کے لیے جن جن ذریعوں سے کام لیا جاسکتا تھا سب سے پورا پورا ایذا دینا اور قرآن  
یہ بتائیں کہ وہ تمام ذرائع قابل اعتماد تھے تو احادیث کی حفاظت میں کسی شک و شبہ کی کوئی گنجائش  
ہی باقی نہیں رہتی ۔

کیا قرآن کریم جس پر منکرین حدیث کو بھی پورا اعتماد ہے آسمان سے تحریری صورت میں نازل ہوا تھا اگر اعتماد کے لیے لکھا ہوا ہونا ہی ضروری ہے تو قرآن بھی معاذ اللہ قابل اعتماد رہا کیونکہ اللہ نے اسے کتابی صورت میں نازل نہیں فرمایا حضرت جبریل علیہ السلام نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اللہ کی جانب سے کوئی لکھی ہوئی تحریر لے کر نہ آتے تھے بلکہ قرآن کریم کے الفاظ جبریل علیہ السلام کی زبان سے نکلتے اور زبان نبوی پر جاری ہو جاتے جبریل علیہ السلام کی لائی ہوئی وحی کیا اس لیے ناقابل اعتماد قرار دی جاسکتی ہے کہ وہ لکھی ہوئی شکل میں نہیں بھیجی گئی ظاہر ہے کوئی بھی اس کا قائل نہیں کلام الہی کو قابل اعتماد سمجھنے کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ اس کا لے والا قابل اعتماد ہے اس کی امانت داری کی خود صاحب کلام نے ضمانت دی ہے نَزَّلَ بِهِ السُّورَةُ الْأَمْثِلُ (اسے امانت دار فرشتے نے اتارا۔ الشعراء: ۱۹۳) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے صحابہ کی طرف قرآن کی منتقلی بھی تحریری صورت میں نہیں ہوئی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کریم کی آیات صحابہ کو زبانی ہی سنائیں جنہیں صحابہ نے سن کر اپنے سینوں میں محفوظ کر لیا یا کاتبین وحی نے متفرق اجزاء پر لکھ لیا صحابہ نے کبھی یہ مطالبہ کیا کہ قرآن اللہ کی طرف سے تحریری صورت میں نازل ہوا وہ تحریر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں دکھائیں تو ہم قرآن کو سچا مانیں زبان نبوی سے سُنی ہوئی آیات کو محض اس لیے سچا مانا گیا کہ ان کا شانے والا صادق و مصدق اور امین تھا :

**تحریر اور اعتماد** لہذا یہ اصول ہی غلط ہے کہ صرف لکھی ہوئی چیز ہی قابل اعتماد ہو سکتی ہے۔ اعتماد و عدم اعتماد کا تحریر و عدم تحریر سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ عین ممکن ہے کہ ایک چیز لکھی ہوئی ہو مگر غلط ہو کسی چیز کے قلم تحریر میں آ جانے سے اشتباہ و شکوک کے بارے دروازے بند نہیں ہو جاتے غلطی کا امکان ہر حال باقی رہتا ہے۔ کاتبوں کے ہاتھوں رحمت کو زحمت بنتے کس نے نہیں دیکھا عصر حاضر میں بھی طباعت اور کتابت کی بے احتیاطی سے کون و انت نہیں ذرا سی بے احتیاطی سے عبارتوں کا کچھ سے کچھ ہو جانا رد مزہ کا مشاہدہ ہے۔ کتابت اور طباعت کے مرحلوں سے نکل آنے کے بعد بھی پڑھنے والوں کی نگاہیں کیا لغزشوں سے بالکل محفوظ ہیں ؟ خصوصاً عربی زبان کی عبارات اور پھر بالخصوص اس زمانے کی عبارات

جب عربی زبان نقاط سے محروم تھی اس زبان کی عبارات میں تو اردو بھی زیادہ مذکورہ بالا قسم کی غلطیوں کے امکانات ہیں آج بھی جب کہ عربی زبان نقطوں سے مزین ہے غیبی کو غیبی پڑھنے والے اور یزاق کو یزاق سمجھنے والے آپ کو بہت مل جائیں گے غرض کسی چیز کا تحریر میں آجانا اس کے محفوظ ہو جانے کی ضمانت نہیں بن سکتا اس لیے کتابت تحریر اور تدریس جیسے الفاظ کی رٹ لگائے جانا بالکل بے سود ہے۔ منکرین حدیث احادیث کے زبانی حفظ کے بارے میں جس تذکرہ کو شک و شبہات کا اظہار کرتے ہیں اس سے کہیں زیادہ شک و شبہات کا اظہار کتابت اور تحریر کے بارے میں بھی کیا جاسکتا ہے۔ اس لیے جانچنے پر کھنے والی بات یہ نہیں کہ احادیث قید تحریر میں کب آئیں بلکہ دیکھنے اور غور کرنے والی بات یہ ہے کہ احادیث ہم تک کن ذرائع سے پہنچیں اور وہ ذرائع محفوظ تھے یا غیر محفوظ۔

احادیث زبانی حفظ و یادداشت کے ذریعے سے محفوظ کی گئی ہوں یا کتابت و تحریر کے واسطے سے دیکھنا یہ ہے کہ حصول اثنار کے لیے جس حزم و احتیاط کی ضرورت تھی اس کا پورا پورا خیال رکھا گیا ہے یا نہیں اگر جواب اثبات میں ہے تو حفاظت حدیث پر شک کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ حفاظت حدیث کے سلسلے میں ابتداء ہی سے اگرچہ حفظ اور کتابت دونوں سے کام لیا گیا ہے لیکن اگر صرف حفظ سے ہی کام لیا گیا ہوتا جیسا کہ منکرین حدیث کہتے ہیں اور یہ ثابت ہو جائے کہ حفظ سے متعلق بعض قدر ذمہ داریاں ضروری ہیں وہ باحسن و بوجہ پوری کی گئی ہیں اور کسی بھی قسم کی امکانی غفلت اور لاپرواہی سے کام نہیں لیا گیا تو ہر صاحب عقل حدیث کو محفوظ ماننے پر مجبور ہو گا۔

منکرین حدیث جب احادیث کی تدوین کا دو سو سال بعد و قوت میں آنے کا ذکر کرتے ہیں تو ان کی گفتگو کا انداز کچھ اس قسم کا ہوتا ہے جیسے کہنا چاہتے ہوں کہ دو سو سال تک احادیث کا ذخیرہ قمر گامی میں پڑا رہا اس سے پہلے حفاظت حدیث کی کوئی صورت نہ تھی احادیث کا کوئی چمچانہ تھا۔ دو سو سال بعد یک بیک کچھ لوگوں کے ذہن میں آیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آج سے دو سو سال پہلے جو کچھ کہا تھا اچھو کچھ کیا تھا وہ لکھ لیا جائے چنانچہ لکھ لیا گیا اور پھر اسی بنیاد پر بڑے محصورانہ انداز میں سادہ لوح مسلمانوں سے سوال کیے گئے ہیں آپ

خود ہی بتائیے دو سو سال بعد کس کو یاد رہتا ہے کہ رسول خدا نے کیا کہا تھا اور کیا نہیں کہا تھا، کوئی کام کس طرح انجام دیا تھا اور کس طرح نہیں اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ صور حال اس کے بالکل برعکس تھی کتابت کے علاوہ احادیث کو حفظ کرنے کا اہتمام بھی کیا گیا تھا تو وہ حفظ کے ذریعے کو کمزور ترین ذریعہ ثابت کرنے اور زبان ی یادداشت کے واسطے کو سب سے زیادہ ناقابل اعتبار واسطہ قرار دینے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگانا شروع کر دیتے ہیں۔

**قوتِ حافظہ** کیا حفظ کا ذریعہ واقعی کمزور ترین ذریعہ ہے کیا انسان کا قوتِ حافظہ واقعی اعتبار کے قابل نہیں؟ انسان کی قوتِ بینائی پر اعتماد کیا جاسکتا ہے قوتِ شنوائی بھروسے کے قابل ہے تو کیا وجہ ہے قوتِ حافظہ ہی کیوں اعتماد کا حامل نہیں۔

دیکھنے میں آنکھوں پر یقین ہے سننے میں کانوں پر بھروسہ ہے سو نیکھنے میں ناکوں پر اعتماد ہے چکھنے میں زبانیں سچی ہیں تو ساری بدگمانیاں ایک یادداشت اور قوتِ حافظہ ہی کے حصے میں کیوں آئی ہیں۔ ان بدگمانیوں کی آخر دلیل کیا ہے؟ انسان کی قوتِ حافظہ کے بارے میں کم از کم امت مسلمہ کا تو تجربہ و مشاہدہ یہ ہے کہ دیگر انسانی قوتوں کے مقابلے میں اس کو بدترین حاصل ہے ایک سات آٹھ سال کا بچہ تقریباً سات آٹھ سو صفحات پر مشتمل کتاب قرآن کریم کو اس طرح حفظ کر لیتا ہے کہ زبردستی پیش تک کی غلطی بھی باقی نہیں چھوڑتا اس کا ذہن قرآن کے اوراق اور صفحات کی حدود تک محفوظ کر لیتا ہے وہ آپ کو یہ تک بتلا سکتا ہے کہ کونسی آیت قرآن کریم میں صفحے کے وسط میں ہے ابجد میں ہے آخر میں ہے یا آگے پیچھے ہے کس لفظ پر قرآن کریم کا صفحہ ختم ہو جاتا ہے اور کس لفظ پر ورق کھلتا ہے۔ اس کو یہ بھی پتہ ہے کہ قرآن کریم میں کونسا لفظ کس طرح لکھا ہے اس میں کونسا حرف صرف تحریر میں آیا ہے مگر پڑھا نہیں جاتا۔ یہ تمام تفصیلات ایک سات آٹھ سال کے بچے نے اپنی قوتِ حافظہ ہی سے کام لے کر اپنے ذہن میں محفوظ کی ہیں اس کے باوجود قوتِ حافظہ بدگمانیوں کا نشانہ ہے! آخر کیوں؟ شاید کہا جائے کہ قرآن کے حفظ میں تائید الہی شامل ہے تو ہمارا تو دعویٰ ہے کہ حفظ حدیث میں بھی تائید الہی شامل ہے اور ہم اس کو سابقہ گفتگو میں دلائل کے ساتھ ثابت کر چکے ہیں۔

بہر حال ہماری سمجھ سے یہ بات بالاتر ہے کہ انسان کی قوتِ حافظہ کے بارے میں اس قدر

بدگمانی سے کام کیوں لیا جائے کہ جو چیز چند روز کے لیے اس کے پُسر ہو جائے وہ ہر قسم کے اعتماد سے محروم ہو جائے۔ منکرین حدیث شاید یہ خیال کرتے ہیں کہ ابتدائیں حدیث کو باقاعدہ حفظ کرنے کا کوئی اہتمام نہ تھا متفرق طور پر متفرق صحابیوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ سنایا کچھ کرتے ہوئے دیکھا تھا بس کبھی کبھی ضرورت پڑنے پر وہ اس کو بیان کر دیا کرتے تھے یا کبھی فرصت کے وقت میں بیٹھ کر دل بہلانے کے لیے ایک دوسرے سے اسی کا تذکرہ کر لیا کرتے تھے جیسے عام دستور ہے کہ گھر کے پُرانے برٹے بوڑھے اپنے عہد جوانی کے قصے گرمی بزم کے لیے بیان کیا کرتے ہیں۔ منکرین حدیث سمجھتے ہیں کہ حدیث کی ابتدا الیٰذا باللہ کچھ اسی طرح پر ہوئی مستقل علم کی حیثیت اسے بعد کو حاصل ہوئی۔

**حفظ حدیث کا اہتمام** | حدیث کے بارے میں منکرین حدیث کا یہ خیال ایک شیطانی دوسوہ سے زیادہ کچھ نہیں۔ قرآن کے ساتھ حدیث کا لانا

تعلق جو گذشتہ اوراق میں ثابت کیا جا چکا ہے اس کے بعد کوئی احمق ہی یہ سوچ سکتا ہے کہ احادیث نبوی صحابہ کے لیے اس قدر غیر اہم ہو سکتی ہیں کہ گزر رہے ہوئے عہد کے قصوں سے زیادہ ان کی کوئی حیثیت نہ ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ ابتدا ہی سے قرآن کے ساتھ ساتھ حدیث کو بھی حفظ کرنے کا پورا پورا اہتمام تھا اصحاب صفہ کے نام سے کون واقف نہیں بے چاروں کا اس کے سوا کوئی کام نہ تھا کہ دن رات مسجد نبوی میں پڑے قرآن اور حدیث حفظ کرتے تھے۔ صفہ محض ایک جھوڑا ہی نہ تھا ایک باضابطہ مدرسہ اور ایک باقاعدہ تعلیم گاہ تھی جس میں طلبہ کی تعداد ایک ایک وقت میں اسی اسی تک جا پہنچتی تھی اس مدرسہ میں کن کن باتوں کی باقاعدہ تعلیم دی جاتی تھی احادیث میں اس کا تفصیلی ذکر موجود ہے وہاں قرآن کی تعلیم کے ساتھ ساتھ فرائض اسلام اور قوانین شریعت بھی پڑھائے اور سکھائے جاتے تھے گویا قرآن اور سنت دونوں کی تعلیم دی جاتی تھی۔ فروہ بن بلیک جو یمن سے مدینہ منورہ آئے تھے وہ بھی اس مدرسہ کے طالب علم تھے ان کے ذکر میں ابن سعد کے یہ الفاظ ہیں:

جَازٍ مِنَ الْيَمَنِ وَتَعَلَّمَ الْقُرْآنَ  
وَقَالَ بِالنِّسْبِ الْإِسْلَامَ وَشَرَّ الْعَمَلِ

یمن سے آئے اور قرآن (کے ساتھ ساتھ) اسلام کے  
فرائض اور قوانین شریعت کی تعلیم حاصل کی۔



یہ وہی فردہ بن ملیک ہیں جن کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے یمن کے قبائل ہر از بید اور ندج کا گورنر بنا کر بھیجا گیا تھا۔ اس صفہ بنوی کے مدرسے میں فردہ جیسے نہ جلنے کتنے شاگرد تھے جن کو تعلیم دینے کا کام ابو ہریرۃ، ابن مسعود، زید بن ثابت اور ابی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہم جیسے جلیل القدر صحابہ انجام دیتے تھے اور یہ تعلیم حفظ قرآن اور حفظ حدیث کے علاوہ اور کیا تھی؟

یہ حفظ حدیث ہی کا تو اہتمام تھا جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور ایک انصاری صحابی کے درمیان اس معاہدے کا متقاضی ہوا جس کی رو سے بارگاہ بنوی میں حاضری کے لیے ان دروں کے درمیان باری مقرر تھی کہ ایک روز حضرت عمر حاضر رہتے اور انصاری بھائی اپنی مشغولیتوں کی دیکھ بھال کرتے اور ایک روز انصاری صحابی حاضری دیتے تاکہ حضرت عمر اپنے کاروبار کی ذمہ داریاں نبھاسکیں۔ اور ہر روز حاضر رہنے والا اپنے غائب رفیق کو وہ سب کچھ من و عن سناتا جو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے سنتا یا آپ کو کرتے دیکھتا بخاری میں خود حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔

میں اور میرا ایک انصاری پڑوسی ہم دونوں امیہ بن زید والوں کی بستی میں رہتے تھے جو مدینہ کے عوالی کی بستیوں میں سے ہے ہم دونوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں باری باری سے حاضری دیتے تھے ایک دن وہ حاضر ہوتے ایک دن میں حاضر ہوتا جس دن حاضر ہوتا اس دن کے حالات اور خبریں وحی و غیرہ کی ان کو سناتا اور جب وہ حاضر ہوتے تو وہ بھی یہی کرتے۔

كُنْتُ اَنَا وَجَارِيٍّ مِنَ الْأَنْصَارِ فِي بَيْتِي  
أُمِّيَّةَ بْنِ زَيْدٍ وَهِيَ مِنْ عَوَالِي الْمَدِينَةِ  
وَكُنَّا نَتَنَاقَشُ النَّبْلَ عَلَى رَسُولِ اللَّهِ  
صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَنْزِلُ يَوْمًا وَانْزِلَ يَوْمًا  
فَإِذَا نَزَلَتْ جِئْتُهُ نَجْعُ خِلَاكِ الْيَوْمِ مِنَ  
الْوَسْطَى وَغَيْرِهِ وَإِذَا نَزَلَ فَعَلَّ مِثْلَ ذَلِكَ۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ

ہم تم سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جو کچھ بیان کرتے ہیں سب کچھ آپ ہی سے ہم نے نہیں سنا ہے بلکہ ہم میں بعضوں نے بعض سے بھی سنا ہے۔

مَا أَكَلْنَا مَخْدُومًا مِنْكُمْ بِهٍ سَمِعْنَاهُ مِنْ رَسُولِ  
اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَلَكِنْ كَانَ يَحْدِثُ  
بَعْضُنَا بَعْضًا (متدرک للحاکم)

حضرت انس رضی اللہ عنہ حفظ حدیث کی کیفیت بیان کرتے ہوئے فرماتے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم

جب مجلس سے اٹھ جاتے تو ہم صحابہ آپس میں مل کر بیٹھ جاتے اور جو کچھ آپ نے ارشاد فرمایا ہوتا اسے بار بار دہراتے بعض مرتبہ صحابہ کا یہ اجتماع ساٹھ ساٹھ صحابہ پر مشتمل ہوتا۔  
مجمع الزوائد میں حضرت انس ہی سے یہ روایت موجود ہے۔ فرماتے ہیں :

ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھتے تھے تو اکثر (درس میں) ساٹھ ساٹھ آدمی ہوتے اور جب آپ تشریف لے جاتے تو ہم احادیث کو بار بار دہراتے اور جب ہم اٹھتے تو ہم کو حدیثیں ایسی یاد ہوتیں جیسے انہیں ہماری دلوں میں بودیا گیا ہو۔

كُنَّا نَعُوذُ اَمَامَ النَّبِيِّ فَعَسَىٰ اَنْ يَكُوْنَ سِتِيْن  
رَجُلًا فَيُحَدِّثُنَا الْحَدِيْثَ ثُمَّ يَدْخُلُ لِحَاجَتِهِ  
فَنُزَاجِعُهُ بَيْنَنَا هَذَا ثُمَّ هَذَا فَنَقُوْمُ  
كَأَنَّمَا زَرَعَ فِيْ قُلُوْبِنَا  
(مجمع الزوائد جلد ۱)

یہ سب کچھ حفظ حدیث ہی کا نوا ہنمام تھا۔  
نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عام گفتگو کے بارے میں یہ عام عادت جو بے ان کی جاتی ہے کہ اَشَدَّ كَانَ اِذَا تَكَلَّمَ بِكَلِمَةٍ اَعَادَهَا ثَلَاثًا (جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کوئی بات دہراتے تو اس کو تین دفعہ دہراتے۔ بخاری) تو غالباً اس میں بھی زیادہ تر دخل اسی مقصد کو تھا کہ سننے والے کو ذہن نشین ہو جائے۔ آثار صحابہ میں متعدد اقوال اس بات کے شاہد ہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجماعاً قرآن ہی کی طرح حدیث کو بھی حفظ کرنا ضروری سمجھتے تھے  
حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے شاگردوں سے فرمایا کرتے

اَكْثَرُ وَاِذَا كُنَّا فِي الْحَدِيْثِ فَاتَّكِمْنَا اَلَمْ  
تَفْعَلُوْا يَدْرُسُ عِلْمُكُمْ (جامع بیان العلم)

حدیث کو بار بار دہراتے رہو اگر ایسا نہ کرو گے تو تمہارا علم فرسودہ ہو کر مٹ جائے گا۔

اسی طرح مغربہ علوم الحدیث میں حاکم نے حضرت عبداللہ بن مسعود کا یہ قول نقل کیا ہے کہ وہ فرمایا کرتے :

تَذَاكُرُوْا الْحَدِيْثَ فَاِنَّ حَيَاتَهُ  
مِثْلَ اَكْبَرَتِهِ

بار بار حدیث کو دہراتے رہو کیونکہ اس کے زندہ رکھنے کی یہی شکل ہے۔

حضرت علی اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما ہی نہیں اکثر صحابہ سے یہ منقول ہے کہ وہ ان لوگوں سے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں ان سے سننے آیا کرتے تھے یہ کہا کرتے تھے ۔

تمہارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہم لوگوں سے حدیثیں بیان کرتے تھے اور ہم ان کو زبانی یاد کر لیتے تھے پس تم لوگ بھی اسی طرح حفظ کیا کرو جس طرح ہم کرتے تھے۔

إِنَّ نَبِيَّكُمْ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يُحَدِّثُنَا فَنَحْفَظُ فَاَحْفَظُوا كَمَا كُنَّا نَحْفَظُ (جامع بیان العلم)

حضرت ابو ہریرہ فرمایا کرتے تھے کہ میں جتنا عرصہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں رہا مجھے احادیث حفظ کرنے سے زیادہ کوئی کام پسند نہ تھا۔ آپ نے حفظ حدیث کی خاطر رات کے اوقات کو تقسیم کیا ہوا تھا خود بتلایا کرتے کہ میں رات کے تین حصے کر لیتا ایک میں سو جاتا ایک میں نماز پڑھتا اور ایک میں احادیث کو یاد کرتا۔

حقیقت یہی ہے کہ صحابہ کرام قرآن ہی کی طرح حدیث کو بھی حفظ کرتے تھے۔ اس زمانے میں جس طرح قرآن کریم کو حفظ کرنے کا رواج تھا اسی طرح حدیث کو بھی حفظ کرنے کا رواج تھا۔ اگر حفظ کرنے کی بنیاد پر قرآن کریم قابل اعتماد ہے تو یقیناً حدیث بھی اسی بنیاد پر قابل اعتماد ہے۔ قرآن کریم بھی انہی صحابہ نے حفظ کیا اور ہم تک پہنچا یا اور ہم سب کے لیے قابل اعتماد بھڑا احادیث کے حفظ کرنے والے بھی یہی صحابہ تھے انہوں نے ہی احادیث کو باقاعدہ حفظ کیا اور ہم تک پہنچایا سمجھ میں نہیں آتا پھر یہ احادیث ناقابل اعتماد کیسے بن گئیں۔ قرآن کریم کو جو تقریباً سات لاکھ سو صفحات پر مشتمل ہے محفوظ ماننے کے لیے اگر قوتِ حافظہ پر بھروسہ کیا جاسکتا ہے تو ذخیرہ حدیث کو محفوظ ماننے کے لیے اس قوت پر بھروسہ کیوں نہیں کیا جاسکتا جبکہ احادیث کا مجموعہ اگر مکرر نکال دی جائے قرآن کریم کی ضخامت سے کم ہی ضخیم ہو گا۔ احادیث کے بارے میں لاکھوں کی تعداد کا ذکر متابعات و شواہد اور اسناد و طرق کے اختلاف کی بنا پر ہوتا ہے ورنہ اس سے قطع نظر اگر تمام قسم کی احادیث جمع کی جائیں تو پچاس ہزار سے ان کی تعداد آگے نہیں بڑھتی۔ یہ بھی اس وقت ہے جبکہ صحیح حسن غریب ہر قسم کی احادیث کو شامل کیا جائے اور اگر صرف صحیح احادیث پر اکتفا کیا جائے تو تمام احادیث دس ہزار سے زیادہ نہیں بنتیں۔ بہر حال پچاس ہزار بھی ہوں تب بھی ان کا مجموعہ قرآن کریم سے کم ہی ضخامت پر مشتمل ہو گا اگر قرآن کریم حفظ ہو سکتا

ہے اور اس طرح ہو سکتا ہے کہ ایک سات آٹھ سال کا بچہ الحمد سے لے کر انسان تک فر فر سنا تا چلا جاتا ہے تو احادیث کیوں حفظ نہیں ہو سکتیں :-

**تقاضائے محبت** | غرض اس امر میں کوئی شبہ نہیں کہ ابتدا ہی سے قرآن کی طرح حدیث کے حفظ کرنے کا بھی اہتمام تھا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین نبی کریم صلی اللہ

علیہ وسلم کی زبان مبارک سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ زبانی رکھ لیتے آپ کا ہر قول ہر فعل اور ہر عمل صحابہ کرام کے دلوں پر نقش ہو جاتا تھا اور کیسے نہ ہوتا صحابہ کرام سچ نبوی کے پروانے تھے۔

انسان جس ہستی سے محبت کرتا ہے اس کی ایک ایک ادا اس کی آنکھوں میں روح جاتی ہے اس کی ایک ایک بات اس کے دل کی دھڑکن بن جاتی ہے۔ محبوب کی زبان سے نکلے ہوئے ہر لفظ کو

وہ ہر وقت کا وظیفہ بنا لیتا ہے ہر ایک کے سامنے فخریہ کتاب تیار ہے میرے محبوب نے یہ کہا اور میرے پیارے نے یہ کیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس صحابہ کرام کے لیے محبوب سے کہیں

بڑھ کر تھی وہ اہتمام نہ بھی کرتے تب بھی ارشادات نبوی کا نور بخود ان کو اندر بردہ ہو جانا فطری بات تھی یہ تشبیہ و استعارے کی بات نہیں حقیقت کا اظہار ہے کہ صحابہ کرام نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے

پروانے تھے وہ اپنے ماں باپ بھائی بہن بیوی بچوں بلکہ اپنی جانوں سے بھی زیادہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی زندگی کو عزیز رکھتے تھے وہ اپنی جان تو کیا اپنا سب کچھ آپ پر

ہمہ وقت قربان کرنے کے لیے تیار رہتے تھے ایسے محبت کرنے والوں کے بارے میں یہ خیال کرنا حماقت ہی ہے کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال کو محفوظ نہ رکھ سکے ہونگے۔

صحابہ کرام تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک ایک ادا کے دیوانے تھے وہ تو یہاں تک بھی یاد رکھتے تھے کہ کونسی بات آپ نے کس طرح کس ہیئت اور کس کیفیت کے ساتھ ارشاد

فرمائی تھی۔ اگر کہیں کوئی بات ارشاد فرماتے ہوئے آپ مسکرا پڑے ہیں تو صحابہ نے اس مسکراہٹ کو اس مخصوص ارشاد کا ایک لازمی حصہ بنا لیا جب کبھی وہ حدیث کسی کو سنائی اسی

طرح مسکرا کر سنائی جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مسکرائے تھے اور آئندہ آنے والے محدثین نے ایسی حدیث کو مسلسل بالضحک کا ایک مخصوص نام دے دیا۔ جو لوگ اصول حدیث

کے علم سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ ایسی تمام احادیث کہ جن میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی

خاص خاص کیفیات کو بھی ملحوظ رکھا گیا ہے اور ہمیشہ انہی کیفیات کے ساتھ ان کو نقل کرنے کا اہتمام کیا جاتا ہے مسلیات کہلاتی ہیں۔ انہی مسلیات میں سے ایک حدیث مسلسل بضرب النجذہ (ران پر ہاتھ مارنے کی کیفیت والی) ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ حدیث ارشاد فرماتے وقت اپنی ران مبارک پر ہاتھ مارا تھا اداؤں کو محفوظ رکھنے والوں نے یہ ادا بھی محفوظ کر لی۔

تباہیئے عشق و سرمستی میں سرشار ایسے لوگوں کے بارے میں یہ خیال کرنا کس قدر نادانی کی بات ہے کہ انہوں نے اپنے محبوب کے اقوال و افعال محفوظ نہ رکھے ہوں گے وہاں تو عالم یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے نکلے ہوئے ارشادات کے بارے میں سننے والے کو یہ بھی یاد ہے کہ اس نے سب سے پہلی بات کوئی سنی ہے اور پھر اس نے اپنی یہ عادت بنائی ہے کہ جب کسی کو احادیث نبوی سنانے کا موقع ملا ہے تو سب سے پہلے اسی حدیث کو بیان کیا ہے۔

اغراض انصافی کے متوالے عشق نبوی کے سوختہ سامانوں کا حال کیا جائیں اگر کہیں بطور عتاب بھی کوئی کلمہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے نکل گیا تو صحابہ نے اسے بھی نر زجاں بنایا ہے۔ ایک بار حضرت ابوذرؓ کے متعجبانہ دوبارہ و سہ بارہ کسی سوال کے جواب میں کہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اندراہ تبنیہ یہ فرمادیا کہ **وَإِنَّ مَرْغَمَهُ أَفْأَبَى ذَرِّیٰ یٰہُو** بات میں کہہ رہا ہوں وہ اسی طرح ہے خواہ ابوذر کی ناک خاک میں گر گئی جلتے تو حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کا حال یہ تھا کہ جب کبھی اس حدیث کو روایت کرے تو تبنیہ کا یہ فقرہ بھی خوب مزے لے لے کر نقل کرتے انصاف کی بات تو یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث ایسے لوگوں کو احادیث ثابدا نہ رہنا محال اور خلافت فطرت نہیں جیسا کہ متکبرین حایت کہتے ہیں بلکہ ایسے لوگوں کو احادیث ثابدا نہ رہنا محال اور خلافت فطرت ہے۔

یہاں لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ اپنے گھوڑوں تک کے شجرہ نسب یاد رکھتے ہوں جانوروں میں گھوڑا ان کو سب سے زیادہ محبوب تھا اور اپنی ہر محبوب چیز کی معمولی معمولی تفصیلات تک یاد رکھنے کے وہ عادی تھے ان کے بارے میں یہ بدگمانی رکھنا کہ انہوں نے اپنے

دلوں جہاں سے زیادہ محبوب آقا کے ارشادات یاد رکھنے میں تساہل یا کسی غفلت سے کام لیا ہوگا؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جن لوگوں میں مبعوث ہوئے ان کا عالم یہ تھا کہ جو شاعر انہیں پسند آجاتا اس کے قصائد وہ ازبکر کر لیتے ہزار ہزار اشعار پر مشتمل قصائد وہ بلا لکھان سنائے چلے جاتے بعثت نبوی کے بعد ان لوگوں کی تمام تر پسند کا محور اور ہمہ جہت محبت کا مرکز صرف اور صرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات تھی۔ یہ لوگ عشق نبوی میں خود کو فنا کر چکے تھے انہوں نے اپنی ذات کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں اس حد تک گم کر دیا تھا کہ اپنا اٹھنا بیٹھنا سونا جاگنا کھانا پینا ہنسا بولنا سب کچھ انہی کے رنگ میں رنگ لیا تھا وہ ہمہ تن محبوب کے مشاہدے میں محو تھے وہ سوتے کس طرح ہیں وہ جاگنے پر کیا غل کرتے ہیں وہ کھانا کھاتے رقت کس ہیئت پر پہنچتے ہیں وہ پانی کس طرح پیتے ہیں وہ اپنے اللہ کو کس طرح پکارتے ہیں وہ اللہ کے بندوں سے کس طرح مخاطب ہوتے ہیں راتوں کو ان کا کیا عالم ہوتا ہے دن ان کے کیسے گزرتے ہیں۔ صحابہ کو تلاش تھی تو انہی باتوں کی انہیں فکر تھی تو انہی عادات و اطوار پر اپنی زندگی کے ایک ایک لمحے کو ڈھال لینے کی۔ صحابہ کو ام اس شعر کی مجسم تصویر بنے ہوئے تھے۔

من تو شدم تو من شدم تو جاں شدم تا کس نگرید بعد ازیں من دیگرم تو دیگر  
ایسے لوگ جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے ایک ایک لمحے کی مخالفت کو جزا بنائے ہوئے تھے ان کے بارے میں کیسے یہ یقین کر لیا جائے کہ انہوں نے احادیث نبوی کی مخالفت میں کوئی اہتمام نہ کیا ہوگا۔ حب نبوی کا جو ثبوت صحابہ اپنی ایک ایک حرکت سے لوح ہماں پر نقش کر رہے تھے اس کی موجودگی میں کیونکر مان لیا جائے کہ انہوں نے اپنے محبوب کی باتوں کو بھلا دیا ہوگا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال فرما جانے کے بعد صحابہ کے اس واہانہ تعلق میں اور زیادہ شدت پیدا ہو گئی تھی عالم یہ تھا کہ وہ اپنے محبوب کا کوئی فعل کوئی قول بیان کرنے لگتے تو رو رو پر پڑتے، کانپتے جاتے اور حدیث نبوی نقل کرتے جاتے۔ حضرت عبداللہ ابن مسعود کے بارے میں دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ حدیث بیان کرنے کا موقع آتا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا نام مبارک زبان پر آتے ہی بدن پر کپکپی طاری

ہو جاتی -

اِرْتَعَدُوا مِنْ تَعَدَّتْ ثِيَابُهُ تَنْفَعُ اَوْ اَحْبَابًا | کا پیسے لگتے انکے کپڑوں میں تفرقہ پید ہو جاتی گردن کی  
اَعَزَّ حَمَاتٍ عَيْنَاهُ (مستدرک الحاکم) | رگیں پھول جاتیں آنکھیں آنسوؤں سے بہر جاتیں -

اندازہ کیجئے جس کا عشق نبوی میں یہ حال ہو وہ اپنے محبوب کی باتیں کرتے ہیں کس قدر احتیاط سے  
کام لیتا ہو گا ہم یہ یقین کرتے ہیں حق بجانب ہیں کہ ایسا شخص ایک ایک حرف کی حفاظت کرتا ہو گا  
اس میدان میں حضرت عبداللہ ابن مسعود اکیلے نہیں ہیں اکثر صحابہ کا یہی حال تھا کہ آنحضرت  
صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر مبارک کے وقت ان پر ایک خاص قسم کی کیفیت طاری ہو جاتی -  
حضرت ابوذر غفاریؓ کے بارے میں ہے کہ کبھی کوئی حدیث بیان کرنا چاہتے تو اکثر اوقات منہ  
سے اَوْصَانِي جُتِّي اَبُو الْقَاسِمِ اَوْصَانِي خَلِيلِي صلی اللہ علیہ وسلم (مجھے میرے محبوب نے وصیت  
کی مجھے میرے دوست صلی اللہ علیہ وسلم نے وصیت کی) کے الفاظ ہی نکل پاتے اور چیخ مار کر بیہوش ہو جاتے۔  
اسی قسم کے واقعات حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے ذکر میں بھی ملتے ہیں۔

مقصود صحابہ کرام کی محبت کے مظاہر بیان کرنا نہیں ہے بلکہ بتلانا یہ مقصود ہے کہ محبت  
اور عشاق کو اپنے محبوب کے ملفوظات اس کے حالات اور اس کی کیفیات کا یاد نہ رہنا محال اور  
خلاف فطرت ہے محبت اور پسند کا تعلق ہو تو بغیر کوشش کے دفتر کے دفتر یاد ہو جلتے ہیں -  
دوسروں جیسے بالکل قریب کی مثال لے لیجئے آج کل کے آزاد طبیعت اور عاشق مزاج نوجوانوں  
کا ذرا جائزہ لیجئے بے شمار عشقیہ اشعار ان کو یاد ہوتے ہیں نیاو لوں اور کہانیوں کے صفحے کے  
صفحے آپ ان سے فر فر سن لیجئے ہزلیات ایک بار ہی سننے پر ان کی زبانوں پر جاری ہو جاتی ہیں  
مگر یہی نوجوان فلسفہ و حساب وغیرہ کا ایک صفحہ بھی باوجود کوشش کے سارے دن میں یاد نہیں  
کر پاتے - کبھی آپ نے غور کیا آخر یہ فرق کیوں؟ صرف اس لیے کہ پہلی قسم کی چیزوں میں ان کے  
شوق اور ان کی رغبت کو دخل ہے جبکہ دوسری قسم کی چیزیں اس سے محروم ہیں بالکل اسی  
طرح حفظ حدیث میں چونکہ صحابہ کے شوق و رغبت کو دخل تھا اور حب نبوی کا جذبہ کار فرما تھا  
اس لیے فطری طور پر ان کے سینے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے ایک ایک لمحے کے  
ایمن بن گئے تھے ۔

**تقاضائے عظمت** | جس طرح محبت اس کی متقاضی ہوتی ہے کہ محبوب کی زبان سے  
 نکلا ہو ایک ایک لفظ و در زبان ہو جائے اور محبوب کی ہر ہر  
 ادا دل میں اتر کر رہ جائے اسی طرح ایک اور جذبہ ہے جو بعینہ اسی قسم کے طرز عمل کا طالب  
 ہے اور وہ ہے عظمت کا جذبہ جو ہستی عظمت کی حامل ہوتی ہے وہ اپنے ملنے والوں کیلئے فطری طور پر تابع و تقلید  
 بن جاتی ہے۔ اس کے ماننے والوں کے دل میں قدرتی طور پر یہ خواہش ہوتی ہے کہ اس کی  
 زبان سے نکلے ہوئے ہر لفظ کو وہ ہمہ تن گوش ہو کر سنیں اور دل کی تہوں میں محفوظ کر لیں۔ ملک  
 کا صدر یا وزیر اعظم اگر کسی سے کوئی بات کر لیتا ہے تو اس کی کمی ہوئی بات کا ایک ایک لفظ  
 دل میں اتر جاتا ہے۔ ریڈیو یا ٹیلی ویژن پر یا کسی عام پبلک جلسے میں کی ہوئی کسی بڑے آدمی  
 کی تقریروں کے اقتباسات لوگ انہی کے انداز میں دوہراتے پھرتے ہیں آج نلاں صاحب نے  
 یہ فرمایا اور یوں فرمایا صدر یا وزیر اعظم تو پھر ملک کی بہت بڑی ہستی ہیں کسی علاقے کا تھاندار  
 یا کوئی اور محولی حاکم ہی کسی سے دوچار باتیں تو جہ سے کر لیتا ہے تو وہ ان باتوں کو مزے مزے لیکر  
 پورے علاقے میں گانا پھرتا ہے غرض عظمت کی حامل ہستی بھی لوگوں کی توجہ کا مرکز بن جاتی ہے  
 اور اس کی تقلید کو باعث فخر سمجھا جانے لگتا ہے۔ اب آپ غور کیجئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے  
 زیادہ با عظمت کون ہو سکتا ہے خصوصاً صحابہ کے لیے صحابہ کے دلوں میں آپ کی عظمت کا عالم  
 یہ تھا کہ جب آپ کی مجلس میں ہوتے تو اس طرح سر جھکائے اور ساکت و صامت بیٹھتے کہ یوں لگتا  
 جیسے ان کے سروں پر پرندے بیٹھے ہوں بعض صحابہ خود اپنا حال بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں  
 كَانَ عَلَيَّ رُؤُوسُ الطَّيْرِ يَوْمَ مَعْلُومٍ هُوَ تَابِ جِيسَ هَمَارٍ بِسَ سُرُورٍ بِرِ پَرِندے بیٹھے ہوں کہ ذرا  
 ہلے تو اڑ جائیں گے یا یوں سمجھئے کہ اس قدر بے حس و حرکت کہ پرندے بھی جو اول تو آدمی کے  
 سایے سے ہی بھاگتے ہیں اور اگر کوئی حس و حرکت محسوس کر لیں تو پھر پٹھر ہی نہیں سکتے وہ  
 بھی اس وقت صحابہ سے متوحش نہیں ہوتے تھے کیونکہ شایدہ نبوی کی محویت ان کو بالکل حائد  
 بنا دیتی تھی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے صحابہ کو نظر اٹھانے کی ہمت نہیں ہوتی تھی ایسی  
 روایات موجود ہیں کہ کسی صحابی سے بعد کے لوگوں میں سے کسی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے  
 حلیہ مبارک کے بارے میں پوچھا تو جواب ملا یہ ہمت ہی کے ہتھی کہ ہرۃ مبارک کو نظر بھر کر



دیکھ سکے حکیمہ بیان ہو تو کیونکر ۔

عظمت کی یہ کیفیت تاریخ انسانی پیش کرنے سے قاصر ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دہن مبارک سے لعاب نکلتا ہے تو صحابہ بالحقوں میں سے کہ چہروں پر مل لیتے ہیں کھلی کرتے ہیں تو لوگ دوڑ پڑتے ہیں کہ کوئی چھینٹ ہو جو ہمارے چہروں پر پڑ جائے اور برکتوں سے مالا مال کر جائے۔ صلح حدیبیہ کے موقع پر عروہ بن مسعود ثقفی جو اس وقت تک مسلمان نہ ہوئے تھے اور کفار قریش کی جانب سے ناصد بن کر آئے تھے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے صحابہ کی تعظیم کا یہ عالم دیکھتے ہیں تو جا کر کفار قریش سے کہتے ہیں خدا کی قسم میں نے بڑے بڑے بادشاہوں کے دربار دیکھے ہیں مگر عظمت کا وہ عالم کہیں نہیں دیکھا جس کا مظاہرہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے دربار میں اصحاب محمد کی جانب سے دیکھنے میں آیا تم ایسے لوگوں کے مقابلے میں کبھی کامیاب نہ ہو گے۔ بخاری کے الفاظ میں عروہ بن مسعود ثقفی اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے کہتے ہیں :

لوگو خدا کی قسم بادشاہوں کے دربار میں بھی مجھے باریابی کا موقع ملا ہے قیصر کسری اور نجاشی (حبشہ) کے سامنے بھی حاضر ہوا ہوں خدا کی قسم میں نے کسی بادشاہ کو نہیں دیکھا کہ لوگ اس کی اتنی عزت کرتے ہوں جتنی محمد کے ساتھی محمد کی کرتے ہیں خدا کی قسم جب وہ بلیغ ہوتے ہیں تو وہ ان کے ساتھیوں میں سے کسی آدمی کے ہاتھ پر ہی گرتا ہے پھر وہ اپنے پھرے اور اپنے بدن پر اسے مل لیتا ہے اور وہ جب کسی بات کا انہیں حکم دیتے ہیں تو اسکی تعمیل میں وہ سب جھپٹ پڑتے ہیں اور جب (محمد) وضو کرتے ہیں تو اس وقت انکے وضو کے پانی پر وہ آپس میں الجھ پڑتے ہیں اور جب وہ (محمد) بات کرتے ہیں تو انکی آوازیں پست ہو جاتی ہیں وہ لوگ (محمد) کو انکی عظمت کی وجہ سے نگاہ بھر کر دیکھ نہیں سکتے۔

اَيُّ قَوْمٍ وَاللّٰهُ لَقَدْ وَفَّيْتُ عَلَى  
الْمُلُوكِ وَفُتِّ عَلَى قَيْصَرَ وَكِسْرَى  
وَالنَّجَاشِيِّ وَاللّٰهُ مَا رَأَيْتُ  
مِلْكًا قَطُّ يُعْظَمُهُ اَصْحَابُهُ فَا يَعْظَمُ  
اَصْحَابُ مُحَمَّدٍ مُحَمَّدًا وَاللّٰهُ اِنَّ  
تَنْحِيْمَ نَخَامَةِ الْاَرَقَمَتِ فِى  
كَفِّ رَجُلٍ مِنْهُمْ فَذَلِكَ بِهَا جَمَّةٌ  
وَجِلْدَةٌ وَاِذَا اَمَرَهُمْ ابْتَدَوْا  
اَمْرًا وَاِذَا تَوَضَّاءُ كَادُوْا لِقَتْلُوْنَ  
عَلٰى وَضُوعَةٍ وَاِذَا اَلَكَمَ  
خَفَضُوْا اَصْوَاتَهُمْ عِنْدَهُ وَمَا  
يَحْدِقُوْنَ اِلَيْهِ النَّظْرَ تَعْظِيْمًا لَهُ  
(بخاری)

ایک طرف صحابہ کرام کی جانب سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے توفیر و عزت اور تعظیم و عظمت کے یہ مظاہر ہیں اور دوسری طرف منکرین حدیث کا یہ مضحکہ خیز دعویٰ کہ احادیث کے بارے میں صحابہ کی یادداشت کا کیا اعتبار! حیرت ہوتی ہے کہ انکی عقلوں کو کیا ہوا۔ کہیں یہ نَحْمَدُ اللہَ عَلٰی تَوْلٰیہِہُمْ عَلٰی سَمْعِہُمْ وَ عَلٰی اَبْصَارِہُمْ غَشَاوۃٌ (اللہ نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے اور ان کی آنکھوں اور انکے کانوں پر پردے پڑے ہوئے ہیں) کے مصداق بن کر تو نہیں رہ گئے۔ جن لوگوں کا تعلق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس قسم کا ہو، آخر کچھ تو سوچنا چاہیے ان لوگوں نے حیات نبوی کے ایک ایک لمحے کی نگہداشت میں کس اہتمام کس انہماک اور کس توجہ سے کام لیا ہو گا۔ جن کے نزدیک ایک مومنے مبارک جو بظاہر بے جان چیز ہے دنیا و مافیہا سے زیادہ محبوب ہو ان کی نظر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حیاتِ جاوداں کے حامل اقوال و افعال کی کیا قیمت ہوگی۔ خادمِ رسول حضرت انس رضی اللہ عنہ کی والدہ کو آپ کا ایک مومنے مبارک ہاتھ آگیا تھا وہ اس مومنے مبارک کو اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتی تھیں۔ انہوں نے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا پسینہ مبارک بھی محفوظ کیا ہوا تھا اور اس کو خوشبو کے طور پر استعمال کرتی تھیں۔ حضرت امیر معاویہ کے پاس بھی چند مومنے مبارک محفوظ تھے جن کے بارے میں انہوں نے اپنی وفات کے وقت وصیت کی کہ میرے مزارِ ارناک میں بھر دیے جائیں۔

غور کا مقام ہے جس ہستی کو عظمت کا یہ مقام عالی حاصل ہو اس کی ایک ایک بات ایک ایک ادا اپنے ماننے والوں کے دل و دماغ کو قدرتی طور پر کس قدر متاثر کرتی ہوگی؟ ان کی قوتِ حافظہ میں اس ہستی کی زندگی کا ایک ایک لمحہ نقش فی الحجر ہو کر رہ جاتا ہوگا؟ اس کی ذات سے متعلق ہر ہر تفصیل ان لوگوں کی ارواح کے لیے غذا کا کام نہ دیتی ہوگی؟ غرض محبت اور عظمت یہ دونوں جذبے اس کے متقاضی ہیں کہ جس ہستی کی طرف بھی ان کی نسبت ہو وہ ہستی خود بخود قطری طور پر ہمہ جہتی توجہ کا مرکز بن جاتی ہے اور اس کا ہر قول،

ہر فعل اور ہر عمل اس قدر اہم ہو جاتا ہے کہ دیکھنے اور سُنے والوں کے ذہنوں میں جاگزیں ہو کر رہ جاتا ہے اس طرح کہ عمر بھر یادداشت کے اوراق پر اس کے نقوش تازہ ہی محسوس ہوتے ہیں۔ لہذا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے صحابہ کرام کی محبت و عظمت کے ان مظاہر کی موجودگی میں جو مشقتِ نمونہ از خروارے کے طور پر ابھی آپ کی نظروں سے گزرے ہیں اس حقیقت کا اعتراف کیے بغیر چارہ نہیں کہ اللہ کے رسول کا ہر قول ہر فعل اور ہر عمل صحابہ کرام کے ذہنوں میں واقعی اس طرح جاگزیں تھا کہ ہمیشہ اس کے نقوش تازہ ہی نظر آتے تھے۔

**صحابہ کی غیر معمولی قوتِ حافظہ** | دراصل محبت اور عظمت کا تعلق ہی ایسا ہے کہ اس کے تقاضوں کو یاد رکھنے کے لیے کسی اضافی کوشش

کی ضرورت نہیں ہوتی اس کے متوالے ضعیف الحافظ بھی ہوں تو قوی الحافظ ہو جاتے ہیں اور صحابہ کو تو اللہ تعالیٰ نے خصوصیت سے اس نعمت کا وافر حصہ عطا فرمایا تھا حضرت جسد اللہ ابن عباس کے متعلق مشہور ہے کہ طویل طویل قصائد صرف ایک بار سن لیتے سے یاد ہو جاتے تھے ایک مرتبہ عرب کا مشہور شاعر عمر بن ابی ربیعہ ان کے پاس آیا اور اپنا ایک طویل قصیدہ جو ستر اشعار پر مشتمل تھا سنا گیا اس کے جانے کے بعد حاضرین مجلس کے درمیان اس کے ایک شعر کے بارے میں گفتگو چلی حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ شاعر نے اسی مصرعے کو اس طرح پڑھا تھا مخاطب نے تجھے پوچھا کہ کیا پہلی دفعہ میں ہی آپ کو پورا مصرعہ صحیح یاد رہ گیا؟ آپ نے جواب دیا کیوں نہیں؟ کہو تو پورا قصیدہ سنا دوں چنانچہ ستر کے ستر اشعار من وعن اسی ترتیب سے سنا دیے جس ترتیب سے عمر بن ربیعہ سنا کر گیا تھا۔ اسی طرح حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے بارے میں ہے کہ ایک ایک دفعہ میں کسی شاعر کے قصیدے کے ساتھ ساتھ ستر ستر بلکہ سو سو اشعار بر جستہ سناتی چلی جاتی تھیں۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ جن سے بہت زیادہ احادیث مروی ہیں بے پناہ حافظے کے مالک تھے۔ امام بخاریؒ نے کتاب الکئی میں ان کے حافظے سے متعلق ایک عجیب واقعہ نقل کیا ہے ایک مرتبہ مروان بن حکم حاکم دمشق نے حضرت ابو ہریرہ کے حافظے کا امتحان کرنا چاہا چنانچہ اس نے آپ کو اپنے دربار میں طلب کیا۔ ان کے آنے سے پہلے اپنے کاتب ابو لؤز عزمہ

کو ایک پردے کے پیچھے چھپا کر بٹھا دیا اور حکم دیا کہ میرے پوچھنے پر سو حدیثیں ابوہریرہ بیان کرتے جائیں ان کو تم لکھتے جانا غرض حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے تشریف لانے پر مروان مختلف باتیں چھیڑ چھیڑ کر آپ سے احادیث پوچھتا جاتا اور آپ بیان کرتے جاتے ادھر پردے کے پیچھے بیٹھا ابوالزغہ ان احادیث کو لفظ بہ لفظ نقل کرتا جاتا۔ اس طرح خاصی تعداد احادیث کی قلم بند کر لی گئی اور حضرت ابوہریرہ کو بہتہ بھی نہ لگا۔ سال بھر کے بعد مروان نے حضرت ابوہریرہ کو دوبارہ طلب کیا اور ابوالزغہ کو حسب سابق پھر پردے کے پیچھے بٹھا دیا۔ سابلہ لکھی ہوئی احادیث کا مجموعہ اس کے ہاتھ میں دیتے ہوئے مروان نے ابوالزغہ سے کہا میں وہی حدیثیں دوبارہ حضرت ابوہریرہ سے پوچھتا جاؤں گا تم اس مجموعہ سے مقابلہ کرتے جانا۔ چنانچہ پروگرام کے مطابق اس امتحان کی پوری کارروائی عمل میں لائی گئی۔ نتیجہ کیا نکلا؟ سنئے۔ خود ابوالزغہ کا بیان ہے :

<p>(مروان) حضرت ابوہریرہ سے پوچھتا جاتا اور میں کتاب میں دیکھتا جاتا پس (ابوہریرہ) نے نہ کسی لفظ کا اضافہ کیا اور نہ کسی کی ۔</p>	<p>فَجَعَلَ لِي سَأَلَهُ وَأَنَا الظَّرْفُ الْكَتَابِ فَاسْرَادٌ وَلَا نَقْصٌ (کتاب الکئی بخاری ص ۳۳)۔</p>
---	--

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے حافظے کی قوت کا یہ عالم فی الحقیقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا زندہ معجزہ تھا یہ وہی ابوہریرہ ہیں جن کو باوجود کوشش کے احادیث یاد نہ ہوتی تھیں مگر ایک بار بڑی حسرت کے ساتھ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اپنی اس کمزوری کی شکایت کی۔ آپ نے فرمایا اپنی چادر پھیلاؤ حضرت ابوہریرہ نے حکم کی تعمیل کی آپ نے اپنے خالی ہاتھوں کو لپ بنا کر ان کی چادر میں ڈال دیا پھر فرمایا کہ چادر سمیٹ لو حضرت ابوہریرہ فرماتے ہیں :

<p>چنانچہ میں نے (چادر کو) سمیٹ لیا پھر اس کے بعد میں کچھ نہیں بولا۔</p>	<p>فَضَمَمْتُهَا فَمَا نَسِيتُ شَيْئًا (بخاری۔ حفظ العلم)</p>
--	---

اور آثار اس پر شاہد ہیں کہ اس واقعہ کے بعد واقعی حضرت ابو ہریرہؓ کا حافظہ اس قدر قوی ہو گیا تھا کہ کسی بات کو ایک بار سُن لینے کے بعد پھر کبھی نہ بھولتے تھے۔ حفظ حدیث کے سلسلے میں تو دراصل قوتِ حافظہ کے جتنے حیرت انگیز مظاہر تاریخ کے اوراق میں ثبت ہیں وہ سب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زندہ معجزے ہیں وہ سب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاؤں کی تاثیر ہی کا زندہ ثبوت ہیں۔ حدیث کو یاد کرنے والوں کے لیے آپؐ کی دعا کے الفاظ ہیں :

ترجمہ: اے اللہ اس بندے کو جس نے میری بات سنی پھر اسے یاد رکھا اور جس نے نہیں سنا ہے اس تک اسے پہنچا دیا۔

نَصَرَ اللّٰهُ عَبْدًا سَمِعَ مَقَالَتِي فَوَعَاَهَا  
ثُمَّ اَدَّاهَا لِي مِنْ لَدُنِّي سَمِعَهَا (صحاح)

کبھی آپؐ فرماتے

اللہ اس بندے پر رحم فرمائے جس نے میری حدیث سنی اور یاد کر لی۔

رَحِمَ اللّٰهُ امْرَأَةً سَمِعَتْ حَدِيثًا  
تَحْفِظُهُ۔ (ابوداؤد۔ فضل نشر العلم۔)

حفظ حدیث کے سلسلے میں صحابہ کی قوتِ حافظہ کے حیرت انگیز مظاہر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی انہی دعاؤں کا طفیل سمجھے یا یوں کہیے کہ یہ تمام مظاہر قرآنی وعدے اَنَّا لَ لِحَافِظُوْنَ کی عملی تفسیر تھے۔ اللہ تعالیٰ نے حفاظتِ حدیث کے لیے کیے ہوئے وعدے کو پورا کرنے کے جو ظاہری اسباب پیدا فرمائے تھے ان میں سے ایک یہ حافظے کی غیر معمولی قوت تھی جو صحابہ اور بعد کے آنے والے راویانِ حدیث کو از غیب عطا کر دی گئی تھی :

**قوتِ حافظہ اور عرب** | اگرچہ محبت کا جذبہ، عظمت کا تعلق، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاؤں کی تاثیر اور تائیدِ الہیہ ان میں سے

ہر ایک بجائے خود حفظ حدیث کے سلسلے میں ایک قوی ضمانت ہے تاہم ان پر اس تاثیر کی حقیقت کا اور اضافہ کر دیجئے کہ عرب کے باشندے تدریجی طور پر قوی الحافظہ واقع ہوئے تھے، ان کے شعراء خطباء اور رواۃ بے پناہ قوتِ حافظہ کے مالک ہوتے

تھے ؟ ان کو ہزاروں اشعار سینکڑوں ضرب الامثال اور بے شمار واقعات از پرہوتے تھے۔ مختلف لوگوں اور مختلف قبیلوں کے شجرہ ہائے نسب کو محفوظ رکھنا ان کا معمول تھا جانوروں تک کے نسب نامے وہ یاد رکھتے تھے۔ قصہ گوئی کو ان کے یہاں باقاعدہ فن کا درجہ حاصل تھا ان میں ایسے لوگ بھی تھے جو اس تدریس صریح الحفظ تھے کہ صرف ایک بار سن کر لمبے لمبے قصائد یاد کر لیتے تھے۔ حافظ ابن عبد البر کے الفاظ ہیں :

كَانَ أَحَدُهُمْ يَحْفَظُ اشْعَارَ بَعْضٍ فِي سَمْعَةٍ وَاحِدَةٍ (جامع بیان العلم) | ان میں سے بعض لوگ صرف ایک دفعہ سن کر لوگوں کے اشعار یاد کر لیا کرتے تھے۔

عرب باشندوں میں قوت حافظہ اس قدر نمایاں تھی کہ آج تاریخی طور پر یہ بات مسلم سمجھی جاتی ہے کہ إِنَّ الْحَرَبَ قَدْ خُصَّتْ بِالْحِفْظِ (عرب حافظہ کے معاملے میں خصوصیت کے حامل تھے) حافظ ابن عبد البر بھی عربوں کی اس تاریخی خصوصیت کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

مَذْهَبُ الْعَرَبِ الْقَدِيمُ كَانُوا مَطْبُوعِينَ عَلَى الْحِفْظِ فَخُصَّوْهُمْ بِذَلِكَ (جامع بیان العلم) | عرب کا عام طریقہ تھا کہ حفظ کے وہ عادی ہو گئے تھے اس بات میں انہیں ایک خاص خصوصیت حاصل تھی۔

عربوں کو اپنی اس خصوصیت پر فخر بھی تھا انہیں اپنی قوت حافظہ پر اس قدر اعتماد تھا کہ لکھ کر یاد کرنے تک کو وہ ایک نقص خیال کرتے تھے۔ کتابی علم کو وہ علم ہی نہ سمجھتے تھے ان کے یہاں یہ فقرہ ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر گیا تھا کہ حُرُوفٌ فِي تَأْمُرٍ خَيْرٌ مِنْ عَشْرَةٍ فِي كُتُبٍ (نیرے ذہن میں ایک حرف کا ہونا کتاب کی دس باتوں سے بہتر ہے) ان کے درمیان ایسے اشعار بہت عام تھے جن میں کتابی علم کا مذاق اڑایا جاتا کتابت اور تحریر کو ایک عیب کے طور پر پیش کیا جاتا اور اس کے مقابلے میں قوت حافظہ کی برتری ثابت کی جاتی۔ مثلاً کسی شاعر کا شعر ہے :

لَيْسَ بِعِلْمٍ مَا حَوَى الْقَطْرُ | مَا الْعِلْمُ إِلَّا مَا حَوَى الْمَدْرُ

یعنی علم وہ نہیں ہے جو کتابوں میں درج ہے بلکہ علم تو صرف وہی ہے جو سینے میں محفوظ ہے۔ ایک اور شاعر کاغذوں کو علم کا بدترین مدفن خیال کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ علم کو کاغذ کے سپرد کر دینا ایسا ہے جیسے اسے ضائع کر دیا وہ کہتا ہے :

اِسْتَوْدَعَ الْعِلْمَ تَوَسَّافَ ضَيْعَةً      وَبَلَّسَ مُسْتَوْدَعَ الْعِلْمِ قَرَّاطِيئُ

یعنی جس نے علم کو کاغذ کے سپرد کر دیا اس نے گویا اسے ضائع کر دیا اور کاغذ تو علم کے بدترین مدفن ہیں۔ غرض عرب تحریر و کتابت کو پسند نہیں کرتے تھے اور جو شخص قوت حافظہ پر اعتماد کرنے کے بجائے لکھے ہوئے پر بھروسہ کرتا تھا اس کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے چنانچہ ذوالریمہ آخری مخضری شاعر مدقوں اس بات کو چھپاتا رہا کہ وہ فن کتابت سے آشنا ہے اسے ڈر تھا کہ کہیں اسے لوگ ناپسند نہ کرنے لگیں۔

عربوں کا تحریر و کتابت کو ناپسند کرنا اور اس پر بھروسہ کرنا ظاہر ہے صرف اس بنا پر تھا کہ انہیں اپنے قوت حافظہ پر ناز تھا وہ زیادہ سے زیادہ اس سے کام لیتے اور جتنا زیادہ وہ اس سے کام لیتے جاتے تھے اتنی ہی زیادہ اس میں بالیدگی اور قوت برستی جاتی تھی کیونکہ قاعدہ ہے کہ جس قوت کو جتنا زیادہ استعمال کیا جائے گا اتنی ہی زیادہ اس قوت میں جلا پیدا ہوتی جائے گی چنانچہ قوت حافظہ سے کام لینے کی عادت نے عربوں کو بے پناہ قوی الحافظ بنا دیا تھا۔

اسلام آیا تو حفظ حدیث کے مشغلے نے عربوں کی اس قوت حافظہ کو مزید جلا بخشی انہوں نے پہلے سے بھی زیادہ اس قوت سے کام لینا شروع کر دیا یوں بھی اسلام کے آجانے سے ان کے وہ تمام مشغلے یک دم متروک ہو گئے تھے جو ان کی ذہنی اور دماغی قوت کے لیے غذا کا حکم رکھتے تھے ان کا سب سے بڑا مشغلہ شعر و شاعری کا تھا مگر اسلام جھوٹ پس پر مبنی مبالغہ آمیز شاعری کو قطعاً پسند نہ کرتا تھا خبری اور غش اشعار کی تو کوئی گنجائش ہی نہ تھی۔ انسا کے علم سے بھی انہیں شغف تھا اسلام بھی اس علم کو اگرچہ ناپسندیدہ نظروں سے نہیں دیکھتا تھا مگر یہ علم زیادہ تر باہمی تفاخر یا ایک دوسرے کی توہین کے لیے استعمال کیا جاتا تھا جو ظاہر

ہے اسلام کی نظر میں غیر پسندیدہ فعل تھا یوں یہ ذہنی مشغلہ بھی متروک ہو گیا تھا۔ ایسے وقت میں جب کہ عربوں کی ذہنی اور دماغی قوتیں اپنی پرکائی غذاؤں سے محروم ہو کر کسی نئی غذا کی ٹھوکری تھیں انہیں حفظِ حدیث کا مشغلہ ہاتھ آ گیا اور پھر وہ ہر طرف سے بے نیاز ہو کر اس کی طرف لپکے اور ایسے گم ہوئے کہ بس اسی کے ہو کر رہ گئے ان کی تشنہ قوتِ حافظہ نے پھر ایسی جولانیاں دکھائیں کہ دنیا حیران رہ گئی :-

**محکم نبوی** عربوں کی قوتِ حافظہ سے متعلق اس تاریخی حقیقت کے پس منظر میں جب ہم صحابہ کرام کی محبت و عظمت کے ان مظاہر پر نظر ڈالتے ہیں جن کا اس سے

پہلے تفصیل سے ذکر ہو چکا ہے تو حفظِ حدیث پر یقین و اعتماد کی ایسی کیفیت پیدا ہوتی ہے جو ہر قسم کے شک و شبہ سے بالاتر ہے مگر بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی یہ یقین و اعتماد کی کیفیت اس وقت مزید قوت حاصل کر لیتی ہے جب ہم اس مرکزِ محبت اور محورِ عظمت، ہستی کو خود یہ محکم دیتا ہوا پاتے ہیں کہ جو کچھ مجھ سے سنو اور جو کچھ مجھے کہتا ہوا دیکھو اسے یاد رکھو اور دوسروں تک پہنچاؤ یعنی بات صرف اتنی ہی نہیں ہے کہ صحابہ کرام نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک ایک ادا کے عاشق تھے اور اس لیے آپ کی حیات کا ایک ایک لمحہ ان کے ذہنوں پر نقش تھا بلکہ اس سے بھی آگے بطرح کہ بات یہ تھی کہ وہ محبوب خود کہہ رہا تھا کہ میری ایک بات یاد رکھو اور عاشقین صادقین اپنے محبوب کی خواہش پورا کرنے میں دن رات ایک کیے ہوئے تھے۔ اسی طرح بات محض اتنی ہی نہیں کہ صحابہ کرام عظمتِ نبوی کے تقاضوں کی تکمیل میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر قول اور ہر فعل کو حرزِ جان بنائے ہوئے تھے بلکہ اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ وہ صاحبِ عظمت، ہستی خود حکم دے رہی تھی کہ میرے ایک ایک قول اور ایک ایک فعل کو یاد رکھو اور دوسروں تک پہنچاؤ اور حکم بھی سرسری طور سے نہیں بلکہ اس کی اہمیت کا عالم یہ ہے کہ منی کا میدان ہے حجۃ الوداع کا موقع ہے وہ حج جس کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس دنیا کی حیاتِ مبارک میں دوبارہ حج نصیب نہیں ہوا۔ ایک لاکھ سے اوپر جانِ نثار صحابہ کا مجمع ہے حجۃ الوداع کے تاریخی خطبے کے الفاظ آپ کی زبانِ مبارک سے نکل رہے ہیں پورا مجمع ہمتن گرج رہا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی ایک خاص کیفیت طاری ہے۔ ایسا



محسوس ہوتا ہے کہ آپ اپنی لائی ہوئی ہدایت کے رہنما اصول اس خطبے میں واضح فرما دیتا چاہتے ہیں اور یہ اطمینان کر لینا چاہتے ہیں کہ تبلیغ ہدایت کی جو ذمہ داری اللہ تعالیٰ کی جانب سے سونپی گئی تھی وہ بہ تمام و کمال پوری ہو گئی ہے کیونکہ صحابہ سے خطاب کر کے بڑے ہی دل سوز انداز میں پوچھا جا رہا ہے کہ کیا میں نے اللہ کا پیغام تم تک تبما سر پہونچا دیا اور مجمع کی طرف سے بیک آواز اثبات میں جواب پا کر بار بار آسمان کی طرف آپ کی انگلی اٹھتی ہے اور زبان سے یہ الفاظ نیکل رہے ہیں:

اللَّهُمَّ هَلْ بَلَغْتَ اللَّهُمَّ هَلْ بَلَغْتَ  
اے اللہ کیا میں نے پہونچا دیا اے اللہ کیا میں نے پہونچا دیا۔

غرض ایسے پراثر ماحول میں اور ایسے اتمام حجت کے موقع پر آپ کی زبان مبارک سے جو آخری الفاظ نکلتے ہیں وہ اسی حکم پر مشتمل ہیں۔ یہی اقوال و افعال نبوی کو یاد رکھنے اور دوسروں تک پہونچانے کا حکم۔ آپ ارشاد فرماتے ہیں:

الْأَقْلَسُ يَلْبِغُ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ | خبردار جو حاضر ہے اسے چاہیئے (میری باتیں)  
(صحابہ) غائب کو پہونچاتا جائے۔

مختلف اطراف و اکناف سے مختلف قبائل کے وفود دربار نبوی میں حاضر ہو رہے ہیں اور جب صحبت نبوی سے مستفید ہو کر اور آپ کے اقوال و افعال کا مشاہدہ کر کے واپس پہونے لگے ہیں تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرما رہے ہیں:

إِحْفَظُوهُنَّ وَأَخْبِرُوهُنَّ | ان تمام باتوں کو یاد رکھو اور جو لوگ تمہارے پیچھے  
مَنْ قَرَأَكُمْ (دُجاری) والے ہیں انہیں مطلع کرتے رہو۔

کبھی صحابہ کے مجمع سے خطاب کر کے بطور پیش گوئی کے ارشاد ہو رہا ہے:

تَسْمَعُونَ وَلَيَسْمَعَنَّ مِنْكُمْ وَلَيَسْمَعَنَّ  
تم مجھ سے سن رہے ہو تم سے بھی سنا جائے گا  
مِنَ الَّذِينَ لَيَسْمَعُونَ مِنْكُمْ۔  
اور جن لوگوں نے تم سے سنا ان سے بھی لوگ  
سُنیں گے۔ (البوادہ)

یعنی جب معاملہ یہ ہے کہ میری باتیں تمہیں دوسروں کو سنانی ہیں تو انہیں یاد رکھو تاکہ اپنی ذمہ داری

سے یا حسن و وجود عمدہ برآہو سکو حامل نبوت کے رمز شناس اس پیش گوئی کے بالواسطہ دیا  
واسطہ ہر قسم کے تقاضوں سے پوری طرح باخبر ہیں و داپنی ذمہ داریوں سے بھی پوری طرح  
واقع ہیں انہیں اپنے محبوب کی منشاء پوری کرنے کے لیے کسی قسم کی تصریحات کی ضرورت نہیں  
وہ تو غم ابرو کے اشاروں کا بھی انتظار نہیں کرتے تعمیل کے لیے دوڑ پڑتے ہیں۔ صحابہ نے واقعی  
اپنی ذمہ داری کو خوب پہچانا بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے جو کچھ سنا جو کچھ دیکھا آنے والوں کو من و عن  
سنا دیا ہو ہو کر کے دکھا دیا۔

صحابہ کرام کے تعمیل حکم کے اس جذبے سے بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی پوری طرح باخبر تھے  
آپ کے سامنے صحابہ ہر طرف سے بے نیاز ہو کر سنت نبوی کی حفاظت کرنے اور پوری صحت کے  
ساتھ اس کو دوسروں تک پہنچانے کا اہتمام کرنے میں لگے ہوئے تھے چونکہ یہ سب کچھ آنحضرت  
صلی اللہ علیہ وسلم کی رضا اور منشاء قلبی کے عین مطابق تھا اس لیے بے اختیار زبان نبوی پر  
صحابہ کرام کے لیے دعائیہ کلمات جاری ہو جاتے۔ آپ فرماتے

اللہ اس شخص کو تروتازہ رکھے جس نے ہم سے  
حدیث کو سنا اور جس طرح سنا تھا اسی طرح دہر دہر  
تک پہنچا دیا بسا اوقات مجھ سے سنتے والوں کی  
نسبت زیادہ حفاظت کرنے والے وہ ہوتے ہیں جو  
ان سے سنتے ہیں۔

نَحْنُ اللَّهُ أَمْرًا سَمِيعًا مُتَّحِدِينَ  
فَبَلَّغَهُ كَمَا سَمِعْتُمْ قُرْبَ مَبْلَغٍ  
أَوْعَىٰ مِنْ سَامِعٍ - (صحیح ابن حبان)

ان دعائیہ کلمات میں بھی کما سمعہ کے الفاظ حفظ حدیث کے حکم کی طرف اشارہ کر رہے  
ہیں جس طرح سنا تھا اسی طرح ہو ہو دوسروں تک پہنچانا اسی وقت ممکن ہے جب سنی ہوئی  
بات کو حفظ کر لیا جائے۔ حفظ حدیث میں بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس قدر اہتمام تھا کہ آپ  
صحابہ کو جو کچھ سناتے یا کر کے دکھلاتے تو اس کے متعلق صرف یہ حکم دے دینے پر اکتفا نہ  
کرتے کہ اس سُننے ہوئے کو یاد رکھو یا جس طرح مجھے کوئی کام کرتے دیکھو اسی طرح تم بھی  
اسے عمل میں لاؤ بلکہ باقاعدہ اس بات کی نگرانی فرماتے کہ اس حکم پر پوری طرح عملدرآمد بھی  
ہوتا ہے یا نہیں۔ ذخیرہ احادیث سے اس قسم کے بہت سے واقعات تلابش کیے جاسکتے ہیں جو

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس نگرانی کا ثبوت مسیا کرتے ہیں مگر طوالت کے خوف سے صرف دو واقعات ہی بطور نظیر کے ہدیہ قارئین ہیں ان میں سے ایک واقعے کا تعلق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قول سے ہے اور دوسرا واقعہ آپ کے فعل سے متعلق ہے۔

ایک مرتبہ آپ نے ایک صحابی کو سوتے وقت پڑھنے کے لیے ایک دعا تعلیم فرمائی۔ پھر پوچھا بتاؤ میں نے کیا کہا جو کچھ میں نے کہا ہے اسے دوہراؤ۔ صحابی نے وہ دعا دوہرائی مگر اس دعا کے آخری فقرے میں غلطی سے تبدیلی کے بجائے صحابی کے منہ سے رسول اللہ کا لفظ نکل گیا۔ اگرچہ دونوں لفظ تقریباً ہم معنی ہیں یعنی نبی اور رسول۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چونکہ اپنی زبان مبارک سے نبی کے لفظ ادا فرمایا تھا اس لیے ارشاد ہوا کہ میں نے یہ نہیں کہا جو کچھ میں نے کہا ہے وہی دوہراؤ۔ غور کیجئے بات اگرچہ صرف دعا کی تھی جو محض مستحب ہے فرض یا واجب کے حکم سے متعلق کوئی لفظ نہ تھا مگر اس کے باوجود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اصرار ہے جو میں نے کہا ہے بالکل وہی دوہراؤ۔ جب ایک معمولی دعا کے الفاظ کے بارے میں اس قدر سخت نگرانی ہے تو خود ہی اندازہ لگائیے کہ ہمتا شریعت اور اساسی امور سے متعلق ارشادات کے بارے میں آپ کی نگرانی کا کیا حال ہوگا۔

اسی طرح آپ کے فعل سے متعلق بھی ایک واقعہ بہت مشہور ہے ایک صحابی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے نماز پڑھ رہے تھے انہوں نے نماز کے تمام ارکان قیام اور رکوع و سجود وغیرہ ادا تو بالکل درست طریقے اور صحیح ترتیب کے ساتھ کیے مگر ان کی ادائیگی میں ذرا جلد بازی سے کام لیا وہ نماز پڑھ کر فارغ ہوئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا صَلِّ فَإِنَّكَ لَمْ تُصَلِّ (پھر نماز پڑھو تم نے نماز نہیں پڑھی) انہوں نے دوبارہ نماز پڑھی مگر اس بار بھی مطربیہ سکون و وقار پیدا نہ ہو سکا آپ نے پھر وہی فرمایا انہوں نے پھر نماز دوہرائی لیکن اس مرتبہ بھی وہ نماز صَلُّوا کَمَا سَأَأْتُمُونِی (اُصَلِّ) اسی طرح نماز پڑھیں۔ طرح مجھے نماز پڑھتے دیکھتے ہو) سکے بنانے میں پوری نہ آتے تھے۔ بہر حال تیسری بار جا کر کہیں وہ صحابی درست نماز پڑھ پاس تھے۔ اس واقعے میں غور کرنے والی بات یہ

ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے افعال کے طریقوں کی حفاظت کا بھی کس قدر اہتمام تھا کہ نماز میں سکون و اطمینان اگرچہ اکثر فقہاء کے نزدیک فرض یا واجب کے درجہ میں نہیں ہے مگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے کیے ہوئے عمل کے نمونے کی حفاظت پر اصرار ہے۔

غرض حفظ حدیث پر یقین و اعتقاد کی کیفیت میں یہ امر مزید قوت کا باعث ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خود یہ خواہش ہے کہ میرا ہر قول اور ہر فعل محفوظ رکھا جائے نہ صرف خواہش بلکہ آپ حکم دیتے ہوئے نظر آتے ہیں اور پھر اس بات کی نگرانی فرماتے ہیں کہ اس حکم کی تعمیل کس انداز میں ہو رہی ہے۔ اندازہ کیجئے کہ اس کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کے متوالوں اور آپ کی عظمت کے شیدائیوں نے اپنے محبوب کی خواہش کو پورا کرنے اور اپنے آقا کے حکم کو بجالانے میں کیا کچھ نہ کیا ہوگا کیا اس کے بعد بھی اس بدگمانی کی کوئی گنجائش رہ جاتی ہے کہ حفظ حدیث میں تساہل غفلت اور لاپرواہی سے کام لیا ہوگا۔

**منشائے الہی** اس سلسلے میں یہ بات بھی بڑی اہم ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ خواہش بلکہ آپ کا یہ حکم کہ مجھ سے جو کچھ سنو اور جو کچھ مجھے کرتے دیکھو اسے یاد رکھو دراصل منشائے الہی کی تکمیل تھی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت کا سلسلہ ختم کر دینے کے بعد اللہ تعالیٰ نے قیامت تک اپنے دین کو محفوظ کرنے کا کام چونکہ امت محمدیہ کے سپرد کر دیا تھا اس لیے ضروری تھا کہ آپ کی لائی ہوئی ہدایت اپنی پوری شکل میں قیامت تک موجود رہے اور اس کی یہی صورت تھی کہ صحابہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ایک قول اور ایک ایک فعل کا محض نمونہ بن جائیں اور آئندہ آنے والوں کو من و عن جو کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے انہوں نے سنا اور کرتے دیکھا پورا پورا پہونچا دیں گویا صحابہ سے خود قرآن کا یہ مطالبہ تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے جو کچھ انہوں نے سنا ہے اور جو کچھ خدا کے نبی کو انہوں نے کرتے دیکھا ہے وہ دوسروں تک مسلسل پہونچاتے چلے جائیں ہر حائر غائب کو اور ہر موجود شخص آئندہ آنے والوں کو

اقوال و افعال نبوی کی طرف بلاتا چلا جائے۔ قرآن کا پیغام تھا :

<p>تم ایک بہترین امت ہو جو لوگوں (کی بہتری) کے لیے ظاہر کی گئی ہے تاکہ لوگوں کو بھلائی کا حکم دے اور بُرائی سے روکے۔</p>	<p>كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (آل عمران: ۱۱۰)</p>
--	--

قرآن کا مطالبہ تھا

<p>اور چاہیے کہ تم میں ایک ایسی جماعت ہو جو فحشاء کی طرف بلایا کرے اور بھلائی کا حکم دیتی رہے۔</p>	<p>وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (آل عمران: ۱۰۴)</p>
--	---

بھلائی کے ممکن تھا کہ صحابہ قرآن کی اس پکار پر لبیک نہ کہتے قرآنی تقاضوں کی تکمیل ہی کی خاطر قرآنوں نے قسم قسم کی مشقتیں سہیں تھیں طرح طرح کی آزمائشیں برداشت کیں تھیں اپنا گھر بار چھوڑا تھا اور اپنے وطن کو خیر باد کہا تھا قرآنی مطالبوں کو پورا کرنے کی خاطر تو انہوں نے اپنے عزیز و اقارب تک سے قطع تعلق کر لیا تھا، وہ سب سے منہ موڑ کر قرآن اور صاحب قرآن کے ہو رہے تھے اب قرآن اگر ان سے کہہ رہا تھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے جو کچھ سنو اسے ورد زبان بنا لو جو کچھ اللہ کے رسول کو کرتا دیکھو اسے کرنا جاؤں کہ ہر تو کیسے یہ تصور کیا جاسکتا ہے کہ صحابہ نے قرآن کے اس مطالبے کی تکمیل میں کسی تساہل یا غفلت سے کام لیا ہو گا۔ قرآن نے ان سے کہا

<p>رسول نے جو کچھ تمہیں دیا ہے اسے لے لو اور جس سے روکا ہے اسی سے رک جاؤ۔</p>	<p>يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا خُذُوا زِينَتَكُمْ مِمَّا فِي دَارِكُمْ (الحشر: ۵)</p>
---	--

اور وہ دنیا کی ہر چیز سے دست بردار ہو کر رسول کی فرائض میں گم ہو گئے وہ اس کی

آواز کے لیے ہمہ تن کان اور اس کے احکام کی تعمیل میں ہمہ تن اطاعت بن گئے۔ رسول نے جو کچھ دیا وہ اسے مضبوطی سے تھامتے چلے گئے اور جس سے روکا اس سے یک لخت منہ موڑ لیا۔ اور پھر اپنی زبان اور اپنے عمل سے رسول اللہ کی زندگی کے ایک ایک لمحے کے امین بن گئے۔ غور کا مقام ہے جس دین کی خاطر صحابہ نے سب کچھ برداشت کیا وہی ان سے مطالبہ کر رہا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر ہر ادا پر نگاہ رکھو اور آپ کی لائی ہوئی ہدایت کے ہر ہر جزو اور ایک ایک خط و خال کی زندہ تصویر بن جاؤ تو کیسے ممکن تھا کہ وہ اس مطالبے کو کوئی اہمیت نہ دیتے اس مطالبے کو پورا کرنے میں ان سے جو بن پڑا انہوں نے اس کے کرنے میں کوئی کسر اٹھانہ رکھی۔

### حفظ حدیث کے عوامل اور اعتماد کی بنیاد | غرض حفظ حدیث کے سلسلے میں اب تک جن عوامل کا بیان ہوا ہے

ان کو یکجا کر کے دیکھئے اور پھر سوچیئے کہ ان عوامل کی موجودگی کی بنا پر حفاظت حدیث میں کس قدر اہتمام کس درجہ انہماک اور کیسی توجہ سے کام لیا گیا ہوگا۔ جن لوگوں کا تعلق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس قسم کا ہو جس کے چند ایک نمونے ابھی آپ کی نظر سے گزرے جو لوگ شمع نبوی پر پروانہ و ارثا رہتے ہوئے ہوں جن کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات عظمت کا پیکر ہو اور جو لوگ بے پناہ قوتِ حافظہ کے مالک ہوں انہوں نے احادیث کی حفاظت میں اپنی محنت کی کیسی روشن مثالیں قائم کی ہوں گی عظمت نبوی کے تقاضوں کی کس کس طرح لاج رکھی ہوگی اپنی قوتِ حافظہ کے لیے کیسے کرشمے دکھائے ہوں گے۔ ایسے لوگوں کے بارے میں اس بدگمانی کی کوئی گنجائش ہی نہیں کہ حفظ حدیث میں کوئی کوتاہی غیر ارادی طور پر بھی ان کی جانب سے ظہور پذیر ہوئی ہو خصوصاً ایسی حالت میں جبکہ خود وہ ہستی ان سے حفظ حدیث کا مطالبہ کرتی ہو جو ان کی محنت کا مرکز ہے جس کو وہ عظمت کی بلندیوں پر متمکن دیکھتے ہیں اور پھر ان سب پر مزید یہ کہ رضائے الہی کا حصول بھی وہ حفظ حدیث ہی میں منحصر سمجھتے ہوں۔ ان تمام عوامل کے یکجا ہوجانے کے بعد کوئی عقل سے عاری ہی ہو تو یہ کہہ سکتا ہے کہ حفاظت حدیث کے سلسلے میں محض صحابہ کے حفظ پر اعتماد

نہیں کیا جاسکتا۔ حتیٰ یہ ہے کہ ان تمام عوامل نے مل کر صحابہ میں ایک ایسی رُوح پھونک دی تھی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و احوال کی حفاظت کے علاوہ ان کو کچھ اور یاد ہی نہ رہا تھا۔  
**حفظِ حدیث میں صحابہ کا شغف** | صحابہ سب کچھ بھول کر حفظِ حدیث کے کام میں ایسے منہمک ہوئے کہ سچ پوچھے تو انہیں

تن من کا ہوش نہ رہا ان میں ایسے لوگ بھی تھے جو آستانہ نبوی پر آئے تو بس اسی در کے ہوئے۔ عمر گزار دی دن رات خدمت نبوی میں رہ کر حفظِ حدیث کے علاوہ کوئی کام نہ کیا۔ ایسے بھی تھے جن کو نہ کھانے پینے کا ہوش تھا نہ راحت و آرام کی فکر۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال کا استحباب و یاد رکھنا ان کے لیے اتنی ہی بات تھی کہ وہ لوگ بھی تھے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک ایک حدیث کے لیے در در کی خاک چھانٹتے پھرتے تھے وہ بھی تھے جو حفظِ حدیث ہی کی دھن میں دور دراز کے سفر کی صعوبتوں کو تسکینِ قلب کا سامان سمجھتے رہے۔

آئیے صحابہ کرام کے اس عظیم الشان کام کی چند جھلکیاں دیکھتے چلیں اندازہ لگائیے صحابہ نے قرآن کی اس پکار کا کہ اللہ کا رسول جو کچھ تمہیں دیتا ہے اسے لے لو کسی طرح جواب دیا۔ یہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہیں ان کے نام سے کون واقف نہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث بہت کثرت سے ان سے مروی ہیں۔ یمن کے رہنے والے ہیں قبیلہ دوس سے ان کا تعلق ہے عین عالم شباب میں یعنی تیس سال کی عمر میں خیمہ کے مقام پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں اور پھر بس آپ ہی کے در کے ہو رہے ہیں دن ہو یا رات، سہری ہو یا گرمی سفر ہو یا حضر صبح و شام جو بیس گھنٹے آپ کا اس کے علاوہ کوئی کام نہیں کہ ہر گھڑی ہر لمحے خدمتِ نبوی میں حاضر رہیں اور جو آپ اپنی زبان مبارک سے ارشاد فرمائیے سنیں اور جو کچھ آپ کو کرنا ہو دیکھیں اس کا بغور مشاہدہ کریں اور پھر آپ کے ان تمام اقوال و افعال کو ذہن میں محفوظ کر لیں۔ آستانہ نبوی پر حضرت ابو ہریرہ کی یہ ہمہ وقت حاضری اور حفاظت حدیث میں یہ ہمہ تن مشغولیت پورے ذوق و شوق اور اہتمام کے ساتھ اس وقت تک جاری رہی جب تک کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بالآخر اس دنیا سے تشریف نہ لے گئے۔ اس پورے دور میں حضرت ابو ہریرہ کا عالم یہ تھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اگر مسجد نبوی میں تشریف فرما ہیں

تو یہ مسجد نبوی کے کسی گوشے میں بیٹھے جمال نبوی کے شاہدے میں مشغول ہیں اگر آپ اندراج  
مطلبات کے مکانات میں سے کسی مکان میں داخل ہو گئے ہیں تو یہ دہلیز تک ساتھ ساتھ ہیں اور  
پھر وہیں بیٹھے آپ کے باہر تشریف لانے کے منتظر ہیں۔ آپ حج پر جا رہے ہیں یا جہاد کا سفر  
در پیش ہے تو ابو ہریرہ ضرور ہم رکاب ہیں غرض کوئی وقت الیسا نہ تھا جب یہ یمنی دوسی نوجوان  
بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارد گرد منڈلاتا نظر نہ آتا ہو۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو آج  
ہم ذخیرہ حدیث کے سب سے بڑے راوی کی حیثیت سے جانتے ہیں کبھی کبھی اپنے واقعات بیان  
کرتے ہوئے خود فرمایا کرتے :

قَدِمْتُ عَلَى رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ  
وَسَلَّمَ يَخْبِي بَنَاتُ الْيَوْمَةِ قَدْ فَرَدَتْ عَلَى  
الثَّلَاثِ خَافَتُ مَعَهُ حَتَّى مَاتَ وَ  
أَدْرَمْتُ مَعَهُ بَيْوتَ نَسَائِهِ وَأَخْدَمْتُ  
وَأَغْرَمْتُ مَعَهُ  
(ابن سعد)

ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں  
خبر کے مقام پر حاضر ہوا اس وقت میری عریس سال  
سے اوپر ہو چکی تھی پھر میں نے آپ کے ساتھ قیام کر لیا  
یہاں تک کہ آپ کی وفات ہو گئی میں آپ کے ساتھ  
لگا رہتا آپ اپنی بیویوں کے مکانات پر جلتے تھے  
آپ کے ساتھ جاتا آپ کی خدمت کرتا حج اور جہاد میں  
آپ کے ساتھ ہوتا۔

بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال کی حفاظت میں حضرت ابو ہریرہ کے شغف کا عالم یہ تھا  
کہ نہ بھوک کی پرواہ تھی نہ پیاس کا خیال کئی کئی وقت خاتون سے گزر جلتے زمین پر ٹیک لگا لگا کر  
یا پیٹ سے پتھر باندھ باندھ کمر اپنے آپ کو تھامے رہتے۔ امام بخاری روایت کرتے ہیں حضرت ابو ہریرہ  
کے خود اپنے الفاظ ہیں :

وَاللَّهِ الَّذِي لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ إِنْ كُنْتُ لَا أَجِدُ  
عَلَى الْأَرْضِ بِكَدِي مِنَ الْجُوعِ وَاشْتِ  
الْجَرَى عَلَى بَطْنِي (بخاری شریف)

اس خدا کی قسم جس کے سوا کوئی معبود نہیں کہ بھوک  
کی وجہ سے میں جگہ تمام کر زمین سے سہارا لے لیتا  
اور اپنے پیٹ پر پتھر باندھ لیتا۔

کبھی کبھی بھوک اس قدر تنگ کرتی کہ چکرا کر گر پڑتے اور ایسے بیہوش ہو جاتے کہ لوگ جنون کا اثر سمجھنے



لگتے۔ بعد میں یہ تمام حالات ابوہریرہ نے بڑے مزے لے لے کر خود بیان کیے ہیں۔ فرماتے ہیں میں خود کو پاتا کہ منبر نبوی اور حضرت عائشہ کے حجرے کے درمیان چکرا کر گر پڑا ہوں خیال کیا جاتا کہ میں پاگل ہوں حالانکہ جنوں سے میرا کیا تعلق وہ تو صرف بھوک کا اثر ہوتا تھا۔

رَأَيْتُنِي أَصْرَعَ بَيْنَ مَنْبَرِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَحَجَرَةِ عَائِشَةَ فَيَقَالُ عَجُونٌ وَمَا لِي جُنُونٌ أَنْ هِيَ إِلَّا الْجُوعُ (معاذ)

حقیقت یہ ہے کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے حفاظت حدیث کے کام کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیا تھا ان سے کثرت سے احادیث روایت ہونے کی وجہ بھی یہی ہے کہ انہوں نے دنیا کے ہر کام سے لاتعلق ہو کر حفاظت قرآن و حدیث کے کام ہی کو اپنا اولیٰ و آخریٰ بچھونا بنالیا تھا۔ خود فرمایا کرتے کہ جو کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے اس کے یاد کرنے اور سمجھنے سے زیادہ مجھے کوئی چیز پسند نہ تھی (ابن سعد) اپنی آنکھوں سے دوسرے لوگوں کو دنیا کے کاروبار سے نفع اٹھاتے اور آرام و راحت کی زندگی گزارتے دیکھتے مگر اپنے لیے سب سے زیادہ نفع کی تجارت اور راحت و آرام کا کام انہیں اس کے سوا نظر نہ آتا تھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارک کے ایک ایک لمحے سے اپنی روح کی غذا کا سامان ہم پہنچالیں بہت سے انصار و مہاجرین دنیا کی مشغولیتوں میں بھی الجھے رہتے اور حتیٰ الامکان خدمت نبوی میں حاضری کا بھی موقع نکال ہی لیتے مگر حضرت ابوہریرہ کو دنیا کے کاروبار سے کوئی سروکار نہ تھا۔ بعض مرتبہ لوگوں کو ان کی کثرت روایت پر تعجب ہوتا تو فرمایا کرتے :

تم لوگ خیال کرتے ہو کہ ابوہریرہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیادہ حدیثیں بیان کیا کرتا ہے مگر خدا کی قسم میں ایک غریب مسکین آدمی تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پیٹ کے بل پڑا رہتا حالانکہ مہاجرین بازاروں کے کاروبار

إِنَّكُمْ تَزْعُمُونَ أَنَّ أَبَا هُرَيْرَةَ يَكْثُرُ الْحَدِيثُ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاللَّهِ الْمَوْعِدُ الْحَقُّ كُنْتُ أَمْرًا مَسْكِينًا أَصْحَبَ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَى مَلَأَ بَطْنِي

كَانَ الْهَاجِرُونَ يَشْغَلُهُمُ الصَّفَقُ  
بِالْأَسْوَاقِ وَكَانَتِ الْأَنْصَارُ يَشْغَلُهُمُ  
الْقِيَامُ عَلَى أَمْوَالِهِمْ (بخاری)

میں مشغول رہتے اور انصار اپنے  
اموال (باغ اور کھیت وغیرہ)  
میں الجھے رہتے۔

یہ تو تھا حضرت ابو ہریرہ کا حال۔ اب دیکھئے یہ حضرت عبداللہ بن مسعود ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے راہدار۔ ان کا بھی یہی عالم تھا کہ ہمہ وقت بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر رہتے تھے کہ آپ حجۃ مبارک میں تشریف فرما ہوتے تو وہاں بھی موجود ہوتے کیونکہ ان کو پرزہ اٹھا کر حجۃ بنوی میں بھی داخل ہونے اور آپ کی تنہائی کی گفتگو سننے کی اجازت تھی اور اسی لیے ان کو صاحب السواد (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے راہدار) کہا جاتا تھا۔ حضرت عبداللہ بن مسعود کو لوگ بس اسی حال میں دیکھتے کہ وہ بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی نہ کسی خدمت میں مصروف ہیں کبھی بستر بچھا رہے ہیں کبھی اٹھا کر رکھ رہے ہیں کبھی آپ کی نعلین مبارک اتار رہے ہیں کبھی پہنا رہے ہیں اور کبھی آپ کے نعلین مبارک ان کی بغل میں دبے ہوئے ہیں۔ کبھی ان کو بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مسواک اس کی مناسب جگہ پر رکھنے کی نکر ہے تو کبھی وضو کا پانی مقررہ وقت پر مہیا کرنے کا خیال ہے۔ بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم غسل فرما رہے ہیں اور حضرت عبداللہ ابن مسعود چادر تانے کھڑے ہیں آپ سوئے ہوئے ہیں اور یہ انتظار میں ہیں کہ مقررہ وقت پر بیدار کرنے کی ذمہ داری پوری کریں۔ اللہ کا رسول سفر میں ہے اور یہ اللہ کا سپاہی مسلح ہو کر بطور کار و سامانہ ساتھ ہے۔ بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مجلس میں تشریف لائے اور عبداللہ ابن مسعود نے لپک کر آپ کا عصا آپ کے دست مبارک میں دے دیا ہے آپ اٹھ کر چلنے لگے ہیں اور عبداللہ ابن مسعود ہیں کہ عصا تے نبوی ہاتھ میں تھا ہے آگے آگے بطور پیش خدمت کے چلے جا رہے ہیں تا آنکہ آپ سے پہلے حجرے میں داخل ہو کر آپ کے راحت و آرام

کی جگہ کو درست کرنے میں مشغول ہو گئے ہیں۔ حضرت عبداللہ ابن مسعود کی انہی مشغولیتوں کی بنا پر صحابہ کے درمیان ان کا خطاب ہی صاحب النعلین والسواک والوسادۃ پڑ گیا تھا۔ دربار رسالت میں ان کی ہر وقت کی حاضری سے بعض نوواردوں کو یہ مخالف لگ جاتا تھا کہ حضرت عبداللہ ابن مسعود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے گھر کے کوئی آدمی ہیں چنانچہ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کہتے ہیں کہ ہم جب یمن سے آئے تو مدائن حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کے متعلق بھی گمان کرتے رہے کہ

<p>کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر کے کوئی آدمی ہیں جس کی وجہ ان کی ادران کی ماں کی آمد و رفت تھی جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ہوتی رہتی تھی۔</p>	<p>اِنَّ رَجُلًا مِّنْ اَهْلِ بَيْتِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَمَّا نَزَىٰ مِنْ دُخُوْلِهِ رُدَّ خُوْلًا اُمِّهِ عَلٰى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ (اصابۃ)</p>
--	--

دو بار نبوی میں یہ ہر وقت کی حاضری ذرا غور کیجئے آخر کس لیے تھی۔ ما آتا کہ الرسول فخذوه (جو کچھ رسول تمہیں دیتا ہے اسے لے لو) کی نرانی پکار کے علی جواب کے علاوہ بھی کوئی اور وجہ اس کی سمجھ میں آتی ہے۔ نہیں ہرگز نہیں۔ یہ ہر وقت کی حاضری صرف اسی لیے تھی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے جو کچھ نینس اور جو کچھ آپ کو کرتے ہوئے دیکھیں ایک ایک لمحہ جہات نبوی کو اپنے سینوں میں محفوظ کر لیں پھر خود بھی اس کے مطابق اپنی زندگی کو ڈھالیں اور دوسروں تک بھی ہدایت کے یہ خزانے من وعن پہنچا دیں۔

بات صرف حضرت ابو ہریرہ یا حضرت عبداللہ ابن مسعود یا اسی قسم کے چند گنے چنے صحابہ تک محدود نہیں بلکہ تقریباً تمام صحابہ کا یہی حال تھا۔ کوئی موقع دربار رسالت میں موجود رہنے کا ہاتھ سے جانے نہ دیتے تھے۔ ابھی حضرت عمرؓ کا حال آپ سن ہی چکے ہیں کہ ایک انصاری صحابی کے ساتھ دربار نبوی میں حاضری کے لیے باری مقرر کی ہوئی تھی کہ کہیں کسی وقت کے فیض و برکت سے محرومی نہ ہو جائے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ مسلسل نو دس

سال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خانگی خدمت میں مصروف رہے یہ دس سال کی عمر میں بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے پھر آپ کے دنیا سے رحلت فرمانے تک آپ کی ہمہ وقت حضوری سے فیض یاب ہوتے رہے۔ ان کے علاوہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے موالی مثلاً حضرت رافع اور حضرت بلال رضی اللہ عنہما بھی شاذ و نادر ہی دربار رسالت کی حاضری سے محروم رہتے۔ ان سب کے سامنے صرف ایک ہی مقصود تھا اور وہ یہ کہ ما استاکم الرسول فخذوه کی زندہ عملی تفسیر بن جائیں بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے جو کچھ ملے اسے لے کر محفوظ کر لیں اور دوسروں تک پہنچائیں۔ اس مقصد کے حصول کی لگن صرف مردوں تک ہی محدود نہ تھی۔ عورتوں میں بھی حال اہمات المؤمنین کا تھا جن میں سے کوئی نہ کوئی آپ کی خلوت کی زندگی میں آپ کے ساتھ ہوتی تھیں اور آپ کے اقوال و افعال کی مخالفت کا فریضہ اسی طرح انجام دیتی تھیں جس طرح جلوت کی زندگی میں مرد صحابہ انجام دے رہے تھے۔

پھر اسی پر بس نہیں جن امور کا علم صحابہ کو براہ راست حاصل نہ ہو پاتا اس کو ایک دوسرے سے پوچھتے پھرتے۔ بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد تو حصول حدیث کے شغف میں صحابہ کا عالم ہی عجیب تھا جس کسی کے بارے میں علم ہو جاتا کہ اس کے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی قول یا فعل محفوظ ہے ہزار جتن کر کے صحابہ اس کے پاس پہنچتے اور جب تک وہ حدیث حاصل نہ کر لیتے چین نہ آتا۔ ایک ایک حدیث کی خاطر میر و شام جیسے دور دراز علاقوں کا بھی اگر سفر کرنا پڑتا تو اس سے بھی انہیں عذر نہ ہوتا حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ جو بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کثیر احادیث کے راوی ہیں خود ایک ایسے ہی سفر کا حال بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابیوں میں سے

ایک صاحب کے واسطے سے مجھے ایک حدیث

پہنچی میں نے ایک اونٹ خریدی اس پر کجاوہ

بلغنی حدیث عن رجل من اصحاب

النبي صلی اللہ علیہ وسلم فابتعت

بعيراً فشدت عليه رحلی ثم

سِرَّتِ إِلَيْهِ شَهْرًا حَتَّى قَدِمَتْ  
الشَّامَ فَإِذَا عَبْدُ اللَّهِ بْنُ أَنَسٍ  
الأنصاري فَأَتَيْتَ مَنْزِلَهُ وَارْسَلْتُ  
إِلَيْهِ أَنَّ جَابِرًا عَلَى الْبَابِ فَرَجَعَ  
إِلَى الرَّسُولِ فَقَالَ جَابِرُ بْنُ عَبْدِ اللَّهِ  
فَقُلْتُ نَعَمْ فَخَرَجَ إِلَيَّ فَأَعْتَقْتَهُ وَ  
إِعْتَقَنِي قَالَ قُلْتُ حَدِيثٌ بَلَّغَنِي  
عَنْكَ أَنَّكَ سَمِعْتَهُ مِنْ رَسُولِ اللَّهِ  
صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي الْمَخْطِ الْمِ  
لَمْ أَسْمَعْهُ أَنَا مِنْهُ قَالَ سَمِعْتُ  
رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ  
يَقُولُ الْحَدِيثَ (جامع بيان العلم)

کسا اور ایک ماہ تک چلتا رہا بیان تک کہ  
میں شام پہنچ گیا پھر میں عبد اللہ بن انیس  
الانصاری (جن سے حدیث پہنچی تھی) کے گھر  
جا پہنچا اندر آدمی بھیجا کہ دروازے پر جا کر  
کہہ دے کہ آدمی نے واپس آکر پوچھا کہ کیا جابر  
بن عبد اللہ انیس میں نے کہا ہاں! عبد اللہ  
بن انیس باہر نکل آئے دونوں نے معائنہ  
کیا پھر میں نے پوچھا کہ مجھے آپ کے واسطے  
سے ایک حدیث پہنچی ہے جو آپ نے رسول  
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منظر الم کے بارے  
میں سنی ہے اور میں اس حدیث کو نہیں سنی تھا  
عبد اللہ بن انیس نے جواب میں کہا کہ میں رسول  
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرمانے سنا کہ پھر  
انہوں نے پوری حدیث سنائی۔

مدینہ سے شام جیسے دور دراز علاقے کا سفر ذرا غور تو کیجیے۔ کہہ دینا اور سن لینا آسان ہے۔  
اتنا طویل سفر کیا جانے تو یہ تہہ لگتا ہے اور پھر خصوصاً آج سے ہزار بارہ سو سال پہلے کا سفر،  
ذرا الجھ امد و رفت کا حال معلوم صرف اونٹ کی پشت پر صحراؤں اور ریگستانوں کے درمیان  
تخلی مسافت۔ یہ سب کچھ کس لیے صرف ایک حدیث کے حصول کی خاطر! ایک حدیث پوری  
بھی بڑی بات ہے بعض اوقات کسی حدیث کے محض ایک حرف کی تصحیح کی خاطر صحابہ نے رخت  
سفر باندھ لیا ہے۔ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کا نام روایت حدیث میں بڑا معروف ہے

ان کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ انہوں نے ایک مرتبہ حدیث کے صرف ایک حرف کی درستی کے لیے باقاعدہ سفر اختیار کیا۔ اسی طرح دائی میں ایک اور صحابی کے متعلق ہے کہ وہ اسی مقصد سے حضرت فضالہ بن عبد اللہ کے پاس مصر پہنچے، فضالہ اس وقت اپنی اونٹنی کا چارہ تیار کر رہے تھے۔ ان کے خوش آمدید کہنے پر وہ صحابی برسے میں آپ کی ملاقات کو نہیں آیا بلکہ میں نے اور تم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک حدیث سنی تھی میں یہ امید لے کر آیا ہوں کہ وہ تمہیں یاد ہوگی۔ اسی قسم کا بلکہ اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز ایک واقعہ حضرت ابو ایوب انصاریؓ کا بھی ہے۔ انہوں نے اور حضرت عقبہ بن عامرؓ نے ایک حدیث مسلمانوں کی عیب پوشی کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک ساتھ سنی تھی۔ حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کو اتفاق سے اس حدیث کے الفاظ میں کچھ شبہ پیدا ہو گیا ضرورت ہوئی کہ حضرت عقبہ بن عامرؓ سے اس سلسلے میں استفسار کریں معلوم ہوا کہ وہ تو مصر جا کر آباد ہو گئے ہیں۔ آپ کو یہ سن کر حیرت ہو گئی کہ حضرت ابو ایوب انصاری صرف ایک معمولی سا شک دُور کرنے کی خاطر مدینہ منورہ سے مصر روانہ ہو جاتے ہیں اور اس سے زیادہ حیرت آپ کو یہ معلوم کر کے ہو گئی کہ مصر پہنچ کر کھڑے کھڑے حضرت عقبہ بن عامرؓ سے وہ حدیث سنتے ہیں اور سنتے ہی پھر واپس سوار ہو کر عائد مدینہ منورہ جاتے ہیں۔ کجا وہ تک بھی اپنی سواری کا مصر میں نہیں کھولتے۔ حافظ ابن عبد البر کے الفاظ ہیں کہ

<p>حضرت ابو ایوب اپنی سواری کی طرف پلٹے سوار ہوئے اور مدینہ کی طرف روانہ ہو گئے آپ نے اپنا کھادہ بھی نہ کھولا۔</p>	<p>فَاتَى ابُو اَيُّوبَ رَاحِلَتَهُ فَرَكِبَهَا وَانْصَرَفَ إِلَى الْمَدِينَةِ وَبَاحِلَ رَحْلَهُ (جامع بيان العلم)</p>
--	---

کہاں تک بیان کیا جائے کہ صحابہ نے حصول و حفاظت حدیث کی خاطر کیسے کیسے کارنامے انجام دیتے ہیں۔ حیرت ہوتی ہے سن سن کر حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ابن عم ہونے کے باوجود صحابہ کبار کے دروازوں پر تلاش حدیث میں فرش خاک پر پڑے نظر آتے ہیں نہ سوج کی تمازت کا خیال ہے نہ تیز و تند گرم ہواؤں کی فکر ہے۔ گرد و غبار کھاتے ایک دروازے سے دوسرے دروازے پر جا رہے ہیں دھن سوار ہے تو بس یہی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کی جو حدیث بھان سے ملتی ہے لے لیں۔ دارمی اپنی سنن میں حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کی نہ بانی روایت کرتے ہیں کہ

كُنْتُ لَا أَتَى الرَّجُلَ فِي الْحَدِيثِ  
يَبْلُغُنِي أَنَّهُ سَمِعَهُ مِنْ رَسُولِ  
اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاجِدُهُ  
قَائِلًا فَأَتُوهُ سَدَسَ دَائِي عَلَى بَابِهِ  
تَسْفِي الرِّيحَ التَّرَابَ عَلَى وَجْهِهِ  
حَتَّى يَخْرُجَ فَإِذَا خَرَجَ قَالَ يَا بَنَ  
رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ  
مَالِكٌ فَأَقُولُ بَلِّغْنِي حَدِيثَ عَنْكَ  
أَنْتَ تَحَدِّثُهُ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى  
اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَأَجِيبْتُ إِنْ  
أَسْمَعُهُ مِنْكَ فَيَقُولُ هَلَّا  
بَعَثْتَ إِلَيَّ حَتَّى أَتِيكَ فَأَقُولُ  
إِنَّا أَحَقُّ إِلَيْكَ -

حدیث کی طلب میں میں کسی ایسے آدمی کے پاس جاتا جن کے متعلق مجھے پتہ لگتا کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ سنا ہے اور ان کو پتا کہ وہ قیلو کہہ رہے ہیں تو اپنی جہاد کو سیکھنا کہ میں ان کے دروازے پر پڑ جاتا ہوں انہیں گرو وغبار الہا لگا کر میرے پھرے پر ڈالتا تھا کہ خود وہ صاحب باہر نکلی آتے۔ باہر نکلی کر (مجھے دیکھتے تو) کہتے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادے آپ کیسے تشریف لائے میں کہتا کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ کوئی حدیث روایت کرتے ہیں میں نے پچا ہا کہ وہ حدیث آپ سے سنوں وہ صاحب کہتے آپ کسی کو بھیج دیتے ہیں خود حاضر ہوتا میں کہتا تمہارے پاس حاضر ہونے کا میں زیادہ مستحق ہوں۔

طلب حدیث میں پھلا اپنے مرتبہ و وقار کا خیال کیسے تھا۔ تحصیل حدیث کی لگن میں صحابہ کے درمیان چھوٹے بڑے کا بھی کوئی امتیاز نہ تھا۔ خلفائے راشدین تک اپنی عظمت مرتبت کے باوجود دوسرے صحابہ سے احادیث پوچھنے میں کوئی عام محسوس نہ کرتے تھے۔ حضرت ابو ہریرہؓ کا بیان ہے کہ

كَانُوا يَعْرِفُونَ لِرَوْحٍ فَيَسْأَلُونِي  
عَنْ حَدِيثِهِ مِنْهُمْ عُمَرُ وَعُثْمَانُ  
وَعَلِيٌّ وَطَلْحَةُ وَالزُّبَيْرُ  
(ابن سعد)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ میری وابستگی کا حال لوگوں کو چونکہ معلوم تھا اس لیے آپ کی حدیثیں لوگ مجھ سے پوچھا کرتے ان میں عمرؓ بھی ہیں عثمانؓ بھی علیؓ بھی طلحہؓ بھی اور زبیرؓ بھی۔

غرض صحابہ نے تحصیل حدیث اور حفظ حدیث میں ہر وہ طریقہ اپنایا جو اس کام میں مدد و معاون ثابت ہو سکتا تھا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال کی ایسی حفاظت کی کہ اس کی نظیر تاریخ انسانی میں نہ اس سے پہلے تھی نہ قیامت تک ممکن ہے اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں، ان عوامل کی موجودگی میں جن کا ذکر تفصیل سے ہو چکا ہے ایسا ہی کچھ ہونا چاہیے تھا جیسا ظہور میں آیا۔ ایسا نہ ہونا تو تعجب کی بات ہوتی۔ حق تو یہ ہے کہ شاید کاغذ کے سفینوں میں بھی حدیث کی ایسی حفاظت ممکن نہ تھی جیسی حفاظت صحابہ نے اپنے سینوں سے کام لے کر کی۔ صحابہ ذخیرہ حدیث کی مجسم کتابیں بن گئے۔ ہر ہر صحابی اپنی جگہ پر حدیث کا ایک نسخہ تھا اور یہ کمن غلط نہ ہو گا کہ ان زندہ نسخوں کی موجودگی میں حدیث کے کاغذی نسخوں کی چنداں ضرورت بھی نہ تھی اس لیے اگر امر واقعہ بھی فرض بھی کر لیا جائے کہ عہد نبوی اور عہد صحابہ میں حدیث کا ذخیرہ تحریر میں نہیں آیا تھا تو حفاظت حدیث کے سلسلے میں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

**حدیث کی زندہ کتابیں** | یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے جن واقعات و حالات اور جن اقوال و ملفوظات کا ظہور ہوا تھا صحابہ کرام اپنے اپنے علم کی حد تک ان اقوال و افعال کا مکمل نمونہ بنے ہوئے تھے اور اس طرح احادیث نبوی کا ذخیرہ صرف کسی ایک نسخے ہی میں نہیں ہزاروں نسخوں کی صورت میں عہد صحابہ سے بھی پہلے عہد نبوی ہی میں وجود میں آچکا تھا۔ قرآن نے صحابہ پر بڑے تاکید و انداز میں یہ بات واضح کی تھی کہ

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ  
أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (احزاب : ۲۱) | تمہارے لیے رسول اللہ (کی زندگی) میں ایک  
عمدہ نمونہ موجود ہے۔

اور صحابہ نے اس قرآنی وضاحت کی روح کو پہچان کر اپنی زندگی کے ہر گوشے میں ہر پہلو سے اس نمونے کی شمع روشن کر لی تھی صرف فرائض و واجبات ہی کے معاملے میں نہیں بلکہ مستحبات و مباحات میں بھی بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر زندگی کے عام معمولات میں بھی صحابہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ایک قول اور ایک ایک فعل کی ہو ہو تصویر بن جانے کی کوشش کرتے تھے حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ کے متعلق عام طور سے



مشہور ہے کہ ان کا تو عالم یہ تھا کہ سفر پر راہ میں قصداً اس بات کا اہتمام کرتے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاں کہیں اپنی اونٹنی کا رخ پھیرا تھا وہاں ان کی اونٹنی کا رخ بھی ضرور پھرے جن جن مقامات پر آپ نے راستے میں نمازیں پڑھی تھیں ان مقامات کو تلاش کر کے حضرت عبداللہ ابن عمر نمازیں پڑھتے حانظ ابن حجر عسقلانی حضرت عبداللہ ابن عمر کی اسی عادت کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

<p>جن جن مقامات پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نمازیں پڑھی تھیں وہ (ابن عمر) ان کو تلاش کرتے تھے اور نمازیں پڑھتے تھے راہ میں جہاں کہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اونٹنی کا رخ پھیرا تھا وہ (ابن عمر) بھی اپنی سواری کا رخ مورتے۔</p>	<p>كَانَ يَتَّبِعُ أَثَارَةَ أَهْلِ كُلِّ مَسْجِدٍ صَلَّى فِيهِ وَكَانَ يُعْتَرِفُ بِوِجْهِهِ فِي طَرِيقِ رَأْيِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَرَضَ نَاقَتَهُ (اصابہ)</p>
--	---

ایک بار نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سفر کے دوران راہ میں کہیں اونٹ سے اتر کر استنجے کی غرض سے بیٹھتے تھے حضرت عبداللہ ابن عمر نے اپنی یہ عادت بنالی تھی کہ جب بھی اس جگہ سے گزرے ہوتا تو بلا ضرورت بھی اپنی اونٹنی سے اس مقام پر اترتے اور استنجے کی شکل بنا کر بیٹھتے۔ اسی طرح حضرت عبداللہ ابن مسعود نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی چال ڈھال اور وضع و قطع تک اس حد تک اپنالی تھی کہ صحابہ ان کو ان کے طریقوں اور ان کی عادات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تشبیہ دیتے تھے ایک مرتبہ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا کہ طرز و روش اور چال ڈھال میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سب زیادہ قریب کون ہے آپ نے جواب میں فرمایا

<p>رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے طرز و روش چال ڈھال اور وضع و قطع میں سب زیادہ قریب آدمی ابن مسعود ہیں۔</p>	<p>اقرب الناس هدياً و ذلاً و سمياً برسول الله صلى الله عليه وسلم ابن مسعود (ترمذی)</p>
---	--

لوں تو عادات و خصائص نبوی کی ہو ہو نقل کرنا تمام صحابہ ہی کا ملخص نظر تھا لیکن بعض صحابہ کبار کو جن میں خلفائے راشدین سب میں ممتاز ہیں عادات و خصائص نبوی کے ساتھ ساتھ خصوصیات نبوی کی خصوصیات سے بھی غلط و افر نصیب ہوا تھا چنانچہ انہیں ہمیں کوئی حدیث کے مقام پر فائز نظر آتا ہے تو کوئی سخت اور باطل میں امتیاز کے لیے غارت گیت کے اعزاز کا حامل دکھائی دیتا ہے کسی کو اصدق الناس جبار کا خطاب ملا ہوا ہے تو کسی کو عدل و قضا کی گمرسی پر سرفرازی نصیب ہوتی ہے کوئی فقر و زہد نبوی کا مجسم پیکر ہے تو کوئی غنا و کفایت پیغمبری کا زندہ نمونہ ہے غرض ہر صحابی اپنی اپنی جگہ پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے کسی نہ کسی پہلو کی مکمل تصویر نظر آتا ہے اور یوں ہر صحابی اپنے اپنے مقام پر احادیث نبوی کی ایک زندہ کتاب ہے۔

اور جب تک دھڑکتے ہوئے سینوں پر مشتمل یہ زندہ کتابیں موجود رہیں اس وقت تک پھر پھڑپھڑاتے اور راق سے جڑی ہوئی بے جان کتابوں کی ضرورت ہی لاحق نہ ہوئی اگرچہ مقتضی کا منہ بند کرنے کے لیے اللہ نے حفاظت حدیث کے لیے ان کاغذ کے سفینوں کا بھی ساتھ ساتھ انتظام فرمایا جیسا کہ عنقریب انشاء اللہ ثابت ہوا جاتا ہے تاہم اللہ نے اگر یہ انتظام نہ بھی فرمایا ہوتا تب بھی صحابہ کے سینوں میں محفوظ ذخیرہ حدیث کے مجموعے حفاظت کے تمام تر تقاضے پورا کرنے کے لیے بالکل کافی تھے۔

**لاکھوں زندہ کتابیں** | ذخیرہ حدیث کے یہ زندہ مجموعے اس وقت اور بھی زیادہ وسیع اور قابل اعتماد بن جاتے ہیں جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ یہ مجموعے ایک دو نہیں دس بیس نہیں سو دو سو یا ہزار دو ہزار بھی نہیں بلکہ ایک لاکھ سے متجاوز ہیں۔ عقل خود فیصلہ کر سکتی ہے کہ حدیث کے زندہ مجموعوں کی یہ کثرت تعداد حفاظت حدیث پر کیسے غیر متزلزل یقین اور کس قدر ٹھوس اعتماد کی کیفیت پیدا کرتی ہے۔ ذرا غور تو کیجئے احادیث کا محض صرف ایک ذات یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ارد گرد آپ کی زندگی کے ایک ایک لمحے کا مشاہدہ کرنے والی لاکھوں زندہ آنکھیں۔ ایک فوکس (مرکزی نقطہ) اور ہر ہر ہمتی تصویر کشی کے لیے لاکھوں کیمرے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگر حرم مبارک میں

تشریف فرما ہیں تو آپ کے ارد گرد ازواج مطہرات کا جھگڑا ہے وہ ازواج مطہرات جن کے لیے آپ کی ذات محض ایک خاوند ہی کی حیثیت نہیں رکھتی بلکہ وہ آپ کو ہادی عالم کی حیثیت سے بھی اچھی طرح پہچانتی ہیں انہیں بخوبی معلوم ہے کہ آپ کی زندگی کے ہر عمل کو امت کے لیے اسوہ حسنہ بنایا گیا ہے وہ اسی نقطہ نظر سے آپ کی زندگی کے ایک ایک لمحے کا مشاہدہ کر رہی ہیں وہ آپ کی زندگی کے ان لمحات کی بھی امین ہیں جن کو بیوی کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔ غرض آپ حرم مبارک میں ہیں تو ازواج مطہرات آپ کے ارد گرد جمع ہیں اور اگر آپ حرم مبارک کے باہر نجی مشاغل میں مصروف ہیں تو آپ کے خدام خاص حضرت انس حضرت عبداللہ بن مسعود حضرت بلال حضرت رافع رضوان اللہ علیہم اجمعین وغیرہ آپ کی خدمت میں حاضر ہیں مسجد میں تشریف فرما ہیں تو اصحاب صفہ حلقہ بنائے آپ کے مختلف ارشادات سن رہے ہیں اور آپ کو مختلف کام کرتے دیکھ رہے ہیں۔ آپ سفر پر تشریف لے گئے ہیں تو ہزاروں صحابہ آپ کے ہم رکاب ہیں اور ایک ایک بات نوٹ کر رہے ہیں آپ کے سفر کی کیا کیفیت ہے آپ سواری پر کس طرح بیٹھتے ہیں سفر کے دوران آپ کی عادات کیا ہیں پڑاؤ پر آپ کا طرز عمل کیا ہوتا ہے اسی طرح آپ بھاد کے لیے نکلے ہیں تو تقریباً تمام ہی صحابہ آپ پر پرواہ و ارشاد سونے کے لیے حاضر ہیں۔ غرض نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک ذات مبارک اور شاہدہ کرنے والے لاکھوں۔ کیا کوئی گوشہ کوئی پہلو اندھیرے میں رہ جانے کا امکان باقی رہتا ہے اگرچہ ان عوامل کی موجودگی میں جن کا ابھی بیان ہوا ہے صحابہ جیسے جاں نثاروں کی ایک چھوٹی سی جماعت بھی ارشادات نبوی کو یاد رکھنے اور ان حالات و واقعات کو محفوظ کرنے کے لیے بہت کافی ہوتی جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اکیلی ذات کے گرد گھومتے تھے مگر یہاں تو معاملہ ہی جدا ہے۔ ان لوگوں کی تعداد جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سن کر اور دیکھ کر روایت کرتے تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت ایک لاکھ سے زیادہ تھی۔

احادیث روایت کر لے والے صحابہ کی اس کثرت کو اگر پیش نظر رکھا جائے تو منکرین حدیث

کی اس وحشت کا علاج بھی ہو جاتا ہے جو احادیث کی کثرت تعداد کو دیکھ کر انہیں ہوتی رہتی ہے کہ لاکھوں احادیث صحابہ نے اپنے حفظ کے سہارے کیسے محفوظ رکھی ہوں گی اول تو یہ لاکھوں کا عدد محض ایک مخالطہ ہے جو مباحات و شواہد اور اسناد و طرق کی حقیقت کو نہ سمجھنے کی بنا پر لگا ہے انشاء اللہ اس مخالطہ کی حقیقت اپنے مقام پر واضح ہو جائے گی تاہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرنے والے صحابہ اگر ایک لاکھ سے متجاوز تھے تو احادیث کے لاکھوں کی تعداد میں ہونے یا نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ایک ایک صحابی کے حصے میں بہت قلیل تعداد احادیث کی آتی ہے جو کا حفظ کرنا کچھ بھی مشکل نہیں چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ محدود سے چند حضرات صحابہ کو چھوڑ کر ہمیں ہم اکثرین کہتے ہیں زیادہ تر صحابہ ایسے ہی ہیں جن کی روایت کی ہوئی حدیثوں کی تعداد سو کے عدد سے بھی آگے نہیں بڑھتی۔ صحابہ کی عمومیت اصحاب العشرات (یعنی سو سے کم احادیث کے راوی) میں شمار ہوتی ہے۔ غرض حدیث روایت کرنے والے صحابہ کی اس کثیر تعداد کے پیش نظر اس بدگمانی کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ اتنی زیادہ احادیث صحابہ نے اپنے حفظ کے سہارے کیسے محفوظ رکھی ہوں گی اور اس وقت تو اس بدگمانی کا اور بھی کوئی جواز نہیں رہتا جب ہمارے سامنے یہ حقیقت آتی ہے کہ وہ ذخیرہ احادیث جو ہر صحابی نے اپنے اپنے طور پر حفظ کیا تھا محض اقوال و ملفوظات نبوی ہی پر مشتمل نہیں تھا بلکہ اس میں کثیر حصہ واقعات کا بھی شامل تھا جن کو یاد رکھنے کے لیے قوتِ حافظہ پر کوئی خاص بوجھ ڈالنے کی ضرورت نہیں ہوتی ایک عام آدمی کے ذہن میں بھی ہزار ہا واقعات کی یاد جو اس کے ساتھ گزرے ہوں پتھر کسی کوشش کے محفوظ رہتی ہے۔

ایک شخص کسی کی زبان سے کوئی بات سنتا ہے مختلف الفاظ سے مرکب کوئی جملہ اس کے کانوں میں پڑتا ہے تو اس کو یاد رکھنے کے لیے اسے باقاعدہ اپنا ذہن استعمال کرنا پڑے گا یہ غلات کسی واقعہ کے جو اس نے دیکھا اسے یاد رکھنے کے لیے ذہن کو بالارادہ استعمال کرنے کی ضرورت نہیں وہ واقعہ خود بخود ذہن پر نقش ہو جائے گا وہ جب چاہے گا اسی واقعہ کو من و عن سنا دے گا۔ حدیث صرف اقوال و ملفوظات ہی کا نام نہیں ہے بلکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جو کچھ کہتے دیکھا گیا یا آپ کے سامنے دوسروں نے جو کچھ کیا اور اس پر کہنے

نہیں فرمائی محدثین کی اصطلاح میں جسے تقریر کہا جاتا ہے ان سب واقعات کو بھی حدیث کا لفظ حاوی ہے اور حدیث کا اکثر حصہ انہی واقعات پر مشتمل ہے احادیث کے ذریعے کا تقریباً تین چوتھائی حصہ واقعات پر مشتمل ہے ذریعہ حدیث کے اس اکثر حصے کو یاد رکھنے کے لیے صحابہ کو باتا عدہ اپنا ذہن استعمال کرنے کی ضرورت نہ تھی صحابہ جو کچھ دیکھتے تھے وہ خود بخود ان کے ذہن پر نقش ہوتا جاتا تھا اس لحاظ سے بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے صادر ہونے والے اقوال و ملفوظات اور آپ کے ارد گرد وجود میں آنے والے واقعات کو یاد رکھنے کے لیے صحابہ کی ایک چھوٹی سی جماعت بھی بہت کافی ہوتی۔ مگر یہاں تو عالم یہ ہے کہ اس کام کو کرنے والے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کے وقت جیسا کہ ابھی ذکر ہوا ایک لاکھ سے اوپر تھے اور یہ تمام سنتے اور دیکھتے والے اس سماعت اور اس نظر سے سنتے دیکھتے والے نہ تھے جن سے ہر عام واقعہ سنا اور دیکھا جاتا ہے بلکہ یہ سب کے سب شمع نبوی کے پروانے حب نبوی کے دیوانے اور عظمت نبوی کے بے دام غلام تھے اور جو کچھ وہ سن رہے تھے اور دیکھ رہے تھے اس کا تعلق کسی قوم کے متفرق ادوار سے نہیں کسی ملک کے وسیع و عریض خطوں سے نہیں کسی حکومت کے پیچیدہ معاملات سے نہیں اور کسی میدان جنگ کے اطراف و جوانب میں بکھرے ہوئے واقعات سے بھی نہیں بلکہ اس کا تعلق صرف اور صرف ایک ذات سے تھا ایک واحد شخص کوئی ایک قوم نہیں کسی قوم کا کوئی ایک قبیلہ نہیں کسی قبیلے کا کوئی ایک خاندان نہیں بلکہ صرف اور صرف ایک واحد انسان جس کے گرد تمام ادوار سمٹ آئے تھے جو تمام معاملات و واقعات کا مرکز و محور تھا جو تمام کثرتوں کا مجموعہ تھا۔ انصاف سے کہیے پر اگندہ اور منتشر کثرتوں کو اکٹھا کرنے کے مقابلے میں ایک مقام پر مرکب کثرتوں کو سمیٹنا کس قدر آسان ہے اور اسی بنا پر ان مرکب کثرتوں کا صحیح پورے طور پر سمٹنا کس قدر یقینی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایسی ذات کے گرد جمع شدہ حقیقتوں کو سمیٹنے اور محفوظ کرنے کے لیے اگر صرف ایک واحد شخص ہی کو مقرر کر دیا جاتا تو یقین و اعتماد کے حصول کے لیے کافی ہو جاتا مگر یہاں تو حال یہ ہے کہ کثرتیں مجتمع اور سمیٹنے والے لاکھوں :

## ذخیرہ حدیث اور تاریخی مواد | ہجرت کی بات ہے کہ یقین و اعتماد کی ان بلندوں میں تو منکرین حدیث کو پستیاں پستیاں نظر آتی ہیں

شکوہ و شبہات اور بدگمانیوں کے عمیق غار دکھائی دیتے ہیں اور اگر حدیث بحال اس کے برعکس ہو یعنی ارد گرد حد نظر تک منتشر پراگندہ اور بکھری ہوئی کثرین اور ان کو سمیٹنے والے ایک یا دو تو شکوک و شبہات کے ان اندھیروں میں بھی انہیں یقین و اعتماد کے چراغ جلتے ہوئے نظر آتے ہیں ہمارا اشارہ عام تاریخی ذخیروں کی طرف ہے یہ تاریخی ذخیرے بن پر منکرین حدیث کو اندھا اعتماد ہے ان کی حقیقت اس کے سوا کیا ہے کہ ابتدا میں مبہم اور غیر واضح افواہوں کی صورت میں یہ تاریخی واقعات پھٹائے عالم میں بکھرے رہے پھر کیا ایک کسی کو شوق پیدا ہوا اس نے انہی افواہوں کو قلم بست کرنا شروع کر دیا اور اپنی صوابدید کے مطابق جس حصے کو یا باقی رکھا اور جسے چاہا حذف کر دیا بعد کے آتے والوں نے تراش و قیاسات کا گورکھ دھند ابھرا کر مزید کتر بیونت سے کام لیا پھر جوں جوں اس انداز میں ترتیب دئے ہوئے واقعات پر زمانہ گزرتا گیا جوں جوں واقعات سے سیاہ شدہ اور باق بوسیدہ ہوتے گئے اور جوں جوں ان کی تحریک کی سیاہی مدھم پڑتی گئی ان واقعات کے تاریخی وثیقہ ہونے پر مہر لگتی چلی گئی اور اگر کہیں کسی تحریر کو کیڑوں نے بھی اپنی خوراک بناتے بناتے کچھ حصہ قبول کرنے سے انکار کر دیا تو کیڑوں کا مسترد کیا ہوا وہ حصہ اور زیادہ تاریخی وثاقفت کی معراج پا گیا تاریخی ذخیرے میں سے کوئی ایسا تاریخی حصہ مشکل ہی سے دستیاب ہوگا جس کو قلم بند کرنے والے اس کے عینی شاہد رہے ہوں اگر بالفرض یہ مان بھی لیا جائے کہ تاریخ کا کوئی ایسا حصہ خوش قسمتی سے موجود ہے جسے ہم چشم دید گواہوں کا بیان قرار دے سکتے ہوں تو بھی ان ابتدائی راویوں کی تعداد ایک یا دو سے زیادہ نہیں آوز وہ بھی ایسے مجہول الحال کہ کچھ پتہ چین کون لوگ تھے کس دماغی قابلیت کے حامل تھے کس قسم کی اخلاقی منزلت سے بہرہ ور تھے ہمارا تمام تاریخی ذخیرہ اسی قسم کی مبہم اور غیر یقینی کوششوں کا یہ بین منت ہے۔ اگر یہ مبہم کوششیں یقین و اعتماد کی ضامن ہو سکتی ہیں تو سمجھ میں نہیں آتا کہ احادیث کا وہ ذخیرہ قابل اعتماد کیوں نہیں ہو سکتا جس کی بنیاد افواہوں پر نہیں عینی شہادتوں پر ہے جو تراش و قیاسات کا گورکھ دھند

نہیں ثابت شدہ حقیقتوں کا چمکتا دمکتا سورج ہے جس کو سننے اور دیکھنے والے ایک دو نہیں لاکھوں کی تعداد میں ہیں جن میں کوئی ایک بھی ایسا نہیں جس کے حال سے ہم واقف نہ ہوں ان عینی شاہدوں میں سے ہم ہر ایک کے بارے میں اس کے حسب و نسب اس کے کردار اس کی دماغی قابلیت اس کی اخلاقی منزلت حتیٰ کہ اس کی ذاتی عادات و خصائل سے متعلق تمام جزئی و کلی تفصیلات سے باخبر ہیں۔ ان عینی شاہدوں کے عادل و لقمہ ہونے میں کوئی عقل سے عاری ہی ہو تو شک کرے گا ورنہ ان کی ثقاہت اور ان کے عدل پر فرشتے بھی گواہ ہیں ذخیرہ حدیث کے ان امینوں کی قوتِ حافظہ بھی مجرم سے کی حد تک حیران کن ہے۔ تعصب کی تو بات ہی علیحدہ ہے ورنہ انصاف سے کہئے کہ یقین و اعتماد کے اعتبار سے تاریخی مواد اور ذخیرہ احادیث میں کیا کوئی نسبت نظر آتی ہے؟ اول الذکر میں کوتاہیوں غلط فہمیوں اور غلط فہمیوں کے اندیشے کی بنا پر شکوک و شبہات کی جس قدر گنجائش ہے یقیناً اسی نسبت سے آخر الذکر میں اپنی صحت و اقصیت کی بنا پر یقین و اعتماد کی اسی قدر عقلاً توقع ہے مگر برا ہو اس تعصب کا کہ منکرین حدیث کو روز روشن تاریک رات کی طرح نظر آتا ہے اور شب تاریک گھپ اندھیرے ٹانگ لڑائیوں کے بے نور چراغوں کے سہارے روشن دکھائی دیتے ہیں۔

بہر حال بات یہ ہو رہی تھی کہ ہر ایک صحابی اپنے اپنے علم کی حد تک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال پر مشتمل ایک زندہ کتاب تھا اور جس وقت آپ نے اس دنیا سے فانی سے کوچ فرمایا اس وقت ذخیرہ حدیث کی ان زندہ کتابوں کی تعداد ایک لاکھ سے بھی کچھ اور پر ہی تھی اس لحاظ سے اگر منکرین حدیث کا یہ دعویٰ تھوڑی دیر کے لیے تسلیم بھی کر لیا جائے کہ عہد نبوی اور عہد صحابہ میں احادیث کتابی صورت میں جمع نہیں ہوئی تھیں تب بھی ان لاکھوں زندہ کتابوں کی موجودگی میں سیاہ و سفید اوراق پر مشتمل کتابوں کی ضرورت ہی کیا تھی۔

ان زندہ کتابوں نے حفاظت حدیث کا کام کاغذ کے سفینوں سے کہیں زیادہ بہتر صورت میں اپنے سینوں

## کاغذی کتابوں کی ضرورت

کے ذریعے سے انجام دیا۔ صرف حفاظت ہی نہیں اپنے سینوں سے دوسرے سینوں میں اس امانت کی منتقلی کا کام بھی ایسی خوش اسلوبی سے انجام دیا کہ نہ اپنی طرف سے کوئی کمی کی نہ زیادتی

نہ کسی بات کو چھپایا نہ کوئی غلط بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نسبت ہونے دی اور اس طرح اس لحاظ سے بھی ان زمرہ کتابوں نے کاغذی کتابوں سے مستغنی کیے رکھا۔

امانت حدیث کی منتقلی کے کام میں بھی صحابہ کے اصحابی زمرہ الہی کا عالم یہ تھا کہ موت کے وقت بھی یہی فکر رہتا کہ کہیں کوئی حدیث ایسی نہ رہ جائے جو ہم نے ابھی تک نہ سنا ہو۔

حضرت محفل بن یسافہ رحمہ اللہ الموت طاری ہے مگر فرما رہے ہیں میں تم سے ایک حدیث بیان کرتا ہوں اگر مرض الموت میں مبتلا نہ ہوتا تو نہ بیان کرتا گو یا فکر یہ ہے کہ اگر مر گیا اور حدیث کی یہ امانت ادا نہ کر سکا تو خدا اس کے یہاں مواخذہ نہ ہو جائے۔ حضرت معاذ بن جبلؓ کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث سنا کر یہ ہدایت فرمادی تھی کہ اس کا عام اعلان نہ کیا جائے حضرت معاذ بن جبلؓ نے عمر بھر اس بات کو چھپایا مگر وقت نزوح محفل اس خوف سے وہ حدیث سنائی کہ کہیں حدیث کو چھپانے کا مرتکب نہ ٹھہرا دیا جائے۔ دراصل صحابہ کے پیش نظر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد رہتا تھا۔

مَنْ سَمِعَ عَنْ عَلِيٍّ كَلِمَةً  
أَجَلَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ بِهَا حِمَامٍ مِّنْ  
فَارِطٍ ذَا الْوَادِدِ، تَوَدَّى)۔

جس کسی سے علم کی کوئی بات ہو جسی حالے فقہ وہ  
اسے چھپائے تو قیامت کے دن اسے آگ کی  
لگام پھانسی چھائے گی۔

ایسی سخت وعید کے صحابہ سے یہ توقع کی ہی نہیں جاسکتی کہ امانت حدیث کے منتقلی کے کام میں وہ معمولی ہی کوتاہی ہی رہا رکھتے۔ عین سکرات کے عالم میں احادیث کے بیان کی فکر اسی قسم کی مولعید سے بچنے والا اہتمام تھا۔ احادیث نبویؐ کے علاوہ خود قرآن کی وہ آیت بھی اسی ضمن میں صحابہ کو مستحضر رہتی ہوگی جس میں ہدایت کی باتیں چھپانے والوں کو اللہ اور اس کے بندوں کی طرف سے لعنت کا مستحق گردانا گیا تھا۔

إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنزَلْنَا مِنْ  
الْبَيِّنَاتِ وَالْهُدَىٰ مِنْ بَعْدِ مَا بَيَّنَّاهُ  
بِالْبَيِّنَاتِ لَيَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ

جو لوگ چھپاتے ہیں اس چیز کو جو ہم کھنی نشانوں اور  
ہدایت کی باتوں میں سے انزال کر چکے ہیں اور اس کے



بعد چھپاتے ہیں جب ہم انسانوں کے لیے اسے کتاب  
 میں کھول کر بیان کر چکے ہیں یہی وہ لوگ ہیں جن پر  
 اللہ بھی لعنت کرتا ہے اور لعنت کرنے والے بھی لعنت  
 کرتے ہیں۔

لَتَأْمَنَ فِي الْكُتُبِ أُولَٰئِكَ يَلْعَنُهُمُ  
 اللَّهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللَّعْنُونَ ○  
 (البقرة : ۱۵۹)

غرض اسی قسم کی آیات قرآنی اور احادیث نبوی کی تعمیل میں صحابہ میں سے ہر صحابی کی کوشش یہ  
 تھی کہ جتنا علم بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اس تک پہنچا ہے وہ پورا کا پورا  
 بعد کے آنے والوں کے سینوں میں منتقل ہو جائے۔ گویا ذخیرہ احادیث پر مشتمل یہ زندہ کتابیں  
 کاغذی کتابوں کا یہ مقصد بھی باحسن و بوجہ پورا کر رہی تھیں کہ ان کے اوراق میں محفوظ ذخیرہ معلومات  
 دوسروں تک بہ تمام و کمال پہنچتا رہتا ہے۔

اسی طرح کاغذی کتابوں کے اوراق پر جو کچھ ایک مرتبہ نقش کر دیا جاتا ہے وہ من و عن  
 ان کتابوں کے پڑھنے والوں تک پہنچ جاتا ہے جس طرح وہ کتابیں ان نقوش میں اپنی طرف  
 سے نہ کمی کرتی ہیں نہ زیادتی بالکل اسی طرح صحابہ کے اوراق قلب پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم  
 سے سن کر اور دیکھ کر جو کچھ ثبت ہو گیا تھا اس میں کسی بھی قسم کی کوئی کمی یا زیادتی کیے  
 بغیر صحابہ نے من و عن وہ سب دوسروں تک پہنچانے میں پوری احتیاط سے کام لیا۔ یوں بھی صحابہ  
 سے اس کی توقع ہی کیسے کی جاسکتی تھی اس لیے کہ احادیث میں کسی بھی قسم کی کمی زیادتی نبی  
 کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف غلط بات منسوب کر دینے کے مترادف تھی اور صحابہ بکثرت بار بار  
 نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے اس شخص کے لیے جہنم کی وعید سن چکے تھے جو  
 آپ کی طرف غلط بات منسوب کرے۔ آپ فرمایا کرتے

میری باتیں روایت کرو اس میں کوئی حرج  
 نہیں مگر میری طرف جو جان بوجھ کر جھوٹ  
 بات منسوب کرے وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنائے گا۔

حَدَّثُوا عَنِّي وَلَا حَرَجَ وَمَنْ كَذَبَ  
 عَلَيَّ مُتَعَدًّا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ  
 النَّارِ (مسلم)

بعضی آپ اسی بات کو یوں ارشاد فرماتے



کی طرف منسوب نہ ہوتے یا اسے خصوصاً حضرت ابو ہریرہؓ تو ہمیشہ ہی اس حدیث کو کسی بھی حدیث کے بیان کرنے سے قبل شروع ہی پڑھتے تھے۔

غرض احادیث نبویؐ دوسروں تک پہنچانے میں صحابیہ نے اس بات کا بھی پورا پورا اہتمام کیا کہ جو کچھ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے سن کر اور آپ کو کرتے ہوئے دیکھ کر انہیں حاصل ہوا تھا وہ بعد کے آنے والوں تک من و عن پہنچا دیا جائے اور اس طرح صحابیہ نے جو فی الحقیقت ذخیرۂ احادیث پر مشتمل زندہ کتابوں کے مترادف تھے ہر لحاظ سے کاغذی کتابوں کی ضرورت ہی محسوس نہ ہونے دی۔ اور ای وجہ یہ کہ اگرچہ ذخیرۂ احادیث کا اکثر حصہ عہد نبویؐ اور عہد صحابیہ میں ظلم بند ہو چکا تھا تاہم احادیث کی تعداد تدریجاً کی ضرورت اس وقت محسوس ہوئی جب صحابیہ کا دور ختم ہونے لگا جب احادیث کی یہ چلتی پھرتی کتابیں دنیا سے اٹھنے لگیں۔ تب کاغذی کتابوں کی ضرورت پڑی۔ حضرت عمر بن العزیرؓ کا وہ مقولہ آج تک تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہے جو باقاعدہ تدریج احادیث کی ابتدا کرتے وقت دن کی زبان پر بے ساختہ آگیا تھا۔ جب انہوں نے اپنی حکومت کی حیثیت سے باقاعدہ اس کا اہتمام کیا کہ احادیث کو مدون کیا جائے تو یہی فرمایا کہ صحابیہ اٹھتے پہلے جا رہے ہیں حدیث پیدا ہو گیا ہے کہ کہیں احادیث کا ذخیرہ خارج نہ ہو جائے۔ گویا جب تک صحابیہ موجود تھے۔ حدیث کا ذخیرہ محفوظ تھا اور اوراق پر مشتمل کتابوں سے بے نیاز تھا اب جبکہ حدیث کے یہ زندہ نسخے دنیا سے رخصت ہو رہے ہیں تو ضروری ہو گیا ہے کہ اس علم کو باقاعدہ کتابوں کی صورت میں یکجا کر لیا جائے۔

بہر حال حفظ حدیث کے سلسلے میں اب تک جو کچھ کہا گیا ہے وہ یہ ثابت کرنے کے لیے بہت کافی ہے کہ تحریر و کتابت کے بغیر بھی صرف حفظ اور یادداشت کے راستے سے ہی احادیث کا ذخیرہ پوری طرح محفوظ رہ سکتا تھا اور حتماً یہ محفوظ رہا۔ یہ حقیقت حال یہ ہے کہ حفظ کے ساتھ ساتھ کتابت حدیث کا بھی اہتمام عہد نبویؐ اور عہد صحابیہ ہی میں پورا کیا گیا جیسا کہ انشاء اللہ ابھی ثابت ہوا جاتا ہے۔

# کتابت حدیث اور صحابہ رضی

یہ ثابت ہو جانے کے بعد کہ احادیث کا ذخیرہ تحریر و کتابت کی مدد کے بغیر ہی صرف حفظ اور یادداشت کے ذریعے بہ تمام و کمال محفوظ رہ سکتا تھا اور رہا اگرچہ اس بات کی کوئی اہمیت نہیں رہی کہ احادیث عہد نبوی و عہد صحابہ میں قلم بند ہوئیں یا نہیں تاہم محترم خدین کا منہ بند کرنے کے لیے اور حقیقت کے اظہار کی خاطر اب ہمیں اس بات کا جائزہ لینا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ میں اور آپ کے بعد کے متصالح زمانے میں ذخیرہ احادیث کا کس قدر حصہ قید تحریر میں آچکا تھا۔

جیسا کہ اس سے پہلے بھی عرض کیا جا چکا ہے احادیث کی کوئی تفصیل تعداد نہیں بلکہ ان کا ایک غالب حصہ عہد نبوی اور عہد صحابہ ہی میں مکتوب صورت میں بھی محفوظ ہو چکا تھا اس وقت احادیث کا جتنا ذخیرہ ہمارے ہاتھوں میں موجود ہے اس کی کوئی معمولی مقدار نہیں بلکہ اکثر حصہ ان لوگوں کے ہاتھوں قید تحریر میں آچکا تھا جو اس تمام تر ذخیرے کے اولین مخاطب تھے صحابہ نے احادیث کو حفظ کے ساتھ ساتھ کتابت کے ذریعے سے بھی پوری طرح محفوظ کر لیا تھا۔ لوگ تو دو سو سال کی بات کرتے ہیں کہ احادیث کتنا بی صورت میں دو سو سال بعد آئیں اور اس کے لیے امام بخاری اور امام مسلم رحمہما اللہ تعالیٰ کے سین و فات کو ثبوت کے طور پر پیش کر دیتے ہیں جبکہ ہمارا دعویٰ ان کے علیٰ انہم یہ ہے کہ دو سو سال تو بہت دور کی بات ہے جو ہالت کے سوا کچھ نہیں یہ مدت سو سال کے عرصہ پر بھی محیط نہیں ہے جیسا کہ بعض اصحاب علم کو مخالفہ لگا ہے اور انہوں نے ابن شہاب زہری کو وہ پہلا شخص قرار دیا ہے جس نے سب سے پہلے احادیث کو مدون کیا اصل میں بات اس سے بھی آگے بڑھ کر جو کہی جا رہی ہے وہ یہ ہے کہ دو سو سال بعد یا ایک سو سال بعد کی باتیں تو خلاف واقعہ ہیں ہی اس سے نصف مدت بعد کی

بات بھی اگر کی جائے تو خلاف واقعہ ہی ہوگی کیونکہ امر واقعہ تو یہ ہے کہ احادیث نبوی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اور خلفائے راشدین ہی کے عہد میں قید تحریر میں آپکی تھیں اور بخوشی بہت نہیں موجودہ ذخیرہ احادیث کا اکثر حصہ قلم بند ہو چکا تھا۔

اس پر تفصیلی گفتگو کرتے سے پہلے ضروری

## فن کتابت اور عرب یا شندے

معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلے میں ایک بنیادی

غلط فہمی کا انزالہ کر دیا جائے دراصل تحریر و کتابت حدیث کے سلسلے میں لوگوں کو دھوکہ یہ لگتا ہے کہ آغاز اسلام کے زمانے میں نہ تو تحریری ساز و سامان ہی پورے طور پر دستیاب تھا نہ عرب میں ہی کچھ زیادہ لکھنے لکھانے کا رواج تھا لکھنا جاننے والے بھی چند گنے چنے لوگ تھے ایسی صورت میں احادیث کے پورے ذخیرے کا قلم بند ہو جانا ناممکن نہیں تو انتہائی مشکل ضرور نظر آتا ہے اگر احادیث قلم بند ہوتی بھی ہوں گی تو چند متفرق چھوٹے چھوٹے جزو و چند مخصوص لوگ تیار کر پاتے ہوں گے۔ اس مغالطے کی اصل وجہ زمانہ جاہلیت کی اصطلاح ہے اسلام سے قبل کا زمانہ جاہلیت کا زمانہ کہلاتا ہے مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ اس زمانے کے لوگ اس معنی میں جاہل تھے کہ انہیں لکھنے پڑھنے سے کوئی واسطہ ہی نہ تھا وہ لکھنے پڑھنے کے سامان قلم و دوات کا غذا اور کتاب وغیرہ سے کوئی سروکار ہی نہ رکھتے تھے۔ لفظ فی الحقیقت علم قرآن و حدیث کے مقابلے میں بولا جاتا ہے گویا جب تک اسلام کا علم نہیں آیا اس وقت تک کا زمانہ بحالت کا زمانہ تھا۔ قرن اولیٰ میں علم نام ہی صرف علم دین کا تھا علم دین کے علاوہ جو کچھ بھی تھا اسے بہالت تصور کیا جاتا تھا۔ جاہلیت دراصل قرآن کی ایک اصطلاح ہے ایک سے زائد مقامات پر قرآن نے اپنی اس خاص اصطلاح کا تذکرہ کیا ہے۔ اس قسم کی جتنی آیات قرآنی ہیں ان کے مفہوم میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ خاص قسم کے ملحدانہ خیالات کا فرانہ عقائد اور فاسقانہ عادات و اطوار کی تعبیر جاہلیت کے لفظ سے کی گئی ہے ورنہ جہاں تک نورشت و خواند کا تعلق ہے اس زمانے میں بھی جسے ہم زمانہ جاہلیت سے تعبیر کرتے ہیں عرب باشندوں کی بھی قریب قریب وہی حالت تھی جو اس زمانے کے عموماً کامل متمدن ممالک نہیں تو کم از کم نیم متمدن ممالک کی تھی۔ دراصل اس

زمانے میں تقریباً ہر ملک اور ہر قوم میں لکھنے پڑھنے والوں کا ایک خاص علیحدہ پیشہ ور طبقہ ہوتا تھا عام لوگوں کو اس کام سے چنداں سروکار نہ ہوتا تھا کسی ملک میں لکھنے پڑھنے کا کام پادریوں کے سپرد تھا تو کسی میں موبد یہ کام سرانجام دیتے تھے ہندوؤں میں مثال کے طور پر یہ کام خاص برہمنوں سے متعلق تھا عرب میں بھی قریب قریب یہی حال تھا عرب باشندوں کی اکثریت یقیناً لکھنے پڑھنے کے فن سے آشنا نہ تھی لیکن ہر شہر میں ایسے لوگ ضرور پائے جاتے تھے جو اس فن سے پوری طرح آشنا تھے اور لکھنے پڑھنے کا کام انجام دیتے تھے اور اس طرح مجموعی طور پر عرب میں ایک اچھی خاصی تعداد لکھنا پڑھنا جاننے والوں کی موجود تھی نہ صرف مرد بلکہ بعض عورتیں بھی ایام جاہلیت میں ایسی پائی جاتی تھیں جو نوشت و خواندہ سے بخوبی واقف تھیں شرفا ہی نہیں بلکہ غلاموں میں بھی اس فن سے آشنا افراد موجود تھے۔ عیسائیوں کے گرجے عرب میں جہاں کہیں تھے ہر ایک میں مختلف مذہبی کتابوں کی موجودگی کا ثبوت ملتا ہے۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے مطابق اس زمانے میں عیسائی گرجوں میں اس قسم کی تقریباً ۷۷ (ہتر) کتابیں پھیلی ہوئی تھیں۔ یہودی مذہب کی کتابوں کا بھی اچھا خاصہ ذخیرہ مدینہ منورہ اور خیر وغیرہ میں جہاں کہیں بھی عرب میں یہودی آباد تھے موجود تھا ان کتابوں کا ذکر بھی بہ کثرت تاریخ و سیر کی کتابوں اور تفسیری روایات کے ذخیروں میں اب بھی ملتا ہے۔ عرب کے عیسائیوں اور یہودیوں کے علاوہ بھی عرب کے عام جاہلی خاندانوں میں ایک کتاب کے عام رواج کا پتہ چلتا ہے جس کا نام مجاہد لقمان تھا کہتے ہیں بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بھی ایک بار یہ کتاب لائی گئی تھی ابراہیموں کے شاہنامہ کا عربی ترجمہ مکہ میں بعض لوگوں کے پاس موجود تھا شام سے بھی اسی قسم کے تاریخی طرز پیر کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ نصیر بن حارث وقتاً فوقتاً لے لایا کرتا تھا۔ دمشق میں علامہ سیوطی نے ایسی روایات نقل کی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ عرب کے بازاروں میں یہودی کتابوں کی باقاعدہ تجارت کرتے تھے نیز بائبل کا عربی ترجمہ کر کے عربوں کے درمیان اس کی اشاعت کیا کرتے تھے اور یہ تو بہت مشہور بات ہے عام لوگ بھی اس سے واقف ہیں بخاری میں بھی ہے کہ مکہ میں ورقہ بن نوفل تورات و انجیل کا ترجمہ عربی میں کیا کرتے تھے طائف کے ایک باشندے حارث بن کلدہ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے ایران کی مشہور طبی درسگاہ

جند ساہواریں طب کی تعلیم حاصل کی تھی اور عربی میں علم طب پر ایک کتاب بھی اس نے لکھی تھی۔ یمن وغیرہ میں مختلف خاندانوں کے پاس کتابوں سے بھرے ہوئے صندوق موجود تھے عرب شاعروں کے قصائد مکتوبہ شکل میں پائے جاتے تھے سبع معلقات کے نام سے کون واقف نہیں آخر وہ قصائد جو بیت اللہ میں مختلف شاعروں کی طرف سے لٹکائے گئے تھے لکھے ہوئے ہی تو تھے۔ مختصر یہ ہے کہ جاہلیت کے لفظ سے مکمل جہالت کا جو ماحول سمجھ لیا جاتا ہے وہ قطعاً درست نہیں ہے نوشت و خواند کے معاملے میں عرب بالکل ہی تہی دست نہ تھے۔

اس موضوع پر بہت کچھ لکھا جاسکتا ہے مگر حقیقت حال کی وضاحت کے لیے اتنا ہی کافی ہے جاہلیت کے لفظ سے دھوکہ کھا کر یہ نہیں سمجھ لینا چاہیے کہ عرب باشندے لکھنے پڑھنے کے فن سے اس حد تک کورے تھے کہ تحریر و کتابت کے ساز و سامان تک سے نا آشنا تھے سمجھ میں نہیں آتا جو شخص قرآن پڑھتا ہے وہ کیسے اس بات پر یقین کر سکتا ہے کہ قرآن ایسے لوگوں کے لیے نازل کیا گیا تھا جو پڑھنا لکھنا بالکل جانتے ہی نہ تھے بھلا جس کتاب کا نام ہی قرآن ہو یعنی پڑھی جانے والی چیز اس کے بارے میں کیسے یہ سمجھ لیا جائے کہ وہ ان لوگوں کی طرف سے بھیجی گئی تھی جو پڑھنے کے لفظ تک سے واقف نہ تھے۔ جس کتاب میں کھولنے کے ساتھ ہی پہلی ہی لائن میں ذلک الکتاب کے الفاظ نظر آتے ہوں اس کے متعلق کیونکہ یہ باور کر لیا جائے کہ وہ ایسے لوگوں میں اتری تھی جو کتابت کے فن سے بالکل عاری تھے جو کتاب رو شنائی، دوات، سفرہ، کا تبین اور سبیل جیسے الفاظ سے بھری پٹری ہو جس کی تقریباً ہر پٹری سورت میں کتاب کا کاغذ کا اور لوح کا ذکر آتا ہو اور جس کے نزول کی ابتدا ہی پڑھنے لکھنے اور قلم کے ذکر سے ہوتی ہو کون خیال کر سکتا ہے کہ ایسی کتاب اپنے لوگوں کے درمیان نازل کی گئی تھی جو نوشت و خواند کے سامان و آلات تک سے ناواقف تھے۔ بھلا غور تو کیجئے قرآن کے مخاطبین اگر ناخواند تھے اور لکھنا نہ جانتے تھے تو قرآن کی اس آیت میں پھر آخر کن لوگوں کو خطاب کیا گیا تھا:

اے ایمان والو جب تم کسی مدت معینہ کے لیے ایک دوسرے کو قرض دو تو اسے لکھ لیا کرو۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا مَدَّ إِلَيْكُمْ مَدِينٌ  
إِلَى أَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوهُ (البقرة: ۲۸۲)

قرآن اگر ایسے لوگوں کے درمیان اُترا تھا جو لکھنے پڑھنے کے فن سے واقف ہی نہ تھے تو قرآن کے اس کہنے کا کیا مطلب تھا کہ

وَلَا تَسْمَعُوا أَنْ تَكْتُبُوا صَغِيرًا | قرص چھوٹا ہو یا بڑا اسے ضبط تحریر میں لانے سے نہ آتا۔

ذرا سوچئے تو سہی جو لوگ لکھنا جانتے ہی نہیں ان کے آگے کا سوال ہی کب پیدا ہوتا ہے معلوم ہوتا ہے قرآن جن سے مخاطب ہے وہ بخوبی لکھنا جانتے ہیں بلکہ قرآن کا یہ عام خطاب تریہ بتلاتا ہے کہ عام آدمی لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔

**آلات کتابت کی دستیابی** | دراصل یہ غلط فہمی کتابت قرآن کے سلسلے میں بیان کی جانے والی ان روایتوں سے بھی پیدا ہوئی ہے جن میں ذکر کیا گیا ہے کہ شروع شروع میں قرآنی آیات ہڈیوں پر، کھجور کی ٹہنیوں پر، چمڑے کے ٹکڑوں پر یا پتھروں پر لکھی جاتی تھیں۔ پس اسی سے یہ نتیجہ اخذ کر لیا گیا کہ اس کی وجہ آلات نوشت و خواندگی کمی تھی عظم، عیب، نجات اور ادم کے الفاظ سے یہ سمجھ لیا گیا کہ ان سے مراد گری، بڑی، بڈیا، نازہ یا سوکھی ہوئی کھجور کی ٹہنیاں، بن گھڑے، بے ڈول پتھر اور کچے پکے چمڑے کے ٹکڑے ہیں۔ حالانکہ غور کرنے کی بات ہے کہ ان چیزوں میں اتنی وسعت ہی کب ہوتی ہے کہ ان پر قرآن جیسی ضخیم کتاب کے اجزاء تحریر میں لائے جاسکیں۔ دراصل یہ تمام الفاظ اصطلاح کے طور پر استعمال ہوئے ہیں۔ وہ تمام چیزیں جو اس زمانے میں مصنوعی طریقوں سے لکھنے کے کام کے لیے تیار کی جاتی تھیں ان کو ان اصطلاحی الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے لکھنے کی جس چیز کی تیاری میں ہڈی کام میں لائی جاتی تھی اس کے لیے عظم کا لفظ ہی اصطلاحی انداز میں اختیار کر لیا گیا اسی طرح کھجور کی شاخوں سے لکھنے کے لیے جو تختہ تیار کیا جاتا ہوگا اسے عیب کے لفظ سے تعبیر کیا جانے لگا انہی پر چمڑے کے ٹکڑوں اور پتھر کے پتروں کو قیاس کر لیجئے۔ غرض ان الفاظ سے عام چیزیں ہڈی، چمڑا، پتھر وغیرہ ہرگز مقصود نہ تھیں موجودہ زمانے میں بھی ہم لکڑی اور پتھر کو لکھنے کے کام میں لاتے ہیں مگر ان کے لیے ہم علیحدہ تختی اور پلیٹ کی اصطلاحیں استعمال کرتے ہیں ورنہ حقیقت میں تو وہ لکڑی اور پتھر ہی ہیں اسی طرح اس زمانے میں کچھ چیزیں لکھنے کے کام میں لائی جاتی تھیں جن کو عظم، عیب



لغات اور ادم کے الفاظ سے تعبیر کیا جاتا تھا۔

بہر حال بات یہ ہو رہی تھی کہ کتابت قرآن سے متعلق ان روایتوں کا اثر کتابت حدیث پر بھی پڑا اور سطحی علم رکھنے والوں نے سمجھا کہ ابتداء میں سامان کتابت کی کمی کی وجہ سے احادیث قید تحریر میں نہ آسکی ہوں گی حالانکہ یہ امر واقعہ کے بالکل خلاف ہے۔ اتنی بات تو مسلم ہے کہ عرب میں مسر کا کاغذ یا چین کا بنا ہوا کاغذ دستیاب نہ تھا مگر پھر بھی اس زمانے میں لکھنے کی جو عام چیز تھی اور جسے عربی میں رقی کہتے تھے اس کی عرب میں کوئی کمی نہ تھی۔ عرب میں اس کی کمی کی کوئی وجہ بھی سمجھ میں نہیں آتی اس لیے کہ یہ رقی جسے آپ پارچہ ٹپ یا شیت یا تختہ کے لفظ سے تعبیر کر سکتے ہیں جانوروں کے معدے کے پاس کی باریک جھلیوں سے تیار کیا جاتا تھا اور یہ کسے معلوم نہیں کہ عرب باشندوں کی عام خوراک گوشت تھی۔ عرب جیسے گوشت کھانے والے ملک میں یہ جھلیاں جتنی وافر تعداد میں فراہم ہو سکتی ہیں وہ محتاج بیان نہیں۔ معدے کی جھلیوں کے علاوہ لکھنے کے یہ شیت شتر مرغ یا خرگوش وغیرہ کی باریک کھالوں سے بھی تیار ہوتے تھے اور ان چیزوں کی بھی ظاہر ہے عرب میں کوئی قلت نہ تھی۔ غرض رقی عرب میں وافر مقدار میں دستیاب تھا اور اس زمانے کے لحاظ سے یہ رقی کاغذ ہی کا متبادل تھا۔ ہڈی چمڑے اور پھنز وغیرہ سے بنی ہوئی چیزیں تو دراصل زیادہ تر حفاظت اور پائیداری کے نقطہ نظر سے استحصال کی جاتی تھیں ورنہ عام حالات میں رقی ہی لکھنے کے کام آتا تھا۔

**فن کتابت سے واقف صحابہ** | غرض عرب میں نہ لکھنے پڑھنے کے ساز و سامان کا قحط تھا نہ لکھنا پڑھنا جاننے والوں کی کوئی

کمی تھی جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا عرب باشندوں کی اکثریت تو واقعی لکھنے پڑھنے کے فن سے آشنا نہ تھی تاہم ایک اچھی خاصی تعداد عرب کے مختلف شہروں میں ایسے لوگوں کی موجود تھی جو نوشت و خواندہ سے بخوبی واقف تھے مرد تو مرد عورتیں بھی بعض ایسی مل جاتی تھیں جو اس فن سے پوری طرح آشنا تھیں چنانچہ صحابہ میں بھی بہت سے لوگ لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ خلفائے اربعہ کے علاوہ حضرت ابی بن کعب حضرت زید بن ثابت حضرت خالد بن ولید حضرت

عمر بن العاص حضرت عبداللہ بن عباس حضرت معاویہ بن ابی سفیان حضرت مغیرہ بن شعبہ حضرت حنظلہ حضرت زبیر بن عوام حضرت ثابت بن قیس حضرت عامر بن ثمر اور حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہم اجمعین کے نام لکھنا پڑھنا جاننے والوں میں سرفہرست ہیں۔ ان کے علاوہ بھی اور بہت سے ایسے صحابہ کے نام لیے جاسکتے ہیں جو لکھنا پڑھنا جانتے تھے آثار و سیر کی کتابوں سے اگر ایسے تمام صحابہ کے نام جمع کیے جائیں تو یقیناً سینکڑوں سے متجاوز ہو جائیں اسی سے اندازہ لگایں کہ وحی قرآنی کی کتابت جن صحابہ کے سپرد تھی ان کی تعداد نسبتاً ایسی تک جا پونچھتی ہے ۔

**کتابت سکھانے کا خصوصی اہتمام** | نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت کچھ لوگ تو پہلے ہی سے لکھنا جانتے تھے

تاہم خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی صحابہ میں فن کتابت کو عام کرنے کے لیے خصوصی اہتمام فرمایا۔ مسجد نبوی میں قائم ہوتے والی سب سے پہلی درسگاہ جو ایک سائبان اور ایک چبوترے پر مشتمل تھی اور جسے درسگاہ صفہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اس میں قرآن و حدیث کی تعلیم کے ساتھ ساتھ لکھنا پڑھنا بھی سکھایا جاتا تھا چنانچہ حضرت عبادہ بن الصامتؓ سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں صفہ میں لوگوں کو لکھنا سکھانے اور قرآن پڑھانے پر مامور فرمایا تھا حضرت عبداللہ ابن مسعود بن العاصؓ کو بھی جو فن کتابت کے ماہر سمجھے جاتے تھے اور بڑے خوشنویس تھے نیز زمانہ جاہلیت میں بھی ماہر کتابت کی حیثیت سے مشہور تھے انھیں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا تھا کہ وہ مسلمانوں کو لکھنا سکھائیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خواہش تھی کہ زیادہ سے زیادہ لوگ لکھنے پڑھنے کے فن سے واقف ہو جائیں چنانچہ جنگ بدر کے ان قیدیوں کے بارے میں جو قیدیہ دے کر رہائی حاصل نہ کر سکے تھے آپ نے اعلان فرمایا کہ جو قیدی دس مسلمان بچوں کو فن کتابت سکھا

دے گا اس کو رہائی دے دی جائے گی۔ ۳۰ مردوں کے ساتھ ساتھ آپ عورتوں کو بھی لکھنے پڑھنے کے فن سے روشناس کرنا ضروری سمجھتے تھے چنانچہ امام مسلم کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شفاء بنت عبد اللہؓ امام المؤمنین حضرت صفیہؓ کو لکھنا سکھایا کرتی تھیں۔

## حدیث کی عام کتابت | غرض کتابت حدیث کے سلسلے میں اس خیال کی ایک مفرغ

سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں کہ سامان کتابت کی قلت کی بنا پر یہاں کتابت سے ناواقفیت کی وجہ سے احادیث قید تحریر میں نہ آسکی ہوں گی۔ امر واقعہ یہ ہے کہ حفظ حدیث کے ساتھ ساتھ صحابہ کتابت حدیث کا بھی پورا پورا اہتمام کرتے تھے اور جس کو لکھنا آتا تھا وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کو لکھ کر بھی محفوظ کرتا جاتا تھا۔ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی یہ روایت اس پر شاہد ہے آپ فرماتے

ہیں: کُنَّا نَعُوذُ أَنْ نَكْتَبَ مَا نَسْمَعُ مِنْ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ | ہم حضور کے گرد بیٹھے ہوئے جو کچھ آپ سے سنتے لکھتے جاتے تھے۔

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے صحیح مسلم کا صیغہ استعمال کیا ہے گویا احادیث لکھنے کا عمل صرف حضرت ابوسعید تک محدود نہ تھا بلکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد بیٹھے ہوئے دیگر صحابہ بھی احادیث لکھتے جاتے تھے گویا صورت حال یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم درمیان میں تشریف فرما ہیں اور آپ کے ارد گرد صحابہ حلقہ بنائے بیٹھے ہیں آپ جو کچھ فرماتے جاتے ہیں صحابہ لکھتے جاتے ہیں۔ حضرت ابوسعید خدری کی اس

روایت کی تائید حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص کے ان الفاظ سے بھی ہوتی ہے۔ فرماتے ہیں: بَيْنَا نَحْنُ خَوْلُ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ | جب ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس علیہ وسلم نکتب (جامع بیان العلم) بیٹھے لکھ رہے تھے۔

اس قسم کی روایات کا اندازہ ذرا غور تو کیجئے کیا بتلا رہا ہے یعنی بات صرف اتنی ہی نہیں کہ صحابہ

اپنے طور پر احادیث لکھا کرتے تھے بلکہ بات اصل یوں بنتی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم لکھاتے جاتے تھے اور صحابہ لکھتے جاتے تھے۔ اس پس منظر میں ان روایات کا مفہوم اور زیادہ کھل کر واضح ہو جاتا ہے جن میں کہا گیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب کوئی بات ارشاد فرماتے تو اسے تین بار دہراتے حضرت انس کی روایت کے الفاظ یہ ہیں :

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب کوئی بات ارشاد فرماتے تو تین مرتبہ دوہراتے یہاں تک کہ وہ خوب سمجھ میں آجاتی -

كَانَ إِذَا تَكَلَّمَ بِكَلِمَةٍ أَعَادَهَا ثَلَاثًا حَتَّى تَفْهَمَ عَنْهُ -

(بخاری باب من أعاد الحديث ثلاثاً) -

گویا آپ اس بات کا خیال رکھتے کہ میری کئی ہوئی بات کا ایک ایک کلمہ حجابین تک پورا پورا پہنچ جائے۔ ظاہر ہے ایسی حالت میں صحابہ احادیث کا ایک ایک لفظ پوری صحت کے ساتھ قلم بند کر لیتے ہوں گے بعض روایات سے تو یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ احادیث قلم بند کرنے کے بعد بعض صحابہ اصلاح و تصحیح کی خاطر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھی پیش کیا کرتے تھے۔ چنانچہ حضرت انسؓ اپنی اکھٹی ہوئی احادیث کے بارے میں فرمایا کرتے تھے کہ میں انکو لکھ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر پیش کر چکا ہوں۔ متدرک میں سعید بن ہلال کا بیان ہے :

ہم جب حضرت انس رضی اللہ عنہ سے زیادہ پوچھ گچھ کرتے تو وہ اپنے پاس سے ایک چونگہ نکالتے اور فرماتے یہ ہیں وہ حدیثیں جو میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سُن کر لکھیں اور لکھ کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ان کو پیش کر چکا ہوں -

كَانَ إِذَا أَكْثَرْنَا عَلَى النَّبِيِّ بْنِ مَالِكٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ فَأَخْرَجَ إِلَيْنَا حِجَالًا عَنْهُ فَقَالَ هَذِهِ سَمِعْتُهَا مِنَ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَكُتِبَتْهَا وَعُزِّقَتْهَا عَلَيْهِ (مسندک للحاکم)

مسند ادرمی میں بھی یہ روایت تھوڑے سے رد و بدل کے ساتھ موجود ہے حضرت انس کو خادم خاص ہونے کی بنا پر جو قرب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا حاصل تھا وہ محتاج بیان نہیں اس لحاظ سے احادیث تحریر کرنے کا خوب موقع ملا ہو گا اور حضرت انس وہ ہیں جو بچپن ہی سے لکھنے کے فن سے خوب واقف تھے چنانچہ ان کی والدہ نے ان کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش

کرتے وقت خاص طور سے ان کی اس مہارت کتابت کا ذکر کیا تھا اور کہا تھا یا رسول اللہ! ہذا ابی وھو غلام کاتب (اسد الخابہ) یہ میرا بیٹا ہے ابھی بچہ ہے مگر فن کتابت جانتا ہے۔

بہر حال یہ تمام روایات یہ بتلاتی ہیں کہ احادیث کو قید تحریر میں لانا صحابہ کی ایک عام عادت تھی۔ صحابہ میں سے جس کو بھی لکھنا آتا تھا وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کو یاد کرنے کے ساتھ ساتھ لکھ بھی لیتا تھا۔ بعض صحابہ اس لیے بھی احادیث کو لکھنے کا خصوصی اہتمام کرتے تھے کہ اس طرح احادیث حفظ کرنے میں انہیں آسانی ہو جاتی تھی جیسا کہ حضرت عبداللہ بن عمرو فرماتے ہیں کہ

کنت اکتب کل شیء اسمعه من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اریذ حفظہ  
 میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو کچھ سنتا تھا اسے لکھ لیا کرتا تھا اس ارادے سے کہ اسے یاد کروں گا۔

حفظ میں آسانی کے علاوہ صحابہ کو سب سے زیادہ نگر اس بات کا رہتا تھا کہ کہیں کوئی غلط بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب نہ ہو جائے ان کے پیش نظر ہر وقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ ارشاد رہتا تھا جس میں غلط بات منسوب کرتے واسے کے لیے بہنم کی وعید سنائی گئی تھی پھر صحابہ کو یہ بات بھی پوری طرح مستحضر تھی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف غلط بات منسوب کرنا خدا پر جھوٹ باندھنے کے مترادف ہے اور خدا پر جھوٹ باندھنے واسے کو قرآن نے جہاں جاسے بڑا ظالم ٹھہرایا تھا اس قرآنی الزام اور وعید نبوی سے بچنے کی خاطر بھی صحابہ حفظ کرنے کے ساتھ احادیث کو لکھتے بھی جاتے تھے چنانچہ ایک موقع پر حضرت عبداللہ بن عمرو کے ایک سوال کے جواب میں صحابہ کبار کی ایک جماعت نے اسی حقیقت کا اظہار بڑے واضح الفاظ میں فرمایا :

یہ سوال و جواب حضرت عبداللہ بن عمرو ہی کی زبانی سنئے وہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ

کان عند رسول اللہ ناس من اصحابہ وانا معهم وانا اصغر القوم فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم من کذب علی متعذراً قلت بوا مقعدۃ من النار فلما خرج القوم قلت  
 رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں صحابہ کی ایک جماعت حاضر تھی اور میں بھی ان میں تھا اور میں سب سے چھوٹا تھا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو مجھ پر قصداً جھوٹ باندھتا ہے وہ اپنا ٹھکانہ جہنم بنائے جب مجلس برخواست ہوئی تو میں نے صحابہ

كَيْفَ تَحَدِّثُونَ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ وَقَدْ  
سَمِعْتُمْ مَا قَالُوا وَانْتَقَرْتُمْ عَنْهَا كُنْ فِي  
الْحَدِيثِ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ فَضِيحًا وَقَالُوا يَا  
ابْنَ أَخِيْنَا إِن كُلَّ مَا سَمِعْنَا مِنْهُ عِنْدَنَا  
فِي كِتَابٍ (مجمع الزوائد)

کہا کہ آپ نے حضور کے ارشاد کو سنا پھر آپ لوگ  
حدیث بیان کرنے کی جرات کیسے کرتے ہیں صحابہ نے  
سنتے ہوئے جواب دیا اے بھتیجے ہم نے رسول اللہ  
صلی اللہ علیہ وسلم سے جو کچھ سنا ہے وہ ہمارے پاس  
لکھا ہوا موجود ہے۔

یعنی لکھا ہوا ہونے کی بنا پر ہمیں پورا اطمینان ہے کہ ہم کوئی غلط بات آپ کی طرف منسوب کرنے کے  
جرم کا ارتکاب نہیں کر رہے ہیں۔ اس روایت کے بیان کرنے والوں کے بارے میں بھی نے تصریح  
کی ہے کہ سب صحیح بخاری کے راوی ہیں :

**کاتبین حدیث** غرض اس امر میں کوئی شبہ نہیں کہ صحابہ کرام کی ایک واضح تعداد احادیث  
نبوی کو حفظ کرنے کے ساتھ ساتھ لکھ کر بھی محفوظ کرتی تھی صحابہ کا جو  
طرز عمل قرآن کے بارے میں تھا کہ حفظ بھی کرتے تھے اور مختلف اجزاء میں لکھ کر بھی اسے محفوظ  
کرتے جاتے تھے یہی طرز عمل احادیث کے بارے میں بھی تھا احادیث کو بھی محفوظ اور کتابت  
دونوں طریقوں سے محفوظ رکھا جاتا تھا۔ اگر ان روایات کو پیش نظر رکھا جائے جن سے معلوم  
ہوتا ہے کہ بعض مخصوص صحابہ کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے کتابت حدیث کی خصوصی  
اجازت ملی ہوئی تھی تو بلا تکلف یہ کہا جاسکتا ہے کہ جن طرح قرآن کی کتابت کے لیے کاتبین  
وحی مقرر تھے اسی طرح احادیث کی کتابت کے لیے بھی بعض صحابہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف  
سے کاتبین حدیث کی حیثیت کے حامل تھے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص ان لوگوں میں  
شامل ہیں جن کو کتابت حدیث کی خصوصی اجازت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ملی ہوئی  
تھی اپنی اس اجازت کا حال بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

حضرت عبداللہ بن عمرو سے روایت ہے کہ وہ  
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں

عن عبد الله بن عمرو رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ يَا رَسُولَ  
اللَّهِ صَلِّ عَلَى مُحَمَّدٍ وَعَلَى آلِهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ يَا رَسُولَ

اللہ انی اريد ان اروي من حديثك  
فاردت ان استعين بكتاب يدي  
مع قلبي ان رايت ذلك فقال رسول  
اللہ ان كان حديثك ثم استعين  
بيدك مع قلبك (سنن دارمی)

حاضر ہوئے اور عرض کیا میں چاہتا ہوں کہ آپ کی  
حدیثیں روایت کروں میرا ارادہ ہے کہ دل کے  
ساتھ ساتھ اپنے ہاتھ سے دل کی مدد بھی لوں اگر  
آپ یہ پسند فرمائیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم  
نے فرمایا اگر میری حدیث ہو تو پھر اپنے دل کے  
ساتھ اپنے ہاتھ سے بھی مدد لو (یعنی لکھ لیا کرو)

اس اہواز کے بعد معلوم ہوتا ہے حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص نے کتابت حدیث میں اس قدر  
انہماک سے کام لیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے جو کچھ سنا اسے تلم بند کر لیا چنانچہ خود ہی فرماتے ہیں:

كنت أكتب كل شيء سمعته  
من رسول الله صلى الله عليه وسلم  
أريد حفظه فمنعتني قريني فقالوا  
أنك تكذب كل شيء تسمعه من  
رسول الله ورسول الله بشر  
يتكلم في الغضب فامسكت  
عن الكتابة فذكرت ذلك لرسول  
الله صلى الله عليه وسلم فقال  
اكتب والذي نفسي بيده  
ما حوج مني الا الحق  
(سنن دارمی)

میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو کچھ سنتا  
تھا اسے لکھ لیتا تھا اس ارادے سے کہ اسے  
یاد کروں گا لیکن قریش نے مجھے منع کیا اور کہا کہ  
تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو سنتے ہو لکھ  
لیتے ہو حالانکہ آپ بشر ہیں اور غصہ میں بھی کچھ  
فرمادیتے ہیں میں نے (یہ سن کر) لکھنا ترک  
کر دیا پھر میں نے اس کا ذکر رسول اللہ صلی اللہ  
علیہ وسلم سے کیا تو آپ نے فرمایا جو مجھ سے سنا  
کر و ضرور لکھ لیا کہ اس کی قسم جس کی قدرت میں  
میری جان ہے میری زبان سے حق کے علاوہ کچھ  
نہیں نکلتا۔

اس روایت سے جہاں یہ معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کتابت حدیث سے منہاں  
حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص کو دی ہوئی امانت کو بحال رکھا وہاں یہ بھی معلوم ہوا کہ آپ نے  
اس امر کی بھی توثیق فرمادی کہ میری ہر بات کو لکھ کر محفوظ کر لیا جائے اس توثیق نبوی کی

تائید مسند احمد کی اس روایت سے بھی ہوتی ہے جس میں ذکر ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمروؓ نے ایک بار بڑی صراحت کے ساتھ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہی سوال کیا کہ

اَلْاُكْتُبُ كُلَّ مَا سَمِعْتُ قَالَ نَعَمْ  
قَالَ فِي الرَّضَى وَالْغَضَبِ قَالَ نَعَمْ  
فَاتَى لَا اَقُولُ فِي ذَلِكَ الْاِحْقَاقًا

میں جو کچھ آپ سے سنوں کیا سب لکھ لیا کروں آپ نے فرمایا ہاں! عرض کیا خواہ آپ راضی ہوں یا غصے میں ہوں؟ آپ نے فرمایا ہاں کیونکہ میں ہر حال میں حق بات کہتا ہوں۔

(مسند احمد)

حضرت عبداللہ بن عمروؓ کی طرح حضرت رافع بن خدیجؓ کو بھی بارگاہ نبوی سے کتابت حدیث کی اجازت ملی ہوئی تھی چنانچہ اتنی سے روایت ہے کہ

قُلْنَا يَا رَسُولَ اللَّهِ اَنَا نَسْمَعُ مِنْكَ  
أَشْيَاءَ أَفْكَتِبُهَا قَالَ اَكْتُبُوا وَلَا  
دَكُنْزُ الْعَالِ

ہم نے عرض کیا اے اللہ کے رسول ہم لوگ آپ سے بہت سی باتیں سنتے ہیں کیا انہیں لکھ لیا کریں آپ نے فرمایا لکھ لیا کرو کوئی مضائقہ نہیں۔

حضرت رافع بن خدیجؓ کے الفاظ ظاہر کر رہے ہیں کہ کتابت حدیث کی اجازت سے متعلق اس سوال میں دیگر صحابہ بھی شامل تھے اور بارگاہ نبوی سے سب سوال کرتے والوں کو کتابت کی اجازت مل گئی تھی۔ ابن سعد کا بیان ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام اور خادم حضرت ابورافعؓ نے بھی آپ سے احادیث لکھنے کی اجازت مانگی تھی اور آپ نے انہیں اجازت دے دی تھی۔ بارگاہ نبوی سے کتابت حدیث کی خصوصی اجازت حاصل کرتے والوں میں ان تذکرہ حضرات کے علاوہ حضرت انس بن مالکؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت جابر بن عبداللہؓ، حضرت سعد بن عبادہؓ، حضرت سمرہ بن جندبؓ اور حضرت عبداللہ بن ابی اوفیؓ رضی اللہ عنہم اجمعین کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہ تمام صحابہ وہ ہیں جنہوں نے اپنے اپنے مستقل صحیفے تیار کیے تھے اور جن کے صحیفوں کے متعلق احادیث کے موجودہ ذخیروں میں بھی اچھا خاصا مواد ملتا ہے ان کے صحیفوں کے بارے میں تفصیلی ذکر انشاء اللہ آگے مناسب موقع پر کیا جائے گا۔

اب تک کتابت حدیث کے سلسلے میں جو کچھ عرض کیا گیا ہے وہ بلاشبہ یہ ثابت کرنے



کے لیے بہت کافی ہے کہ صحابہ میں سے جس جس کو بھی لکھنا آتا تھا وہ احادیث کو حفظ کرنے کے ساتھ ساتھ قلم بند بھی کرتا تھا اور ان میں سے بعض حضرات نے ہار گاہ نبوی سے کتابت حدیث کی باقاعدہ اجازت بھی حاصل کی تھی :-

**کتابت حدیث کی ممانعت پر مبنی روایات** | اس موقع پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان روایات کا بھی جائزہ لے

لیا جائے جن میں یہ ذکر کیا گیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے احادیث لکھنے کی ممانعت فرمادی تھی اگرچہ منکرین حدیث کا طرز عمل اس سے یکسر مختلف ہے وہ ان ممانعت حدیث والی روایات کو تو بہت نمایاں کر کے پیش کرتے ہیں اور ان سے اپنے مزعومہ نتائج تکمال نکال کر سادہ لوح مسلمانوں کو گمراہ کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہیں مگر ان احادیث کا ذکر تک نہیں کرتے جن سے ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے احادیث لکھنے کی اجازت مرحمت فرمائی تھی۔ یہ ایک علمی خیانت ہے جو منکرین حدیث ہی کو سمجھی ہے جن کا مقصد محض اپنے مخصوص عزائم کو پورا کرنا ہے مگر ہمارا مقصود اثبات حق ہے اس لیے ہمارے لیے یہی مناسب ہے کہ ہم ان روایات کی بھی اصل حقیقت معلوم کیے بغیر اگے نہ بڑھیں جن کو سادہ دین حدیث کے متعلق بے اعتمادی پھیلانے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

اس سلسلے میں منکرین حدیث کے تمام اعتراضات کا اصل مدار حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی وہ روایت ہے جس کو امام مسلم نے کتاب الزہد میں باب التثبت فی الحدیث و حکم کتابۃ العلم کے تحت بیان کیا ہے اور جس کے الفاظ اس طرح ہیں :

عن ابی سعید الخدری ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال لا تکتبوا عنی غیر القرآن ومن کتب عنی غیر القرآن فلیتمحہ وحدثوا عنی ولا حرج و من کذب علی متعمدا فلیتبع ا مقعدا من النار۔

حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھ سے سوائے قرآن کے کچھ نہ لکھو اور اگر کسی نے سوائے قرآن کے مجھ سے کچھ لکھا ہے تو وہ مٹا دے البتہ میری حدیث کو نہ بانی روایت کرو اس میں کوئی حرج نہیں اور جس نے جان بوجھ کر مجھ پر جھوٹا باندھا وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنائے۔

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی مزید وضاحت اتنی کی روایت کردہ اس حدیث سے ہوتی ہے جس کو انیشمی نے مجمع الزوائد میں مستاحمد سے نقل کیا ہے اس کے الفاظ یہ ہیں :

حضرت ابوسعید خدریؓ نے فرمایا ہم نے جو کچھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا تھا اسے بیٹھے لکھ رہے تھے کہ آپؐ تشریف لائے اور فرمایا یہ کیا لکھ رہے ہو ہم نے عرض کیا وہ کچھ جو آپؐ سے سنتے ہیں آپؐ نے فرمایا کیا اللہ کی کتاب کے ساتھ ایک اور کتاب (بھی لکھی جا رہی ہے) اللہ کی کتاب کو علیحدہ کر کو اسے خالص رکھو پس ہم نے جو کچھ لکھا اسے اکٹھا کیا اور جلادیا۔

عن ابی سعید الخدری قال کنا نعود ان نکتب ما نسمع من النبی صلی اللہ علیہ وسلم فخرج علینا فقال ما هذا تکتبون فقلنا ما نسمع منك فقال اکتاب مع کتاب اللہ فحضرنا کتاب اللہ واخضوہ قال فجمعنا ما کتباہ فحسبنا واحد ثم احرقناہ۔

اسی طرح کی ایک روایت حضرت ابوہریرہ سے بھی بیان کی جاتی ہے خلیف بغدادی نے اس کو تقييد العلم میں نقل کیا ہے۔ روایت ہے

حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس تشریف لائے اور ہم احادیث لکھ رہے تھے آپؐ نے فرمایا یہ تم کیا لکھ رہے ہو ہم نے کہا یہ وہ احادیث ہیں جو ہم نے آپؐ سے سنی ہیں آپؐ نے فرمایا اللہ کی کتاب کے علاوہ کوئی کتاب ہے کیا تم جانتے ہو کہ پہلی قوم میں صرف اس وجہ سے تباہ ہوئیں کہ انہوں نے اللہ کی کتاب کے ساتھ ملا کر کتب لکھیں۔

عن ابی ہریرۃ انه قال خرج علینا رسول اللہ ونحن نکتب الاحادیث فقال ما هذا الذی تکتبون قلنا احادیث نسمعہا عنک قال کتاب غیر کتاب اللہ اتدرون ما ضل الامم قبلکم الا بما اکتبوا من الکتاب مع کتاب اللہ۔

اتنی روایات کو بنیاد بنا کر متکرمین حدیث یہ ثابت کرتے کی کوشش کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے احادیث کو قید تحریر میں لانے سے مطلقاً منع فرما دیا تھا اور پھر انہوں نے جو نتیجہ نکالتے

ہوتے ہیں کہ اس ممانعت کتابت سے آپ کا منشاء یہ تھا کہ احادیث کو محفوظ نہ کیا جائے  
مبادا بعد کے لوگ احادیث کو بھی قابلِ محبت سمجھنے لگیں۔

## منکرین حدیث کا غیر منطقی طرزِ عمل

علمائے کرام نے ان روایات کی جو توجہات پیش کی ہیں ان کا ذکر کرنے سے پہلے منکرین حدیث سے اس سلسلے میں ایک اہم بات کا فیصلہ کر لینا بہت ضروری ہے منکرین حدیث پہلے یہ بتلائیں کہ احادیث کی عدم کتابت کے ثبوت کے لیے اگر ان متذکرہ بالا روایات کا سہارا لیا جاسکتا ہے جیسا کہ انہوں نے لیا ہے تو تحریر و کتابت حدیث کو ثابت کرنے کے لیے ان روایات سے استشہاد کیوں نہیں کیا جاسکتا جو اسناد کے اعتبار سے اول الذکر روایتوں سے قوی تر ہیں۔ وہ اگر روایات کی مدد سے کوئی بات ثابت کر رہے ہیں تو تمام روایات کو پیش نظر رکھ کر نتیجے تک پہنچنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے اگر واقعی حقیقت کی تلاش ہے تو انصاف سے کیے کیا اس غیر منطقی طرزِ عمل سے حقیقت کا حصول ممکن ہے کہ پہلے اپنے طور پر ایک بات طے کر لی جائے اور پھر روایات کا جائزہ لیا جائے جو روایت اپنے مفروضے کی تائید کرتی ہوئی ملے اسے لے لیا جائے اور جس روایت سے اس مفروضے پر رد پڑتی ہو اسے ترک کر دیا جائے۔ ممانعت حدیث والی روایات پر بے بنیاد دلائل کی خواہ کیسی ہی فلک بوس عذرت تعمیر کر لیجئے اجازت حدیث والی روایات سے معاذ حق ہوتے ہی آپ کی اس عذرت میں ایسے رخصتے پڑتے ہیں ایسی در راہیں آتی ہیں کہ اس کی فلک بوسی زمین بوس ہوئے بغیر نہیں رہتی۔ آپ یا تو ان رخنوں اور ان در اڑوں کو پُر کر کے دکھائیے یا پھر اپنے مفروضہ نتائج پر مبنی بر خود غلط و عادی سے دست بردار ہو جائیے۔ پہلی بات تو یقیناً آپ کے بس کی نہیں اس لیے آپ کے لیے دوسری راہ اختیار کیے بغیر چارہ نہیں مگر ہمیں معلوم ہے آپ سے یہ بھی نہ ہو سکے گا جھوٹا قرار اور بے جا ضد ہمیشہ قبول حق کے راستے میں زبردست رکاوٹ بنے رہے ہیں آپ کی بھی یہی مجبوری ہے۔

منکرین حدیث کا معاملہ اللہ کے پُروردہ سمجھے مگر جس کو حق کی تلاش ہے وہ خود سوچے روایات وہ بھی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے احادیث کی

کتابت سے منع فرمایا تھا اور روایات وہ بھی ہیں اور وہ گزشتہ ادراک میں آپ کی نظر سے گزرنے لگی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ آپؐ سے بعض صحابہ نے خصوصی طور سے احادیث لکھنے کی اجازت طلب کی اور آپؐ نے مرحمت فرمادی نہ صرف ایک بار مرحمت فرمادی بلکہ اس اجازت کو اس وقت بھی باقی رکھا جب بعض حضرات کو کتابت حدیث کی اجازت سے متعلق اصل منسلکے نبوی کے سمجھنے میں شبہ پیش آیا ہمارا اشارہ حضرت عبداللہ بن عمرو سے مری غصہ کی حالت میں کلام نبوی سے متعلق روایت کی طرف ہے جس کا تفصیلی حال ابھی گزر چکا ہے۔ ان دونوں قسم کی روایات کی موجودگی میں انصاف سے کہیے کیا وہی نتیجہ نکلتا ہے جو منکرین حدیث نکالتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے احادیث لکھنے سے کلی طور پر مطلقاً منع فرمادیا تھا۔ اگرچہ حضرت ابوسعید خدریؓ کی ممانعت حدیث والی روایت کو امام بخاری نے موقوف علیہ قرار دیا ہے اور اس سے استدلال کو درست نہیں بنانا اس لحاظ سے اجازت حدیث والی روایات زیادہ قوی ہو جاتی ہیں تاہم دونوں قسم کی روایات کو صحت کے اعتبار سے اگر ایک مقام پر بھی رکھا جائے تب بھی وہ نتیجہ کسی طرح نہیں نکلتا جو منکرین حدیث اپنے طور پر نکالے بیٹھے ہیں۔ دونوں قسم کی روایات کی موجودگی میں ہم زیادہ سے زیادہ جس نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ جہاں آپؐ نے بعض صحابہ کو احادیث لکھنے سے منع فرمایا وہاں بعض صحابہ کو خصوصی طور سے لکھنے کی اجازت بھی دی گئی یا زیادہ سے زیادہ جزری ممانعت ثابت ہوتی ہے کلی ممانعت کسی طرح ثابت نہیں ہوتی :

ممانعت کیوں کی گئی تھی اور اجازت کیوں

احادیث قلمبند کرنے کی ہدایت | دی گئی تھی اس سلسلے میں یہ حاصل تبصرہ اور

اصل حقیقت حال کی وضاحت تو ہم آگے چل کر کریں گے اس وقت تو ہمیں منکرین حدیث کے اس دعوے کا ابطال مقصود ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کتابت حدیث سے بالکل ہی منع فرمادیا تھا یہ دعویٰ ایک سفید جھوٹ سے زیادہ کچھ نہیں بس اتنی بات درست کہی جاسکتی ہے کہ کتابت حدیث کی اگر ممانعت کی گئی تھی تو اجازت بھی دی گئی تھی بلکہ صرف اجازت ہی نہیں ایسی روایتیں بھی موجود ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ آپؐ نے احادیث کو لکھ لینے کا باقاعدہ حکم فرمایا تھا ۔

چنانچہ حضرت انس سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :

قَدْ طَعَلْتُ بِالْكِتَابَةِ (جانتے ہیں العلم) | علم کو لکھ کر مقید کرو۔

یہ طرح حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

قَدْ طَعَلْتُ وَمَا تَقْيِيدُهُ قَالَ | علم کو مقید کر کے میں نے عرض کیا مقید کرنے  
کتابتہ (مستند رکھنا)

ایسی روایات بھی موجود ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بعض صحابہ نے یہ  
شکایت کی کہ ہم آپ کی احادیث سننے میں مگر بھول جاتے ہیں تو آپ نے ان کو ہدایت فرمائی کہ  
اپنے دامن ہاتھ سے مدد لیں یعنی ان کو لکھ لیا کرو۔ ترمذی نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے کہ

كَانَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَجْلِسُ إِلَى النَّاسِ مِنْ أَضْوَارِهِمْ

وَيَسْمَعُ مِنْهُمْ وَيُحَدِّثُهُمْ وَيُحَدِّثُهُمْ فِيهِمْ وَيَسْمَعُ مِنْهُمْ وَيُحَدِّثُهُمْ فِيهِمْ

وَيَسْمَعُ مِنْهُمْ وَيُحَدِّثُهُمْ فِيهِمْ وَيَسْمَعُ مِنْهُمْ وَيُحَدِّثُهُمْ فِيهِمْ

وَيَسْمَعُ مِنْهُمْ وَيُحَدِّثُهُمْ فِيهِمْ وَيَسْمَعُ مِنْهُمْ وَيُحَدِّثُهُمْ فِيهِمْ

وَيَسْمَعُ مِنْهُمْ وَيُحَدِّثُهُمْ فِيهِمْ وَيَسْمَعُ مِنْهُمْ وَيُحَدِّثُهُمْ فِيهِمْ

وَيَسْمَعُ مِنْهُمْ وَيُحَدِّثُهُمْ فِيهِمْ وَيَسْمَعُ مِنْهُمْ وَيُحَدِّثُهُمْ فِيهِمْ

وَيَسْمَعُ مِنْهُمْ وَيُحَدِّثُهُمْ فِيهِمْ وَيَسْمَعُ مِنْهُمْ وَيُحَدِّثُهُمْ فِيهِمْ

وَيَسْمَعُ مِنْهُمْ وَيُحَدِّثُهُمْ فِيهِمْ وَيَسْمَعُ مِنْهُمْ وَيُحَدِّثُهُمْ فِيهِمْ

وَيَسْمَعُ مِنْهُمْ وَيُحَدِّثُهُمْ فِيهِمْ وَيَسْمَعُ مِنْهُمْ وَيُحَدِّثُهُمْ فِيهِمْ

(ترمذی باب ماجاء فی التوضیۃ فیہ)

کچھ الفاظ کے رد و بدل کے ساتھ اسی قسم کی ایک روایت حضرت ابو ہریرہ سے ہی خلیف بغدادی  
نے تیسرا علم میں بھی نقل کی ہے۔ حکیم کتابت حدیث کی پہلی دو روایتوں میں لفظ علم کی مختلف تعبیرات  
کی بحث چھوڑ کر منکرین حدیث ممکن ہے کہ ان کی کوشش کریں مگر حضرت ابو ہریرہ سے مروی یہ  
متذکرہ بالا روایتیں تو کتابت حدیث سے متعلق حکم بنویں کے ثبوت میں بہت ہی واضح ہیں۔ ان

روایات کی موجودگی میں ہر کوئی خود ہی فیصلہ کر سکتا ہے کہ منکرین حدیث کے اس دعوے میں کیا وزن رہ جاتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کتابت حدیث کی بالکل ممانعت فرمادی تھی۔ یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ اجازت کتابت اور حکم کتابت سے متعلق روایات ابتدائی زمانے کی ہیں اور ممانعت کتابت والی احادیث کا زمانہ بعد کا ہے اس لیے کہ مؤخر الذکر روایات کے بارے میں محدثین کا خیال ہے کہ آغاز ہجرت سے تعلق رکھتی ہیں محدث راہرزی نے اسی خیال کا اظہار کیا ہے جبکہ اول الذکر روایات میں سے بعض کے بارے میں حتیٰ طور پر کہا جاسکتا ہے کہ ان تعلق حجة الوداع سے ہے چنانچہ وہ روایت اس پر شاہد ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی روایت میں حجۃ الوداع کے موقع پر خطبہ دینے کا پورا واقعہ بھی نقل کیا گیا ہے تاہم ترمذی کی روایت کے الفاظ یہ ہیں :

ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ پڑھا اور راوی نے حدیث میں ایک قصہ کا ذکر کیا تو ابو ہریرہ نے کہا اے اللہ کے رسول مجھے لکھو دیجئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ابو ہریرہ کے لیے لکھ دو۔

عن ابی ہریرۃ أن النبی صلی اللہ علیہ وسلم خطب فذکر قصۃ فی الحدیث فقال ابو ہریرۃ اکتبوا لہ  
یا رسول اللہ فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اکتبوا لی شاہ  
(ترمذی ابواب العلم باب فی الرخصة فیہ)

حکیم ترمذی نے اس حدیث کو حسن صحیح قرار دیا ہے۔

**ممانعت کتابت سے علماء استدلال** | یہ بات کسی طرح ثابت نہیں ہوتی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیشہ ہمیش کے لیے کلی طور پر احادیث لکھنے سے منع فرمادیا تھا۔ انہی

روایات سے منکرین حدیث یہ نتیجہ بھی نکالتے ہیں کہ اس ممانعت کتابت سے منشاء نبوی یہ تھا کہ احادیث کو قید تحریر میں لا کر محفوظ نہ کیا جائے مبادا بعد کے لوگ احادیث کو بھی دین میں حجت سمجھنے لگیں۔ ممانعت کی اصل حقیقت پر گفتگو کرتے سے پہلے آئیے منکرین حدیث کے اس دعوے کا بھی تجزیہ کرتے چلیں۔

اس سلسلے میں سب سے پہلی بات یہ دریافت طلب ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس منشا کا علم منکرین حدیث کو ہر کس طرح؟ کیا وہ کوئی ایسی روایت پیش کر سکتے ہیں جو اشارتاً ہی اس منشاء نبوی کا پتہ دیتی ہو؟ کیا یہ منشا منکرین حدیث کا خود تراشیدہ نہیں؟ کیا یہ سب کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ایک غلط بات منسوب کرنے کے مترادف نہیں؟ وہ بات جس کا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی قول کسی فعل میں دور دور تک پتہ نہیں اس کو آپ کی منشا قرار دینا کیا بہتان طرازی کے علاوہ بھی کچھ ہے؟ ممانعت کتابت سے متعلق روایات سے اخذ کردہ اس برخود غلط نتیجہ کو منشاء نبوی کہہ کر کیا منکرین حدیث از خود اس ارشاد نبوی کی زد میں نہیں آگئے جس میں آپ ص کی طرف غلط بات منسوب کرنے والے کو جہنم کی وعید سنائی گئی ہے؟

منکرین حدیث اگر ذرا عقل سے کام لیتے تو ان کو اتنی روایات سے جن کو وہ اپنے دعویٰ کے ثبوت میں پیش کرتے ہیں حقیقت حال کا علم ہو جاتا اگر انہوں نے ان ممانعت کتابت پر مشتمل روایات ہی کو ذرا غور کی نظر سے دیکھ لیا ہوتا تو انہیں اتنی بڑی ٹھوکر بھی نہ لگتی وہ ایک غلط بات کو منشاء نبوی کبھی قرار نہ دیتے۔ منکرین حدیث کو دعوت فکر ہے وہ حضرت ابوسعید خدریؓ کی اس روایت کو جو ان کے تمام دعاوی کا اصل ماخذ ہے آخر تک ذرا غور سے پڑھیں۔ اس روایت میں جہاں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کیا گیا ہے کہ مجھ سے قرآن کے سوا کچھ نہ لکھو اور اگر کسی نے کچھ لکھا ہے تو اسے چاہیے کہ اسے فوراً مٹا دے اس کے فوراً بعد آپ کے الفاظ یہ ہیں کہ

میری حدیث کو زبانی روایت کرو اس میں کوئی مہرج نہیں۔

رحد ثوا عنی ولا حرج

اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ کی منشا یہ تھی کہ میری احادیث کو دین میں حجت نہ سمجھا جائے تو آپ زبانی روایت کو بھی ممنوع قرار دیتے زبانی روایت کی اجازت دینا تو یہ بتلاہا ہے کہ آپ کی منشا اس کے برعکس تھی آپ کی خواہش تھی کہ لوگ اپنی دینی زندگی میں میری احادیث سے مستفید ہوتے رہیں اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی احادیث کو دین میں حجت قرار دینا نہیں چاہتے تھے تو کتابت حدیث سے منع فرماتے وقت آپ کو بڑی صراحت کے ساتھ یہ فرمانا چاہیے تھا کہ میری احادیث کو زبانی بھی ہرگز ہرگز روایت نہ کرو مگر یہاں تو ہم دیکھتے ہیں کہ معاملہ اس کے برعکس ہے کتابت حدیث کی ممانعت کے فوراً بعد آپ خصوصی طور پر احادیث کو زبانی روایت کرنے کی اجازت دیتے ہیں نہ صرف اجازت بلکہ فرماتے ہیں کہ زبانی روایت کرنے میں کوئی حرج نہیں گویا اس متوقع غلط فہمی کا ازالہ کرنا چاہتے ہیں کہ ممانعت کتابت سے کہیں یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ اس سے مقصود حفاظت حدیث اور تبلیغ حدیث سے رکنا ہے احادیث کی سیدہ بر سیدہ منتقلی جاری رہنی چاہیے۔

حیرت کی بات ہے منکرین حدیث جس روایت کو اپنے دعوے کے ثبوت میں پیش کر رہے ہیں اس روایت کے ان الفاظ کو تو خوب نمایاں کر کے پیش کیا جا رہا ہے جن میں کتابت حدیث کی ممانعت کا ذکر ہے اور فوراً بعد ان کے اسے ان الفاظ سے عمداً آنکھیں بند کی جا رہی ہیں جو ان کے مفروضہ نتائج کا صریحاً رد کرتے ہیں۔ اسی سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ منکرین حدیث تحقیق و تلاش حق میں دیانت و امانت کے تقاضوں کا کس حد تک خیال رکھتے ہیں۔

منکرین حدیث کو اسی روایت کے آخری الفاظ بھی شاید نظر نہیں آئے ذرا سوچ کر

بتلائیے اگر منشا یہ بنی یہ ہے کہ احادیث کو دین میں حجت نہ بٹھرایا جائے تو پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالہ سے کوئی بات نقل کرنے میں جھوٹ اور سچ کا امتیاز کیسا۔ پھر تو آپ کو یہ فرمانا چاہیے تھا کہ میری طرف منسوب کر کے کوئی بات بھی نقل نہ کرو آپ کا یہ فرمانا کہ من کذب علی متعداً فلیتیوا مقعدہ من النار (جو شخص عمداً میری طرف جھوٹ بات منسوب کرتے وہ اپنا ٹکادہ ہم میں بنا لے) صاف بتلاہا ہے کہ چونکہ احادیث کو دین میں حجت کی حیثیت حاصل ہے اس لیے جھوٹ بات منسوب کرنے سے دین میں جہنم واقع ہوگا۔ جہنم دین



سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ میری طرف نسبت کر کے جو بات بھی بیان کی جائے اس کے متعلق پورا یقین حاصل کر لیا جائے کہ وہ اپنے مفہیم میں بالکل اسی طرح ہے جس طرح میں نے کہا تھا یا جس طرح کوئی کام میں نے کر کے دکھایا تھا۔

حجیت حدیث پر تفصیلی بحث تو انشا اللہ اپنے مقام پر ہوگی مگر یہاں بھی اتنی بات تو منکرین حدیث ہمیں سمجھائیں کہ کتابت حدیث کی ممانعت سے اگر مقصود یہی تھا کہ دین میں احادیث کو حجیت کا مقام نہ حاصل ہو پائے تو پھر ان ارشادات نبوی کا آپ کیا مطلب لیں گے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے بڑے ہی تاکید و انداز میں یہ ہدایت فرمائی کہ میری بات جس جس کے پاس پہنچتی رہے وہ آگے ان لوگوں تک پہنچاتا چلا جائے جن تک میری بات نہیں پہنچتی۔ مثلاً احادیث کے جس ذخیرے سے منکرین حدیث حضرت ابو سعید خدریؓ کی یہ کتابت حدیث کی ممانعت سے متعلق روایت نکال کر لائے ہیں اسی ذخیرے میں انہیں کیا یہ روایت نظر نہیں آئی الا فلیبلغ الشاهد الغائب (خبردار جو حاضر ہے اسے چاہیے میری باتیں ان تک پہنچاتا جائے جو غائب ہیں) یہ روایت تو صحاح کی تمام کتابوں میں موجود ہے تعصب کی عینک اترنے تو نظر آئے۔ اگر مقصود یہی تھا کہ احادیث نبوی سے امت مسلمہ مستفید نہ ہو تو اس تاکید و انداز میں تبلیغ احادیث کا حکم دینا کیا معنی۔ اگر کتابت حدیث کی ممانعت سے منشاء نبوی ہی تھا کہ احادیث کو حجیت نہ جانا جائے تو لازم تھا کہ احادیث کی حفاظت کرنے والوں کی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حوصلہ شکنی فرماتے مگر ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے بالکل برعکس آپ ان لوگوں کی قدم قدم پر حوصلہ افزائی فرماتے ہیں جو احادیث کو محفوظ کرنے اور دوسروں تک پہنچانے کے کام میں مصروف ہیں ایسے لوگوں کے لیے زبان نبوی پر بے اختیار دعائیہ کلمات جاری ہو جاتے ہیں کبھی آپ فرما رہے ہیں اللہ اس شخص کو ترقی نازد رکھے جس نے مجھ سے حدیث کو جس طرح سنا تھا اسی طرح دوسروں تک پہنچا دیا۔ کبھی روایت حدیث کی ضرورت و اہمیت جملانے کے لیے آپ اس حقیقت کا اظہار فرما رہے ہیں کہ فَرَّبَ مِلَّةً اِدْعٰی مِنْ سَاحِحٍ (لہذا اوقات مجھ سے سننے والوں کی نسبت حدیث کی حفاظت زیادہ

وہ کرتے ہیں جو ان سے نمٹ کر پہونچانے والے ہوتے ہیں) اور کبھی صحیح فہم حدیث کی فقہی ضرورت کو اذہان میں اُجاگر کرنے کے لیے ارشاد مہر رہا ہے قسربَ حاملِ فقہِ الیٰ مَنْ هُوَ اَفْقَهُ لَمَنْ (اہمیت سے اہل فقہ حدیث کو ان لوگوں تک پہونچاتے ہیں جو ان سے زیادہ فقیہ ہیں)۔ اگر منشاء نبوی حجیت حدیث کے حق میں نہیں تھا تو روایت حدیث کی اہمیت جقلانے کے بجائے اس پر ناپسندیدگی کا اظہار ہونا چاہیئے تھا اعداد حدیث کو فقہی ضرورت قرار دینے کے بجائے واضح الفاظ میں یہ بتلانا چاہیئے تھا کہ احادیث کا فقہ اسلامی میں کوئی مقام نہیں۔ یہ تمام روایات منکرین حدیث کو احادیث کے کسی مجموعے میں نظر نہیں آتیں مگر کیا وہ حضرت ابوہریرہؓ کی اس مشہور روایت سے بھی آنکھیں بند کر لیں گے جو صحاح کی عام کتابوں میں پائی جاتی ہے اور امام بخاری نے بھی باب حفظ العلم کے تحت اس کو بیان کیا ہے۔ اور جس میں حضرت ابوہریرہؓ نے اپنی قوتِ حافظہ کی شکایت بارگاہِ نبویؐ میں پیش کرنے کا واقعہ بیان کیا ہے اس واقعہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اعجازی طور پر حضرت ابوہریرہؓ کا حافظہ قوی کر دیا تھا سوال یہ ہے کہ اگر احادیث کی حفاظت و تبلیغ منظور نہ تھی تو حافظہ کو قوی کرنے کے بجائے اعجازی انداز میں اور زیادہ کمزور کیا جانا چاہیئے تھا تا کہ احادیث کا سینہ بہ سینہ منتقلی کا دروازہ ہی بند ہو جاتا امت میں احادیث کا ذکر ہی پہنچنے نہ پاتا اور حجیت و عدم حجیت کی بحث ہی نہ چھڑتی۔

غرض کتابت حدیث کی ممانعت والی روایات سے منکرین حدیث کا نہ یہ دعویٰ ثابت ہوتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیشہ کے لیے کالی طور پر احادیث لکھنے سے منع فرما دیا تھا اور نہ یہ دعویٰ ثابت ہوتا ہے کہ ممانعت کتابت سے مقصود حفاظت و تبلیغ حدیث سے روکنا اور احادیث کے حجت ٹھہرا لیے جانے کے خدشے کو دور کرنا تھا۔

**ممانعت کتابت کی اصل وجہ** | منکرین حدیث کے ان دونوں دعوؤں سے پیدا شدہ غلط فہمی دور ہو جانے کے بعد اب ہمارے لیے ممانعت

نعمہ زیر نظر کتاب میں یہ واقعہ حفظ حدیث اور صحابہؓ کے عنوان کے تحت تفصیل سے بیان ہوا ہے۔

سہ اولاد باب فضل نشر العلم

کتابت پر مشتمل احادیث کے بارے میں اصل حقیقت حال تک پہنچنا بہت آسان ہو گیا ہے۔  
آئیے ان روایات کو دوبارہ بغور پڑھیں اور ان تمام ترجیحات کی روشنی میں جو علماء نے کرام نے  
اس سلسلے میں پیش کی ہیں کتابت حدیث کی ممانعت سے جو اصل مقصود و منشاء نبوی تھا وہ  
معلوم کرنے کی کوشش کریں۔

علمائے کرام نے کتابت حدیث کی ممانعت سے متعلق روایات کی متعدد ترجیحات پیش  
کی ہیں۔ ان تمام ترجیحات کا باہم ترجیح و تطبیق کے نقطہ نظر سے اگر بغور مطالعہ کیا جائے  
تو درج ذیل دو نتیجے برآمد ہوتے ہیں۔

(۱) اول یہ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے احادیث کو قلم بند کرنے سے مطلقاً منع نہیں فرمایا تھا  
بلکہ اس طور سے احادیث لکھنے کی ممانعت فرمائی تھی کہ جس سے قرآن اور حدیث دونوں آپس  
میں خلط ملط ہو جائیں۔

(۲) دوم یہ کہ اس ممانعت سے مقصود قرآن اور حدیث کے درمیان ایک واضح امتیاز  
باقی رکھنا تھا متن اور عبارت کے لحاظ سے بھی اور احکام و نتائج میں فرق مراتب کے  
اعتبار سے بھی۔

**قرآن اور حدیث میں امتیاز** | حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت کردہ احادیث  
پر ذرا دوبارہ نظر ڈالیے خصوصاً اس روایت کے

الفاظ میں غور کیجئے جس کو ایشمی نے مجمع الزوائد میں مندا حمد سے نقل کیا ہے اِخْصُوا كِتَابَ  
اللّٰهِ وَاِخْلَصُوْهُ یعنی اللہ کی کتاب کو علیحدہ کر دو اور اسے خالص دیے آمیز کر دو کے الفاظ

اپنے مفہوم میں بالکل واضح ہیں کہ اللہ کی کتاب کی ساتھ کسی دوسری چیز کی آمیزش نہ کر دینی  
مطلوب یہ نہیں ہے کہ احادیث کو بالکل نہ لکھو بلکہ مطلوب یہ ہے کہ قرآن کی ساتھ خلط ملط کر کے

نہ لکھو۔ اسی روایت میں ان الفاظ سے پہلے جو سوال جواب صحابہ کے اور رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم کے درمیان ہوا ہے اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ قرآن اور حدیث کو یکجا کر کے

اس طرح لکھ رہے تھے کہ دونوں میں کوئی حدیث اصل کھینچنا مشکل تھا۔ غور فرمائیے صحابہ کو لکھنا

ہوا دیکھ کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پوچھتے ہیں کہ کیا لکھ رہے ہو تو صحابہ جواب میں عرض

کرتے ہیں جو کچھ آپ سے سنتے ہیں۔ یعنی قرآن اور حدیث میں سے جو کچھ آپ سے سنتے ہیں اسے لکھ لیتے ہیں۔ ظاہر ہے قرآن و حدیث دونوں کو یکجا اس طرح لکھنا کہ دونوں میں کوئی امتیاز نہ ہو سکے دینی مقاصد کے لیے انتہائی ضرر رساں تھا اس لیے آپ نے روکا اس بات سے تھا کہ اللہ کی کتاب کے ساتھ دوسری کتاب کو اس طرح نہ لکھو کہ دونوں میں کوئی امتیاز باقی نہ رہے۔ ”اَلْکِتَابُ مَعَ کِتَابِ اللّٰہِ“ کے الفاظ بھی یہی بتلا رہے ہیں کہ اللہ کی کتاب کے ساتھ کسی دوسری کتاب کے لکھنے سے روکنا مقصود ہے۔

مشہور محدث امام خطابی معالم السنن میں اسی نکتے کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

<p>آپ نے قرآن و حدیث کو ایک ہی صحیفہ میں لکھنے سے منع فرمایا تھا تاکہ کہیں خلط ملط نہ ہو جائے اور پڑھنے والا کسی شبہ میں نہ پڑ جائے تاہم نفس کتابت اور علم کو لکھ کر محفوظ کر لینا ہرگز ممنوع نہ تھا۔</p>	<p>اِنَّہٗ اِنَّمَا نَهٰی اَنْ یَّکْتُبَ الْحَدِیثُ مَعَ الْقُرْآنِ فِیْ صَحِیْفَةٍ وَاحِدَةٍ لِّسَلَا غَلَطٍ بِہٖ وَیَنْتَبِہُ عَلٰی الْقَارِیْ فَاَقَانْ یَّکُوْنُ نَفْسُ الْکِتَابِ مَحْظُوْرًا وَتَقْیِیْدُ الْعِلْمِ بِالْمَحْظُوْرِ مَنْہٰی عَنْہُ فَلَا۔</p>
---	---

محدث رامہرزئی نے بھی حضرت ابوسعید خدری کی روایت پر تبصرہ کرتے ہوئے اسی خیال کا اظہار فرمایا ہے کہ آپ نے کتابت حدیث کی ممانعت اس وقت فرمائی تھی جب قرآن و حدیث کے مل جانے کا خطرہ تھا۔ بات یہی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث کی کتابت مطلقاً منع نہیں فرمائی تھی بلکہ اصل حقیقت حال یہی تھی کہ بعض صحابہ کلام الہی اور کلام رسول دونوں کو ایک ہی ورق پر یا ایک ہی صحیفہ میں ساتھ ساتھ لکھ رہے تھے اس طرح تدریجاً یہ تھا کہ قرآن و حدیث کہیں اس طرح خلط ملط نہ ہو جائیں کہ دونوں میں کوئی امتیاز نہ رہے باقی نہ رہے جبکہ دونوں میں امتیاز باقی رہنا عبارت کے اعتبار سے بھی ضروری تھا کہ کلام الہی رسول کے کلام سے ملنس نہ ہو جائے اور احکام و نتائج کے اعتبار سے بھی لازمی تھا کہ دونوں کا فرق مراتب برقرار رہے۔

قرآن اور حدیث اگرچہ دونوں دین کے سرچشمے ہیں مگر ان دونوں سے پیدا ہونے والے احکام کے مطالبوں میں قوت و ضعف کا جو فرق ہے وہ محتاج بیان نہیں کون نہیں جانتا کہ تواتر و توارث کی جس راہ سے منتقل ہوتا ہو قرآن ہم تک پہنچا ہے اسی راہ سے منتقل ہونے والی وہ ساری چیزیں جو ہمیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملی ہیں یقیناً و اعتماد کا جو مقام قرآن کو اور ان چیزوں کو امت مسلمہ میں حاصل ہے وہ مقام ان چیزوں کو کہاں حاصل جن کے علم کا ذریعہ وہ حدیثیں ہیں جنہیں اصطلاحاً خبر آحاد کہا جاتا ہے۔ ملازوال یقیناً و اعتماد سے بہرہ ور دین کا ازل الذکر حصہ یقیناً قرآن کی اپنی اصطلاح کے مطابق بینات کا درجہ رکھتا ہے جبکہ مؤخر الذکر حصے کو بینات کے مقابلے میں غیر بیناتی کہا جاسکتا ہے۔ دین کے ان درون حصوں سے پیدا ہونے والے احکام کے مطالبوں میں قوت و ضعف کا جو فرق ہے وہ ظاہر و باہر ہے۔ اس فرق کو باقی رکھنے کے لیے بھی ضروری تھا کہ قرآن اور حدیث آپس میں غلط ملط نہ ہو جائیں اور دین کا وہ حصہ جس کو امت کی سہولت کے پیش نظر غیر بیناتی رکھنا مقصود ہے بینات کی شکل نہ اختیار کر لے۔

۱۴ دین کا بیناتی حصہ وہ اصول و کلیات ہیں جن کا انکار خود دین کا انکار بن جاتا ہے جبکہ دین کا غیر بیناتی حصہ ان فروع اور ان جزئیات پر مشتمل ہے جن سے اگرچہ دینی زندگی کی تعمیر کا کام لیا جاتا ہے لیکن ان سے نکل جانے پر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ آدمی دین سے نکل گیا۔ گویا دین کے بیناتی حصہ کا بنیاد قرآن کے بعد وہ احادیث ہیں جو تمام صحابہ اور تواتر و توارث عامۃ المسلمین کی راہ سے بغیر کسی انقطاع کے نہلاً بعد نسل لاکھوں لاکھوں انسانوں کے ذریعے منتقل ہوتی ہوئی ہم تک پہنچی ہیں۔ ایسی احادیث کی بنیاد پر تشکیل پاتے والے دین کے بیناتی حصے کی مقدار متعین کرنے کے لیے عقائد و ایمانیات کے سوا ظہارت غسل و ضو عبادات نماز روزہ حج زکوٰۃ معاملات عقوبات سیاسیات اور مباحات و محذورات وغیرہ مختلف ابواب سے ان اتفاقی مسائل کا انتخاب کر لیا جائے جن پر امت اسلامیہ کے تمام فرقے متفق ہیں اور جو عہد نبوت سے اس وقت تک ہر ملک اور ہر فرقہ کے مسلمانوں میں تواتر کے ساتھ احمدیت سے مسلم ہیں (باقی اگلے صفحہ پر)

مقصد پیش نظر اسی امتیاز کو برقرار رکھنا تھا البتہ اس کے لیے آپ نے ظاہر ہے تدابیر مختلف اختیار فرمائی ہوں گی۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے شروع شروع میں چند مخصوص لوگوں کو احادیث لکھنے کی اجازت دی اور عام طور پر ممانعت فرمادی ممکن ہے آپ نے ان لوگوں کو اجازت دے دی ہو جو علم رسم الخط سے پوری طرح واقفیت رکھتے تھے اور ان کی تحریر کردہ باتوں میں غلطی اور شبہ کا امکان نہ تھا اور جو اس فن سے پوری طرح واقف نہ تھے انہیں منع فرمادیا ہو ابن قتیبہ نے ممانعت و اجازت کتابت پر تبصرہ کرتے ہوئے یہی خیال ظاہر کیا ہے <sup>۱</sup> بعض فرائض بھی اس کی تائید میں ہیں۔ مثلاً ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص جن کو احادیث لکھنے کی اجازت دی گئی تھی سریانی و عبرانی رسم الخط میں مکمل مہارت رکھتے تھے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کتابت حدیث سے منع کرنے اور اجازت دینے میں آپ نے صحابہ کی قوت یادداشت کو ملحوظ رکھا ہو جن صحابہ کا حافظہ قوی تھا۔ ان کے لیے آپ نے یہ پسند فرمایا ہو کہ وہ اپنی اس

بجائے سے پیوستہ

کہ اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم اور ہی آپ کا طرز عمل تھا اگر پوری تلاش و جستجو سے کام لیا جائے تو اس قسم کے مسائل کی تعداد یقیناً ہزاروں سے بڑھاؤ ہوگی۔ یہی دین کا بنیاتی حصہ ہے اس کے مقابلے میں دین کا غیر بنیاتی حصہ ان احادیث کی بنیاد پر تشکیل پاتا ہے جن کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تصدیقاً اور اراداً انفرادی معلومات تک محدود رکھا ہے تاکہ یہ احادیث اپنے مطالبوں کی قوت میں دین کے اول الذکر حصے کے برابر نہ ہوں یا پیش نہ دین اسلام کے بنیاتی اور غیر بنیاتی حصوں کے درمیان اس امتیاز نے ہی اسلام کو تنبیہ اور سہولت پسندانہ خصوصیت عطا کی ہے کہ عزم و ہمت رکھنے والے اگر چاہیں تو دین کے دونوں حصوں پر عمل پیرا ہو کر محبوبیت حق میں ترقی کرتے چلے جائیں اور عزم و ہمت سے محروم افراد اگر دین کے ان دونوں حصوں کے مطالبوں کو پورا کرنے میں کامیاب نہ ہو پاتے ہوں تو کم از کم دین کے بنیاتی حصے کی تعمیل کر کے ان ثمرات و نتائج سے تو محروم نہ رہیں جن کی توقع ایک مسلمان بحیثیت مسلمان ہونے کے اپنی آخرت کی زندگی میں رکھتا ہے۔ مولانا مناظر احسن گیلانی نے اپنی کتاب تدریس حدیث میں اس موضوع پر بڑی سیر حاصل بحث کی ہے۔

خدا و قدرت سے کام لیں اور احادیث کو لکھنے کے بجائے حفظ کریں اس کے مقابلے میں ان لوگوں کو جن کی قوتِ حافظہ کمزور تھی کتابت کے فن سے مدد لینے کی ہدایت کی گئی اس خیال کو تقویت ان روایات سے بھی ملتی ہے جن میں بیان کیا گیا ہے کہ بعض صحابہ نے سورہ حفظ کی تسننیت کی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہاتھ کی طرف اشارہ کر کے احادیث کو قلم بند کر لینے کی ہدایت کی۔ ابن جہان نے کتابت حدیث سے ممانعت پر مشتمل روایات کی یہی توجیہ کی ہے ان کا کہنا ہے کہ قرآن کے سوا حدیث لکھنے سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس لیے منع کیا تھا کہ حفظ حدیث پر زور دینا مقصود تھا۔

تدائیر خواہ کچھ بھی اختیار کی گئی ہوں مگر اتنی بات بالکل صاف ہے کہ کتابت حدیث سے ممانعت محض اسی مقصد کے پیش نظر تھی کہ کہیں قرآن اور حدیث ایک دوسرے میں خلط ملط نہ ہو جائیں چنانچہ یہ ممانعت اسی وقت تک رہی جب تک یہ قرآن و حدیث کے خلط ملط ہونے کا خطرہ باقی رہا جب قرآن کا اکثر حصہ نازل ہو گیا اور بہت سے صحابہ تھے اسے حفظ کر لیا اور اس طرح احادیث سے اس کے التباس کا کوئی خطرہ نہ رہا تو آپ نے حدیث نویسی کی کھلی اجازت دے دی وہ روایات جن سے کتابت حدیث کی عام اجازت مفہوم ہوتی ہے اسی بعد کے دور کی ہیں۔ محدث رامہرزی کتابت حدیث کی ممانعت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ممانعت آپ نے آغاز ہجرت میں اس وقت فرمائی تھی جب قرآن و حدیث کے آپس میں ملتس ہو جانے کا خطرہ تھا لے ڈاکٹر صبحی صالح کا رجحان بھی اسی طرف ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے احادیث کو قلم تحریر میں لانے سے آغاز وحی میں منع فرمایا تھا کہ مبادا آپ کے اقوال و تشریحات اور سیرت قرآن سے خلط ملط ہو جائے اور دونوں میں کسی فرق و امتیاز کا امکان باقی نہ رہے۔

مولانا مناظر احسن گیلانی اس بات سے تو اتفاق کرتے ہیں کہ کتابت حدیث سے ممانعت اسی مقصد کے پیش نظر تھی کہ قرآن اور حدیث سے پیدا ہونے والے احکام و نتائج کے مطالبوں میں

قوت و ضعف کا جو فرق ہے اسے قائم کیا جائے اس نکتہ کی وضاحت پر انہوں نے اپنی کتاب تدوین حدیث میں سیر حاصل بحث بھی کی ہے مگر وہ ممانعت کتابت کی اس توجیہ سے متفق نہیں ہیں کہ اس سے مقصود قرآن اور حدیث کی عبارات کے آپس میں خلط ملط ہو جانے کے اندیشے کو روکنا تھا۔

مولانا مناظر احسن گیلانی دراصل اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ یہ ممانعت کتابت کا حکم یکایک نہیں دے دیا گیا تھا بلکہ اس حال سے واقف ہونے کے بعد دیا گیا تھا کہ آپ سے ہر سنی ہوئی بات لکھی جا رہی ہے احادیث کی اس طرح کی عمومی اشاعت آپ کو پسند نہ تھی کیونکہ عہد نبوت ہی میں اگر مکتوب احادیث کے اس کثرت سے مجموعے تیار ہو جاتے تو ان سے بتدریج پیدا ہونے والے احکام و نتائج میں اور قرآنی آیات سے پیدا ہونے والے احکام و نتائج میں کوئی فرق باقی نہ رہتا اور اس طرح دین کے احکام میں تنگی پیدا ہو جاتی مولانا کے نزدیک منشاء نبوی دراصل یہ تھا کہ ان احادیث کو چھوڑ کر جو قرآن کے علی مطالبات کی تشکیلات اور اسی نوعیت کے حامل دین کے دوسرے بیانی احکام پر مشتمل ہیں عام احادیث کی تدوین اس اہتمام سے نہ ہو جس اہتمام سے قرآن کی تدوین ہو رہی تھی تاکہ عام احادیث کا سرمایہ قطعیت اور یقینی ہونے میں قرآن کے برابر نہ ہو جائے۔ مولانا کے خیال کے مطابق اسی لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے احادیث کو عام طور پر لکھنے سے منع کر دیا اور قصداً و اراداً ایسا طرز عمل اختیار کیا کہ قرآن کے مقابلے میں ان احادیث کا درجہ دوسرا ہو گیا ایسا دوسرا درجہ جس کی وجہ سے ان کے متعلق علماء کے اجتہاد کی راہیں کھل گئیں اور فقہاء کو فکر و نظر کے لیے وسیع میدان ملے آگیا اور اس طرح دین پر عمل کرنا آسان ہو گیا نیز انے والے زمانوں میں دین جمود کے خطرے سے محفوظ ہو گیا۔

مولانا مناظر احسن گیلانی کا یہ نقطہ نظر اپنی جگہ پر اگرچہ درست ہے مگر سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کے لیے انہوں نے ممانعت کتابت کی اس توجیہ کو رد کرنا کیوں ضروری سمجھا کہ اس سے مقصود قرآن و حدیث کے باہم خلط ملط ہو جانے کے اندیشے کو دور کرنا تھا حالانکہ یہ توجیہ ان کے نقطہ نظر کے ثبوت کے لیے تائید کی حیثیت رکھتی ہے۔ مولانا کے یہ الفاظ کہ



”میری سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ ہر لکھی ہوئی چیز کو صحابہ یا ان کے بعد کے مسلمان قرآن کیوں سمجھ لیتے تھے“

اگرچہ صحابہ کی اکثریت کے معاملے میں بالکل مبنی پر حقیقت ہیں لیکن صحابہ کے درمیان بھی دیہات سے تعلق رکھنے والے ایسے اصحاب کی موجودگی کو غائب اندامکان قرار نہیں دیا جاسکتا جو گہری دینی بصیرت سے پوری طرح بہرہ ور نہ ہونے کی بنا پر کلام الہی اور کلام رسول کے درمیان امتیاز کرنے میں کسی شبہ کا شکار ہو سکتے تھے۔ چنانچہ خلیفہ بغدادی کتابت حدیث کی ممانعت پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

ابتداءً اسلام میں علم کو مکتوب کرنے سے اس لیے منع کیا کہ اس وقت اس بارے میں گہری بصیرت کی کمی تھی اور وحی وغیروحی میں امتیاز کرنے میں شبہ ہو سکتا تھا کیونکہ اکثر دیہاتیوں کو دینی بصیرت حاصل نہ تھی اور نہ وہ عادت علماء کے پاس بیٹھتے تھے اس کا اندیشہ تھا کہ وہ دیگر صحیفوں کو قرآن سے ملحق کر دیتے اور یہ سمجھنے لگ جاتے کہ جو کچھ ان میں ہے وہ اللہ کا کلام ہے۔

وَبُنِيَ عَنْ كُتُبِ الْعِلْمِ فِي صَدْرِ الْإِسْلَامِ  
لَقَلَّةِ الْفُقَهَاءِ فِي ذَلِكَ الْوَقْتِ وَالْمَيِّزِينَ  
بَيْنَ الْوَحْيِ وَغَيْرِهِ لِأَنَّ أَكْثَرَ الْأَعْرَابِ  
لَمْ يَكُونُوا فَتَقَهُوا فِي الدِّينِ وَلَا جَالَسُوا  
الْعُلَمَاءَ الْعَارِفِينَ فَلَمْ يُؤْمِنُوا  
بِأَحْقَاقِ مَا يَجِدُونَ مِنَ الصُّحُفِ  
بِالْقُرْآنِ وَيَعْتَقِدُوا أَنَّ مَا اشْتَمَلَتْ  
عَلَيْهِ كَلَامُ الرَّحْمَنِ

(تفہیم العلم)

جب قرن اول میں یہ خدشہ موجود تھا کہ بعض لوگ قرآن اور غیر قرآن کو باہم ملتبس نہ کر دیں تو ان کے بعد کے مسلمانوں کا معاملہ تو اور بھی زیادہ معرض خطر میں ہے۔ ذرا سوچئے تو سہی وحی الہی کے اولین مخاطبین کے ہاتھوں سے لکھے ہوئے اوراق بعد میں آنے والوں کے لیے یقین و

قلطیت کے کس مقام پر ہوتے اور وہ اوراق جن میں قرآن اور حدیث یکجا لکھے ہوئے ہوتے کیسے شبہات کو دعوت دیتے اور کتنے عظیم فتنے کا سبب بن جاتے۔ حضرت ابوسعید خدریؓ کی روایت میں جو یہ آتا ہے کہ لکھنے والوں نے جو کچھ لکھا تھا وہ سب ایک جگہ لاکر جمع کیا اور نذر آتش کر دیا یہ سب کچھ اسی عظیم فتنے کے سد باب کے لیے تھا کہ بع کے آنے والے کہیں قرآن اور حدیث کو باہم ملا نہ دیں۔

بہر حال کتابت حدیث کے موافق و مخالفت قرآن پر اس تفصیلی گفتگو کے بعد شکوک و شبہات کے وہ بادل پوری طرح چھٹ گئے ہیں جو عدم کتابت کے ثبوت کی ناکام کوشش میں منکرین حدیث کے اٹرائے ہوئے غبار سے وجود میں آسکتے تھے اور ہمارے اس دعوے کے لیے فضائل و صفات ہو گئی ہے جو ہم نے اس موضوع پر گفتگو کی ابتدا کرتے وقت کیا تھا کہ احادیث کا اکثر حصہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نجات مبارکہ اور آپ کے بعد کے متصل زمانے میں ہی قیصر تحریر میں آچکا تھا۔ آئیے اب حقیقت حال کے آئینے میں اس دعوے کا اصل عکس دیکھنے کی کوشش کریں :

سب سے پہلے ہم ان صحابہ کے مکتوب  
**مکثرین صحابہ کے مکتوب ذخیرے** | ذخیروں کا جائزہ لیتے ہیں جو مکہ میں کی  
 صفت میں شمار ہوتے ہیں یعنی جن کی مرویات کی تعداد ایک ہزار سے اوپر ہے۔

## حضرت ابو ہریرہؓ کا تحریری ذخیرہ

مکثرین صحابہ میں سرفہرست حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہیں آپ سے پانچ ہزار تین سو چوبتر (۵۳۷۴) احادیث مروی ہیں۔ فقہ اسلامی میں جن تین ہزار احادیث پر مدار احکام ہے ان میں سے پندرہ سو احادیث حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہیں۔ اب وہ شواہد ملاحظہ کیجئے جن سے ثابت ہوتا ہے کہ جتنی روایات بھی حضرت ابو ہریرہؓ مروی ہیں وہ سب کی سب مکتوب صورت میں آپ کے پاس محفوظ تھیں۔

تھانم بیان العلم میں حافظ ابن عبد البر نے ایک واقعہ بیان کیا ہے جو مشہور صحابی

حضرت عمرو بن ابیہ ضمیرؓ کے صاحبزادے حضرت حسن کے الفاظ میں اس طرح پر ہے کہ

أُحَدِّثُ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ بِحَدِيثٍ  
فَأُنْكِرُهُ فَقُلْتُ إِنِّي قَدْ سَمِعْتُهُ مِنْكَ  
فَقَالَ إِنَّ كُنْتَ سَمِعْتَهُ مِنْيَ فَهُوَ  
مَكْتُوبٌ عِنْدِي فَاخْذْ بِيَدِي إِلَى  
بَيْتِهِ فَإِنَّا كُتِبَتْ كَثِيرَةٌ مِنْ حَدِيثِ رَسُولِ  
اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَوَجَدَ  
ذَلِكَ الْحَدِيثَ فَقَالَ قَدْ أَخْبَرْتُكَ إِنَّ  
كُنْتُ حَدَّثْتُكَ بِهِ فَهُوَ مَكْتُوبٌ عِنْدِي

میں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے سامنے  
ایک حدیث بیان کی انہوں نے اس کا انکار کیا میں  
نے عرض کیا کہ اس حدیث کو میں نے آپ ہی سے  
سنا ہے بولے اگر تم نے مجھ سے حدیث سنی ہے تو  
پھر وہ میرے پاس لکھی ہوئی ہوگی پھر انہوں نے  
میرا ہاتھ پکڑا اور اپنے گھر لے گئے مجھے انہوں نے  
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کی بہت سی  
کتابیں دکھائیں۔ انہی میں وہ حدیث بھی پائی گئی  
حضرت ابو ہریرہ نے فرمایا میں نے تم سے کہا نہ  
تھا کہ میں نے اگر تم سے کوئی حدیث بیان کی تھی  
تو وہ میرے پاس لکھی ہوئی ہے۔

اس واقعے کو سرسری نظر سے پڑھتے ہوئے نہ گزر جائیے غور کیجئے حضرت ابو ہریرہ کا یہ فرمانا کہ  
”اگر تم نے مجھ سے کوئی حدیث سنی ہے تو پھر وہ میرے پاس لکھی ہوئی ہوگی“ صاف یہ بتلا رہا  
ہے کہ جو کچھ آپ روایت کرتے تھے وہ سب آپ کے پاس مکتوب صورت میں محفوظ تھا اور  
یہ ہمیں معلوم ہے کہ آپ کی مرویات کی تعداد پانچ ہزار تین سو چوبیس ہے اس کا مطلب یہ  
ہوا کہ پانچ ہزار سے اوپر احادیث حضرت ابو ہریرہ کے پاس لکھی ہوئی موجود تھیں پھر  
راوی کا یہ کہنا بھی قابل غور ہے کہ حضرت ابو ہریرہ نے مجھے حدیث کی بہت سی کتابیں دکھائیں  
معلوم ہوا یہ تحریری ذخیرہ صرف چند اوراق پر مشتمل نہ تھا بلکہ کتابوں کی ایک کثیر تعداد تھی اس  
سے بھی اسی بات کی تائید ہوتی ہے کہ حضرت ابو ہریرہ کی تمام مرویات کتابی شکل میں محفوظ تھیں۔  
اس واقعے میں کسی شک و شبہ کی بھی کوئی گنجائش نہیں کیونکہ حافظ ابن حجر نے بھی اس  
واقعہ کو فتح الباری میں نقل کیا ہے اگرچہ اس کی سند مختلف ہے۔ اس کے علاوہ حضرت  
ابو ہریرہ کی مرویات کے مکتوب ہونے پر اس سے قوی تر ایک اور شاہد بھی موجود ہے۔

سنن دارمی حدیث کی ایک مستند کتاب ہے اور اس کا درجہ صحاح ستہ کی اکثر کتابوں سے بلند ہے ملا علی قاری نے صحاح ستہ میں ابن ماجہ کے بجائے سنن دارمی کو شامل کرنے کی رائے دی ہے، اس کی ایک روایت کے مطابق حضرت ابو ہریرہؓ کی مرویات کا ایک نسخہ ان کے شاگرد بشیر بن نیک نے تیار کیا تھا نہ صرف تیار کیا تھا بلکہ پڑھ کر حضرت ابو ہریرہؓ کو سنایا بھی تھا۔ بشیر بن نیک ہی سے روایت ہے فرماتے ہیں :

میں حضرت ابو ہریرہؓ سے جو حدیثیں سنا کرتا تھا وہ لکھ لیا کرتا تھا میرا جب ارادہ ان سے الگ ہونے کا ہوا تو کتاب ان کے پاس لے کر آیا اور ان کے سامنے پڑھ گیا اور پھر میں نے ان سے کہا کہ یہ وہ حدیثیں ہیں جو آپ سے ہیں سنی ہیں فرمایا ہاں

کُنْتُ أَكْتُبُ مَا أَسْمَعُ مِنْ الْحَبِ  
هَرِيرَةَ فَلَمَّا أَرَدْتُ أَنْ أَفَارِقَهُ أَتَيْتُهُ  
بِكِتَابِهِ فَقَرَأْتُهُ عَلَيْهِ وَقُلْتُ لَهُ  
هَذَا مَا سَمِعْتَهُ مِنْكَ قَالَ نَعَمْ۔

اس روایت کے الفاظ بھی یہی بتا رہے ہیں کہ حضرت بشیر بن نیک نے جو کچھ حضرت ابو ہریرہؓ سے سنا تھا سب کچھ قلم بند کر لیا تھا اور پھر لکھ کر حضرت ابو ہریرہؓ سے گویا اس کی تصدیق بھی کر لی تھی ظاہر ہے حضرت بشیر کا یہ مجموعہ اس مجموعے کے علاوہ تھا جو حضرت ابو ہریرہؓ نے از خود اپنے لیے تیار کیا ہوا تھا اور جس کا ذکر ابھی حافظ ابن عبد البر کے حوالے سے گزرا ہے۔ اسی طرح حضرت ابو ہریرہؓ کی مرویات کے یہ دو نسخے علیہ علیہ تیار ہو گئے تھے بلکہ ان رد کے علاوہ ایک ارد نسخہ کا ثبوت بھی حدیث کی کتابوں سے ملتا ہے جس کو حضرت ابو ہریرہؓ کے ایک اور شاگرد حضرت ہمام ابن منبہ نے تیار کیا تھا اور انہی کے نام پر صحیفہ ہمام کے نام سے مشہور ہے امام احمد بن حنبل نے اس کتاب کا ایک بہت بڑا حصہ اپنی مسند میں شامل کیا ہے امام مسلم نے بھی اپنی صحیح میں اس کو نقل کیا ہے۔

ان شواہد کی روشنی میں اتنی بات بہر حال یقینی ہو گئی ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ کی تمام مرویات کتابی شکل میں محفوظ تھیں گویا یہ شواہد اس بات کا ثبوت ہیں کہ پانچ ہزار تین سو چوبیس (۵۳۷) احادیث قرن اول ہی میں قلم بند ہو چکی تھیں۔

عہد نبوت اور قرن صحابہ میں حدیث کے جن مکتوب ذخیروں کی موجودگی کا ہم جائزہ لینے

لگے ہیں ابھی اس کی صرف ابتدا ہی ہوئی ہے۔ ابھی صرف ایک صحابی کی مرویات کا تذکرہ ہوا ہے مگر اس پہلے قدم ہی پر ہم یہ ثابت کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا اکثر و غالب حصہ قرن اول ہی میں قید تحریر میں آچکا تھا اس لیے کہ اول درجے کی صحیح احادیث کی تعداد دس ہزار سے زیادہ نہیں ہے اور پانچ ہزار تین سو چوبیس کا عدد دس ہزار کے عدد کا یقیناً اکثر و غالب حصہ ہے۔

**احادیث کی صحیح تعداد** | صحیح حدیثوں کی تعداد کے بارے میں دس ہزار کا عدد سن کر شاید بعض ناواقف حضرات کو حیرانی ہو رہی ہو مگر یہ امر واقعہ ہے کہ اول درجے کی صحیح حدیثوں کی تعداد دس ہزار تک بھی نہیں پہنچ پاتی اور یہ بات یونہی بے سند نہیں کہی جا رہی بلکہ ہمارے پاس اس کے لیے سند موجود ہے۔ تمام کتابوں سے چھان بین کر کے امام حاکم نے جو تعداد صحیح حدیثوں کی بیان کی ہے وہ یہی ہے ان کے الفاظ ہیں :

الاحادیث التي في الدرحة الاولى لا تبلغ عشرة آلاف (بحوالہ توجیہ النظر ص ۹۳) | اعلیٰ درجے کی حدیثوں کی تعداد دس ہزار تک نہیں پہنچ پاتی۔

اسی سے اندازہ لگایے کہ صحیح بخاری میں صحیح سند کے ساتھ جو حدیثیں مروی ہیں ان کی تعداد بمشکل دو ہزار چھ سو کے قریب ہے اور صحیح مسلم کی حدیثوں کی کل تعداد چار ہزار ہے جبکہ اس میں اکثریت ان روایتوں کی ہے جو صحیح بخاری اور صحیح مسلم دونوں میں مشترک ہیں۔ بتلائیے حدیث کی یہ دو بڑی کتابیں ہیں ان دونوں کی صحیح حدیثوں کی مجموعی تعداد تین چار ہزار سے آگے نہیں بڑھتی۔ مؤطا امام مالک کو بھی شمار کر لیجئے جسے ام المصنوعین کہا جاتا ہے اس میں صحیح سند کے ساتھ مروی احادیث صرف چھ سو ہیں۔ غرض اعلیٰ درجے کی صحیح حدیثوں کی تعداد کسی طرح بھی دس ہزار کے عدد تک پوری نہیں پہنچتی دس ہزار سے کم ہی رہتی ہے اور یہ دس ہزار سے کم کی تعبیر بھی امام حاکم کے قول کے مطابق ہے جن کی تنقید کا معیار سب جانتے ہیں کہ اتنا سخت نہیں ہے۔

حقیقت حال سے ناواقف بعض حضرات کی سمجھ میں ممکن ہے یہ بات پوری طرح نہ اپاری ہو اور ان کے ذہنوں میں وہ لاکھوں کے ہند سے گھوم رہے ہوں جو مختلف محدثین کے تذکرے

ہیں وہ سنتے چلے آئے ہیں کہ فلاں فلاں محدث کو اتنے اتنے لاکھ حدیثیں یاد تھیں۔ اس سبب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آگے بڑھنے سے پہلے اصل صورت حال کی وضاحت ہو جائے :

**دو بنیادی باتیں** | احادیث کی صحیح تعداد کا تعین کرنے سے پہلے دو بنیادی باتوں کا سمجھ لینا انتہائی ضروری ہے۔ اول یہ کہ محدثین کا طریقہ یہ رہا ہے کہ وہ احادیث

کو متون کے اعتبار سے نہیں بلکہ ان کے طریقوں اور ان کی سندوں کے اعتبار سے گنتے تھے یعنی اگر کوئی حدیث دس طریقوں سے روایت ہوئی ہے تو محدثین کے نزدیک وہ ایک حدیث نہیں رہی بلکہ دس حدیثیں بن گئیں۔ دوم یہ کہ حدیث کا اطلاق ابتدا میں اگرچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات، آپ کے افعال اور آپ کی تقریرات پر ہی کیا جاتا تھا مگر بعد میں صحابہ کے اقوال و فتاویٰ اور ان کے مختلف فیصلوں کو بھی حدیث ہی کے ضمن میں داخل سمجھا جانے لگا بلکہ اس کے بھی بعد کے زمانے میں نوتا بعین اور تبع تابعین تک کے اقوال پر بھی حدیث کے لفظ کا اطلاق کیا جانے لگا :

ان دونوں بنیادی باتوں کا اگر لحاظ رکھا جائے تو حفاظ حدیث کی طرف منسوب احادیث کے سلسلے میں بیان کیے جانے والے لاکھوں کے ہندسوں کی اصل حقیقت سمجھنے میں کوئی دشواری نہ رہے گی۔

**توابع و تشواہد** | دراصل صحابہ سے روایت کرنے والے محدثین کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ ایک ہی روایت کو جن جن صحابیوں سے سننا ممکن ہو سب سے سنا جائے

اس طرح ایک روایت اگر کسی نے مثلاً حضرت ابو ہریرہؓ سے بھی سنی ہے، حضرت عائشہ صدیقہؓ سے بھی اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے بھی تو اپنی عبارت اور اپنے متن کے اعتبار سے تو

وہ اگرچہ ایک ہی حدیث ہے مگر محدث جب اسے ان تینوں سے روایت کرے گا تو یہی کہا جائیگا کہ اسے تین حدیثیں یاد ہیں۔ گویا ایک حدیث کی تین حدیثیں بن گئیں شروع شروع میں تو یہ سلسلہ

مختصر ہی رہا مگر جوں جوں زمانہ گزرتا گیا راویوں کی تعداد بڑھتی چلی گئی ہر راوی کی یہ کوشش رہی کہ جتنے شیوخ و اساتذہ سے کوئی حدیث حاصل کی جا سکے اس میں کمی نہ کی جائے چنانچہ ایک ایک حدیث کے راویوں کی تعداد سینکڑوں تک پہنچ گئی۔ دراصل کسی حدیث کے راویوں کی

تعداد جس قدر بڑھتی جاتی تھی اسی قدر اس حدیث کی قطعیت اور اس کے یقینی ہونے میں قوت بڑھتی چلی جاتی تھی اس لیے ہر محدث اپنی روایتوں میں قوت پیدا کرنے کے لیے زیادہ سے زیادہ راویوں کی تلاش کرتا تھا۔ اس طریق عمل کا نام محدثین کی اصطلاح میں متابعت ہے اور جو حدیثیں اس طرح جمع کی جاتی ہیں انہیں توابع و شواہد کہا جاتا ہے۔ مرور زمانہ کے ساتھ ساتھ توابع و شواہد جمع کرتے کا شوق شدید ہوتا گیا اور راویوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ اندازہ کیجئے ایک مشہور حدیث ہے: **اَلْمَا لَا عَمَالٍ بِالْاَنْبِیَاءِ** یہ کہنے کو تو ایک حدیث ہے مگر اس کے راویوں کی تعداد سات سو سے بھی منبج اور ہے اور اس طرح محدثین کی نظر میں یہ ایک حدیث نہیں بلکہ سات سو حدیثیں ہیں اور یہ کسی ایک حدیث کی بات نہیں بلکہ ذخیرہ حدیث کے بیشتر حصے کا۔ یہی حال ہے۔ یہ جو ہم امام احمد بن حنبل اور امام ابو زرعہ جیسے حفاظ حدیث کے بارے میں سنتے ہیں کہ انہیں سات لاکھ سے اوپر احادیث یاد تھیں یا امام بخاری کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انہیں دو لاکھ کے قریب غیر صحیح اور ایک لاکھ کے قریب صحیح احادیث زبانی حفظ تھیں یا اسی طرح امام مسلم اپنی صحیح کے بارے میں خود فرمایا کرتے تھے کہ میں نے اپنے کانوں سے سنی ہوئی تین لاکھ احادیث سے یہ مجموعہ منتخب کیا ہے۔ یہ اور اسی قسم کے بڑے بڑے اعداد جو مختلف محدثین کی طرف منسوب ہیں ان کا راز یہی ہے کہ یہ سب اعداد حدیثوں کے متن اور عبارت کے اعتبار سے نہیں بلکہ سند اور طریقے کے اعتبار سے ہیں راویوں کے ناموں میں ہماں کہیں لفظ دو لفظ کا اضافہ یا تبدیلی ہوئی حدیث کے عدد میں اضافہ ہو گیا اس طرح سے ایک حدیث چند لفظوں کے فرق سے سات سات سو کے عدد تک شمار ہوتی چلی گئی۔ احادیث کی تعداد کے سلسلے میں جو لاکھوں کے ہند سے نظر آتے ہیں وہ زیادہ تر اسی بنا پر ہیں۔ یا پھر حدیثوں کے عددی اضافہ کی بنیاد وہ توسع اور کشادگی ہے جو بعد کے دور میں حدیث کے لفظ کے اطلاق کے بارے میں اختیار کر لی گئی اور جس کا ذکر دوسرے درجے کے عامل کے طور پر ابھی اوپر ہوا ہے کہ صحابہ کرام کے اقوال و فتاویٰ نیز تابعین و تبع تابعین تک کے ملفوظات کو اصطلاحاً حدیث میں شامل سمجھا جانے لگا۔ انہی دو بنیادوں کا تذکرہ کرتے ہوئے صاحب توجیہ النظر لکھتے ہیں :

اکثر متقدمین حدیث کے لفظ کا اطلاق  
ایسے عام مفہوم پر کرتے تھے جس میں صحابہ  
تابعین اور تبع تابعین کے آثار و فتاویٰ سب  
ابھی داخل ہیں نیز ایک ہی حدیث جو دو سندوں  
سے مروی ہوتی اسے دو حدیث قرار دیتے

إِنْ كَثُرَ مَنْ الْمُتَقَدِّمِينَ كَأَوَّلِ الْبُلْقُونَ  
اسْمُ الْحَدِيثِ عَلَى مَا شَمَلَ آثار الصحابة  
وَالْتَابِعِينَ وَتَابِعِيهِمْ وَفَتَاوَهُمْ  
وَيُعَدُّونَ الْحَدِيثَ الْمُرَوِّىَ بِإِسْنَادَيْنِ  
حَدِيثَيْنِ۔

احادیث کی تعداد میں لاکھوں کے ہندسوں کی بنیاد انہی دو وجوہ کی بنا پر ہے۔ ورنہ  
جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے کہ اعلیٰ درجہ کی معیار حدیثوں کی تعداد دس ہزار تک بھی  
نہیں پہنچتی۔ صحیح کے ساتھ حسن ضعیف ہر قسم کی تمام حدیثیں جو اس وقت صحاح ستہ  
مسند احمد اور دو سہی کتابوں میں موجود ہیں ان سب کو بھی اگر ملا لیا جائے تب بھی تمام  
حدیثوں کی تعداد پچاس ہزار تک بھی بمشکل پہنچتی ہے یہ بھی اس وقت جبکہ اس میں  
جعلی اور موضوع احادیث بھی شامل کر لی جائیں۔ علامہ ابن جوزی سے بڑھ کر کس کا بیان  
قابل اعتماد ہو سکتا ہے انہوں نے اپنی کتاب صیदाخر اطریس فی فصل ۷۵ کے تحت  
احادیث کے اس عددی مغایطے کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

صحیح حدیثوں کے ساتھ ان ساری بے بنیاد جھوٹی  
اور گھڑی ہوئی جعلی حدیثوں کو بھی جمع کر لیا جائے  
جو کتابوں میں پائی جاتی ہیں تو وہ بھی پچاس ہزار  
تک نہیں پہنچتیں۔

انہ لوجع الصحیح والمحال والموضوع  
وکل منقول عن رسول اللہ صلی اللہ  
علیہ وسلم ما بلغ خمسين الفا۔

ابن جوزی کے قول کو ممکن بنانے کی تشدد پسندی اور تنقید کے معیار میں سختی اختیار کرنے  
کی بنا پر درخور اعتنا نہ سمجھا جائے لیکن علامہ جلال الدین سیوطی کی سہولت پسندی اور تنقید  
کے معیار میں نرمی تو سب کو معلوم ہے انہوں نے اپنی کتاب جمع الجوامع میں تمام حدیثوں کو جمع  
کرنے کا اہتمام کیا ہے۔ اس کتاب میں احادیث کی تعداد پچاس ہزار سے کہیں کم ہے۔  
بکہ دُر کیوں جائیے کنز العمال نامی کتاب سے کون واقف نہیں یہ جمع الجوامع ہی کی فتنی ترتیب



ہے اس کے مؤلف ہندوستان کے مشہور محدث علی متقی ہیں ان کا دعویٰ ہے کہ اس کتاب میں نہ صرف جمع ابواب کی کل حدیثیں موجود ہیں بلکہ وہ بھی ہیں جو جمع ابواب میں شامل ہونے سے رہ گئی تھیں۔ اب سنئے کنز العمال میں جمع شدہ احادیث کی کل تعداد چالیس ہزار نو سو اسیٹھ ہے اور یہ بھی اس وقت ہے جبکہ اس کتاب میں ابھی مکمل رات موجود ہیں غرض اس امر میں کوئی شبہ نہیں کہ صحیح اعلیٰ معیار کی حدیثوں کی تعداد اگر دس ہزار تک بھی نہیں پہنچتی تو ضعیف و حسن و صحاح سب کو ملانے کے بعد تیس یا بیس ہزار سے آگے ان کی تعداد کا بڑھنا مشکل ہے البتہ موضوعات کو ملا لینے کے بعد شاید پچاس ہزار تک یہ تعداد پہنچ جائے۔

ہر حال چونکہ اعلیٰ درجے کی صحیح احادیث دس ہزار سے کم ہی ہیں اس لیے حضرت ابوہریرہ کی پانچ ہزار تین سو چوبیس روایات کا مکتوب صورت میں محفوظ ہو جانا ثابت ہو جانے کے بعد ہمارا یہ دعویٰ پایہ ثبوت کو پہنچ گیا کہ احادیث کا اکثر و غالب حصہ قرن اول ہی میں قلم بند ہو چکا تھا مگر ابھی ہمیں بہت کچھ کہنا ہے ابھی تو مکثرین صحابہ میں سے صرف ایک صحابی کی روایات کا ذکر ہوا ہے۔

**حضرت عبداللہ بن عباس کا کتابی مجموعہ** | مکثرین صحابہ میں سے دوسرے نمبر پر حضرت عبداللہ بن عباس کا نام آتا ہے ان سے روایت ہونے والی احادیث کی تعداد دو ہزار چھ سو ساٹھ (۲۶۶۰) ہے۔ متعدد شواہد ایسے موجود ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کی روایات کا مجموعہ ان کی زندگی ہی میں قلم بند ہو چکا تھا۔

طبقات ابن سعد کی یہ روایت بہت مشہور ہے حدیث کا کوئی طالب علم بھی اس سے بے خبر نہ ہوگا کہ حضرت عبداللہ بن عباس کی جب وفات ہوئی تو جو علم انہوں نے چھوڑا وہ اتنی کتابوں کی صورت میں تھا کہ ایک اُرنٹ کا بوجھ بنتا تھا۔ ایسے حافظ ابن حجر عسقلانی نے

بھی تہذیب التہذیب میں موسیٰ بن عقبہ کا بیان نقل کیا ہے وہ فرماتے تھے :

میرے پاس عبداللہ ابن عباس کے غلام  
کرینے ابن عباس کی کتابیں رکھوائی تھیں  
جو ایک یا نصف بار شتر تھیں۔

وضع عندنا کُریب (موسىٰ عبد اللہ بن  
العباس) حملٌ بعیراً وعدلٌ بعین  
کتب ابن عباس (تہذیب جلد ۵)

علم کا یہ کتابی مجموعہ کیا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے سوا بھی کچھ ہو سکتا ہے۔ نبی  
کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث قلم بند کرنے میں حضرت عبداللہ بن عباس کا عالم یہ تھا  
کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام حضرت ابورافع کے پاس پہنچتے اور  
حیات نبوی سے متعلق ایک ایک دن کا حال تفصیل سے پوچھتے جاتے اور لکھتے جلتے۔  
الکتانی کی وہ روایت اس پر شاہد ہے جو انہوں نے روایانی کی مسند سے بسند متصل نقل  
کی ہے اس کے الفاظ ہیں :

ابن عباس ابورافع کے پاس آتے اور کہتے کہ  
فلاں دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا  
کیا اور ابن عباس کے ساتھ ایک شخص ہوتا  
جو ان باتوں کو لکھتا جاتا۔

کان ابن عباس یأتی ابا رافع فیقول  
ما صنع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم  
یوم کذا مع ابن عباس من یکتب ما  
یقول (الکتانی)

طبقات ابن سعد کی ایک روایت کے مطابق حضرت عبداللہ ابن عباس نے احادیث نبوی بہت سی  
تختیوں پر بڑے اہتمام کے ساتھ لکھی ہوئی تھیں جب آپ کی محفل میں جاتے تو یہ تختیاں اپنے ساتھ  
لے کر جاتے۔ حضرت ابورافع کی بیوی حضرت سلمیٰ کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ  
ان تختیوں میں وہی علم تھا جو حضرت عبداللہ ابن عباس نے حضرت ابورافع سے حاصل کیا  
تھا۔ روایت ہے :

رَأَيْتُ ابْنَ عَبَّاسٍ مَعَ الْوَاخِ يَكْتُبُ  
عَلَيْهَا عَنْ أَبِي رَافِعٍ شَيْئًا مِنْ  
فَعَلِ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ  
وَسَلَّمَ

(المکاتبی بحوالہ طبقات ابن سعد)

میں نے ابن عباس کو دیکھا کہ ان کے پاس تختیاں  
ہیں جن پر وہ ابورافع کی بیان کی ہوئی ان روایتوں  
کو لکھا کرتے تھے جو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ  
وسلم کے افعال کے متعلق بیان کیا کرتے تھے۔

یہ تمام شواہد اس بات کا ثبوت ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عباس نے اپنی تمام مرویات اپنے  
طور پر لکھ کر اپنے پاس محفوظ رکھی ہوئی تھیں۔ اب کچھ ایسے شواہد بھی ملاحظہ کر لیجئے جن  
سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ کی مرویات کے کچھ نسخے آپ کے شاگردوں اور دوسرے لوگوں نے  
بھی تیار کیے ہوئے تھے۔

سنن دارمی میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس کے ممتاز ترین شاگرد سعید بن جبیر  
نے اپنے استاد کی مرویات کے متعدد صحیفے تیار کیے ہوئے تھے۔ حضرت عبداللہ بن عباس  
باقاعدہ ان کو املا کرتے جاتے اور وہ لکھتے جاتے۔ انہماک کا عالم یہ ہوتا کہ لکھتے لکھتے اگر کاغذ  
ختم ہو جاتا تو اپنے کپڑوں پر اور اپنے جوتوں پر ہی لکھنا شروع کر دیتے۔ بعض اوقات کچھ  
نہ ملتا تو اپنی سٹھیلی پر ہی لکھ لیتے اور پھر اپنے گھر جا کر اپنے صحیفوں میں درج کر لیتے۔ حضرت  
سعید بن جبیر کے اس انہماک کو دیکھ کر اور اس حقیقت کو سامنے رکھتے ہوئے کہ حضرت عبداللہ  
ابن عباس کے علم کے یہ سب سے بڑے راوی ہیں یہ یقین کر لینے میں کوئی امر مانع نہیں کہ  
حضرت عبداللہ بن عباس کی شاید ہی کوئی حدیث ایسی ہو جو ان کے ہاتھوں تحریر میں  
آئے سے رہ گئی ہو۔ علم ابن عباس پر مشتمل یہ صحیفے ڈاکٹر صبحی صالح کے بیان کے مطابق  
مدت مدید تک متداول رہے اور حضرت عبداللہ بن عباس کے بیٹے حضرت علی ان صحیفوں  
سے استفادہ کرتے ہوئے دیکھے گئے۔

حضرت عبداللہ بن عباس کی مرویات کے مکتوب ہونے پر ایک اور شہادت آپ کے مشیر آزاد کردہ غلام حضرت عکرمہ کی زبانی نلاحظہ فرمائیے۔ فرماتے ہیں :

<p>حضرت ابن عباس کے پاس طائف کے کچھ لوگ ان کی کتابوں کو لے کر حاضر ہوئے اور ان کے سامنے پڑھنے لگے۔</p>	<p>أَنَّ لَفْرًا قَدْ مَرَّ عَلَى ابْنِ عَبَّاسٍ مِنْ أَهْلِ الطَّائِفِ بَكْتَبٍ مِنْ كُتُبِهِ فَيَجْعَلُ يَقْرَأُ عَلَيْهِمْ (كتاب العل)</p>
--	---

حضرت عکرمہ کی اس روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس کے خاص خاص شاگردوں کے علاوہ کچھ دوسرے اصحاب نے بھی آپ سے روایت کردہ احادیث کے مجموعے تیار کیے ہوئے تھے اور یہ مجموعے ایک دوہیں بلکہ متعدد تھے کتب کا لفظ یعنی جمع کا صیغہ ہی بتلاتا ہے۔ اس روایت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ مختلف مجموعے حضرت عبداللہ بن عباس کی زندگی ہی میں تیار ہو چکے تھے اور آپ سے ان کی تصدیق بھی کرائی جا چکی تھی۔

**حضرت عائشہؓ کی مرویات کا مکتوب ذخیرہ** | مکترین صحابہ میں ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا تیسرے نمبر پر ہیں۔ محدثین نے ان کی روایت کردہ حدیثوں کی تعداد دو ہزار دو سو دس (۲۲۱۰) بتائی ہے۔ عورتوں میں سب سے زیادہ احادیث حضرت عائشہ صدیقہؓ ہی سے مروی ہیں۔ اگرچہ حضرت عائشہ صدیقہؓ کے اپنے متعلق تو یہ ثابت نہیں ہے کہ آپ نے خود اپنی مرویات کا کوئی مجموعہ تیار کیا تھا یا نہیں مگر یہ ضرور ثابت ہے کہ آپ کے براہ راست شاگرد اور حقیقی بہن کے لڑکے حضرت عروہ بن زبیر نے یقیناً اپنے علم کو ایک کتاب میں محفوظ کیا تھا جس میں ظاہر ہے حضرت عائشہ صدیقہؓ کی مرویات ہی ہوں گی کیونکہ حضرت عروہ بن زبیر کا شمار ان لوگوں میں ہے جو حضرت عائشہ صدیقہؓ کی روایتوں کے سب سے زیادہ جاننے والے تھے۔ ان کا تو سارا سرمایہ ہی اپنی خالہ سے حاصل کیے ہوئے علم میں منحصر تھا۔ حضرت عروہ کے اس مکتوب مجموعے کا ثبوت ان کے اس واقعے سے ملتا ہے جو حافظ ابن حجر نے تہذیب التہذیب میں واقعہ عروہ کے سلسلے میں نقل کیا ہے کہ جب مدینہ

ٹوٹا اور برباد کیا گیا تو غلط فہمی کی بنا پر انہوں نے اپنے اس مجموعے کو قصداً ضائع کر دیا مگر بعد میں اپنی اس بلد بازی پر تائب ہو کر پچھتاتے رہے۔ اپنے اس مکتوب مجموعے کے ضائع ہو جانے کا حضرت عروہ کو اس قدر افسوس تھا کہ اکثر فرمایا کرتے :

<p>اچھا ہوتا کہ میں اپنے اہل و عیال اور اپنے مال کو اس کتاب پر قربان کر دیتا۔</p>	<p>لَوَدِدْتُ اَنْتَ كُنْتُ فَدَيْتُهَا بِاهْلِي وَمَالِي</p>
---	---

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی مرویات کے امین جس طرح مردوں میں حضرت عروہ بن زبیر تھے اسی طرح عورتوں میں حضرت عمرہ بنت عبد الرحمن تھیں۔ حضرت عمرہ بنت عبد الرحمن کے علم کے مکتوب ہونے کا ثبوت بھی ملتا ہے ان کے علم کو ان کے بھانجے ابو بکر بن محمد بن عمرو بن خروم نے حضرت عمر بن عبد العزیز کے اس مشہور فرمان کی بنیاد پر قلم بند کر لیا تھا جس کا ذکر امام بخاری نے بھی کیا ہے اس طرح حضرت عائشہ کی مرویات ایک مرتبہ مکتوب ہونے کے بعد اگر حضرت عروہ کے ہاتھوں ضائع ہو گئی تھیں تو آپ کی خاتون شاگرد حضرت عمرہ بنت عبد الرحمن کے واسطے سے دوبارہ تحریری صورت میں جمع ہو گئیں۔ حضرت عمرہ نے حضرت عائشہ صدیقہ کی گود میں پرورش پائی تھی۔ مشہور محدث شیخ ابن مدینی کا قول ہے کہ عمرہ حضرت عائشہ کی مستند حدیثوں کی جاننے والی تھیں۔

حضرت عائشہ صدیقہ کے تیسرے مشہور شاگرد اور آپ کی مرویات کے امین آپ کے بھتیجے حضرت قاسم بن محمد بن ابی بکر ہیں ان کے علم کو بھی حضرت عمر بن عبد العزیز کے فرمان پر ابو بکر بن محمد بن عمرو بن خروم نے ہی قلم بند کیا تھا۔ حضرت عمرہ اور حضرت قاسم کے علم کو جمع کرنے کا حکم دیتے ہوئے حضرت عمر بن عبد العزیز نے لکھا تھا :

<p>عمرہ بنت عبد الرحمن اور قاسم بن محمد کے علم (حدیثوں) کو وہ ان کے لیے لکھ کر تیار کریں۔</p>	<p>اَنْ يَكْتُبَ لَهُ مِنَ الْعِلْمِ مَنْ عِنْدَ عَمْرَةَ بنت عبد الرحمن والقاسم بن محمد (بخاری)</p>
---	--

حضرت قاسم کے علم کا زیادہ تر مدار حضرت عائشہ ہی کی مرویات پر تھا کیونکہ ان کے والد محمد بن ابی بکر ان کے بچپن کے زمانے ہی میں مشہور نقتے میں شہید ہو چکے تھے ان کے بعد ان کی تمام تر کفالت حضرت عائشہ نے اپنے ذمے لے لی تھی اور اپنے اس یتیم بھتیجے کی بڑی شفقت سے تعلیم و تربیت کی تھی۔ بہر حال حضرت قاسم کی راہ سے بھی حضرت عائشہ کی مرویات مکتوب ہو کر محفوظ ہو گئیں :

حضرت عبداللہ بن عمر کی مرویات کے تحریری نسخے کا نمبر آتا ہے ان کی روایات کی تعداد ایک ہزار چھ سو تیس (۱۶۳۰) ام المومنین۔ حضرت حفصہ کے بھائی ہونے

کی خثیبت سے آپ کو چونکہ حرم نبوی میں آمد و رفت کی سہولت حاصل تھی نیز آپ اسلام بھی بہت پہلے لا چکے تھے اس لیے آپ کو احادیث نبوی سے استفادے کا خوب خوب موقع ملا۔ السنۃ قبل التدوین کے مصنف محمد عجاج الخطیب نے الجراح بلا خلاق الراوی و آداب السامع کے حوالہ سے بیان کیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر کے پاس اپنی روایات کا مکتوب ذخیرہ موجود تھا۔ لکھا ہے

روایت ہے کہ عبداللہ بن عمر جب کبھی بازار نکلتے تو اپنی کتابوں کو دیکھ لیتے راوی تاکید کرتے ہیں کہ ان کی کتابیں احادیث پر مشتمل تھیں۔

يُرْوَى أَنَّ عَبْدَ اللَّهِ بْنَ عَمْرٍو كَانَ إِذَا خَرَجَ إِلَى السُّوقِ نَظَرَ فِي كِتَابِهِ وَقَدْ أَكَّدَ الرَّوَاةُ أَنَّ كِتَابَهُ هَذِهِ كَانَتْ فِي الْحَدِيثِ.

کتب کا لفظ اس روایت میں بھی قابل غور ہے گویا ایک دو کتابیں نہیں بلکہ متعدد کتابیں تھیں جو حضرت ابن عمر نے اپنی مرویات کی تیار کی ہوئی تھیں راوی نے اس بات کی بطور خاص صراحت کی ہے کہ یہ کتابیں احادیث نبوی پر مشتمل تھیں حضرت ابن عمر کے اس ذاتی مکتوب ذخیرے کے علاوہ بھی آپ کی مرویات آپ کے بھراہ راست شاگرد حضرت نافع کے واسطے سے تحریری شکلی میں محفوظ ہو گئی تھیں۔ اس کے ثبوت کے لیے شہادت کے طور پر سنن دائمی کی وہ روایت پیش کی جاسکتی ہے جس میں سلمان بن موسیٰ کے حوالہ سے یہ کہا گیا ہے کہ

اللّٰهُ رَأٰى نَافِعًا مَوْلٰى ابْنِ عُمَرَ عَلٰى  
عِلْمِهِ وَيَكْتُبُ بَيْنَ يَدَيْهِ ۔

انہوں نے حضرت ابن عمر کے آزاد کردہ غلام حضرت  
نافع کو دیکھا کہ لوگ ان کے سامنے بیٹھ کر لکھ رہے ہیں

طبقات ابن سعد میں بھی یہ روایت موجود ہے۔ حضرت نافع حضرت عبداللہ ابن عمر کے آزاد  
کردہ غلام اور چیمپے شاگرد تھے اس قدر چیمپے کہ حضرت ابن عمر کبھی کبھی فرمایا کرتے :

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا بِنَافِعٍ (تہذیب) | اللہ نے نافع کی صورت میں ہم پر احسان کیا ہے

یہ تیس برس تک مسلسل حضرت ابن عمر کی خدمت میں رہے اس طویل عرصے میں حضرت عبداللہ  
ابن عمر کے علم سے کیا کچھ مستفیض نہ ہوئے ہوں گے۔ ان کے علم کا مکتوب ہو جانا یقیناً حضرت  
ابن عمر کے علم کا مکتوب ہو جانا ہے :

حضرت جابر کے صحیفے | مکثر بن صحابہ میں سے اب صرف ایک دو ہی کا ذکر باقی رہ  
گیا ہے انہی میں حضرت جابر بن عبداللہ ہیں ان کی مرویات

کی کل تعداد ایک ہزار پانچ سو چالیس (۱۵۴۰) ہے۔ اب ان کی مرویات کے قلم بند  
ہونے کا حال سنئے۔ جہاں تک ان کے اپنے ذاتی مجموعے کا تعلق ہے اتنی بات یقینی ہے کہ انہوں  
نے بھی ایک صحیفہ رقم کیا ہوا تھا۔ اس صحیفے کی ضخامت معلوم ہوتا ہے سورہ بقرہ کے برابر  
یا اس سے کچھ زیادہ ہی تھی کیونکہ مشہور تابعی قتادہ بن دعامة السدوسی جہنور نے اس  
صحیفہ کو حفظ کیا ہوا تھا کہا کرتے تھے :

جابر کا صحیفہ تو مجھے سورہ بقرہ سے بھی زیادہ  
اندر ہے ۔

لَا نَا بِصَحِيفَةِ جَابِرٍ أَحْفَظَ مِنِّى  
سُورَةُ الْبَقَرَةِ (تاریخ الکبیر۔ امام بخاری)۔

حضرت قتادہ ابن دعامة کے اس قول سے جہاں یہ معلوم ہوا کہ یہ صحیفہ کافی ضخیم تھا وہاں یہ بھی  
پتہ لگا کہ یہ صحیفہ لوگوں میں عام طور پر مشہور بھی تھا حضرت قتادہ کے بات کرنے کا انداز یہی  
بتلا رہا ہے اس صحیفے کی موجودگی کا ثبوت صحیح مسلم کی اس روایت سے بھی ملتا ہے جس میں  
ذکر ہے کہ حضرت جابر کا صحیفہ حج کے مناسک پر مشتمل تھا ۔

حضرت جابرؓ کے اس ذاتی مجموعے کے علاوہ ایسے شواہد بھی موجود ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت جابرؓ کے شاگردوں نے بھی اپنے استاد کی مرویات کے مجموعے تیار کیے تھے۔ چنانچہ ان کے مشہور شاگرد سلمان بن قیسؓ الیشکری کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انہوں نے حضرت جابرؓ کا ایک مجموعہ تیار کیا تھا اور شعبی و سفیان جیسے بڑے بڑے محدثین نے اس مجموعے کو سلمان بن قیسؓ کی زبان سے لفظ بہ لفظ سنا بھی تھا۔ صاحب تفتیح العلم نے محدث ابوسفیانؓ کا ایک قول نقل کیا ہے کہ سلمان حدیثیں لکھ لیا کرتے تھے اور میں لکھا نہیں کرتا تھا۔

اسی طرح حضرت جابرؓ کے دوسرے مشہور شاگرد وہب بن منبہ کے بارے میں حافظ ابن حجرؒ نے تہذیب التہذیب میں ایک روایت نقل کی ہے کہ حضرت جابرؓ جب مسجد نبویؐ کے حلقہٴ درس میں اپنے شاگردوں کو حدیثیں لکھوایا کرتے تو وہب بن منبہ وہ حدیثیں لکھا کرتے تھے۔ اس روایت سے حضرت جابرؓ کی مرویات حضرت وہب بن منبہ کے ہاتھوں لکھتے ہو جانے کا ثبوت تو ملتا ہی ہے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ حضرت جابرؓ اپنے تلامذہ کو باقاعدہ حدیثیں لکھوایا کرتے تھے اس طرح نہ جانے کتنے شاگردوں نے اپنے استاد کی مرویات کو لکھ کر محفوظ کر لیا ہوگا۔ مسجد نبویؐ میں حضرت جابرؓ کے حلقہٴ درس کے بارے میں نوالاصباح فی معرفۃ الصحابہ میں بھی ہشام بن عروہ کی ایک روایت موجود ہے کہ

مسجد نبویؐ میں حضرت جابر بن عبد اللہؓ کا ایک حلقہٴ درس تھا جس میں ان سے لوگ علم حاصل کرتے تھے۔

كَانَ لِجَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ حَلَقَةٌ فِي  
الْمَسْجِدِ النَّبَوِيِّ يُؤْخَذُ عَنْهُ الْعِلْمُ

(امایہ جلد ۱ ص ۳۳)

اس حلقہٴ درس میں شریک ہونے والوں میں مشہور تابعی محمد بن الحنفیہؓ، محمد بن علی ابو جعفر الباقرؓ اور عبد اللہ بن محمد عقیلؓ جیسی ہستیوں کے نام آتے ہیں ان تینوں حضرات کے بارے میں ابن سعد کا بیان ہے کہ یہ تینوں حضرت جابرؓ کی خدمت میں حاضر ہو کر احادیث نبویہ کے



بارے میں دریافت کرتے اور لکھا کرتے تھے۔

حضرت انس کا تحریری مجموعہ | مکترین صحابہ کی فہرست میں سے ابھی حضرت انس رضی اللہ عنہ کا ذکر کرنا باقی ہے حضرت

انس رضی اللہ عنہ ہی سے لکھنے کے فن سے خوب واقف تھے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خادم خاص ہونے کی بنا پر دربار نبوی میں ہمہ وقت حاضری بھی نصیب تھی اس لحاظ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث لکھنے کا خوب خوب موقع ملا آپ نے نہ صرف احادیث لکھیں بلکہ لکھ کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے تصدیق کے لیے پیش بھی کیں۔ حاکم نے مستدرک میں سعید بن ہلال سے روایت کیا ہے کہ

كُنَّا إِذَا أَكْثَرْنَا عَلَى أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ فَأَخْرَجَ إِلَيْنَا مَجَالًا عِنْدَهُ فَقَالَ هَذِهِ سَمْعَتُهَا مِنَ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَكُتِبَتْهَا وَعُرِضَتْهَا عَلَيْهِ

ہم حضرت انس رضی اللہ عنہ سے زیادہ پوچھ گچھ لگاتے تو وہ اپنے پاس سے ایک چونگہ نکالتے اور فرماتے یہ ہیں وہ حدیثیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے میں نے سنی اور ان کو لکھا اور لکھ کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کر چکا ہوں۔

اسی بات کو خطیب بغدادی حضرت قتادہؓ سے ان الفاظ میں روایت کرتے ہیں :

كَانَ يَمْلِكُ الْحَدِيثَ حَتَّى إِذَا أَكْثَرَ عَلَيْهِ النَّاسُ جَارِ بِجَالٍ مِنْ كُتُبٍ فَأَلْقَاهَا ثُمَّ قَالَ هَذِهِ أَعْلَدْتُ سَمْعَتُهَا وَكُتِبَتْهَا عَنْ رَسُولِ اللَّهِ وَعُرِضَتْهَا عَلَيْهِ (تقييد العلم)

وہ حدیثیں لکھو یا کرتے اور جب لوگ زیادہ آ جاتے تو کتابوں کا ایک چونگہ نکال کر ڈال دیتے اور فرماتے یہ ہیں وہ احادیث جو میں نے رسول اللہ سے سنی ہیں انہیں لکھا ہے اور حضور کے سامنے پیش کیا ہے۔

ہر حال ان روایتوں سے معلوم ہوا کہ حضرت انسؓ نے احادیث کو صرف قلم بند ہی نہیں کیا تھا اصلاح و تصحیح کی غرض سے بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش بھی کیا تھا اس لحاظ سے شاید یہ واحد صحابی ہیں کہ جن کا مجموعہ احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تصدیق و توثیق شدہ تھا۔

یہ تحریری مجموعہ تو وہ تھا جو حضرت انسؓ نے خود تیار کیا تھا اس مجموعے کے علاوہ بھی بعض مجموعے آپ کے شاگردوں نے بھی تیار کیے تھے مثلاً دارمی میں سلم العلوی سے روایت ہے کہ

رَأَيْتُ ابَانَ يَكْتُبُ عِنْدَ أَنَسٍ فِـ | میں نے ابان کو دیکھا کہ وہ حضرت انسؓ کے پاس  
سُورَةَ۔ | بیٹھے کاپی میں حدیثیں لکھتے تھے۔

شاگردوں کے علاوہ گمانِ اغلب ہے کہ آپ کی اولاد نے بھی آپ کی مرویات کے مجموعے تیار کیے ہوں گے کیونکہ داری ہی میں ان کے بیٹوں کے بارے میں جن کی ایک بڑی تعداد تھی ایک روایت ہے کہ حضرت انسؓ اپنے بیٹوں سے اکثر فرمایا کرتے

يَا بَنِيَّ تَيِّدُوا هَذَا الْعِلْمَ | میرے بچو اس علمِ حدیث کو قید تحریر میں  
سے آبا کرو۔

مکثرین صحابہ میں سے اب صرف حضرت ابوسعید خدریؓ کا ذکر باقی رہ گیا ہے ان کے بارے میں اگرچہ کوئی ایسی شہادت نہیں ملتی جس سے معلوم ہو سکے کہ ان کی مرویات قلم بند ہوئی تھیں یا نہیں مگر متذکرہ بالا مکتوب ذخیروں کے پیش نظر کہا جاسکتا ہے کہ حضرت ابوسعید خدریؓ بھی اپنے ساتھیوں سے پیچھے نہ رہے ہوں گے۔ یہی منکرین حدیث کی پھیلائی ہوئی یہ غلط فہمی کہ انہیں احادیث لکھنے سے منع کر دیا گیا تھا اس لیے انہوں نے کوئی حدیث قلم بند کی ہی نہیں تو اس کی اصل حقیقت ممانعتِ کتابت پر گفتگو کرتے ہوئے واضح کی جا چکی ہے۔

مکثرین صحابہ کے جن تحریری ذخیروں کا اب تک ذکر ہوا ہے ان کی موجودگی میں یہ کہنا کسی طرح بھی قرین الصواب نہیں کہ عہد نبوت و عہد صحابہ میں حدیث کا دار و مدار صرف حفظ پر مرکوز تھا یا تحریری شکل میں اس ذخیرے کو محفوظ نہیں کیا جاسکا یہ مکتوب ذخیرے اس بات کا

ممتہ یولتا بثوت ہیں کہ احادیث صحیحہ کا اکثر وغالب حصہ ہی نہیں تمام تر حصہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک اور اس کے متصل زمانے میں ہی قید تحریر میں آکر مسینوں کے ساتھ ساتھ مسینوں میں بھی پوری طرح محفوظ ہو چکا تھا۔ اور ابھی تو یہ مکتوب ذخیرے بھی صرف ناکثرین صحابہ کی مرویات تک محدود رہے ہیں ابھی تو ایسے کئی صحیفوں کا ذکر ہمیں کرنا ہے جو مکثرین صحابہ کے علاوہ دیگر اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب ہیں نیز ان صحف کے علاوہ ابھی ان خطوط، معاہدوں، امان ناموں اور جاگیر و قطائع کے فرامین کا ذکر بھی باقی ہے جن کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود لکھوایا ہے اور جن کی تعداد سینکڑوں سے متجاوز ہے۔

کتابت حدیث کے سلسلے میں جو کچھ اب تک کہا گیا ہے وہ اگرچہ ان شکوک و شبہات کے ازالے کے لیے بہت کافی ہے جو حدیث کو عامۃ المسلمین کے اعتماد سے محروم کرنے کے لیے اس کے غیر محفوظ ہونے کے بارے میں منکرین حدیث کی طرف سے برسرے شد و بدر سے اچھالے جاتے ہیں تاہم کتابت حدیث سے متعلق ہماری بات ابھی پوری نہیں ہوئی اس لیے اب ہم مزید چند ایسے قابل ذکر صحیفوں کی نشاندہی کرتے لگے ہیں جو مکثرین کے علاوہ دیگر صحابہ کی طرف منسوب ہیں۔ ان میں وہ صحیفے بھی ہیں جو بعض صحابہ نے اپنے طوے پر رقم کیے اور وہ صحیفے بھی ہیں جن کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض مخصوص حالات میں بعض لوگوں کو خود لکھوا کر عطا فرمائے :

**صحیفۃ الصادقہ** | ان صحف میں سے جس صحیفہ کا ذکر اولیت کا منتقاضی ہے وہ صحیفۃ صادقہ ہے جس کو حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص نے تیار کیا تھا۔ آپ غالباً سب سے پہلے شخص ہیں جنہوں نے احادیث کو کتابی شکل دی جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے آپ کو دربار نبوی سے کتابت حدیث کی خصوصی اجازت ملی ہوئی تھی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اکثر حاضر رہتے اور جو کچھ زبان نبوی سے نکلتا لکھ لیتے اس طرح آپ نے ایک مستقل کتاب تیار کر لی اور باقاعدہ اس کو الصادقہ کے نام سے مرسوم

کیا۔ مولانا مناظر احسن گیلانی نے اپنی کتاب تدرین حدیث میں حوالہ دے کر اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ یہ نام خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تجویز فرمایا تھا اگرچہ نلاحظاں بسیار کے باوجود ایسی کوئی روایت نہیں مل سکی تاہم اس میں کوئی شبہ نہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمر و خود اس کتاب کو اسی نام سے یاد کرتے تھے۔ ابن اثیر جزیری نے اسد الغابہ میں حضرت عبداللہ بن عمر کا تذکرہ کرتے ہوئے ان کا یہ قول نقل کیا ہے :

صادقہ ایک صحیفہ ہے جو میں نے بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سُن کر لکھا ہے اس میں وہ کچھ ہے جو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا اور میرے اُور ان کے درمیان جس میں کوئی واسطہ نہیں۔

الصَّادِقَةُ صَحِيفَةُ كُتُبِهَا مِنْ  
رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَقَالَ هِيَ  
الصَّادِقَةُ فِيهَا مَا سَمِعْتُهُ مِنْ رَسُولِ  
اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَلَيْسَ بَيْنِي  
وَبَيْنَهُ أَحَدٌ۔

حدیث کی اکثر کتابوں میں اس صحیفہ کا تذکرہ ملتا ہے امام احمد نے تو اپنی مستند میں اس سے جو کاتوں نقل کر دیا ہے۔ حافظ ابن حجر نے تہذیب التہذیب میں مشہور جلیل القدر تابعی حضرت مجاہد کے بارے میں لکھا ہے کہ انہوں نے یہ صحیفہ عبداللہ بن عمرو کے پاس دیکھا تھا اے نیز حضرت عبداللہ بن عمرو کے پوتے عمرو بن شعیب کے متعلق نقل کیا ہے کہ وہ اس صحیفہ سے حدیثیں روایت کیا کرتے تھے یہ سنن دارمی میں بھی اس صحیفہ کا تذکرہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن الحارث کے اپنے الفاظ میں اس طرح ہے :

مجھے زندگی و د چیزوں کی وجہ سے عزیز ہے ایک  
صادقہ کی بنا پر اور ایک و صطہ (نای زمین)  
کی بنا پر۔ صادقہ وہ صحیفہ ہے جو میں نے رسول  
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے (سُن کر) لکھا  
..... الخ

ما بين غبني في الحياة إلا خصلتان  
الصادقة والوهضة فأما الصادقة  
فصحيفة كتبتها عن رسول الله  
الخ - (سنن دارمی جلد ۱)۔

اس روایت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ کو یہ صحیفہ حضرت عزیرؓ  
 تھا اور کیوں نہ ہوتا زندگی بھر کی کمائی تھی۔ تذکرۃ الحفاظ میں ہے کہ جب بھی آپؓ کوئی  
 شخص الیا مسئلہ پوچھتا جس کا جواب نہ ہوتا تو آپؓ اس صحیفے سے دیکھ کر وہ  
 مسئلہ بتاتے معلوم ہوتا ہے ہر قسم کے مسائل و احکام پر مشتمل احادیث اس صحیفے میں موجود  
 تھیں۔ اس صحیفے میں احادیث کتنی تعداد میں تھیں اس سلسلے میں حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جاسکتا۔  
 اگرچہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ کی کل مرویات کی تعداد سات سو بتائی جاتی ہے لیکن  
 اسد الغابہ میں ابن الاثیر جزریؒ نے حضرت عبداللہ بن عمروؓ کے تذکرے میں نقل کیا ہے  
 کہ صحیفہ صادقہ میں ایک ہزار احادیث تھیں مگر یہ قول بھی مروج نظر آتا ہے اس لیے کہ صحیح بخاری  
 میں منقول حضرت ابو ہریرہؓ کے اس اعتراف کو اگر مد نظر رکھا جائے جس میں انہوں نے حضرت  
 عبداللہ بن عمروؓ کو اپنے سے زیادہ حدیثوں کا حامل مانا ہے تو پھر ماننا پڑے گا کہ صحیفہ  
 صادقہ میں ایک ہزار سے کہیں زیادہ احادیث مرقوم تھیں۔ حضرت ابو ہریرہؓ فرمایا کرتے تھے:

صیابہ میں مجھ سے زیادہ کثیر الروایات اور کوئی نہ  
 تھا البتہ حضرت عبداللہ بن عمروؓ کا معاملہ جداگانہ  
 نوعیت کا تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ حدیثیں لکھ  
 لیا کرتے تھے اور میں لکھتا نہیں تھا۔

ما من أصحاب رسول الله أحد أكثر  
 حديثاً عنه مني إلا ما كان من  
 عبد الله بن عمرو فإنه كان  
 يكتب ولا أكتب۔

حضرت ابو ہریرہؓ کی مرویات جیسا کہ بتایا جا چکا ہے کہ پانچ ہزار تین سو چوبیس ہیں تو اس کا  
 مطلب یہ ہوا کہ اس روایت کی روشنی میں حضرت عبداللہ بن عمروؓ کی مرویات پانچ ہزار تین سو  
 چوبیس سے یقیناً زیادہ ہونی چاہئیں اور زیادہ بھی دو چار نہیں بلکہ خاصی تعداد میں ہونی چاہئیں  
 اس لیے کہ عام محاورے میں اکثر کے لفظ سے دو چار عدد کی زیادتی کبھی مقصود نہیں ہوتی بلکہ  
 اکثر کا لفظ معقول تعداد کی زیادتی کو چاہتا ہے گویا احادیث صحیحہ کی جو تعداد بتائی گئی ہے  
 اس کے قریب قریب تعداد کے برابر احادیث تھیں جو حضرت عبداللہ بن عمروؓ روایت کرتے تھے  
 اور یہ پہلے گزر چکا ہے کہ آپؐ بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر بات لکھ لیتے تھے اس لیے یہ خیال

کرنا غلط نہ ہوگا کہ صحیفہ صادقہ میں دس ہزار کے قریب قریب احادیث مرقوم تھیں اس طرح احادیث کا اگر کوئی اور تحریری ذخیرہ نہ بھی ہوتا تب بھی صحیفہ صادقہ ایک بلا ہی یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ عہد نبوت ہی میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کی اتنی بڑی مقدار خود آپ کے حکم سے حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص کے ہاتھوں قلم بند ہو چکی تھی ۔

بخاری مسلم اور صحاح کی دوسری کتابوں میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ صحیفہ حضرت علی کے ایک صحیفے کا ذکر پایا جاتا ہے جسے وہ اپنی تلوار کی نیام میں رکھا

کرتے تھے۔ امام بخاری نے کتاب العلم میں حضرت ابو جحیفہ سے روایت کیا ہے انہوں نے فرمایا

نیں نے حضرت علی سے پوچھا کہ کیا آپ کے پاس کوئی کتاب ہے فرمایا نہیں مگر کتاب اللہ یا وہ فہم جو ہر مسلمان کو عطا کیا گیا یا وہ کچھ جو اس صحیفے میں ہے۔

لَمْ يَكُنْ عِنْدِي كِتَابٌ إِلَّا كِتَابُ اللَّهِ أَوْ فُهِمٌ أُعْطِيَهِ رَجُلٌ مِّنْ أَهْلِ بَيْتِي أَوْ مَا خِيفَ هَذِهِ

الصحيفة ....

اسی طرح امام مسلم اپنی صحیح میں کتاب الحج کے تحت ایک روایت لائے ہیں جس کو ابو ایہم البقیعی نے اپنے والد سے نقل کیا ہے وہ فرماتے ہیں کہ

ہمیں حضرت علی نے خطبہ دیا تو فرمایا ہمارے پاس کوئی کتاب نہیں ہے جس کو ہم پڑھتے ہیں سوائے اللہ کی کتاب کے اور اس کے جو اس صحیفے میں ہے۔

خَطْبَنَا عَلِيٌّ فَقَالَ مَا عِنْدَنَا كِتَابٌ نَقْرَأُ إِلَّا كِتَابَ اللَّهِ وَمَا خِيفَ

هَذِهِ الصَّحِيفَةُ .....

اس صحیفہ کے مندرجات کے بارے میں مختلف روایات میں مختلف احکام پر مشتمل احادیث کا ذکر کیا گیا ہے بعض روایات میں غلاموں اور قیدیوں کے آزاد کرنے کے احکام کا ذکر ہے بعض میں جراحات و دیت کے احکام اور اونٹوں کی زکوٰۃ کا حوالہ ہے اور بعض نے حرم مدینہ سے متعلق احکام کو خصوصیت سے ذکر کیا ہے۔ بعض روایات میں کہا گیا ہے کہ اس صحیفے میں مسلمان، کافر اور معاہد کے قصاص سے متعلق احکام پر مشتمل احادیث تھیں۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اس صحیفے

میں شریعت کے متعدد اہم مسائل تھے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی کو لکھوا دیئے تھے۔ ان متفرق احکام و مسائل کا حوالہ یہ بھی بتلا رہا ہے کہ یہ صحیفہ کافی ضخیم تھا جس پر حضرت علی کرم اللہ وجہہ

کو یہ صحیفہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود عطا فرمایا تھا چنانچہ ابن شہاب کہتے ہیں کہ میں نے منبر پر حضرت عائشہ صلی کو یہ فرماتے سنا تھا کہ

واللہ ہمارے پاس پڑھنے کی کوئی کتاب نہیں ہے  
سوائے اللہ کی کتاب کے اور اس صحیفے کے جو  
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے عطا فرمایا اور  
اس میں احکام زکوٰۃ ہیں۔

واللہ ما عندنا کتاب نفرداً علیکم  
إلا کتاب اللہ تعالیٰ و ہذہ الصحیفۃ  
أعطانیہا رسول اللہ فیہا فرائض  
الصدقۃ۔ (مسند احمد)

مسند احمد میں اس ابو طفیل سے بھی اسی قسم کا ایک قول منقول ہے کہ جب حضرت عائشہ سے یہ دریافت کیا گیا کہ آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بطور خاص کیا عطا فرمایا تھا تو آپ نے اس صحیفہ کا حوالہ دیا اور پھر صحیفہ نکال کر بھی دکھایا۔ اُستریلتے ہیں کہ حضرت علی کے بارے میں یہ بات عام ہو گئی تھی کہ آپ کے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی فرمان ہے استفسار کیا گیا تو آپ ایک صحیفہ نکال کر لاتے۔

صحیفہ سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ  
حضرت سعد بن عبادہ نے بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بیشتر ارشادات ایک صحیفہ میں قلم بند کیے تھے۔ دورِ جاہلیت میں جن لوگوں کو کتابت کے فن میں مہارت حاصل تھی ان میں ایک حضرت سعد بن عبادہ بھی تھے۔ انہوں نے اپنی اس مہارت سے یقیناً پورا پورا فائدہ اٹھایا ہوگا۔ ترمذی کا ایک روایت میں اس صحیفے کا ذکر ملتا ہے۔ کتاب الاحکام میں باب ”ما جاء فی الیمین مع الشاہد“ کے تحت حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدعی کی قسم پر صرف ایک گواہ کے ساتھ فیصلہ دے دیا۔ اس روایت کے ایک راوی ربیعہ اس حدیث کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ مجھ کو حضرت سعد بن عبادہ کے ایک بیٹے نے بتلایا کہ یہ حدیث صحیفہ سعد بن عبادہ میں موجود تھی۔ ربیعہ کے الفاظ ہیں :

اور مجھے سعد کے ایک بیٹے نے خبر دیا کہ ہم نے  
سعد بن عبادہ کی کتاب میں یہ پایا کہ نبی کریم صلی اللہ  
علیہ وسلم نے ایک گواہ اور قسم پر فیصلہ کر دیا۔

وَأَخْبَرَنِي ابْنُ إِسْعَدَ بْنِ عِبَادَةَ قَالَ  
وَجَدْنَا فِي كِتَابِ سَعْدِ بْنِ  
صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَضَى بِالْمِيمِ  
مَعَ الشَّاهِدِ

اس روایت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ صحیفہ حضرت سعد بن عبادہ کے ایک بیٹے کے پاس بعد  
میں موجود رہا اور وہ اس صحیفہ سے احادیث روایت کیا کرتے تھے بلکہ مسند امام احمد کی ایک  
روایت سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ کئی پشت تک یہ صحیفہ حضرت سعد بن عبادہ کے خاندان  
میں محفوظ رہا۔

**صحیفہ سمرة بن جندب** | حضرت سمرة بن جندب رضی اللہ عنہ نے بھی ایک صحیفہ  
میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث جمع کی تھیں  
اور معلوم ہوتا ہے کہ ان کا یہ صحیفہ خاصا ضخیم تھا کیونکہ حافظ ابن حجر نے تہذیب التہذیب  
میں اس صحیفہ کا ذکر کرتے ہوئے نسخہ بکیرہ کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ وہ حضرت  
سمرة کے بیٹے سلیمان بن سمرة کے متعلق لکھتے ہیں کہ

رَوَى عَنْ أَبِيهِ نَسْخَةً كَبِيرَةً | وہ اپنے والد سے ایک بڑا نسخہ روایت کیا کرتے تھے

بڑا نسخہ ظاہر ہے کسی ضخیم اور بڑی کتاب کو ہی کہا جاسکتا ہے غالباً یہ وہی صحیفہ ہے جو  
حضرت سمرة نے اپنے بیٹوں کو بصورت مکتوب روانہ فرمایا تھا امام ابن سیرین بھی اس  
مکتوب کے بارے میں کہتے ہیں کہ اس میں علم کثیر تھا۔ ان کے الفاظ ہیں :

بیٹوں کے نام حضرت سمرة کے خط میں  
علم کثیر موجود ہے۔

رسالة سمرة إلى بني هذيل  
علم كثير (تہذیب)

امام ابن سیرین کے اس قول سے بھی اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ حضرت سمرة کا متذکرہ صحیفہ  
خاصا ضخیم تھا۔ ظاہر ہے چند احادیث کے مجموعے کو تو علم کثیر یا نسخہ بکیرہ جیسے الفاظ سے



تعبیر نہیں کیا جایا کرتا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض مخصوص لوگوں کو مخصوص

## صحیفہ وائل بن حجر

حالات میں کچھ چیزیں لکھوا کر عطا فرمائی تھیں جیسا کہ حضرت

علی کے بارے میں ابھی ذکر ہوا کہ آپ نے انہیں مختلف احکام و مسائل پر مشتمل ایک صحیفہ عطا فرمایا تھا اسی طرح ایک صحیفہ آپ نے حضرت وائل بن حجر کو بھی جو حضرت موت کے شاہزادوں میں سے تھے اس وقت عطا فرمایا تھا جب وہ مسلمان ہونے کے لیے مدینہ حاضر ہوئے تھے اور کچھ دن قیام فرما کر واپس جا رہے تھے اس صحیفے میں نماز، وزہ، شراب اور سوز وغیرہ کے احکام تھے۔

اسی طرح کثر العمال میں ایک روایت ہے کہ عمرو بن حزم کو جب آپ

## صحیفہ اہل یمن

نے حاکم یمن مقرر فرمایا تو ایک تحریر بھی لکھوا کر ان کے حوالہ کی مسند

امام احمد بن حنبل اور مستدرک للحاکم میں بھی یہ روایت موجود ہے اس صحیفے میں فرائض، صدقات، دیات، طلاق، عتاق، صلوٰۃ اور مس مصحف وغیرہ کے احکام تھے داری میں اس صحیفے کا ذکر ان الفاظ میں ہے :

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل یمن کو لکھ

بھیجا کہ قرآن کریم صرف پاک آدمی چھو سکتا ہے

نکاح سے پہلے طلاق نہیں اور غلام خریدنے سے

پہلے اسی کی آزادی نہیں۔

اَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

كُتِبَ إِلَى أَهْلِ الْيَمَنِ أَنْ لَا

يُمَسَّقَ الْقُرْآنَ إِلَّا طَاهِرٌ وَلَا تَطْلُقَ

قَبْلَ مِلَاحٍ وَلَا عِتَاقٍ حَتَّى يَبْتَاعَ

(مسند داری)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حیات مبارکہ کے آخری ایام

میں مختلف علاقوں کے حاکموں کو بھیجنے کے لیے کتاب الصدقہ

## کتاب الصدقة

لکھوائی تھی مگر ابھی بھینچنے نہ پائے تھے کہ رحلت فرما گئے۔ آپ کے وصال کے بعد حضرت ابو بکرؓ نے وہ کتاب عاملوں کے پاس بھجوائی۔ اس کتاب میں جانوروں کی زکوٰۃ کے متعلق مسائل تھے۔ ترمذی میں اس کتاب کا ذکر اس روایت میں موجود ہے جو حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے منقول ہے اور جس کو امام ترمذی نے باب ”ما جاء فی ترکوٰۃ الابل“ میں نقل کیا ہے۔ مسند امام احمد بن حنبل اور دارقطنی کی روایات سے پتہ چلتا ہے کہ یہ کتاب اصل میں والی بحرین کے نام تھی لیکن دوسرے عاملین کو بھی روانہ کی گئی تھی۔

**صحیفہ ابو شاہ یمنی** | حضرت ابو شاہ یمنی رضی اللہ عنہ کی درخواست پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو وہ خطبہ لکھوا کر دیا تھا جو آپ نے حجۃ الوداع کے موقع پر ارشاد فرمایا تھا۔ کون نہیں جانتا کہ اس خطبہ کا ہر فقرہ بجائے خود اسلام کا ایک اصول تھا یہ خطبہ اچھا خاصا طویل ہے۔ امام ترمذی ابو داؤد حازن ابن حجر خطیب بغدادی ابن صلاح اور ابن عبد البر میں سے ہر ایک نے اس واقعہ کا ذکر کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب حجۃ الوداع کے خطبہ سے فارغ ہوئے تو حضرت ابو شاہ یمنی نے درخواست کی کہ یہ خطبہ مجھے لکھوا دیا جائے تو آپ نے ارشاد فرمایا اکتبوا لابی شاہ (ابو شاہ کے لیے لکھ دو) چنانچہ یہ خطبہ ان کو لکھ کر دے دیا گیا۔ امام بخاری نے بھی اپنی صحیح میں اس کا ذکر کیا ہے۔ ممکن ہے کسی کو یہ شبہ ہو کہ پورا خطبہ شاید لکھ کر نہ دیا گیا ہو بلکہ اس کا کچھ حصہ ہو جس کی نقل کا حکم دیا گیا ہو تو اس شبہ کے ازالے کے لیے امام ازہری کی شہادت جو سیر کے امام ہیں بہت کافی ہے ان سے پوچھا گیا کہ کیا پورا خطبہ لکھوا کر دیا گیا تھا تو جواب میں فرمایا :

نعم هذه الخطبة التي سمعها من النبي صلى الله عليه وسلم (یعنی ص ۵۲)

ہاں وہی خطبہ جو انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا تھا۔

**دیگر چھوٹی بڑی تحریریں** | یہ تمام صحیفے جن کا اب تک ذکر ہوا ہے اگر جمع کیے جائیں تو ذرا اندازہ لگائیے کس قدر واقعہ تحریری ذخیرہ احادیث

محض انہی صحیفوں سے تیار ہو جاتا ہے۔ اور اس میں بھی ذکر صرف ان صحیفوں تک محدود رہا ہے جو اپنی ضخامت کے اعتبار سے اور متفرق احکام و مسائل کو محیط ہونے کے لحاظ سے اہم اور نمایاں تھے ورنہ ان کے علاوہ بھی اور متعدد چھوٹی بڑی تحریروں کی موجودگی کے ثبوت موجود ہیں مثلاً حضرت عبداللہ بن حکیم صحابی کے پاس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک نامہ مبارک تھا جس میں مردہ جانوروں کے متعلق احکام تھے یہ حضرت ضحاک بن سفیان رضی اللہ عنہ کے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تحریر کرائی ہوئی ایک ہدایت تھی جس میں شوہر کی دیت کا حکم تھا۔ حضرت معاذ بن جبل کو آپ کی طرف سے ایک تحریر یمن بھیجی گئی جس میں بنیوں ترکاریوں پر زکوٰۃ نہ ہونے کا حکم تھا۔ نیز حضرت رافع بن خدیج کے پاس بھی ایک تحریر تھی جس میں یہ درج تھا کہ مدینہ بھی مثل مکہ کے حرم ہے۔ اسی طرح حضرت ابو موسیٰ اشعری، حضرت عبداللہ بن ربیعہ بن مرثد اسلمی اور حضرت سعد بن ربیعہ انصاری کے متعلق کہا جاتا ہے کہ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کچھ حدیثیں قلم بند کی تھیں۔

**خطوط و وثائق** | اور اب ان سب پر آپ ان خطوط و وثائق کا اولا ضافہ کر دیجئے جو مختلف اوقات میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف سلاطین و امراء اور سرداران قبائل کے نام لکھوائے یا مختلف مواقع پر معاہدے اور میثاق کی صورت میں تیار کرائے۔ مثال کے طور پر وہ خطوط جو آپ نے قیصر روم، خسرو ایران، مقوقس شاہ مصر، نجاشی بادشاہ حبش، عارت غسانی رئیس حدود شام اور مختلف رؤسائے یمامہ کی جانب لکھوا کر روانہ فرمائے۔ ان میں سے ان خطوط کی تو نقلیں بھی محفوظ ہیں جو مقوقس اور نجاشی کے نام لکھوائے گئے تھے۔ حال ہی میں ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے الوثائق السیاسیہ کے نام سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام خطوط شائع کر دیے ہیں۔ وثائق میں وہ تحریری احکام و فرامین ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف قبائل کو بھیجے تھے، مشہور صلح حدیبیہ کا

معاہدہ نامہ ہے جو ۶۰ھ میں حضرت علی کے ہاتھوں تحریر میں آیا اور اس سلسلے کی اہم  
کرہی رد دستاویز ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ تشریف لانے کے بعد اہل  
مدینہ کے ساتھ معاہدے کی صورت میں لکھوائی اور جو میثاق مدینہ کے نام سے مشہور ہے  
سیرت ابن ہشام میں اس میثاق کا متن لفظ بہ لفظ نقل کیا گیا ہے۔

حدیث کے مکتوب ذخروں کے بارے میں جو تفصیلات اوپر گزری ہیں ذرا  
ان پر دوبارہ نظر ڈالیے، مکثرین صحابہ کی مرویات پر مشتمل طویل، طویل تحریری مجموعے،  
دیگر مختلف صحابہ کی طرف منسوب ضخیم صحیفے، متفرق تحریری احکام، فرامین، معاہدات،  
وثنائق، خطوط اور امان نامے وغیرہ ان سب کو یکجا کر کے دیکھئے کہ عہد نبوت و قرن صحابہ  
میں حدیث کا کیا زبردست سرمایہ کتابی شکل اختیار کر چکا تھا۔ اس پر بھی اگر منکرین حدیث  
یہی رستے چلے جائیں کہ احادیث غمہ نبوی و عہد صحابہ میں قید تحریر میں نہیں آسکیں تو ہر  
کوئی خود فیصلہ کر سکتا ہے کہ ان کا یہ بے بنیاد و ادیلا کس حد تک کان دھرنے کے  
قابل ہے ؟



# حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ رضی اللہ عنہما کی طرف انکارِ حدیث کی نسبت

حدیث کا انکار کرنے والے اپنی اغراض کے بندے حفاظتِ حدیث کے سلسلے میں سادہ لوح مسلمانوں کو جس طرح دھوکے دیتے ہیں گزشتہ اوراق میں اس کا پورا نقشہ سامنے آچکا ہے لیکن ان لوگوں کے ایک اند فریب کا پردہ چاک کرنا ابھی باقی ہے۔ ان لوگوں نے خوب خدا سے بے نیاز ہو کر اپنے مذموم مقاصد کو پورا کرنے کی خاطر حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما جیسے جلیل القدر صحابہ پر اتھام طرازی اور تہان تراشی کرتے ہیں بھی کوئی عار محسوس نہ کی۔ تاوقتِ حضرات کو یہ معلوم کر کے شاید حیرت ہو کہ منکرینِ حدیث کا دعویٰ یہ ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ بھی انہی کی طرح حدیث کی حجیت کے قائل نہ تھے العیاذ باللہ۔ اپنے اس دعوے کے ثبوت میں وہ مختلف بے سرو پا باتیں بناتے ہیں جن کا حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا اور جو سادہ لوح ناواقف حال مسلمانوں کو گمراہ کرنے کی ناکام کوششوں سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتیں۔ یہ باتیں اس قابلِ توجہ نہیں کہ انہیں کسی سنجیدہ تحریر کا موضوع بنایا جاتا مگر اصل حقیقتِ حال کی وضاحت بھی ضروری ہے اس لیے مناسب یہی ہے کہ منکرینِ حدیث کے متذکرہ دعویٰ کا بھی مختصر جائزہ لے لیا جائے۔

منکرینِ حدیث کے اس دعوے کا تعلق اگرچہ حجیتِ حدیث کے موضوع سے ہے جو اس

وقت ہمارے زیرِ بحث نہیں ہے تاہم یہ دعویٰ جس بنیاد پر کیا جاتا ہے وہ چونکہ بلا واسطہ حفاظتِ حدیث سے ہی متعلق ہے اس لیے موجودہ مرحلے پر ہی ہمیں اس دعوے کا تجزیہ کرنا ہے۔

**منکرین حدیث کا الزام** | منکرین حدیث کا کہنا یہ ہے کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ دونوں اصحاب نبی کریم

صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث روایت کرنے سے لوگوں کو منع کرتے تھے اور چاہتے تھے کہ احادیث کو محفوظ نہ رکھا جائے چنانچہ حضرت ابو بکرؓ نے اپنی لکھی ہوئی احادیث کا مجموعہ نذر آتش کر دیا اسی طرح حضرت عمرؓ نے بھی اپنے زمانہ خلافت میں بعض لوگوں کے لکھے ہوئے مجموعے منگو کر ان کو جلادیا۔ یہ روایت حدیث سے منع کرنا اور احادیث کی حفاظت کرنے کے بجائے ان کے مکتوب مجموعوں کو نذر آتش کرنا بقول منکرین حدیث اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ دونوں اصحاب حدیث کو دین میں حجت خیال نہ کرتے تھے۔

کیسی ستم ظریفی ہے کہ وہ لوگ جن کی زندگی کا ایک لمحہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال کا مجسم نمونہ تھا جن کی عبادات جن کے معاملات و اخلاق جن کے امور سیاست و معیشت اور جن کی معاشرت غرض جن کی زندگی کا ہر گوشہ سنت نبوی کے رنگ میں رنگا ہوا ہوا ان حضرات کے بارے میں یہ کہا جائے کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو دین میں حجت نہ سمجھتے تھے۔

**حجیت حدیث اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ** | کتنی حیرت کی بات ہے کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ جنہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے

ارشادات کے نفاذ کی راہ میں کبھی کسی دینی مصلحت اور مادی مجبوری کو درخور اعتنا نہ سمجھا ان کے بارے میں یہ یاد رکھنے کی کوشش کی جائے کہ وہ احادیث نبوی کو واجب العمل خیال نہ کرتے تھے۔ یہ صریح بتان ہے۔ حضرت ابو بکرؓ کی نظر میں سنت نبوی کی حجیت کس اہمیت کی حامل تھی اس کو ثابت کرنے کے لیے تو کسی طویل و عریض دلیل کے طومار کی بھی ضرورت نہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد جیش اسامہ اور مانعین زکوٰۃ کے سلسلے میں حضرت ابو بکرؓ کا طرز عمل ہی اس بات کی شہادت کے لیے بہت کافی ہے۔ ذرا تصور تو کیجئے۔ جھوٹے مدعیان نبوت کے شبہاتی فتنوں نے سراٹھایا ہوا ہے ہر طرف سے ارتداد کی خبریں آرہی ہیں اور دشمنان اسلام مار پیٹے پرہیزگار جانب سے حملے کی تیاریوں میں مصروف ہیں۔

ایسے اڑے وقت میں صحابہ متروکہ ہیں کہ شام کی طرف جس لشکر کشی کا حکم حضرت اسامہ کی سرکردگی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مرض الموت میں دیا تھا اس کو روانہ کیا جائے یا نہیں مگر حضرت ابوبکر ہیں کہ انتہائی یقین و اعتماد کے ساتھ فرما رہے ہیں کہ :-

”اگر مجھ کو اس بات کا بھی یقین ہو کہ اس لشکر کے

روانہ کرنے کے بعد مجھے مارینے میں کوئی تردد نہ تھا

پاکر پھاڑ کھائے گا تب بھی میں اس لشکر کی روانگی

کو ہرگز ملتوی نہ کروں گا جس کو آنحضرت صلی اللہ

علیہ وسلم نے روانہ فرمایا تھا“ (طبری)

اسی طرح مانعین زکوٰۃ سے قتال کے موقع پر صدیق اکبر اپنے اس عزم کا اظہار کرتے ہیں کہ

”خدا کی قسم کوئی قبیلہ اگر زکوٰۃ کا ایک جانور یا

ایک دانہ بھی جو وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے

سامنے ادا کرتا تھا اب ادا نہ کرے گا تو میں اس

سے ضرور قتال کروں گا۔“ (طبری)

کیا عزم و استقامت سے بھرپور یہ الفاظ کسی ایسے شخص کی زبان سے نکلی سکتے ہیں جو نبوت نبوی کو واجب العمل نہ سمجھتا ہو۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے سرمو اخراجات حضرت ابوبکر کے لیے ناقابل تصور تھا جیسا اسامہ کی سرداری کے بارے میں جب یہ تجویز پیش کی گئی کہ کوئی معمر قریشی اس منصب پر مقرر کیا جائے تب بھی جو جواب حضرت ابوبکر نے دیا اس کا بھی ایک ایک لفظ اس بات کا ثبوت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر فرمان آپ کے لیے جبروتِ آخر کی حیثیت رکھتا تھا آپ نے فرمایا جس کا تقرر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے اس میں کوئی رد و بدل ابوبکر کیسے کر سکتا ہے۔“

منکرین حدیث خفائق کو مسخ کر کے اپنی مطلب براری کی کوشش میں ہیں ورنہ یہاں خطیبہ کوئی وجہ نہیں کہ وہ اس خطیبہ سے بے خبر ہوں جو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے خلیفہ چنے جانے کے فوراً بعد دیا تھا اور جس میں واضح الفاظ میں اپنے اس عزم کا اعلان کیا تھا کہ

قرآن کے بعد سنت نبوی کا اتباع ہی میری منزل مقصود ہے۔ اس خطبے کے الفاظ ہیں:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ وُلِّيتُ أَمْرَكُمْ وَلَسْتُ  
بَخِيلٍ كَمَا وَلَّيْتُكُمْ لَكُنْ نَزَلَ الْقُرْآنُ وَسُورَةُ  
النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الشُّنْفُ  
نَعْلَمُوا وَعَلِمْنَا- أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّمَا أَنَا مُتَّبِعٌ  
وَلَسْتُ بِمُتَّبِعٍ فَإِنْ أَحْسَنْتُ فَأَعِينُونِي  
وَإِنْ زَعَيْتُ فَقُومُونِي

(طبقات ابن سعد ج ۲ ص ۱۲۹)

اے لوگو میں تمہارا والی بنا دیا گیا ہوں مگر میں تم  
سے بہتر نہیں ہوں لیکن خوب بخود جوہم میں قرآن  
اُترا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں سنتیں  
اور طریقے سکھائے جو ہم نے جانے اور سیکھے لے  
لوگو میں ان دونوں کی پیروی کرنے والا ہوں کوئی  
نئی بات نکالنے والا نہیں ہوں اگر میں ٹھیک چلوں  
تو میرا اتباع کرو اور اگر انحراف کروں تو مجھے  
بیدھا کر دو۔

خلافت بکرہ منصب پر فائز ہونے کے بعد حضرت ابوبکر کا پہلا خطبہ ہونے کی حیثیت سے اس  
کو جدید اصطلاح میں پالیسی تقریر کا نام دیا جا سکتا ہے گویا اس خطبہ میں حضرت ابوبکر نے  
کاروبار خلافت چلانے کے لیے اپنی آئندہ پالیسی کے خطوط متعین کر دیئے کہ قرآن اور سنت  
یہ دو چیزیں ہوں گی جن کا اتباع خلافت صدیقی کا رہنما اصول رہے گا۔ اپنی اس پالیسی کو  
اور زیادہ متوکد بنانے کے لیے حضرت ابوبکر نے اپنی اطاعت کے مطالبے کو بھی انہی دونوں کی  
اتباع کے ساتھ مشروط کر دیا علامہ طبری نے اس خطبے کا ذکر کرتے ہوئے حضرت ابوبکر کے  
یہ الفاظ بھی نقل کیے ہیں :

أَطِيعُونِي مَا أَطَعْتُ اللَّهَ وَرَسُولَهُ  
فَإِنْ عَصَيْتُ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَلَا طَاعَةَ  
لِي عَلَيْكُمْ (طبری جلد ۲ ص ۴۵)

تم میری اطاعت کرو جب تک میں اللہ اور  
اس کے رسول کی اطاعت کروں اور اگر میں  
اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کروں تو پھر  
تم پر میری کوئی اطاعت نہیں۔

عام دستور العمل | واقعات اس پر شاہد ہیں کہ حضرت ابوبکر کے سامنے جب کوئی  
مقدمہ پیش ہوتا تو آپ اس کے فیصلے کے لیے پہلے قرآن میں اسکی



اصل تلاش کرتے اس میں اگر کوئی اصل نہ ملتی تو سنت نبوی میں اس سے متعلق کوئی اثر یا نمونہ ڈھونڈتے اگر دلائل بھی کچھ نہ ملتا تو پھر اپنا اجتہاد کام میں لاتے حضرت ابو بکر کا یہ عام دستور العمل تھا چنانچہ محقق ابن سیرین آپ کے اس دستور العمل کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

حضرت ابو بکر کے سامنے جب کوئی ایسی صورت حال پیش ہوتی جس کے متعلق نہ اللہ کی کتاب میں کوئی اصل ملتی اور نہ سنت نبوی میں اس سے متعلق کسی اثر کا سراغ ملتا تو فرماتے میں اب اپنی رائے سے اجتہاد کرتا ہوں اگر درست ہو تو اللہ کی طرف سے ہے اور اگر غلط ہو تو میری جانب سے اور اس پر میں اللہ سے معافی کا طلب گاہ ہوں۔

أَنَا أَبُوبَكْرٍ إِذَا نَزَلَتْ بِهِ قَضِيَّةٌ  
لَمْ يَجِدْ لَهَا فِي كِتَابِ اللَّهِ أَصْلًا  
وَلَا فِي السُّنَّةِ أَثَرًا فَقَالَ اجْتَهَدُ  
بِرَأْيِي فَإِنْ يَكُنْ صَوَابًا فَمِنْ اللَّهِ وَإِنْ  
يَكُنْ خَطَأً فَمِنِّْي وَأَسْتَغْفِرُ اللَّهَ  
(طبقات ابن سعد جلد ۳ صفحہ ۱۳۶)

بلکہ مسند دارمی کی ایک روایت میں ترہاں تک بھی ہے کہ قرآن اور حدیث دونوں میں کوئی حکم نہ ملتا تو حضرت ابو بکر اپنے اجتہاد سے بھی پہلے صحابہ کرام سے مشورہ کرنے کو ترجیح دیتے اور اس مشورے کے نتیجے میں جو کچھ سامنے آتا اس کے مطابق فیصلہ فرما دیتے گویا کتاب و سنت کے بعد اجماع کو تیسرا ماخذ احکام قرار دیتے۔ مسند دارمی کے الفاظ ہیں :

ابو بکر صدیق کا طریقہ یہ تھا کہ جب ان کے سامنے کوئی مقدمہ پیش ہوتا تو کتاب اللہ میں نظر فرماتے اگر اس میں حکم پاتے تو اسی کے موافق فیصلہ کرتے اور اگر کتاب اللہ میں نہ ہوتا لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے بارے میں کوئی سنت معلوم ہوتی تو اسکے مطابق فیصلہ فرماتے اور اگر حدیث اور سنت میں بھی اسکے متعلق کوئی حکم نہ ملتا تو یا ہر نیکل کر مسلمانوں سے دریافت فرماتے۔

كَانَ أَبُو بَكْرٍ إِذَا وَرَدَ عَلَيْهِ الْخَصْمُ  
نَظَرَ فِي كِتَابِ اللَّهِ فَإِنْ وَجَدَ فِيهِ  
مَا يَقْضِي بَيْنَهُمَا قَضَىٰ وَ  
إِنْ لَمْ يَكُنْ فِي الْكِتَابِ وَعَلِمَ مِنْ  
رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي  
ذَلِكَ شَيْءٌ قَضَىٰ بِهِ فَإِنْ أَعْيَاهُ  
ذَلِكَ خَرَجَ فَسَالَ الْمُسْلِمِينَ۔

غرض اس امر میں کوئی شبہ نہیں کہ قرآن میں کوئی حکم نہ ملنے کی صورت میں حضرت ابو بکر حدیث کی طرف رجوع فرماتے اور اسی کے مطابق عمل کرتے تھے یعنی یہ بات ہر قسم کے شک و شبہ سے بالاتر ہے کہ حضرت ابو بکر قرآن کے بعد حدیث کو دین میں حجت قرار دیتے تھے تاہم سیر سے متعدد واقعات اس کے ثبوت میں پیش کیے جاسکتے ہیں۔ مثال کے طور پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال فرما جانے پر صحابہ کے درمیان جب اس بات پر اختلاف ہوا کہ آپ کے جسد مبارک کو دفن کہاں کیا جائے تو حضرت ابو بکر نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث ہی سے سند پکڑ لی اور فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ جس جگہ اللہ کے نبی کی روح قبض ہوتی ہے اسی جگہ اس کو دفن کیا جاتا ہے چنانچہ اس حدیث کے سنتے ہی سب اختلاف رفع ہو گیا۔ اگر حضرت ابو بکر کے نزدیک حدیث حجت نہ تھی تو پھر رفع اختلاف کے لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد پیش کرنا کیا معنی؟ اسی طرح باغ فدک کے مشہور قصبے کے فیصلے کے لیے حضرت ابو بکر نے ایک حدیث نبوی ہی سے استشاد کیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جب حضرت طاہمہ الزہراء رضی اللہ عنہا نے باغ فدک میں اپنی میراث کا مطالبہ کیا تو حضرت ابو بکر نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد پیش کیا۔

ہم گروہ انبیاء نہ وارث ہوتے ہیں اور نہ کوئی ہمارا وارث ہوتا ہے ہم جو کچھ چھوڑتے ہیں وہ صدقہ ہوتا ہے۔

إِنَّا مَعْشَرُ الْأَنْبِيَاءِ لَا نَرِثُ وَلَا نَرِثُ مَا تَرَكْنَا صَدَقَةٌ۔  
(بخاری باب ما جاز فی قعة فدک)

اور اسی ارشاد نبوی کی روشنی میں باغ فدک کو تقسیم کرنے کے بجائے اس کی آمدنی کو حسب سابق آل محمد کے لیے مخصوص رہنے دیا گیا۔ کیا حدیث کسی عدم حجیت ای کا نام ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد سامنے آتے ہی سادے جھگڑے ختم ہو جائیں اور ہر ایک کا اطاعت و

تسلیم کے اظہار میں جسکا نظر آئے ۔

**احادیث کی تلاش و جستجو** | غرض یہ ایک دو واقعہ ہی نہیں اور بھی متعدد واقعات اس ثبوت میں پیش کیے جاسکتے ہیں کہ حضرت ابوبکر

صدیق دیگر تمام صحابہ کی طرح حدیث کو دین میں حجت تسلیم کرتے تھے۔ تذکرۃ الحفاظ کی وہ روایت کس سے مخفی ہے جس کو نہ ہری نے قبضہ سے نقل کیا ہے کہ ایک جدہ یعنی دادی اپنے پوتے کی میراث مانگنے کے لیے حضرت ابوبکرؓ کے پاس آئی تو آپؓ نے فرمایا کہ دادی کے متعلق تو نہ کتاب اللہ میں میں کوئی حکم پاتا ہوں اور نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی فرمان ہی مجھ کو اس بارے میں معلوم ہے اس کے بعد آپؓ نے صحابہ کرام سے دریافت کیا کہ شاید انہیں ایسی کسی حدیث کا علم ہو تو حضرت مغیرہ بن شعبہؓ نے کہا کہ بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دادی کو چھٹا حصہ دلویا تھا پھر حضرت محمد بن مسلمہؓ نے جی اس کی تصدیق کی۔ حضرت ابوبکرؓ نے اسی حدیث کو بنیاد بنا کر اس خاتون کو چھٹا حصہ دلوا دیا۔ اب منکر بن حدیث بتلاتے ہیں کہ بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلوں کی تلاش و جستجو آخر کس لیے تھی؟ اگر حدیث حجت ہی نہ تھی تو پھر اس سارے نبرد کی ضرورت کیا تھی؟ قرآن میں کوئی اصل نہ ملنے کی صورت میں حضرت ابوبکرؓ کو بلا کھٹکے اپنی رائے سے فیصلہ کر دینا چاہیے تھا اس فکر میں پڑنا ہی نہیں چاہیے تھا کہ اس باب میں بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا عمل رہا ہے یا اس بارے میں آپؓ نے کیا فرمایا ہے اور کیا نہیں فرمایا۔ کیا منکر بن حدیث کوئی ایک بھی نظیر ایسی پیش کر سکتے ہیں جس سے حضرت ابوبکرؓ کے اس طرز عمل کا اظہار ہوتا ہو کہ آپؓ نے بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور آپؓ کی سنت ثابتہ کی پروا کیے بغیر اپنی مرضی سے کبھی کوئی فیصلہ کر دیا ہو۔ حافظ ابن قیم اعلام الموقعین میں فرماتے ہیں :

حضرت ابوبکرؓ کی زندگی میں نص کی خلاف ورزی کی

لا یحفظ للصدیق خلاف

ایک مثال بھی نہیں ملتی۔

تَعَبٍ بَعْدَ امْدٍ ۱۔

(اعلام الموقعین جلد ۵ ص ۵۸)

یا کیا کوئی ایسی نظیر منکرین حدیث بتلا سکتے ہیں جس سے یہ ثابت ہوتا جو کہ حضرت ابوبکر نے حدیث کی بنیاد پر کوئی فیصلہ کیا ہو اور صحابہ میں سے کسی ایک فرد نے ہی یہ اعتراض کیا ہو کہ اے ابوبکر حدیث کی بنیاد پر آپ فیصلہ کیسے دے سکتے ہیں حدیث تو دین میں حجت ہی نہیں۔ اگر کسی ایسی نظیر کی منکرین حدیث نشانہ ہی نہیں کر سکتے اور یقین ہے کہ نہیں کر سکتے تو پھر ماننا پڑے گا کہ صرف حضرت ابوبکر ہی نہیں تمام صحابہ بالا جماع حدیث کو حجت جانتے اور مانتے تھے۔

روایت حدیث سے ممانعت  
اور حضرت ابوبکر

کا جائزہ لیں جس کی بنیاد پر منکرین حدیث یہ دھوکہ دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ چونکہ حضرت ابوبکر احادیث بنو یہ کی روایت سے منع کرتے تھے اس لیے ثابت ہوتا ہے کہ آپ حدیث کو دین میں حجت نہ سمجھتے تھے۔ وہ روایت جس سے یہ سارا تانا بانا بنا گیا ہے تذکرۃ الحفاظ میں ذہبی نے ابن ابی ملیکہ سے نقل کی ہے۔ اس روایت کے الفاظ ہیں :

حضرت ابوبکر صدیق نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دنات کے بعد لوگوں کو جمع کیا اور کہا تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایسی احادیث بیان کرتے ہو جن میں تمہارا اختلاف ہے اور تمہارے بعد کے لوگ اختلاف میں پناہ دہ سخت ہو جائیں گے پس تم رسول اللہ کی طرف منسوب کر کے کوئی بات نہ کیا کرو اگر تم سے کوئی پوچھے تو کہو کہ ہمارے اور

إِنَّ الصِّدِّيقَ جَمَعَ النَّاسَ بَعْدَ  
وَفَاتِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ  
فَقَالَ إِنَّكُمْ تَحِدُّ ثَوْنًا عَنْ رَسُولِ  
اللَّهِ الْأَحَادِيثَ تَخْتَلِفُونَ فِيهَا  
وَالنَّاسُ بَعْدَكُمْ أَمْثَلُ اخْتِلَافًا  
فَلَا تَحِدُّ ثَوَانِ رَسُولِ اللَّهِ شَيْئًا  
فَمَنْ سَأَلَكُمْ فَقُولُوا بَيْنَا وَ

بَيْنَكُمْ كِتَابُ اللَّهِ فَاسْتَحِلُّوا حِلَّاهُ  
وَحَرِّمُوا حَرَامَهُ

(تذکرۃ الحفاظ جلد ۱ ص ۳)

تمہارے درمیان خدا کی کتاب ہے اس نے بن  
چیزوں کو حلال کیا انہیں حلال جانو اور بن چیزوں  
کو حرام کیا انہیں حرام جانو۔

اس روایت کے اصل مفہوم و منشا پر تفصیلی گفت گویا سے پہلے منکرین حدیث کی ایک اور علمی خیانت  
ذرا ملاحظہ ہو۔ منکرین حدیث اپنی عادت کے مطابق اس روایت کے متن کو تو اپنے مرعومہ  
دعوے کو ثابت کرنے کے لیے بڑے شد و مد سے اچھالتے ہیں مگر اس کے فوراً بعد اذہبی  
نے اس روایت سے جو نتیجہ اخذ کیا ہے اس کو بائبل گول کر جلاتے ہیں۔ ان لوگوں کو اس روایت  
کے فوراً بعد آنے والے الفاظ تذکرۃ الحفاظ میں نظر ہی نہیں آتے اس لیے کہ وہ الفاظ منکرین  
حدیث کے مرعومہ دعوے کی تردید کرتے ہیں امام ذہبی اس روایت کو بیان کرنے کے  
معا بعد کہتے ہیں :

فهذا الموصول يدل لك ان مراد  
الصدیق الثبت فی الاخبار  
والیقینی لاسد باب الروایة الاترا  
انه لما نزل به امرا بجدة  
ولم يجد في الكتاب  
كيف سئل عنه في السنن فلما  
اخبى الثقة ما اكتفى حتى  
استظهر بثقة آخر ولم  
يقل حسبنا كتاب الله كما نقول  
الخوارج (تذکرۃ الحفاظ جلد ۱ ص ۳)

اس روایت سے ظاہر ہے کہ صدیق اکبر کا مقصود یہ  
ہے کہ احادیث کی روایت میں تثبت اور احتیاط لازم  
ہے روایت کا دروازہ بند کرنا مقصود نہیں کیا تم نے  
نہیں دیکھا کہ جب صدیق اکبر سے دادی (کی میراث)  
کے متعلق دریافت کیا گیا اور اس کا حکم کتاب اللہ میں  
نہ پایا تو کسی ارجح اس کے متعلق احادیث بنویہ کو  
دریافت کیا اور جب ایک ثقہ اور معتبر آدمی نے اس  
بارے میں حدیث بنوی کی خبر دی تو اس پر اکتفا نہ فرمایا  
بلکہ ایک دوسرے ثقہ آدمی کی توثیق طلب کی اور فرائع  
کی طرح یہ نہیں کہا کہ ہمیں کتاب اللہ کافی ہے۔

س بات کو تو ایک معمولی سمجھ بوجھ رکھنے والا آدمی بھی سمجھ سکتا ہے کہ اگر حضرت ابو بکر کے پیش نظر  
روایت حدیث کا دروازہ بند کرنا ہوتا تو مختلف معاملات و مسائل کے تصفیے کے لیے بنی کریم

صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے بارے میں خود لوگوں سے استفسار کیوں فرماتے۔ امام ذہبی نے ابن ابی بلیکہ کی متذکرہ بالا روایت نقل کرنے کے بعد اسی فکر کی دعوت دی تھی مگر منکرین حدیث نے اس کو درخور اعتنائہ سمجھا کیونکہ یہ ان کی اپنی خواہش کے خلاف تھی انصاف سے کیئے کیا تلاش حق کا یہی طریقہ ہے؟ تلاش حق کو بھی چھوڑے کہ منکرین حدیث کا وہ مطمح نظر ہی نہیں کیا علمی دیانت داری بھی کوئی چیز نہیں کیا علم کی دنیا میں اس قسم کی خیانتوں کی گنجائش ہے؟

سوال یہ ہے کہ اگر حضرت ابوبکر احادیث بنویہ کی روایت ابوبکر اور روایت حدیث

ابوبکر اور روایت حدیث کا دروازہ بند کرنا چاہتے تھے تو خود اس کے خلاف کیوں کرتے تھے کیا اس بات میں بھی کوئی شبہ ہے کہ خود حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں بیان کیا کرتے تھے۔ ابن جوزی نے حضرت ابوبکر کی مرویات کی تعداد یحییٰ بن محمد کی مسند کے حوالے سے ایک سو بیالیس بیان کی ہے۔ حال ہی میں مسند ابی بکر صدیق طبع ہوئی ہے یہ احمد بن علی بن مسعود الاموی المروزی (۲۹۲-۲۰۲ھ) کی تصنیف ہے اس کی تحقیق و تعلیق اور تخریج کا کام شعیب ارناؤوط نے کیا ہے اس مسند میں بھی حضرت ابوبکر کی کل مرویات کی تعداد ایک سو بیالیس ہے۔ گویا ایک جانب صرف ایک روایت ہے جو بقول منکرین حدیث اس پر دلالت کرتی ہے کہ حضرت ابوبکر روایت حدیث سے منع کرتے تھے اور دوسری جانب اس ایک روایت کے مقابلے میں دو چار یا دس بیس نہیں پوری ایک سو بیالیس روایتیں ہیں جو اس پر شاہد ہیں کہ دوسروں کو منع کرنا کیا معنی حضرت ابوبکر خود احادیث بنویہ روایت کرتے تھے۔ بلکہ ایک سو بیالیس ہی نہیں اگر شاہ ولی اللہ کے قول کو لیا جائے تو حضرت ابوبکر کی مرویات کی تعداد ایک سو پچاس تک جا پہنچتی ہے۔ اب بتلائیے ایک روایت کے مقابلے میں کیا ڈیڑھ سو روایات سے قطع نظر کیا جاسکتا ہے؟ اپنے خود تراشیدہ اوہام اور من مانے خیالات کے پیچھے لگ کر کسی روایت سے کوئی اثنا سیدھا نتیجہ نکال لینا بہت آسان ہے مگر علمی سطح پر اس کو نبھانا بہت مشکل ہے۔

اس کے علاوہ ذرا یہ بھی تو سوچئے کہ کیا آپ ایسی ہستی کے بارے میں جو صدیقیت کے مقام پر فائز ہے یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ معاذ اللہ وہ کہتے کچھ تھے اور کرتے کچھ تھے لوگوں کو روایت حدیث سے متح کرتے رہے اور خود اتنی تعداد میں حدیثیں روایت کر گئے۔ کتنی غیر محقول بات ہے یہ! اس کے ساتھ ہی اس پر بھی غور کیجئے کہ صحابہ کی ایک کثیر تعداد ہمیشہ حدیثوں کی روایت میں مشغول رہی تو کیا یہ سمجھ لیا جائے کہ تمام صحابہ نے حضرت ابوبکر کی اس تجویز کو قطعی طور پر مسترد کر دیا تھا کہ حدیثوں کی روایت کا سلسلہ بقول منکرین حدیث ہمیشہ کے لیے بند کر دیا جائے اور روایت کے الفاظ یہ بتلا رہے ہیں کہ حضرت ابوبکر نے یہ تجویز سرسری طور پر پیش نہیں کی تھی بلکہ باضابطہ صحابہ کی ایک مجلس منعقد کی تھی اور اس مجلس میں یہ حکم دیا گیا تھا تو کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ صحابہ نے خلیفہ وقت کے حکم کی کوئی پروا نہ کی۔ غیر معقولیت کی بھی حد ہوتی ہے منکرین حدیث ہیرت سے ذرا بھی فکر سے کام نہیں لیتے۔

### ممانعت کی اصل وجہ رفع اختلاف

الفاظ فلا تخذوا عن رسول اللہ شیئاً (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کردہ کوئی بات نہ بیان کیا کرو) سے بظاہر یہی مستفاد ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکر نے روایت حدیث سے روک دیا تھا مگر ان الفاظ کا یہ مطلب اس وقت نکلتا ہے جب اس کو سیاق و سباق سے علیحدہ کر کے پڑھا جائے۔ ان الفاظ سے پہلے حضرت ابوبکر نے جو کچھ کہا ہے اسے علیحدہ نہ کیجئے۔ حضرت ابوبکر نے صحابہ کے سامنے یہ تجویز رکھنے سے پہلے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کردہ کوئی بات بیان نہ کی جائے تمہید کے طور پر ایک ایسے امر واقعہ پر صحابہ کو مطلع کیا ہے جس کی طرف اگر بروقت دھیان نہ دیا جاتا تو فساد دین کا موجب ہو سکتا تھا۔ اس امر واقعہ کی اطلاع دیتے ہوئے حضرت ابوبکر فرماتے ہیں:

انکم تخذون عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الاحادیث تختلفون فیہا و الناس بعدکم اشد اختلافاً۔  
تم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسی احادیث روایت کرتے ہو جن میں تمہارا اختلاف ہے اور تمہارے بعد کے لوگ اختلاف میں زیادہ سخت ہو جائیں گے۔

گویا حضرت ابوبکر صحابہ کرام کی توجہ اس حقیقت کی طرف مبذول کرنا چاہتے ہیں کہ وہ احادیث جن کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کی سہولت پسندانہ خصوصیت کو برقرار رکھنے کی خاطر اپنے محتاط حکیمانہ طرز عمل کے ذریعے انفرادی معلومات تک محدود رکھا ہے ان کا یہ منورہ انفرادی معلومات تک محدود رہنا انتہائی ضروری ہے ورنہ وہ اختلافات جو اس قسم کی احادیث میں قدرتی طور پر موجود ہیں ارادی اور اختیاری مخالفتوں کی شکل اختیار کر لیں گے۔ ابتدا میں عہد نبوت سے قرب کی بنا پر ممکن ہے ان مخالفتوں میں شدت نہ ہو لیکن جوں جوں اس غیر القرون سے دوری بڑھتی جائے گی یہ مخالفتیں بھی شدید سے شدید تر ہوتی چلی جائیں گی اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ ایسی احادیث روایت ہی نہ کی جائیں جس کے پاس جو علم ہے وہ اس کے مطابق عمل کرتا چلا جائے دوسروں کو مجبور نہ کرے کہ وہ بھی اس کے علم کے مطابق عمل کریں کہ دین میں سہولت اور وسعت صرف اسی صورت میں باقی رہ سکتی ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف اوقات میں دین کے مختلف طریقوں پر عمل کرنے کی نظیریں اسی لیے چھوڑی ہیں اور ان کو قصداً اور اراداً اسی لیے کثرت سے اشاعت پذیر نہیں ہونے دیا کہ دین میں کسی قسم کی تنگی پیدا نہ ہونے پائے۔ حضرت ابوبکر نے صحابہ کے سامنے جو تجویز رکھی تھی اس کا مقصد روایت حدیث سے مطلقاً روکنا نہ تھا بلکہ مطمح نظر یہ تھا کہ احادیث کی اس طور پر روایت نہ کی جائے جس سے وہ قدرتی اور فطری اختلافات جو امت کی سہولت کے لیے ہیں ارادی اور اختیاری مخالفتوں میں تبدیل ہو کر امت کے لیے زحمت اور تنگی کا سبب بن جائیں۔

فائدہ یہ کہ محسوس کریا ہو گا کہ کسی کلام کے ایک جز کو اس کے سیاق و سباق سے علیحدہ کر دینے اور ملا کر سمجھنے میں معافی کے اندر کس قدر تفاوت واقع ہو جاتا ہے۔ حضرت ابوبکر کے الفاظ فلا تحلّوا عن رسول اللہ شیداً اپنے مابقی سے علیحدہ نہیں ہیں بلکہ اگر غور کیا جائے تو اپنے مابقی کے لازمی نتیجے کے طور پر کہے گئے ہیں۔ عربی زبان سے واقفیت رکھنے والے اچھی طرح جانتے ہیں کہ فلا تحلّوا کی ابتدا میں جو حرف (ف) ہے وہ ترتیب پر دلالت کرتا ہے یعنی اس سے پہلے جو بات بیان کی گئی ہے اس کے نتیجہ کا اظہار کرنے کے لیے کلام کی ابتدا (ف) کے حرف سے کی گئی ہے۔ گویا پوری بات اس طرح بنتی ہے کہ چونکہ احادیث



کے قدرتی اختلافات کو ارادی مخالفتوں کا ذریعہ بنایا جائے لگا ہے اس لیے اس سے تو بہتر ہے کہ احادیث کو روایت ہی نہ کیا جائے انصاف سے بتلائیے اس پوری بات کے الفاظ سے کیا یہ مطلب نکالنا کسی طرح بھی درست ہے کہ یہ بات کہنے والا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کی روایت کو سرے ہی سے ختم کرنا چاہتا ہے۔ خود ہی سوچئے اس قسم کا مطلب نکالنا بہتان و افتراء نہیں تو اور کیا ہے۔ حضرت ابوبکر کا مقصود اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ مخالفانہ اغراض کو ہوا دینے کے لیے احادیث بیان کرنے سے لوگوں کو روکا جائے۔ وہ صحابہ کرام پر دراصل یہ واضح کرنا چاہتے تھے کہ احادیث نبویہ کا صحیح استعمال یہ نہیں ہے کہ ان کے متعلق جس شخص کے پاس جو معلومات ہیں وہ ان کی پابندی کا خواہ مخواہ دوسروں سے مطالبہ کرے بلکہ صحیح مسلک ان اختلافات کے متعلق جو اس قسم کی حدیثوں میں پائے جاتے ہیں یہ ہے کہ امت مسلمہ کا ہر فرد ایک دوسرے کے قدرتی و فطری اختلافات کو برداشت کرنے کی صلاحیت اپنے اندر پیدا کرے اور اگر کوئی شخص ارادی مخالفتوں کی آگ بھڑکانے کے لیے ڈھونڈ ڈھونڈ کر ایسی احادیث بیان کرے جو دین کے طریقوں کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے مختلف نظیروں کی حامل ہوں تو اس کو خاموش کرانے کے لیے فوراً یہ کہا جائے کہ ان تمام نظیروں کے بنیادی اصول و کلیات قرآن کی شکل میں ہمارے پاس محفوظ ہیں جو پوری امت مسلمہ کو اتفاقی نقطے پر بیٹھنے کے لیے بہت کافی ہیں حضرت ابوبکر نے متذکرہ روایت کے آخر میں یہی بات ارشاد فرمائی کہ

اگر تم سے کوئی پوچھے تو کہہ دو کہ ہمارے اور تمہارے درمیان خدا کی کتاب ہے اس نے جن چیزوں کو حلال کیا انہیں حلال جانو اور جن کو حرام کیا انہیں حرام جانو۔

مَنْ سَأَلَكُمْ فَقُولُوا بَيْنَا وَبَيْنَكُمْ  
كِتَابُ اللَّهِ فَاسْتَحِلُّوا حَلَالَهُ  
وَحَرِّمُوا حَرَامَهُ۔

ان الفاظ سے حضرت ابوبکرؓ نے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ایک قاعدہ کلیہ بتلا دیا کہ جب کبھی اختلافی اغراض کے لیے احادیث نبویہ کے بارے میں کسی گوشے سے کنوکرید اور پوچھ گچھ کا سلسلہ شروع ہوتا ہے تو واضح الفاظ میں اعلان کر دینا چاہیے کہ ان تمام باتوں کا مرکز و محور وہی

اصول و کلیات میں جو فسران میں محفوظ کر دی گئی ہیں۔

غرض تذکرۃ الحفاظ کی مذکورہ بالا روایت سے یہ کسی طرح ثابت نہیں ہوتا کہ حضرت ابوبکر نے صحابہ کرام کو احادیث بنویہ روایت کرنے سے بالکل روک دیا تھا اور اس طرح وہ بنیاد ہی باقی نہیں رہتی جس پر منکرین حدیث نے حضرت ابوبکر کو متمم کرنے کے لیے عدم حجیت حدیث کے دعوے کی عمارت کھڑی کی تھی۔

**مجموعہ حدیث کو نذر آتش کر دینا** | دوسری چیز جو منکرین حدیث حضرت ابوبکر کی طرف عدم حجیت حدیث کا نظریہ منسوب کرتے

کے لیے استشہاد کے طور پر پیش کیا کرتے ہیں وہ واقعہ ہے جس کو ابن اثیر جزیری نے اسد الغابہ میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی زبانی نقل کیا ہے اور جس میں بتایا گیا ہے کہ حضرت ابوبکر نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پانچ سو احادیث پر مشتمل ایک مجموعہ تیار کیا تھا مگر بعد میں خود اپنے ہی ہاتھوں اسے نذر آتش کر دیا۔ اس واقعہ سے بھی منکرین حدیث یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ حضرت ابوبکر احادیث بنویہ کو دین میں حجت خیال نہ کرتے تھے۔

بہاں تک احادیث بنویہ کو دین میں حجت سمجھنے نہ سمجھنے کا تعلق ہے اس سلسلے میں حضرت ابوبکر کے طرز عمل پر گزشتہ اوراق میں اس موضوع پر گفتگو کی ابتدا کرتے وقت تفصیل سے بحث کی جا چکی ہے اور واضح دلائل کی روشنی میں یہ ثابت کیا جا چکا ہے کہ منکرین حدیث کا یہ دعویٰ سراسر ہمتان اور افتراء ہے۔ اس وقت تو ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اپنے مجموعہ حدیث کو نذر آتش کرتے وقت حضرت ابوبکر کے سامنے اصل محرک کیا تھا؟

**پورا واقعہ** | ایسے پہلے یہ معلوم کریں کہ پورا واقعہ کیا ہے۔ حضرت عائشہ سے اس واقعہ کے بارے میں اسد الغابہ میں جو روایت منقول ہے اس کا لہجہ باب

یہ ہے کہ حضرت ابوبکر نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال فرما جانے کے بعد احادیث بنویہ کا ایک مجموعہ قلم بند کیا جو پانچ سو احادیث پر مشتمل تھا یہ مجموعہ تحریر کرنے کے بعد اپنے پاس رکھوا دیا۔ کچھ عرصے کے بعد ایک رات حضرت عائشہ نے

دیکھا کہ حضرت ابوبکر بے چین ہیں اور کر دین بدل رہے ہیں حضرت عائشہ اپنا والد ماجد

کی یہ غیر معمولی بے چینی دیکھ کر اٹھ کھڑی ہوئیں سر ہانے تشریف لائیں اور پوچھا کہ آپ یہ کہہ رہیں کسی جسمانی تکلیف کی بنا پر بدل رہے ہیں یا کسی غیر نے آپ کو بے چین کر دیا ہے؟ حضرت ابوبکر نے کوئی جواب نہ دیا مگر جب صبح ہوئی تو حضرت عائشہ سے فرمایا بیٹی! وہ مجموعہ احادیث جو تمہارے پاس ہے اسے آؤ۔ حضرت عائشہ نے وہ مجموعہ لاکر دیا تو حضرت ابوبکر نے لے کر اسے آگ کی نذر کر دیا۔ حضرت عائشہ حیران رہ گئیں کہ اس قدر محنت سے لکھی ہوئی احادیث نبویہ کو آخر کیوں جلا دیا گیا۔ وجہ پوچھنے پر جو جواب حضرت ابوبکر دیتے ہیں وہ اس سارے واقعہ میں بہت اہم ہے۔ یہ جواب ہی دراصل ہمارے بھی ان تمام سوالات کا جواب ہے جو اس سلسلے میں تدریقی طبع پر ذہن میں ایسے کرتے ہیں اور جن کو منکرین حدیث طرح طرح سے ہوا دینے کی کوشش کرتے ہیں حضرت ابوبکر جواب میں فرماتے ہیں :

مجھے یہ اندیشہ پیدا ہوا کہ میں مرجائوں اور حدیثوں کا یہ مجموعہ میرے پاس رہ جائے اس حالت میں کہ اس میں ایسے شخص کی بھی حدیثیں ہوں جس کی امانت پر میں نے بھروسہ کیا اور اس کے بیان پر اعتماد کیا مگر جو کچھ اس نے مجھ سے بیان کیا اصل بات ویسی نہ ہو اور میں نے اسے نقل کر دیا۔ پس ایسا کرنا درست نہ ہو گا۔

خَشِيتُ اَنْ اَمُوتَ وَهِيَ عِنْدِي  
فَيَكُوْنُ فِيْهَا اَحَادِيْثٌ عَنْ رَّسُوْلِيْ  
قَدْ اَسْتَمْنَدْتُ وَوَقَعَتْهُ وَلِيْهِ يَكُنْ  
صَحَابَةٌ شَيْءٌ فَاَكُوْنُ قَدْ نَقَلْتُ  
ذَاكَ فَهٰذَا لَا يَصَحُّ  
(مسند الغابہ جلد ۳ ص ۲۲۴)

**واقعہ کا محرک** حضرت ابوبکر کے ان الفاظ میں ذرا غور کرنے کی ضرورت ہے۔ ان الفاظ سے ایک عام آدمی کا ذہن تو شاید یہی نتیجہ اخذ کرے گا کہ حضرت ابوبکر نے راویوں کی روایت میں کذب کا احتمال موجود ہونے کی بنا پر اپنے مجموعہ حدیث میں مرقوم احادیث کو قابل اعتماد نہ سمجھا اس لیے ان کو جلا دیا مگر وہ اذہان جو غور و فکر کی صلاحیتوں سے مزین ہیں وہ ذرا سوچیں کہ اگر احتمال کذب کی بنا پر حضرت ابوبکر نے ان احادیث کو ناقابل اعتماد سمجھا ہوتا تو کیا پہلے تھا کہ ابتدا میں ان کو قلم بند ہی نہ کرتے اس لیے کہ یہ احتمال تو اس

وقت بھی موجود تھا۔ اگر باوجود سچ بولنے کے ہر شخص کے بیان کے بارے میں یہ اندیشہ باقی رہتا ہے کہ شاید اس کی خبر میں سچ کے ساتھ جھوٹ بھی ہو تو یہ اندیشہ تو قید تحریر میں آنے سے پہلے بھی ان ساری روایتوں میں موجود تھا باوجود اس اندیشہ کے حضرت ابوبکرؓ نے احادیث کو قلم بند کیا تھا تو ظاہر ہے ان پر اعتماد کرتے ہوئے ہی کیا تھا۔ صدق کے ساتھ کذب کی موجودگی کا محض امکان کسی خبر کو ناقابل اعتماد اور ناقابل قبول قرار دینے کے لیے کافی نہیں ہوا کرتا بلکہ عام طور پر یہی دیکھا جاتا ہے کہ خریدنے والا بظاہر معتبر اور ثقہ ہے یا نہیں۔ دُنیا کا عام کاروبار اسی بنیاد پر قائم ہے۔ عدالتوں تک میں قانون شہادت کی بنیاد یہی اعتماد و اعتبار ہے جس کے تحت حکام آئے دن فیصلے صادر کرتے رہتے ہیں قضی اور لازوال یقین حاصل کرنے کی نہ کوئی کوشش کرتا ہے اور نہ اس کا حصول ممکن ہی ہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے بھی راویوں کو معتبر اور قابل اعتماد سمجھ کر ہی ان سے سنی ہوئی حدیثوں کو جمع کر لیا تھا۔ احتمال کذب کی اہمیت نہ لکھنے سے پہلے تھی اور نہ لکھنے کے بعد۔ لہذا معلوم ہوا کہ مجموعہ احادیث کا جلانا ان کے ناقابل اعتماد ہونے کی بنا پر نہ تھا۔

ہمارے اس خیال کی تائید اس امر سے بھی ہوتی ہے کہ حدیثوں کے اس مجموعے میں یقینی بات ہے وہ احادیث بھی ضرور شامل ہوں گی جن کو حضرت ابوبکرؓ نے بذات خود بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل کیا تھا کم از کم وہ احادیث تو تمام کی تمام حضرت ابوبکرؓ کے لیے ہر قسم کے کذب کے احتمال سے خالی تھیں اگر ناقابل اعتماد سمجھے جانے کی بنا پر احادیث کے مجموعے کو جلایا گیا ہوتا تو اس مجموعے میں سے ان احادیث کو تو یقیناً الگ کر لینا چاہیے تھا جن میں کذب کا کوئی امکان نہ تھا۔ پورے مجموعے کو جلانا اس بات کا ثبوت ہے کہ اس کی وجہ احادیث پر عدم اعتمادی ہرگز نہ تھی ۝

معلوم ہوا کہ بیان کرنے والوں کے بیان میں جس شبہ کا اظہار حضرت ابوبکرؓ نے اپنے مجموعے کے جلانے کے سلسلے میں کر رہے ہیں اس کا تعلق ان شکوکِ شبہات

دین کی سہولت پسندانہ  
خصوصیت کی حفاظت

سے نہیں ہے جن کی موجودگی و عدم موجودگی کسی خبر پر عدم اعتماد یا اعتماد کا موجب ہوا کرتی ہے بلکہ یہ شبہ اس ظن و گمان کی قبیل سے ہے جس کو قصداً ان حدیثوں میں باقی رکھنا بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اصل مقصود تھا جن کے متعلق عمومیت اور عام اشاعت کا طریقہ آپ نے اختیار نہیں فرمایا تھا۔ اسلام کی سہولت پسندانہ خصوصیت کو برقرار رکھنے کی خاطر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے محتاط حکیمانہ طرز عمل کے ذریعے جن احادیث کو انفرادی معلومات تک محدود رکھا ہے وہ احادیث ظاہر ہے یقیناً اعتماد کا وہ مقام حاصل نہیں کر سکتیں جو تواتر و تواتر کی راہ سے منتقل ہو کر آنے والی احادیث کو حاصل ہے۔ اول الذکر احادیث میں قصداً اور اراداً اس احتمال کی گنجائش چھوڑی گئی ہے کہ بیان کرنے والے کا بیان ممکن ہے صحیح نہ ہو اسی گنجائش نے ان احادیث کے مطالبے کی قوت کو دین کے اس حصے کے مطالبے کی قوت کے مقابلے میں کچھ کمزور کر دیا ہے جس میں قطعاً اس احتمال کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑی گئی۔

حضرت ابوبکرؓ کو خدشہ تھا تو اسی بات کا کہ میرے ہاتھ سے قید تخریر میں آجانے کے بعد ایسا نہ ہو کہ یہ احادیث اس حال پتہ قائم نہ رہ سکیں جس پر ان کا باقی رہنا لازمی ہے اور اس طرح دین میں جو سہولت کی راہ کھلی ہوئی ہے وہ کہیں بند نہ ہو جائے۔ سوچنے کی بات ہے جو کتاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سب سے پاک خلیفہ اور دینی سیاسی جانشین کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہو اس میں ہر قوم ہو جانے کے بعد کہ ان انفرادی معلومات پر مبنی احادیث کا اپنے مطالبوں کی قوت میں وہ حال باقی رہ سکتا تھا جس کا باقی رکھنا مقصود تھا۔ حضرت ابوبکرؓ کی یہ کتاب اگر باقی رہ جاتی تو اس کی حیثیت سربراہ حکومت کی جانب سے جاری کیے جانے والے ایک سرکاری وثیقہ کی بن جاتی اور آنے والے زمانوں میں اس کتاب کی حدیثوں کے ساتھ اور ان حدیثوں سے پیدا ہونے والے احکام و قوانین کے ساتھ عقیدت و گرویدگی کا جو عالم ہوتا وہ کسی بیان و تشریح کا محتاج نہیں۔ حضرت ابوبکرؓ کے یہ الفاظ کہ حشیت اَنْ اُصوت وحي عندي (مجھے اندیشہ ہوا کہ میں مر جاؤں اور حدیثوں کا یہ مجموعہ میرے

پاس رہ جائے، تو اس باب میں بہت ہی واضح ہیں کہ حضرت ابو بکرؓ اپنی زندگی میں ان احادیث کی اشاعت نہ بھی کرتے تو آپ کے بعد آپ کے پاس سے محض اس کتاب کا نکل آنا ہی اس میں موجود احادیث کی اس نوعیت کو بدل دینے کے لیے کافی ہوتا جس کو قصداً باقی رکھنا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصود تھا۔ حتیٰ یہ ہے کہ حضرت ابو بکرؓ نے اپنے مکتوب مجموعے کو جلا کر اس خطرے کا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے انسداد فرما دیا۔

بلکہ دیکھا جائے تو حضرت ابو بکرؓ اپنے مجموعہ حدیث کو نذر آتش کر کے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک سنت کو زندہ کیا۔ حدیثوں کے کتابی ذخیرے کو جلانے کا پہلا واقعہ عہد نبوت میں ہوا تھا جب صحابہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کتابت حدیث کی ممانعت کا حکم سن کر اپنے مکتوب مجموعوں کو جلا دیا تھا اس وقت بھی پیش نظر یہی خدشہ تھا کہ قرآن کے ساتھ ساتھ لکھے جانے کی بنا پر یا کثیر تعداد میں مکتوب مجموعے تیار ہو جانے سے ان میں عمومیت کا رنگ پیدا ہو جانے کی بنا پر کہیں ان احادیث سے نکلنے والے احکام و نتائج کے مطالبوں میں وہ قوت نہ پیدا ہو جائے جو قرآن کو یا دین کے اس حصے کو حاصل ہے جو قرآن کی عملی تشکیلات پر مشتمل ہے اور اس طرح یہ حدیثیں کہیں امت مسلمہ کی دینی زندگی میں ضیق اور تنگی کا سبب نہ بن جائیں۔ اس خطرے کا انسداد کرنے کے لیے پہلی بار نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں حدیثوں کے کتابی ذخیرے کو جلایا گیا تھا اب اسی طریقہ کا احیاء حضرت ابو بکرؓ نے اپنے کتابی ذخیرے کو جلا کر کیا اب بھی مقصود اسی خطرے کا انسداد تھا کہ دین کا وہ حصہ جو تواتر و توارث کی دولت سے مالا مال ہے اور جس کو ہم نے گذشتہ اوراق میں بیانات کی قرآنی اصطلاح سے تعبیر کیا ہے وہ دین کے اس حصے سے خلط ملط نہ ہو جائے جس کی بنیاد وہ احادیث ہیں جن کو قصداً اور اراداً دین میں سہولت کے پیش نظر انفرادی معلومات تک محدود رکھا گیا ہے۔ دین کے ان دونوں حصوں کے مطالبوں میں قوت و ضعف کو برقرار رکھنے کے لیے جو طرز عمل عہد نبوت میں اختیار کیا گیا تھا اسی طرز عمل کی تجدید حضرت

ابوبکرؓ نے اپنے زمانے میں فرمائی۔

غرض روایت حدیث سے ممانعت کی بات ہو یا مجموعہ حدیث جملانے کا ذکر ہو حضرت ابوبکرؓ کی طرف حدیث کی عدم حجیت کا نظریہ ثابت کرنے کے لیے کسی طرح بھی یہ دونوں باتیں بنیاد کا کام نہیں دے سکتیں۔ اس لیے بلاخوف تردد یہی کہا جائے گا کہ حضرت ابوبکرؓ کے بارے میں منکرین حدیث کا دعویٰ ایک بہتان سے زیادہ کوئی حقیقت نہیں رکھتا ۛ

**حضرت عمرؓ اور منکرین حدیث کا الزام** | منکرین حدیث کی اتمام طراری کا دوسرا نشانہ

ہے۔ حضرت عمرؓ کے بارے میں تریہ دریدہ دین لوگ اس تند آگے بڑھ گئے ہیں کہ انکو انکار حدیث کے فتنے کا امام قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ احادیث کو معاذ اللہ دین سے بالکل خارج کر دینا چاہتے تھے۔ اپنے اس دعوے کے ثبوت کے لیے بھی منکرین حدیث نے انہی دو باتوں کا سہارا لیا ہے جو حضرت ابوبکرؓ کے سلسلے میں ان کا تختہ مشق بن چکی ہیں یعنی روایت حدیث سے ممانعت اور حدیث کے مختلف کتابی ذخیروں کو نذر آتش کر دینا۔ منکرین حدیث اپنی فاسد اغراض کو پورا کرنے کے لیے ڈھونڈ ڈھونڈ کر ایسی روایات لاتے ہیں جن میں کسی نہ کسی طرح بس یہ ذکر آگیا ہو کہ حضرت عمرؓ نے احادیث بنویہ کو روایت کرنے سے لوگوں کو روکا تھا یا پھر بڑے شد و مد کے ساتھ اس روایت کو اچھلتے ہیں جس میں آبا ہے کہ حضرت عمرؓ نے لوگوں کے ٹکے ہوئے حدیث کے مجموعے منگوائے اور ان کو جلا دیا ۛ

**منکرین حدیث کی علمی خیانت** | ان تمام روایات کا انشاء اللہ تفصیل سے جائزہ لیا جائے گا مگر اس سے قبل ہم منکرین حدیث

کے طرز عمل کے بارے میں اپنے اسی سوال کا پھر اعادہ کرتے ہیں کہ آخر یہ لوگ قدم قدم پر علمی خیانت کے مرتکب کب کب ہوتے ہیں حدیث کے جن ذخیروں سے کرید کرید کر انہوں نے اپنے مطلب کی روایات لکالی ہیں کیا انہی ذخیروں میں وہ روایات انہیں نظر نہیں آئیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ روایت سے بالکلہ لوگوں کو روکنا تو کجا حضرت عمرؓ رضی اللہ عنہ خود سینکڑوں حدیثیں روایت کرتے رہے ہیں۔ عجب حال ہے ان لوگوں کا ایک طرف روایات

کے تمام ذخیرے کو ناقابل اعتبار ٹھہرایا جاتا ہے۔ جھوٹ کا پلندہ اور عجی سازش کا نام دے دے کر روایات کی پوری بساط کو لپیٹ کر رکھ دینے کے مشورے دئے جاتے ہیں۔ دوسری طرف اسی ذخیرہ روایات میں سے کچھ روایتیں نکال کر اور انہیں اپنے معنی پہنا کر اس پر اصرار کیا جاتا ہے کہ جو کچھ وہ کہہ رہے ہیں اس پر اعتماد کیا جائے جو روایات وہ پیش کر رہے ہیں انہیں حجت کے طور پر قبول کیا جائے۔ روایات تو روایات ہی ہیں اگر منکرین حدیث کی پیش کردہ روایات درست ہو سکتی ہیں تو وہ روایات درست کیوں نہیں ہو سکتیں جو ان کے خلاف دوسروں کی جانب سے حجت کے طور پر پیش کی جاتی ہیں۔ اگر رد کرنا ہے تو تمام روایات کو رد کر دیجئے اور اگر قبول کیا ہے تو سب کچھ قبول کیجئے۔ ”میٹھا میٹھا پپ کڑوا کڑوا تھو“ کی منطق تلاش حق میں ممدوحین ثابت ہونے کے بجائے ہمیشہ زیر دست رکاوٹ بنی رہی ہے۔ اگر ہم سے مطالبہ ہے کہ ہم آپ کی پیش کردہ وہ روایات قبول کریں جن سے آپ حضرت عمر کو بزرگم خود انکار حدیث کا امام معاذ اللہ ثابت کرتے ہیں تو ہمیں اس مطالبے کی مقبولیت ثابت کرنے کے لیے پہلے یہ بتلانیے کہ ہم ان روایات کو کس دلیل کی بنا پر رد کر دیں جن سے آپ کے دعوے کی کھلی تردید ہوتی ہے جبکہ وہ روایات جو آپ اپنے دعوے کے ثبوت میں پیش کرتے ہیں ان کی اسناد کو صحت و وثاقت کے لحاظ سے ان روایتوں کی اسناد سے کوئی نسبت نہیں جو حضرت عمرؓ سے مروی ہیں اور آپ کے دعوے کی تردید کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ حضرت عمرؓ سے مروی احادیث عموماً صحاح ستہ کی کتابوں میں بلکہ زیادہ تر بخاری اور مسلم میں پائی جاتی ہیں جن کی اسناد کا قوی ترین ہونا متفق علیہ ہے اور منکرین حدیث کی طرف سے جن روایات کو پیش کیا جاتا ہے ان کا کم از کم صحاح کی کتابوں میں کوئی ذکر نہیں۔ اس کے علاوہ ان روایات کی تعداد دو چار دس پانچ کے عدد سے آگے نہیں بڑھتی جبکہ ان حدیثوں کی تعداد جو حضرت عمرؓ سے مروی ہیں سینکڑوں سے متجاوز ہے۔

**حضرت عمرؓ اور روایت حدیث** | حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے جو احادیث مروی ہیں وہ صاحب تصنیف ابن جوزی کے

مطابق پانچ سو سینتیس (۵۳۷) ہیں علامہ ابن حرم نے جوامع السیر میں حضرت عمرؓ کی مرویات



کی تعداد پانچ سو تلاتی ہے۔ ممکن ہے اس تعداد میں طرق کا شمار شامل ہو اگر متون ہی کا اعتبار کیا جائے تب بھی حضرت عمرؓ کی مرویات دو سو سے کچھ اوپر بیان کی گئی ہیں۔ غور تو کیجئے جس ہستی کے بارے میں یہ دعویٰ کیا جا رہا ہے کہ وہ لوگوں کو حدیثیں روایت کرنے سے روکتی تھی وہی ہستی خود دو چار نہیں دس بیس نہیں پوری دو سو سے کچھ اوپر احادیث بنویہ روایت کرتی نظر آتی ہے۔ اگر منکرین حدیث کی بات مان لی جائے تو پھر حضرت عمر فاروق جیسے حلیل القدر اور خلیفہ رسول صحابی کے اس علی تضاد کی آخر آپ کیا توجیہ کریں گے کہ ایک طرف لوگوں کو روکتے رہے اور دوسری طرف دو دو سو احادیث خود روایت کرتے رہے اور یہ دو سو کی تعداد بھی اس وقت ہے جب ہم حضرت عمرؓ کے ان فقہی استدلالات کو شامل نہ کریں جو آپ نے قرآن پاک کی تعبیر و تفسیر اور احکام و مسائل کی توضیح و تبیین میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ عمل سے کیے ہیں اور فن حدیث کے نقطہ نظر سے وہ حدیث ہی کی تعریف میں آتے ہیں ایسے استدلالات فاروقی کی تعداد ہزار سے بھی اوپر ہے اسی بنا پر شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے ازالۃ الخفاء میں کہا ہے کہ حضرت عمرؓ کا شمار مکثرین صحابہ کے طبقہ میں ہونا چاہیے یعنی وہ صحابہ جن کی مرویات کی تعداد ہزار یا ہزار سے اوپر ہے۔ منکرین حدیث ذرا آنکھیں کھولیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ عمل سے ہزار سے زیادہ استدلالات کرنے والا بھی کہیں منکر حدیث ہو سکتا ہے کیا ایسے شخص کے بارے میں بھی یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ احادیث بنویہ کو دین سے معاذ اللہ بالکلہ خارج کر دینا چاہتا ہے؟

**عمال کو تحلیم حدیث کا حکم** | حیرت کی بات ہے جس عمرؓ کے بارے میں یہ کہا جا رہا ہے کہ وہ احادیث بنویہ کو دین سے خارج کر دینا چاہتا تھا وہی عمرؓ نہیں حج کے موقع پر لاکھوں اصحاب رسول کے سامنے اپنے خطبے میں یہ اعلان عام کرتا نظر آتا ہے :

لوگو! میں تم پر اس لیے حاکم مقرر نہیں کرتا کہ وہ تمہارے

ایہا الناس لعل عملکم لا یضربوا

ابنائکم ولا یأخذوا اموالکم  
وانما ارسلکم الیکم  
لیعلمکم دینکم و سنتہ  
نبیکم (تاریخ ابن اثیر ص ۲۰۸)

بیٹوں کو ماریں اور نہ اس لیے کہ وہ تمہارے  
مال چھین لیں میں نے ان کو صرف اس لیے بھیجا  
ہے کہ وہ تمہیں تمہارا دین اور تمہارے نبی کی  
سنت کی تعلیم دیں۔

کیا سنت نبوی کی تعلیم دینا سنت نبوی کو دین سے خارج کرنا کہلاتا ہے۔ جو شخص اپنے عمال  
مقرر کرنے کا مقصد واحد یہ بتلاتا ہے کہ وہ لوگوں کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سکھائیں اس  
کے بارے میں کیسے یہ تصور کر لیا جائے کہ وہ نبی کی سنت کو دین سے خارج کر دینا چاہتا  
ہے۔ معلوم ہوتا ہے حضرت عمرؓ اپنے عمال روانہ فرماتے وقت بطور خاص ان کے ذمے  
یہ فرض سونپتے تھے کہ وہ اپنے علاقے میں جا کر قرآن کے ساتھ ساتھ حدیث لوگوں کو سکھائیں  
چنانچہ حضرت ابو موسیٰ اشعری کو جب حضرت عمرؓ کی جانب سے بصرہ کا دالی بنا کر بھیجا گیا تو جاتے  
ہی حضرت ابو موسیٰؓ نے مجمع عام میں جو تقریر کی اس میں انہوں نے اپنے بھیجے جانے کا مقصد  
تعلیم قرآن و حدیث ہی کو قرار دیا۔ آپ نے فرمایا

مجھے عمرؓ نے بھیجا ہے کہ میں تمہیں تمہارے  
رب کی کتاب اور تمہارے نبی کی سنت  
سکھلاؤں۔

بَعَثَنِي عُمَرُ لَا عَلِمَ كِتَابِ رَبِّكَ  
وَسُنَّةَ نَبِيِّكَ (دارمی ص ۶۵)

عدالتی فیصلوں کی بنیاد | سنت نبوی کی صرف تعلیم ہی نہیں حضرت عمرؓ کے دربار خلافت  
سے باقاعدہ ہدایت نامے روانہ کیے جاتے تھے کہ قرآن  
کے بعد حدیث کو مقدمات و خصوصیات کے فیصلوں کی بنیاد بنایا جائے۔ ماضی شریح کے نام  
ایک مکتوب میں ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے لکھا :

جب تمہارے پاس کوئی مقدمہ پیش ہو تو اس میں  
کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ دو اور اگر کوئی  
ایسی چیز آئے جو کتاب اللہ میں نہیں تو تم رسول اللہ  
کی سنت کے مطابق فیصلہ کرو۔

اِذَا اتَاكَ اَمْرًا فَاقْضِ بِمَا فِيْهِ  
كِتَابُ اللّٰهِ فَاِنْ اَتَاكَ مَا لَيْسَ فِيْهِ  
الْكِتَابِ فَاقْضِ بِمَا سَمِعْتَ مِنْ رَّسُولِ اللّٰهِ  
(الموافقات للبیہقی ج ۴ ص ۴)

اسی طرح ایک اور موقع پر حضرت شریح ہی کے نام ہدایت مذبحی کہ جو چیز تھیں کتاب اللہ میں مل جاتے تو پھر اس میں مزید کسی پوچھ بچھ کی ضرورت نہیں اسی پر عمل کرو لیکن اگر کوئی چیز کتاب اللہ میں نہ ملے یا مبہم ہو تو پھر سنت رسول کا اتباع کرو۔ حضرت عمرؓ کے الفاظ ہیں :

تم دیکھو جو چیز تمہارے لیے کتاب اللہ میں واضح ہو  
اس بارے میں کسی سے مت سوال کرو اور جو چیز  
کتاب اللہ میں واضح نہیں اس میں سنت رسول کا  
اتباع کرو۔

أَنْظُرُوا مَاتَيْنَ لَكَ فِي كِتَابِ اللَّهِ فَلَا  
تَسْأَلُ نِيْدًا وَحَدًّا وَالْمَتَّبِعِينَ لَكَ  
فِي كِتَابِ اللَّهِ فَاتَّبِعْ فِي  
سُنَّةِ رَسُولِ اللَّهِ -

(الوافقات ج ۴ ص ۷)

ان شواہد کے بعد بھی اگر کسی کو اس پر اصرار ہے کہ حضرت  
عمرؓ حجرت حدیث کے قائل نہ تھے یا حدیث کو دین سے

نبی کی رائے وحی الہی ہے

خارج کر دینا چاہتے تھے تو ہم اس کا معاملہ خدا پر چھوڑتے ہیں اور اس باب میں آخر  
کے طور پر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا ایک قول پیش کر کے فیصلہ قارئین پر چھوڑتے ہیں  
کہ اس سے جو نتیجہ چاہیں اخذ کریں۔ حافظ ابن عبد البر نے جامع بیان العلم میں اور علامہ  
جلال الدین سیوطی نے مفتاح الحشر میں حضرت عمر کا یہ قول نقل کیا ہے :

اے لوگو! بھلا تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی  
بات کا تعلق ہے سودہ درست ہے کیونکہ اللہ آپ کی  
رہنمائی کرتا تھا لیکن ہماری رائے تو صرف گمان  
اللہ تکلف ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ ! إِنَّ الرَّاْيَ إِنَّمَا  
كَانَ مِنْ رَسُولِ اللَّهِ مُصِيبًا لِأَنَّ  
اللَّهُ كَانَ يُمِيزُهُ وَإِنَّمَا هُوَ مِنْهَا  
الظَّنُّ وَالتَّكَلُّفُ -

نبی کی رائے کو وحی الہی قرار دینے والا بھی اگر منکر حدیث ہے تو پھر مؤید حدیث اور حجرت  
حدیث کا قائل آپ کے کہیں گے جو یہ سمجھتا ہو کہ رسول اللہ کی رائے ہر حال میں درست ہے اس  
لیے کہ اس کی پشت پر اللہ کا ارادہ کام کرتا ہے اس کے بارے میں یہ دعویٰ کرتا کہ وہ حدیث  
کو دین سے خارج کرنا چاہتا ہے بہتان اور افتراء تو ہے ہی دعویٰ کرنے والوں کے عقل  
سے عاری ہونے کی دلیل بھی ہے :

منکرین حدیث کے دعوے کا اصل مدار

حضرت عمرؓ کے اس قول کو تمام حجت کے طور پر پیش کرنے کے بعد اب ہم ان روایات کا جائزہ لیتے ہیں جو اس سلسلے میں منکرین حدیث کے دعوے کا اصل

مدار ہیں۔ منکرین حدیث اپنے دعوے کے ثبوت میں جن روایات کو بہت بڑھ چڑھ کر پیش کرتے ہیں وہ تین طرح کی ہیں :

(۱) وہ روایات جن سے بظاہر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ حدیثیں روایت کرنے سے سختی کے ساتھ منع کرتے تھے۔

(۲) وہ روایت جس سے یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے حدیثیں روایت کرنے پر بعض صحابہ کو سزا دی تھی۔

(۳) وہ روایت جس میں ذکر ہے کہ حضرت عمرؓ نے لوگوں کے لکھے ہوئے احادیث کے مجموعے منگوائے اور ان کو جلادیا۔ اب ہم ان تینوں قسم کی روایات کا تفصیل سے جائزہ لیں گے اور بتلائیں گے کہ ان روایات کے اصل مفہوم کی روشنی میں فی الواقع کیا نتیجہ نکلتا ہے اور منکرین حدیث نے خود ساختہ معنی پہنا کر ان روایات سے کتنے دوزخ کا رستہ اخذ کیے ہیں :

روایت سے منع کرنا

وہ روایات جن کو مختلف سباق و سباق میں بار بار پیش کر کے منکرین حدیث ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ روایت حدیث سے سختی کے ساتھ منع کرتے تھے ان میں سب نمایاں روایت وہ ہے جس کو حضرت قرظ بن کعبؓ صحابی سے امام شعبیؒ نے نقل کیا ہے اور علامہ ذہبیؒ نے اسے تذکرۃ الحفاظ میں حضرت عمرؓ کے حالات بیان کرتے ہوئے جوں کا توں لے لیا ہے۔ حضرت قرظ بن کعبؓ سے روایت ہے :

ہم (مدینہ سے) نکلے تو حضرت عمرؓ ہماری مشایعت میں ہجرہ نامی مقام تک آئے پھر آپؓ نے پانی طلب کر کے وضو کیا پھر فرمایا تم لوگوں نے سمجھا بھی کہ میں

خرجنا فشيئاً عمرالى صرار ثم دعا بما فتوصنا ثم قال آهرون لم خرجت معكم قلنا أردت أف

تَشْتَعْنَا، تَكْرِمًا قَالَ: اِنَّ مَعَ  
ذَلِكَ لِحَاجَةً اِخْرَجْتَ اِيَّكُمْ بَاكُونَ  
بَلَدَةً لَا اَهْلَ لَهَا وَرِثَى بِالْقُرَآءِ  
كَدَوِيٍّ الْخَلِّ فَلَا تَصَدُّوهُمْ  
بِالْاَحَادِيثِ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ  
عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَتَشْغَلُوهُمْ جُرُودًا  
الْقُرْآنَ وَاقْتُلُوا رِوَايَةً عَنْ  
رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ  
إِمْضُوا وَأَنَا شَرِيكُكُمْ  
(تذكرة الحفاظ ج ۱ ص ۱۷)

تمہارے ساتھ (مدینہ سے) نکل کر کون آیا عرض کیا  
ہم لوگوں کی مشایعت اور عزت افزائی کے لیے فرمایا اس  
نے ہوا بھی ایک ضرورت تھی میرے نکلنے کی وہ یہ کہ تم  
ایسے شہر میں پہنچو گے جس کے باشندوں میں قرآن کی تلاوت  
اس طرح گونجتی ہے جیسے شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ  
دیکھنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں بیان کر  
کر کے تم ان لوگوں کو (قرآن کی مشغولیت سے) روک  
رہے دینا قرآن کو استوار کرتے چلا جانا اور رسول اللہ صلی  
اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں روایت کرنے میں کمی کرنا۔ اب جاؤ  
میں تمہارا ساتھ ہی ہوں۔

روایت حدیث سے منع کرنے کے ثبوت میں بنیادی طور پر تو یہی روایت منکرین حدیث کی جانب  
سے بار بار پیش کی جاتی ہے البتہ اس روایت سے جو نتیجہ وہ اخذ کرتے ہیں اس میں قوت  
پیدا کرنے کے لیے بعض ایسے اقوال بھی بطور تائید پیش کیے جاتے ہیں جن سے ظاہر ہوتا  
ہے کہ حضرت عمر روایت حدیث سے روکنے میں اس قدر سخت تھے کہ ان کی وفات کے  
بعد بھی لوگ ان کی سختی کو یاد کر کے کانپ اٹھتے تھے۔ مثلاً حضرت ابوہریرہ کا ایک قول  
نقل کیا جاتا ہے جس کو ان کے شاگرد ابو سلمہ نے روایت کیا ہے کہ

میں نے حضرت ابوہریرہ سے (پوچھا کہ کیا  
آپ حضرت عمر کے زمانے میں بھی اسی طرح  
احادیث روایت کرتے تھے تو انہوں نے کہا اگر میں  
حضرت عمر کے زمانے میں اسی طرح روایت کرتا  
جیسا اب کرتا ہوں تو عمر مجھے در سے مارتے۔

قُلْتُ لِمَ كُنْتَ تَحَدِّثُ فِي زَمَانِ  
عُمَرَ هَكَذَا فَقَالَ لَوْ كُنْتُ أَحَدَهُ  
فِي زَمَانِ عُمَرَ مِثْلَ مَا أَحَدُتُكُمْ  
لَضَرَبَنِي بِخَفَّيْهِ

(تذكرة الحفاظ ج ۱ ص ۱۷)

اسی سے ملنے جلتے مضمین کا حامل ایک اور قول بھی پیش کیا جاتا ہے جو دوسری صدی ہجری

کے مشہور محدث سفیان بن عیینہ کی طرف منسوب ہے کہ حدیث کے طلبہ جب ان کے حلقہ درس میں آتے تو کبھی کبھی ان کو مخاطب کر کے حضرت سفیان بن عیینہ فرماتے :

<p>اگر حضرت عمرؓ ہمیں اندھتیں پالیتے تو ضرور ہمیں مار کر ڈکھ بھونچاتے۔</p>	<p>لَوْ اَدْرَكْنَا دِيَارَكَ عُمَرَ لَا ضَعُفًا ضَعُفًا (جامع بيان العلم جلد ۱ ص ۱۳۵)</p>
--	--

غرض اسی قسم کی مختلف روایتیں پیش کر کر کے منکرین حدیث ثابت یہ کرنا چاہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ روایت حدیث کے تائل نہ تھے اور لوگوں کو حدیثیں روایت کرنے سے روکنے میں اس قدر سختی سے کام لیتے تھے کہ لوگ ان سے ڈرتے تھے۔ منکرین حدیث ان روایات سے جو نتیجہ نکالتے ہیں وہ کس حد تک غلط ہے اس پر گفتگو کرنے سے پہلے اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ ان میں سے اکثر روایات کی صحت میں محدثین کو کلام ہے۔ حافظ ابن عبدالبر نے جامع بیان العلم میں ان روایتوں کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ بعض لوگوں کو ان روایتوں کی صحت میں شبہ ہے۔ علامہ ابن حزم نے بھی کتاب الاحکام میں حضرت عمرؓ کی طرف منسوب اس قسم کی روایات کے راویوں پر جرح کر کے ان روایتوں کو مشتبہ و مشکوک قرار دیا ہے :

**روایت میں کمی کا مشورہ** تاہم ان روایتوں کی صحت و ثاقب سے قطع نظر حیرت تو اس بات پر ہے کہ حضرت قرظہ بن کعبؓ مروی

وہ روایت جس کی بنیاد پر روایت حدیث سے ممانعت کی ساری عمارت کھڑی کی گئی ہے بجائے تائید کرنے کے منکرین حدیث کے دعوے کی کھلی تردید کرتی ہے۔ حدیث دشمنی کی پاداش میں شاید اللہ نے ان کی عقلوں پر پردے ڈال دیے ہیں کہ اتنی تمیز بھی نہ رہی کہ کوئی بات ان کے حق میں جاتی ہے اور کوئی ان کے خلاف اس روایت کے الفاظ پر پہلے اچھی طرح غور تو کر لیا ہوتا۔ حضرت عمرؓ نے روایت حدیث سے روکنے کے وقت یہ نہیں کہا کہ میں تم لوگوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں روایت کرنے سے منع کرتا ہوں بالکل کوئی حدیث روایت نہ کرنا بلکہ کہا یہ ہے کہ حدیثیں کم روایت کرنا۔ حضرت عمرؓ

کے الفاظ ہیں **دَا قَلَّوْا السَّوَادِيَةَ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ** (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیثیں روایت کرنے میں کمی کرنا) ان الفاظ سے روایت حدیث کی ممانعت تو بہت دور کی بات ہے البتہ یہ مستفاد ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ روایت حدیث کا حکم دے رہے ہیں۔ جب کسی کام کے بارے میں یہ کہا جائے کہ اس کام کے کرنے میں ذرا کمی کرنا تو اس کا کھلا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس کام کو کرتے ضرور رہنا۔ مخاطب کو اس کام سے جو تعلق خاطر ہے اس کے پیش نظر چونکہ غرض یہ ہے کہ کس اعتدال سے نکل کر کثرت سے اس کام میں انہماک نہ پیدا ہو جائے جو بعض مصالح کے تحت مقصود نہیں اس لیے کہا یہ جاتا ہے کہ اس کا میں کمی ہی رکھنا کہ وہی مطلوب ہے۔ اس کو ایک قریب کی مثال سے سمجھئے کوئی شخص کھانوں کا بہت سونہا ہو اور اس بنا پر غرض یہ ہونہ انواع و اقسام کے کھانے دیکھ کر اپنے اوپر قابو نہ رکھ سکے گا۔ ضرورت سے زیادہ کھائے گا اس غرض کے پیش نظر طیب اسے کہے کہ دعوت میں جاتو رہے ہو مگر کھانے میں کمی ہی رکھنا تو کیا یہ سمجھا جائے گا کہ طیب کھانا کھانے سے اسے بالکل منع کر دیا ہے صاف ظاہر ہے کہ ہر کوئی طیب اس جملے سے یہی مطلب اخذ کرے گا کہ کھانا کھانے سے روکا نہیں جا رہا ہے بلکہ اجازت دی جا رہی ہے کہ کھانا کھاؤ ضرور مگر کم کھاؤ صحابہ کے لیے بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں روایت کرنے سے زیادہ کوئی چیز مرغوب ہو سکتی تھی حقیقت یہ ہے کہ احادیث بنوہ صحابہ کی محبوب ترین مدحانی غذا تھی اور حضرت عمرؓ مدحانی طیب ہونے کی حیثیت سے جس چیز سے منع کر رہے تھے وہ یہی تھی کہ روایت حدیث میں متمادی اپنے تعلق خاطر کی بنا پر ضرورت سے زیادہ انہماک نہ ہو جائے گویا بالواسطہ طور پر اس بات کی تو اجازت کیا حکم دے رہے ہیں کہ احادیث بنوہ ضرور روایت کرنا مگر ساتھ ہی اس بات کی تاکید کر رہے ہیں کہ حد اعتدال میں رہتے ہوئے حدیثیں روایت کرنے میں کمی کرنا۔

حضرت ابو ہریرہؓ اور حضرت سفیان بن عیینہؓ وغیرہما کے جو اقوال تائید کے طور پر پیش کیے جاتے ہیں ان کے الفاظ بھی یہی بتلا رہے ہیں کہ ان حضرات کو حضرت عمرؓ کی سختی کا خیال آتا تھا تو کثرت سے حدیثیں روایت کرنے کی بنا پر۔ حضرت ابو ہریرہؓ کا یہ فرمانا کہ

لَوْ كُنْتُ أَحَدًا فِي زَمَانِ عُمَرَ مِثْلَ مَا أَحَدٌ شَكَرَ (اگر میں حضرت عمر کے زمانے میں اسی طرح حدیث روایت کرتا جیسے اب کرتا ہوں) اسی طرح حضرت سفیان کو روایت حدیث کے لیے ہاتھ دھو کر حلقہ بنا کر بیٹھنے پر یہ خیال آنا کہ اگر حضرت عمرؓ اس طرح مجمع بنا کر حدیثیں روایت کرتے ہیں دیکھ لیتے تو ضرور ہمیں سزا دیتے ان سب سے ہی مفہوم مستفاد ہوتا ہے کہ جس کثرت سے ہم اب حدیثیں بیان کرتے ہیں اسی کثرت سے اگر حضرت عمرؓ کے سامنے بیان کرتے تو ضرور سزا پاتے۔ مطلق انکار روایت کا مفہوم کسی طرح بھی ان اقوال سے سمجھ میں نہیں آتا۔ وہ واقعہ بھی جس میں ذکر ہے کہ حضرت عمرؓ نے بعض صحابہ کو حدیثیں روایت کرنے پر سزا دی تھی اور جس پر تفصیلی بحث آگے آ رہی ہے۔ یہی ظاہر کرتا ہے کہ حضرت عمرؓ کو ان حضرات سے شکایت تھی تو اس بات کی کہ وہ بہت زیادہ حدیثیں روایت کرتے ہیں۔ سزا دیتے وقت حضرت عمرؓ نے ان کی غلطی کا ذکر کرتے ہوئے صراحت کے ساتھ یہی بات کہی تھی کہ اِنَّكُمْ قَدْ اَكْثَرْتُمْ الْحَدِيثَ (تم لوگ بہت زیادہ حدیثیں روایت کیا کرتے ہو)۔ ان الفاظ کا اس کے علاوہ کوئی مطلب نکلتا ہی نہیں کہ بہ کثرت حدیثوں کی روایت سے حضرت عمرؓ منع کرتے تھے۔ حافظ ابن عبد البر نے بھی جامع بیان العلم میں ان روایتوں کا تذکرہ کر کے لکھا ہے کہ

یہ روایات ہیں بات کی دلیل ہیں کہ حضرت عمرؓ روایت حدیث میں کثرت اور زیادتی کو روکنا چاہتے تھے اور اس بات کا حکم کرتے تھے کہ روایت حدیث میں کمی کی راہ اختیار کی جائے۔

هَذَا يَدُلُّ عَلَى فَهْمِهِ عَنِ الْاَكْثَارِ  
وَأَمْرِهِ بِالْاِقْلَالِ مِنَ الرِّوَايَةِ عَنْ  
رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔

(جامع بیان العلم ص ۱۷۲)

ہر حال ان روایات سے جو منکرین حدیث کی طرف سے بار بار پیش کی جاتی ہیں ان کے الفاظ کو خواہ کسی طرح توڑ مروڑ کر لیا جائے یہ کسی طرح ثابت نہیں ہوتا کہ حضرت عمرؓ روایت حدیث سے بالکل منع کرتے تھے۔ منکرین حدیث یا تو کوئی اور ایسی روایت پیش کریں جو ان کے دعوے کو واقعی درست ثابت کر دے اور یہ یقینی بات ہے کہ وہ کوئی ایسی روایت پیش نہیں کر سکتے تو پھر انہیں یہ مان لینا چاہیے کہ ان روایات سے صرف اتنا ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ روایت حدیث کی کثرت سے منع فرماتے تھے۔ ظاہر ہے منکرین حدیث یہ بات ماننے کے لیے کبھی تیار نہ ہوں گے کیونکہ وہ اگر یہ



مان لیں تو پھر منطقی نتیجے کے طور پر انہیں یہ بھی ماننا پڑے گا کہ حضرت عمر روایت حدیث کو ناپسند نہیں فرماتے تھے اس لیے کہ آپ کے نزدیک اگر روایت حدیث ناپسندیدہ ہوتی تو پھر کمی زیادتی کی کیا بحث دونوں ہی سے رک جلنے کا حکم دیتے۔ کسی ناپسندیدہ کام کے بارے میں یہ کہنے کا تو کوئی مطلب ہی نہیں کہ اس کام کو کم کرنا ایسے موقع پر تو صاف یہ کہا جاتا ہے کہ اس کام کو مت کرنا۔ ان روایات پر تبصرہ کرتے ہوئے یہی بات حافظ ابن عبد البر نے بھی لکھی ہے۔ فرماتے ہیں:

اگر آپ مطلق روایت کو ناپسند کرتے اور برا جانتے تو زیادتی اور کمی دونوں ہی سے منع کرتے۔

ولو كره التواضع وذمها للضعف

عن الاقلالي والاكثر

(جامع بيان العلم ج ۲ ص ۱۲۲)۔

میدھی سی بات ہے معمولی تامل سے سمجھ میں آ جانے والی بات۔ اگر حضرت عمر کی نظر میں حدیث کی زوات کرنا معاذ اللہ کوئی بُرا کام ہوتا تو پھر ان روایات کا مطلب یہ نکلا کہ حضرت عمر زیادہ بُرا کام کرتے سے روک رہے ہیں لیکن مقرر اس بُرا کام کر لینے کی اجازت دے رہے ہیں بلکہ صرف اجازت ہی نہیں کہ یہ رہے ہیں کہ اس مقرر سے پُرے کام میں یوں خود بھی تمہارا شریک ہوں آخر میں امضوا وناشر یککمہ (اب جاؤ میں تمہارا ساتھی ہوں) کہنے کا تو یہی مطلب ہے۔ ذرا سوچئے تو سہی کیسی غیر معقول بات حضرت عمرؓ کی طرف منسوب کی جا رہی ہے۔

**کثرت روایت سے روکنے کی وجہ** | اب رہا یہ سوال کہ حضرت عمرؓ کثرتِ روایت ہی سے آخر کیوں منع کرتے تھے اگر حدیث

روایت کرنا کوئی نیک کام ہے تو پھر جتنا زیادہ یہ نیک کام کیا جاتا بہتر تھا حضرت عمرؓ ایک نیک کام کی انجام دہی میں کمی پر کیوں اصرار کرتے تھے تو اس کے جواب کے لیے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے وہ الفاظ کافی ہیں جو ان روایات پر بحث کرتے ہوئے انہوں نے ازالۃ الخفایں بطور تبصرہ ارشاد فرمائے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

باستقرار تام معلوم شد کہ فاروق اعظمؓ نظر دقیق را در تفریق میان احادیث کہ بہ تبلیغ شرائع و اچھی طرح تلاش و تفتیش سے معلوم ہوا کہ فاروق اعظمؓ کی دقیق نظر حدیث کے دونوں حصوں میں امتیاز

تکمیل افراد بشر حلق دارد از غیراں مصروف  
می ساخت۔ لہذا احادیث شمائل و احادیث  
سنن زوائد مدلبا کس و عادات کمتر روایت  
می کرد۔ اینہما از علوم تکلیفہ تشریحیہ نیست  
یعنی کہ چون اہتمام تام بروایت اں بکار برند  
بعض اشیاء از سنن زوائد بہ سنن ہدی  
مشتبہ می گردد۔

(ازالۃ الخفاف - ۲ ص ۱۱۱)

پیدا کرنے پر زحمت رہی یعنی وہ حصہ جو شرائع  
کی تبلیغ اور انسانی افراد کی تکمیل سے متعلق  
تھا اس میں مشغول رکھ کر دوسرے حصے میں  
انہماک سے لوگوں کو روکتے تھے اسی لیے شمائل  
نبوی سے متعلق احادیث اور سنن زوائد پر مشتمل  
احادیث جن کا تعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم  
کے لباس اور آپ کی عادات سے تھا ان کو کم  
روایت کرتے تھے چونکہ ان محدثوں کا شمار ان  
علوم میں نہیں ہے جن کا لوگوں کو مکلف بنایا گیا  
ہے اور عام تشریح و قانون کی حیثیت، ان کی  
نہیں ہے اس لیے اس کا احتمال تھا کہ اگر زیادہ  
توجہ ان کی اشاعت میں کی جائے گی تو سنن زوائد  
اور سنن ہدی آپس میں خلط ملط ہو جائیں گے۔

در اصل یہ وہی بات ہے جو اس سے پہلے حضرت  
ابوبکرؓ کے ذکر کے سنن میں عرض کی جا چکی ہے کہ یہ سب  
کچھ صرف اس لیے تھا کہ خبر احادیث زوائد میں ثبوت

## دین کے بیناتی اور غیر بیناتی حصوں میں امتیاز

کی ایسی کیفیت پیدا نہ ہونے پائے جس کی وجہ سے دین کے بیناتی حصہ کے مطالبوں کی جو  
قوت ہے وہی قوت لوگ ان روایتوں کے مطالبوں میں بھی محسوس کرنے لگیں یعنی دین کے  
بیناتی اور غیر بیناتی حصے کہیں آپس میں گڈ بڈ نہ ہو جائیں دین کے ان دونوں حصوں میں امتیاز  
پیدا کرنے کے لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ طریقہ اختیار فرمایا تھا کہ اول الذکر کی تبلیغ  
واشاعت میں عمومیت کا رنگ جس حد تک پیدا ہو سکتا تھا اس کے پیدا کرنے پر پورا زور صرف  
فرمایا اور مؤخر الذکر حصے کو پہنچانے کی حد تک تو آپؐ نے پہنچایا لیکن اس کو ہر شخص تک  
پہنچانے کی کوشش نہیں کی گئی مقصد ہی تھا کہ دین کے ان دونوں حصوں کے مطالبوں میں

قوت و صنعت کا فرق برقرار رہے جو دین میں سہولت و آسانی کے پیش نظر بہت ضروری تھا اپنے عہد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی پوری نگرانی فرمائی آپ کے بعد حضرت ابو بکرؓ نے اپنے زمانے میں اس امتیاز کو برقرار رکھنے پر پورا زور صرف فرمایا اور اب یہی غرض حضرت عمرؓ کے پیش نظر تھی جس کے لیے آپ کثرت روایت سے منع فرماتے تھے :

**کذب سے حفاظت** | اس اہم مقصد کے علاوہ ایک اور مصلحت بھی تھی جس کے پیش نظر حضرت عمرؓ کثرت روایت سے لوگوں کو منع فرماتے تھے۔ دراصل کثرت روایت کی صورت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف غلط بات منسوب ہو جانے کا اندیشہ قلت روایت کی صورت کے مقابلے میں زیادہ تھا۔ حضرت عمرؓ کو فکر یہ تھا کہ کہیں کثرت روایت کی بنا پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث میں جھوٹ سیح کی آمیزش نہ ہو جائے۔ ظاہر ہے تعداد میں کم احادیث حافظ میں آسانی سے محفوظ رکھی جاسکتی ہیں جتنی زیادہ احادیث ہوں گی اتنا ہی ان کو یاد رکھنا مشکل ہوگا اور اسی قدر بھول چوک اور غلطی کا امکان بڑھے گا۔ اس لیے بجائے اس کے کہ آدمی زیادہ سے زیادہ احادیث بیان کرنے کے شوق میں کوئی غلط بات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر دیکھے اور اپنے ہاتھوں جہنم کو اپنا ٹھکانہ بنائے بہتر یہ ہے کہ کم سے کم حدیثیں بیان کرے صحابہ کے درمیان یہ حدیث بہت مشہور تھی جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ من کذب علی متعداً فلیتبعوا مقعداً من النار (جس نے جان بوجھ کر کوئی غلط بات میری طرف منسوب کی اسے چاہیے کہ وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنائے۔ بخاری کتاب العلم) کثرت روایت سے روکتے وقت معلوم ہوتا ہے حضرت عمرؓ کے لیے یہی حدیث ایک محرک قوت کے طور پر کام کر رہی تھی۔ ایک مرتبہ کسی نے حضرت عمرؓ سے قلت روایت کے بارے میں استفسار فرمایا تو آپ نے اسی خطرے کی نشاندہی کرتے ہوئے فرمایا :

لَا آتِي أَحَدٌ أَنَّ أَرِيدَ خُفَّ | اگر مجھے یہ ڈر نہ ہوتا کہ روایت حدیث میں مجھ سے

کمی بیشی ہو جائے گی تو میں تم سے حدیث بیان کرتا۔

الحديث أو أنقص فحدثكم به .  
(انساب الاشراف للبلاذری)

اسی کمی بیشی سے ڈرتے ہوئے حضرت عمرؓ خود بھی حدیثیں کم روایت کرتے تھے اور یہی ڈر ان کو مجبور کرتا تھا کہ دوسرے لوگوں کو بھی کثرت سے حدیثیں روایت کرنے سے روکیں۔ علامہ ذہبی اسی موضوع پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

حضرت عمرؓ اس ڈر سے کہ صحابہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرنے میں غلطی نہ کریں ان کو حکم دیتے تھے کہ رسول اللہ سے روایت کم کریں۔

وَقَدْ كَانَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ  
الصَّاحِبَ عَلَى رَسُولِ اللَّهِ يَا مَعْرُومُ أَنْ يَقْلَ  
الرَّوَايَةَ عَنْ نَبِيِّهِ (تذكرة الحفاظ ج ۱ ص ۱۸۱)

**روایت میں احتیاط** | حضرت عمرؓ دراصل چاہتے یہ تھے کہ صرف ان احادیث کی روایت کی جائے جن کے متعلق راوی کو پورا اطمینان ہو کہ جو اس نے دیکھا یا سنا ہے وہی کچھ وہ بیان کر رہا ہے۔ چنانچہ بعض مرتبہ کوئی حدیث بیان کرے آپؐ مخاطبین سے کہتے کہ جس نے اس حدیث کو خوب اپنے فطے میں جمایا ہے اسے چاہیے کہ وہ جہاں جہاں جائے اس حدیث کو بیان کرتا چلا جائے۔ حافظ ابن عبد البر نے جامع بیان العلم میں لیا یہی ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ ایک بار ایک حدیث بیان کرنے کے بعد حضرت عمرؓ نے لوگوں سے مخاطب ہو کر فرمایا :

جس نے اس حدیث کو اچھی طرح حافظے میں جمایا اور اس کو سمجھ لیا اور یاد کر لیا اسے چاہیے کہ وہ اس حدیث کو ان مقامات تک بیان کرتا چلا جائے جہاں پہنچ کر اس کی سواری رک جائے مگر جسے اندیشہ ہے کہ حدیث کو پوری طرح دل میں جمائیں سکا میں اس کی یہ جائز نہ کہ وہ میری طرف جھوٹ کو منسوب کرے۔

مَنْ دَعَلَهَا وَعَقَلَهَا وَحَفِظَهَا فَلْيَحْدِثْ بِهَا  
بِمَا حِثُّ تَنْتَهَى بِهِ رَاحِلَتُهُ  
وَمَنْ خَشِيَ أَنْ لَا يَعْبَهَا نَاقِيَةً  
لَا أَحِلَّ لَهُ أَنْ يَكْذِبَ عَلَى  
(جامع بیان العلم ج ۲ ص ۱۲۱)

بات یہی ہے جسے عمرؓ کا اصل مقصود صرف ان لوگوں کو روکنا تھا جن کو اپنی یادداشت اور حافظے پر پورا اطمینان اور اعتماد نہ ہو۔ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ سے مروی وہ مشہور حدیث جس میں تین بارہ سلام کے ذریعے استیذان کے طریقے کا ذکر ہے اور جس کے روایت کرنے پر حضرت عمرؓ نے تصدیق کے لیے کسی شاہد کا مطالبہ کیا تھا۔ اس میں بھی ذکر ہے کہ اس موقع پر حضرت عمرؓ نے خاص طور سے جس بات کا ذکر کیا وہ یہی تھی کہ اگر تمہیں حدیث پوری طرح یاد ہے تو خیر ورنہ میں تم کو دوسروں کے لیے باعث عبرت بناؤں گا۔ جمع الفوائد میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا :

اگر یہ کوئی ایسی بات ہے جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سن کر تم نے یاد کر لیا تو خیر ورنہ میں تم کو دوسروں کے لیے عبرت بناؤں گا۔

إِنْ كَانَ هَذَا شَيْئًا حَفِظْتَهُ مِنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيهَا وَإِلَّا لَا جَعَلْتُكَ عِظَةً۔

(جمع الفوائد ص ۱۳۴)

حقیقت یہی ہے کہ حضرت عمرؓ کو خوف تھا تو اس بات کا کہ کہیں لوگ ان احادیث کو بھی بیان کرنے پر جری نہ ہو جائیں جو ان کو اچھی طرح محفوظ نہ ہوں یا جن کے بارے میں انہیں اپنی یاد پر پورا بھروسہ نہ ہو حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ سے ان کی روایت پر جو گواہ طلب کیا گیا تھا اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ حضرت عمرؓ کو ان پر اعتماد نہ تھا بلکہ وہ دکھانے چاہتے تھے کہ جب حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ جیسے جلیل القدر صحابی کے ساتھ ایسی سختی کا معاملہ ہے تو عام آدمی کو خود ہی سمجھ لینا چاہیے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف بے احتیاطی سے کوئی غلط بات منسوب کرنے کا کیا انجام ہو سکتا ہے۔ حضرت ابو موسیٰ نے جب حضرت ابوسعید خدریؓ کو اپنی تائید میں پیش کیا تو بعض روایتوں میں آتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کو خطاب کر کے فرمایا :

خبردار میں تم کو غلط بیانی سے متہم نہیں کرتا لیکن تمہارا ہوں کہیں لوگ غلط باتیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نہ منسوب کرنے لگیں۔

أَمَّا إِنْ لَمْ أَتِهْمَكَ وَلَكِنْ خَشِيتُ أَنْ يَقُولَ النَّاسُ عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔

غرض حضرت عمرؓ کثرتِ روایت سے اگر منع کرتے تھے تو آپ کے پیشِ نظر بھی دو مقصود تھے اول یہ کہ کثرتِ روایت کی بنا پر کہیں خبرِ احاد پر مبنی احادیث میں عمومیت کی کیفیت نہ پیدا ہو جائے اور دوم یہ کہ اس طرح نبی کریم صلی اللہ کی احادیث میں جھوٹ پرچ کی آمیزش نہ ہو جائے۔

متذکرہ بالا وضاحتوں کی روشنی میں جو لوگ حق کے طالب ہیں خداوند تعصب میں مبتلا نہیں ہیں ان پر پوری طرح یہ بات روشن ہو گئی ہوگی کہ حضرت قرظہ بن کعب والی روایت ہو یا اس کی تائید میں پیش کیے جانے والے دیگر اقوال ہوں کسی سے بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ حضرت عمرؓ بالکلہ حدیثیں روایت کرنے سے منع کرتے تھے اور اس طرح حدیث کہ معاذ اللہ دین سے خارج کر دینا چاہتے تھے :-

**روایت حدیث پر سزا** | اب رہی وہ روایت جس میں ذکر ہے کہ بعض صحابہ کو حضرت عمرؓ نے حدیثیں روایت کرنے پر سزا دی تھی تو اس کے بارے میں بعض نادان واقف حضرات کو یہ معلوم کر کے شاید حیرت ہو کہ یہ حدیث سب کے نزدیک موضوع ہے۔ حیرت کی بات ہے منکرین حدیث ایک طرف وضع حدیث کا ردنا روتے رہتے ہیں اور دوسری طرف خود ہی اپنی تائید میں موضوع احادیث سے استدلال بھی کرتے رہتے ہیں اس طرح اندھیرے میں رکھ کر عامۃ الناس کو بھی آخر تک یہ لوگ بے وقوف بنا سکیں گے حق چھپا نہیں رہتا بالآخر ان کے فریب کا پروردہ چاک ہو ہی جاتا ہے۔ یہ روایت امام ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں سعید بن ابراہیم کے حوالے سے نقل کی ہے کہ ان کے والد ابراہیم کہتے تھے۔

حضرت عمرؓ نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ حضرت ابوالدرداءؓ اور حضرت ابوسعود انصاریؓ تین آدمیوں کو مجبوس کر دیا تھا اور کہا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تم نے بہت زیادہ حدیثیں بیان کرنا شروع کر دی ہیں۔

اَنْ عَمْرٍو جَسَّ ثَلَاثَةً ابْنَ مَسْعُودٍ  
وَابَا الدَّرْدَاءِ وَابَا مَسْعُودٍ الْاَنْصَارِيَّ  
فَقَالَ اِنَّكُمْ قَدْ اَكْثَرْتُمْ الْحَدِيثَ  
عَنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ -  
(تذکرۃ الحفاظ جلد ۱)۔

علامہ ابن حزم ظاہری جو روایت بالحدیث اور تمسک بالحدیث میں ایک منفرد مقام رکھتے ہیں اس روایت کا تجزیہ کرتے ہوئے اس کی سند کو ناقابل اعتبار قرار دیتے ہیں اور اس کے نفس مضمون کو کذب و افتراء سے تعبیر کرتے ہیں۔ ان کے الفاظ ہیں :

یہ روایت فی نفسہ کذب اور افتراء کا  
نمونہ ہے۔

إِنَّ الْخَبَرَ فِي نَفْسِهِ ظَاهِرُ الْكُذْبِ  
وَالْتَعْلِيلِ - (کتاب الاحکام جلد ۳)

اس روایت کو علامہ نے سند کے لحاظ سے منقطع قرار دیا ہے اس لیے کہ اس کے اصل راوی ابراہیم بن عبد الرحمن کا سماع حضرت عمر سے ثابت نہیں امام بیہقی نے بھی یہی لکھا ہے۔ ابراہیم بن عبد الرحمن ۹۵ھ یا ۹۹ھ میں بعمر ۷۵ سال فوت ہوئے بنابرین وہ ۱۰۰ھ میں خلافت فاروقی کے اواخر میں پیدا ہوئے ظاہر ہے اس قدر چھوٹی عمر میں حضرت عمر سے انہوں نے کیسے یہ روایت سنی ہوگی اس کے علاوہ سوچنے کی بات ہے اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ حضرت عمرؓ نے بعض صحابہ کبار کو صرف اس لیے قید کر دیا تھا کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں روایت کرتے تھے تو لازم آتا ہے کہ ہم یہ بھی تسلیم کریں کہ حضرت عمرؓ معاذا اللہ دین کی تبلیغ سے زبردستی روکتے تھے اور احکام دین کو لوگوں سے چھپانا چاہتے تھے۔ کتنی غیر معقول بات ہے یہ۔ کسی عام مسلمان سے اس کی توقع نہیں کی جاسکتی چہ جائیکہ حضرت عمرؓ جیسے اولوالعزم خلیفہ رسول کی طرف اس کی نسبت کی جائے۔ اس کے علاوہ یہ کیسے ممکن ہے کہ حضرت عمرؓ حضرت عبداللہ بن مسعود کو ”علم سے بھرا ہوا ایک طرف“ بھی کہتے جائیں اور پھر اسی بات پر ان کو قید کی سزا بھی دیں کہ انہوں نے اس علم کو دوسروں تک کیوں پہنچایا ہمارا اشارہ اس روایت کی طرف ہے جو طبقات ابن سعد میں زید بن وہب سے نقل کیا گیا ہے اور جس میں ذکر ہے کہ وہ حضرت عمرؓ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے اتنے میں ایک دہلا پتلا آدمی آیا تو اس کو دیکھ کر حضرت عمرؓ نے تین بار یہ بات دہرائی کہ ”یہ ایک طرف ہے علم سے بھرا ہوا“ اور وہ آنے والا شخص حضرت عبداللہ بن مسعودؓ تھے۔

حضرت عمرؓ حضرت عبداللہ ابن مسعود کو انتہائی عزیز رکھتے تھے۔ ایک موقع پر اپنے ایک عامل کی طرف کسی ضرورت سے ان کو روانہ فرمایا تو عامل کے نام خط میں لکھا کہ میں عبداللہ بن مسعود کو اپنے پاس رکھنے کی بجائے تمہارے پاس بھیجنے میں بڑے ایشیاء سے کام لے رہا ہوں کیا ایسے عزیز اور محبوب شخص کو حضرت عمرؓ محض اس جرم میں قید میں ڈال دیتے کہ وہ لوگوں سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں بیان کرتا ہے اسی طرح حضرت ابوالدرداء کے بارے میں ہم جانتے ہیں کہ ان کو حضرت عمرؓ نے شام میں مسلمانوں کا معلم مقرر کیا تھا۔ ایک طرف ان کو علم سکھانے پر مقرر کیا جا رہا ہے اور دوسری طرف اسی علم کو لوگوں کے سامنے بیان کرنے پر ان کو قید کیا جا رہا ہے۔ منکرین حدیث خدا را کچھ تو سوچیں یہ کیا عملی تضاد ہے جو حضرت عمرؓ جیسے جلیل القدر صحابی کی طرف منسوب کیا جا رہا ہے۔

اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی غور کرنے کی ہے کہ اگر حدیثیں روایت کرنے پر سزا دینا مقصود تھا تو حضرت عمرؓ سب سے پہلے ان لوگوں کو سزا دیتے جن کی مرویات سینکڑوں اور ہزاروں سے متجاوز ہیں بڑے تعجب کی بات ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ رضوان اللہ علیہم اجمعین جیسے مکثرین صحابہ کو حضرت عمرؓ کچھ نہیں کہتے اور قید میں ڈال دیتے ہیں تو بے چارے حضرت ابوالدرداءؓ اور ابومسعود انصاریؓ جیسے اصحاب کو جن کی مرویات کی تعداد سو دو سو سے آگے نہیں بڑھتی اور جو بے چارے متوسطین میں بھی نہیں مقبلین میں شمار ہوتے ہیں۔

غرض کسی معمولی سمجھ بوجھ رکھنے والے کی بھی سمجھ میں یہ بات کسی طرح نہیں آتی کہ حضرت عمرؓ نے محض اس بنا پر بعض صحابہ کو قید کر دیا تھا کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں روایت کیا کرتے تھے لہذا متذکرہ روایت کے بارے میں علامہ ابن حزمؒ ظاہری کے یہ الفاظ بالکل معنی برحقیت ہیں کہ ان الخبیر فی نفسه ظاہر الکذب والتلید (یہ خبر فی نفسه کذاب و اخترا کا نمونہ ہے)۔



البتہ یہ ممکن ہے کہ اس روایت میں جَبَسَی کا لفظ قید کرنے کے معنی میں نہیں بلکہ روک دینے کے معنی میں استعمال ہوا ہو اس صورت میں ہم کم از کم درایت کے اعتبار سے اس روایت کو قابل قبول قرار دے سکتے ہیں۔ ایسی صورت میں اس روایت کو بھی پھر انہی روایات کی قبیل سے تصور کیا جائے گا جن میں ذکر ہے کہ حضرت عمرؓ نے بعض اصحاب کو کثرت روایت سے روک دیا تھا۔ اس روایت کے الفاظ بھی ہمارے اس خیال کی تائید کرتے ہیں اِنکُمۃٌ قد اکثرتمۃ الحدیث کا یہی مطلب تو ہے کہ تم نے حدیثوں کے بیان کرنے میں اکثر کی راہ اختیار کی ہے اس لیے بہتر یہی ہے کہ اب تم حدیث روایت ہی نہ کیا کرو۔ یہ الیا ہی ہے جیسے کہا جائے کہ غلال کام میں چونکہ تم سے احتیاط نہیں برتی جاتی اس لیے اس سے تو اچھا ہے تم وہ کام کہو ہی مت ۝

**مکتوب ذخیرے جلاتا** | عتقر یہ ہے کہ منکرین حدیث کی طرف سے پیش کی جانے والی کسی روایت سے بھی نذیرہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت

عمرؓ روایت حدیث سے بالکلہ منع کرتے تھے اور نہ ہی یہ ثابت ہوتا ہے کہ آپ نے حدیثیں روایت کرنے پر بعض صحابہ کو قید کر دیا تھا۔ اس کے بعد اب ہم اس روایت کا جائزہ لیتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے اپنے زمانے میں احادیث کے مکتوب ذخیرے منگو کر ان کو جلا دیا تھا۔ اس سلسلے میں عموماً جو روایت پیش کی جاتی ہے اس کو ابن سعد نے قاسم بن محمد کے حوالہ سے طبقات میں ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا ہے :

إِنَّ الْأَحَادِيثَ قَدْ كَثُرَتْ عَلَى عَهْدِ  
عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ فَأَلْشَدَّ النَّاسَ  
أَنْ يَأْتَوْا بِهَا فَلَمَّا آتَوْا بِهَا أَمَرَ  
بِتَحْرِيقِهَا.

حضرت عمر بن خطاب کے زمانے میں حدیثوں کی بھر  
کثرت ہو گئی تب حضرت عمرؓ نے لوگوں کو قسیمی دے  
دے کر حکم دیا کہ ان حدیثوں کو ان کے سامنے پیش کریں  
جب لوگوں نے پیش کر دیا تو آپ نے ان کو جلانے کا  
حکم دے دیا۔

(طبقات ج - ۵)

**منکرین حدیث کا استدلال** | اس روایت کے سلسلے میں بنیادی بات غور کرنے کی  
یہ ہے کہ حدیثوں کے نذیرہ انش کرنے کے اس

واقعہ سے منکرین حدیث جو نتیجہ نکالتے ہیں کیا وہ درست ہے۔ منکرین حدیث کا کہنا یہ ہے کہ حضرت عمرؓ احادیث بنویہ کو محفوظ کرنے کے اس قدر مخالف تھے کہ جن لوگوں کے پاس لکھی ہوئی حدیثیں پائی گئیں ان سب کو منگوا کر آپؐ نے نذرِ آتش کر دیا اور پھر اسی پر اپنی طرف سے ایک نتیجہ مرتب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس سے ثابت ہوا کہ حضرت عمرؓ حدیث بنویہ کو دین میں حجت نہیں سمجھتے تھے :-

**حدیث کی مخالفت نہیں حمایت** | جہاں تک حضرت عمرؓ کے نزدیک حدیث کے دین میں حجت سمجھے جانے کا تعلق ہے اس پر تفصیلی بحث

حضرت عمرؓ سے متعلق گفتگو کی ابتدا کرتے وقت گزر چکی ہے اس وقت تو صرف یہ ثابت کرنا ہے کہ حدیثوں کے نذرِ آتش کر دینے کے اس واقعے سے حفاظت حدیث کی مخالفت نہیں حمایت ثابت ہوتی ہے منکرین حدیث جو کچھ کہہ رہے ہیں معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے حضرت عمرؓ حفاظت حدیث کے مخالف نہیں زیر دست داعی تھے۔

اس سلسلے میں منکرین حدیث کی توجہ پہلے اس روایت کی طرف مبذول کرانا مناسب معلوم ہوتا ہے جس کو بیہقی نے مدخل میں اور ابن عبد البر نے جامع بیان العلم میں عروہ بن زبیر کی زبانی نقل کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں :

حضرت عمرؓ نے احادیث بنویہ کی کتابت کا ارادہ فرمایا تو انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابیوں سے اس سلسلے میں مشورہ طلب کیا سب نے بالاتفاق یہی مشورہ دیا کہ احادیث بنویہ کی کتابت کرانی چاہیے۔ اس کے بعد حضرت عمر ایک ماہ تک اللہ تعالیٰ سے اس بارے میں استخارہ کرتے رہے ایک دن صبح کو اٹھے اور اس وقت تک حق تعالیٰ نے فیصلہ کی یکسوئی عطا فرمادی تھی تو فرمایا میں نے حدیثوں کو قلم بند کرنے کا ارادہ کیا تھا لیکن مجھ کو گزشتہ

أَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ أَرَادَ أَنْ يَكْتُبَ السُّنَنَ فَاسْتَشَارَ فِي ذَلِكَ أَصْحَابَ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَأَشَارُوا عَلَيْهِ أَنْ يَكْتُبَهَا فَطَفِقَ عُمَرُ بِسُخْرِ اللَّهِ فِيهَا شَهْرًا ثُمَّ أَصْبَحَ يَوْمًا وَقَدْ عَزِمَ اللَّهُ لَهُ فَقَالَ إِنْ خُتَّ كُنْتُ أَرِيدُ أَنْ أَكْتُبَ السُّنَنَ وَإِنْ خُتَّ ذَكَرْتُ قَوْمًا كَانُوا قَبْلَكُمْ كَتَبُوا كِتَابًا

نَاكِبًا عَلَيْهِمَا وَتَرَكَوْا كِتَابَ اللَّهِ وَ  
الْحَقُّ لَا اسْتَوْبَ كِتَابَ اللَّهِ بِشَيْءٍ  
ابداً۔ (جامع بیان العلم ص ۳۳)

قوموں کا خیال آیا کہ انہوں نے کتاب لکھی اور اسی  
پر ٹوٹ پڑیں اور اللہ کی کتاب کو چھوڑ بیٹھیں  
کی قسم میں اللہ کی کتاب کے ساتھ کسی اور چیز کا  
ملا نا پسند نہیں کرتا۔

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے ایک بار حادثہ بنویہ کو قلم بند کرانے کا  
ارادہ کیا تھا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ اگر حفاظت حدیث کے مخالف تھے تو پھر امارت  
بنویہ کو قید تحریر میں لانے کا خیال ہی آپ کو کیوں آیا اور اس خیال کو آپ نے اتنی اہمیت  
کیوں دی کہ اسے صحابہ کی مجلس کے سامنے پیش کیا اس پر بھی اطمینان نہ ہوا تو مہینہ بھر  
تک استخارہ کرتے رہے۔ کسی چیز کو قید تحریر میں لانے سے مقصود اس کی حفاظت کرنا  
ہوتا ہے یا اس کو ضائع کرنا؟ انکار حدیث کی تو ساری عمارت ہی کتابت و عدم کتابت  
کے فرق پر استوار کی گئی ہے منکرین حدیث کے نزدیک تو حفاظت کا ذریعہ ہے ہی صرف  
کتابت تو پھر بتلائیے حضرت عمرؓ کتابت حدیث کرنا چاہتے تھے تو حفاظت مقصود تھی یا  
نہیں۔ ہاں البتہ اب بات سوچنے کی یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے اپنے اس ارادے کو عملی  
جامہ کیوں نہیں پہنایا جبکہ دیگر صحابہ کا بھی یہی مشورہ تھا کہ احادیث بنویہ کو قلم بند کر لیا  
جائے بس یہی ہے وہ سوال جس کے جواب کی روشنی میں اصل حقیقت واضح ہوتی ہے اور  
حدیثوں کے نذر آتش کرنے کا اصل مقصود کھل کر سامنے آتا ہے :

قرآن اور حدیث میں امتیاز

کہ کہیں قرآن اور حدیث آپس میں خلط ملط نہ ہو جائیں واللہ لا استوب کتاب اللہ بشیء  
ابداً (خدا کی قسم میں کتاب اللہ کے ساتھ کسی چیز کی آمیزش نہ ہونے دوں گا) کہہ کر حضرت عمرؓ نے  
در اصل اسی مفہوم کو ادا کیا ہے جس کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر جنس صحابہ کو کتابت  
حدیث سے روکتے ہوئے کتابت مع کتاب اللہ کے الفاظ سے ادا کیا تھا بلکہ بعض روایتوں

میں حضرت عمرؓ کے الفاظ بالکل الفاظ نبویہ سے ملتے جلتے ہیں آپ فرماتے ہیں لا کتاب مع کتاب اللہ (اللہ کی کتاب کے ساتھ کوئی کتاب نہیں) گو ہا حدیث کی حفاظت تو مقصود ہے مگر ان تمام روایتوں کے ساتھ مقصود ہے جن کی بطور خاص نگرانی بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے عہد میں فرماتے رہے اور جن کو باقی رکھنے میں حضرت ابو بکرؓ نے اپنے زمانے میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کیا یعنی حدیث کی حفاظت تو ہو مگر اس طرح کہ قرآن اور حدیث آپس میں خلط ملط نہ ہونے پائیں۔ قرآن اور وہ احادیث جو قرآن کے عملی مطالبات کی تشکیل اور اسی نوعیت کے دوسرے بنیاتی احکام پر مشتمل ہیں وہ عام احادیث سے ہمیشہ نمیز اور علیحدہ رہیں گویا اس بات کا پورا اہتمام رہے کہ دین کا وہ حصہ جو تواتر و تعامل اور توارث کی دولت سے مالا مال ہے وہ دین کے اس حصے سے خلط ملط نہ ہوتے پائے جس کی بنیاد وہ احادیث ہیں جن کو قصداً اور امداداً دین میں سہولت کے پیش نظر انفرادی معلومات تک محدود رکھا گیا ہے۔ حضرت عمرؓ اگر اپنی نگرانی میں بلکہ دوسرے لفظوں میں اگر اپنی خلافت و حکومت کی جانب سے حدیثوں کو قلم بند کرا جاتے تو یہ بنیاداً مقصد فوت ہو جاتا، ظاہر ہے حضرت عمرؓ کے ہاتھوں مرتب شدہ مجموعے میں جو حدیثیں مندرج ہو یا تیں ان کے نتائج کے مطالبے اور گزشت کی وہ نوعیت قطعاً باقی نہ رہتی۔ جو اس وقت خبر احاد کی حدیثوں سے پیدا ہونے والے نتائج کی ہے۔ حضرت عمرؓ کا مرتب شدہ وہ مجموعہ اگر آج موجود ہوتا تو ذرا اندازہ لگائیے اس مجموعے کی حدیثوں کے ساتھ اور ان حدیثوں سے پیدا ہونے والے احکام و قوانین کے ساتھ مسلمانوں کی عقیدت و گرویدگی کا کیا عالم ہوتا۔ اس مجموعے کے متعلق مسلمانوں میں وہ احساس قطعاً باقی نہ رہتا جسے بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خبر احاد کی روایتوں میں رکھنا چاہتے تھے۔ حضرت عمرؓ کے پیش نظر یہی خطرہ تھا جس کے انسداد کے لیے انہوں نے اگرچہ پہلے خود ہی یہ تجویز رکھی کہ احادیث بنویہ قلم بند کر لی جائیں مگر پھر خود ہی اپنی اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے سے باز رہے۔

**صحابہ سے مشورہ** | اس سلسلے میں صحابہ سے مشورہ کرنا بھی یہی بتلاتا ہے کہ جس

وقت حفاظت حدیث کے مقصد کے پیش نظر حضرت عمرؓ یہ سوچ رہے تھے کہ احادیث قلم بند کرالی جائیں اس وقت بھی آپ کے ذہن میں یہ خطرہ موجود تھا اور نہ سوچنے کی بات ہے نیک کام میں مشورے کی کیا ضرورت۔ حضرت عمرؓ دریافت یہ کرنا چاہتے تھے کہ کیا اس مصلحت کی رعایت کرنا اب بھی ضروری ہے جس کے پیش نظر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر احاد کی حدیثوں کی تبلیغ میں بجائے عمومیت کے خاص خاص افراد تک ان کے علم کو محدود رکھا تھا اور خود حضرت عمرؓ بھی شروع شروع میں اسی مصلحت کی بنیاد پر حدیثوں کے بیان کرنے میں اقلال اور کمی پر اصرار کرتے رہے تھے۔ ظاہر ہے یہ مصلحت وقتی تھی بنوت اور بنوت سے قریب تر زمانوں میں اگر ان حدیثوں میں عمومیت کا رنگ پیدا ہو جاتا تو یقیناً آئندہ زمانے میں ان حدیثوں کے مطالبات میں زیادہ سختی پیدا ہو جاتی جو شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام کا مقصود نہ تھا۔ مگر بعد کے زمانے میں ان حدیثوں میں عمومیت کا رنگ پیدا ہونے سے اس خطرے کا کوئی امکان نہ تھا۔ حضرت عمرؓ کے سامنے مشورہ طلب امر یہی تھا کہ وہ زمانہ گزر گیا ہے یا ابھی ان اباب کی مزاحمت کے سلسلے کو جاری رکھنے کی ضرورت ہے جس سے ان حدیثوں کے مطالبات میں شدت کے پیدا ہونے کا خطرہ پیش آ سکتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے صحابہ کی اس مجلس شوریٰ نے یہ خیال کرتے ہوئے کہ اب وقت خاصا گزر گیا ہے اور اب اگر احادیث قید تحریر میں آکر مسلمانوں کی ایک نسل سے دوسری نسل میں منتقل بھی ہوتی رہیں تو عمومیت اور قطعیت میں اپنے اصل مقام سے بلند نہ ہو جائیں گی یہی مشورہ دیا کہ حضرت عمرؓ اپنی تجویز پر عمل کرتے ہوئے احادیث بنویہ کو قلم بند کرائیں مگر حضرت عمرؓ کو شرح صدر نہ ہوا۔ ان کی نظر میں ابھی خطرہ موجود تھا چنانچہ جبکہ حضرت عروہ بن زبیر سے منقول محولہ بالا روایت میں ذکر ہے حضرت عمرؓ نے اس معاملے میں اللہ سے استخارہ کیا اور کامل ایک مہینے تک استخارہ کرتے رہے بالآخر اللہ نے اس مسئلے کے تمام پہلوؤں کو اور جن خطرات کا اندیشہ تھا ان کے تمام گوشوں کو نئے سرے سے تازہ کر کے آپ کے سامنے پیش کر دیا اور آپ کے

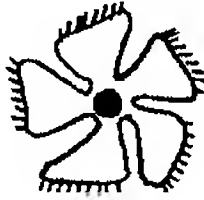
دل میں یہ عزم راسخ پیدا کر دیا کہ اپنی خلافت و حکومت کی نگرانی میں احادیث کو قلم بند نہ کرایا جائے۔ مگر معلوم ہوتا ہے لوگ انفرادی طور پر حدیثیں پھر بھی قلم بند کرتے رہتے تھے تاکہ اچھے خاصے مجموعے مختلف افراد کے ہاتھوں تیار ہو گئے جیسا کہ اس روایت کے الفاظ سے ظاہر ہے جو طبقات ابن سعد کے حوالے سے حدیثوں کے نذر آتش کر دینے کے واقع کے ضمن میں ابھی پیش کی گئی ہے اس روایت کے الفاظ ہیں **إِنَّ الْأَحَادِيثَ تَذْكَرُتُ عَلَى عَهْدِ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ فَأَلْشَدَّ النَّاسُ أَنْ يَأْتَوْهُ بَهَا** (حضرت عمر بن خطابؓ کے زمانے میں حدیثوں کی پھر کثرت ہو گئی تو حضرت عمرؓ نے لوگوں کو قسمیں دے دے کر حکم دیا کہ ان حدیثوں کو ان کے سامنے پیش کریں) ان تمام مجموعوں کو منگا کر حضرت عمرؓ نے انہیں جلا دیا۔ گویا استخارے کے بعد آپؐ نے خود تو حدیثیں لکھوانے کا ارادہ ترک کر ہی دیا تھا لیکن لوگوں کے بارے میں آپؐ شرمندہ میں کچھ دھیل سے کام لیتے رہے لہذا میں آپؐ کو خیال آیا ہو گا کہ خلافت و حکومت کی طرف سے نہ سہی انفرادی طور پر ہی سہی جو تحریر بھی مرتب ہو گئی وہ عہد فاروقی ہی کی طرف نسبت کی جائے گی اور اس طرح متذکرہ خطرہ جو کاتوں پر قرار رہا ہے گا لہذا اس خطرے کا پوری طرح ہی سد باب کیوں نہ کر دیا جائے چنانچہ

فَلَمَّا أَتَوْهُ بَهَا مِنْ تَحْوِيلِهَا۔ جب وہ مجموعے لئے گئے تو آپؐ نے انہیں جلاتے کا حکم دے دیا۔

اب اس سارے پس منظر میں حدیثوں کے نذر آتش کیے جانے کے واقعہ کو دیکھیں تو ہمارے اس دعویٰ کی حقیقت پوری طرح کھل کر سامنے آ جاتی ہے کہ اس واقعے سے حفاظت حدیث کی مخالفت نہیں حمایت ثابت ہوتی ہے۔ حدیثوں کے مکتوب مجموعے نذر آتش کر کے حضرت عمرؓ نے فی الواقع حفاظت حدیث کا فریضہ انجام دیا اگر حضرت عمرؓ یہ کام نہ کرتے تو جن رعایوں کے ساتھ حدیث کی حفاظت مقصود تھی وہ پوری نہ ہوتی اور حفاظت حدیث کا اصل مقصد ہی فوت ہو جاتا۔

کتنی حیرت اور تعجب کا مقام ہے کہ وہ کام جو خدمت حدیث کے طور پر پیش

کیے جانے کے قابل ہیں منکرینِ حدیث کی طرف سے مخالفتِ حدیث کے ثبوت میں پیش کیے جاتے ہیں بہر حال ہمارے تائیدین پر توبہ بات پوری طرح واضح ہو گئی ہوگی کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہوں یا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ دونوں اصحاب نے اپنے اپنے زمانے میں حدیث کی حفاظت میں کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہیں کیا اس حقیقت پر پردہ ڈالنے کے لیے منکرینِ حدیث کی طرف سے جو اتہام طرازی اور بہتان تراشی حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے بارے میں کی جاتی ہے وہ سادہ لوح نادانِ حال مسلمانوں کو گمراہ کرنے کی ناکام کوشش سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتی ۔



# حفاظت حدیث اور خلفائے راشدین

حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کی طرف منسوب کیے جانے والے الزامات کی اصل حقیقت واضح ہو جاتے کے بعد اب ہم مختصر طور پر ان خدشات کا ذکر کرنا چاہتے ہیں جو حفاظت حدیث کے سلسلہ میں حضرت ابوبکر و عمر اور حضرت عثمان و علی چاروں خلفائے راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اپنے اپنے عہد میں انجام دیں :-

**حفاظت حدیث اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ** | سب سے پہلے حضرت ابوبکر کا نمبر آتا ہے۔ آپ کی خلافت کا زمانہ اگرچہ مدت کے لحاظ سے ایک بہت ہی مختصر زمانہ ہے یعنی صرف ڈھائی سال اور یہ ڈھائی سال بھی ایسے کہ مختلف قسم کے فتنہ و فساد اور قسم قسم کی شورشوں سے بھرپور۔ اندرون عرب بھی عدم استحکام کی سی صورت اور بیرونی خطرات کا بھی سامنا مگر اس مقصودی سی مدت میں ہی اور ان تمام مشکلات کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ حفاظت حدیث کے لیے جس بنیادی کام کی اس وقت ضرورت تھی حضرت ابوبکر نے اسے باحسن وجہ انجام دیا۔ اس سلسلے میں حضرت ابوبکر کے تین اصولی اقدامات کا تذکرہ کتابوں میں پایا جاتا ہے۔

**رفع اختلاف** | اول یہ کہ آپ نے اس بات کی بطور خاص نگرانی کی کہ وہ احادیث جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کی سہولت پسندانہ خصوصیت کو برقرار رکھنے کی خاطر اپنے محتاط طرز عمل کے ذریعے انفرادی معلومات تک محدود رکھا ہے



وہ بدستور انفرادی معلومات تک محدود رہیں اور ان کی روایت اس طور پر نہ کی جائے جس سے وہ قدرتی اور فطری اختلافات جو امت کی سمولت کے پیش نظر ان احادیث میں موجود ہیں وہ ارادی اور اختیاری مخالفتوں میں تبدیل ہو کر امت کے لیے زحمت اور تنگی کا سبب بن جائیں۔ حضرت ابوبکرؓ نے اسی قسم کی روایات کے سلسلے میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ایک قاعدہ کلمہ کے طور پر یہ بات لوگوں کے ذہن نشین کرادی کہ احادیث بنوہ کا صحیح استعمال یہ نہیں ہے کہ ان کے متعلق جس شخص کے پاس جو معلومات ہیں وہ ان کی پابندی کا خوا مخواہ دوسروں سے مطالبہ کرے بلکہ صحیح مسلک ان اختلافات کے متعلق جو اس قسم کی حدیثوں میں پائے جاتے ہیں یہ ہے کہ امت مسلمہ کا ہر فرد ایک دوسرے کے قدرتی و فطری اختلافات کو برداشت کرنے کی صلاحیت اپنے اندر پیدا کرے اور اگر کوئی شخص ارادی مخالفتوں کی آگ بھڑکاتے کے لیے ڈھونڈ ڈھونڈ کر ایسی احادیث بیان کرے جو دین کے طریقوں کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے مختلف نظیروں کی حامل ہوں تو اس کو خاموشی کرانے کے لیے فوراً یہ کہا جائے کہ ان تمام نظیروں کے بنیادی اصول و کلیات قرآن کی شکل میں ہمارے پاس محفوظ ہیں جو پوری امت مسلمہ کو اتفاقی نقطے پر سمیٹنے کے لیے بہت کافی ہیں حضرت ابوبکرؓ کی جانب سے حفاظت حدیث کے لیے کی جانے والی اس پہلی بنیادی خدمت کی پوری کیفیت اور اس پر سیر حاصل تبصرہ گذشتہ اوراق میں گزر چکا ہے تاہم اس پر دوبارہ نظر ڈالیں۔

**دین کے بنیاتی و غیر بنیاتی حصوں کا امتیاز**

دوسری بنیادی خدمت جو حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھوں حفاظت حدیث کے سلسلے میں انجام پائی یہ ہے کہ آپ نے پانچ سو احادیث کا ایک مجموعہ جو قریب قریب مرطا امام مالک کی مرفوع احادیث کی تعداد کے برابر ہے اپنے ہاتھ سے لکھ کر تیار کیا مگر پھر سنت بنوی اور مصلحت پیغمبری کی تجدید کرتے ہوئے اس مجموعہ کو اپنے ہاتھوں ہی جلا کر اس

ساحہ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے مسوٰی شرح مؤطا میں ابن حزم کا جو قول نقل کیا ہے اس کے مطابق مؤطا امام مالک میں مرفوع حدیثوں کی کُل تعداد پانچ سو سے کچھ اوپر ہے۔

خطرے کا دروازہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند کر دیا کہ دین کا وہ حصہ جو قرآن اور قرآن کی عملی تشکیلات پر مشتمل ہے یعنی وہ حصہ جو تواتر و توارث اور تعامل صحابہ کی دولت سے مالا مال ہے وہ دین کے اس حصے سے غلط ملکہ نہ ہو جائے جس کی بنیاد وہ احادیث ہیں جن کو قصداً اور اراداً دین میں سہولت کے پیش نظر انفرادی معلومات تک محدود رکھا گیا ہے۔ دین کے دونوں حصوں کے مطالبوں میں قوت و ضعف کو برقرار رکھنے کے لیے جو طرز عمل عہد نبوت میں اختیار کیا گیا تھا اسی طرز عمل کی تجدید حضرت ابوبکر نے اپنے زمانے میں اس طرح فرمائی کہ پہلے احادیث کا مجموعہ خود اپنے ہاتھوں تحریر فرمایا اور پھر اپنے ہی ہاتھوں اسے نذر آتش کر دیا۔ حضرت ابوبکر کی اس خدمت پر بھی تفصیلی بحث گذشتہ اوراق میں گزر چکی ہے۔

**اصول شہادت کی بنیاد** | حفاظت حدیث کے سلسلے میں تیسری بنیادی خدمت حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے یہ انجام دی کہ اپنے

تحقیق حدیث کے لیے اصول شہادت کی بنیاد قائم فرمائی آپ نے اپنے طرز عمل سے اس بات کو ایک اصول کے طور پر پیش کیا کہ ہر وہ بات جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر دی جائے محض منسوب ہو جانے کی وجہ سے قابل قبول نہیں ہو جاتی بلکہ چھان بین اور تحقیق و تفتیش کے بعد یقین حاصل کرنا ضروری ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اس بات کو منسوب کرنے میں کسی غلط بیانی یا سہو کا دخل نہیں ہے۔

اس بات کو اصول کے طور پر پیش کرنے میں حضرت ابوبکرؓ کا طرز عمل کیا تھا اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے جس میں ذکر ہے کہ ایک مرتبہ حضرت ابوبکرؓ کی خدمت میں ایک خاتون نے آکر اپنے پوتے کے چھوڑے ہوئے ترے میں اپنے حصے کی میراث کا مطالبہ کیا۔ اب مشکل یہ پیش آئی کہ قرآن تو اس مسئلے میں خاموش تھا ہی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی ارشاد بھی حضرت ابوبکرؓ کو اس بارے میں معلوم نہ تھا چنانچہ آپ نے لوگوں سے دریافت فرمایا حضرت مغیرہؓ کھڑے ہوئے اور فرمایا میں نے سنا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دادی کو چھٹا حصہ دلواتے تھے حضرت ابوبکرؓ نے یہ سن کر فرمایا کیا تمہارے علاوہ بھی کوئی اس پر شاہد ہے اس پر محمد بن مسلمہ نے شہادت دی ان کی شہادت پر حضرت ابوبکرؓ نے اس خاتون کو چھٹا حصہ

دلوادیا۔ اپنے اس طرز عمل سے گویا حضرت ابوبکر نے یہ بات بتلا دی کہ اخبار احاد کے رد و قبول میں لا پرواہی سے کام نہ لینا چاہیے۔ اس واقعہ کا تذکرہ کرتے ہوئے حافظ شمس الدین ذہبی تذکرۃ الحفاظ میں لکھتے ہیں:

وكان (ای ابوبکر) اول من احتاط  
في قبول الاخبار فروي ابن  
شهاب عن قبيصة بن ذؤيب  
انَّ الجَدَّةَ جَارَتِ الْحَبِيبِ  
تَلَمَّسُ ان تورث فقال ما  
اجد لك في كتاب الله شيئاً  
وما علمت ان رسول الله صلى  
الله عليه وسلم ذكر لك شيئاً  
ثمَّ سأل النَّاسَ فقام المغيرة فقال  
سمعت رسول الله صلى الله عليه  
وسلم يعطيها السدس فقال  
له هل معك احد فشهد  
محمد بن مسلمة لمثل ذلك  
فانفذها لها۔

(تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۳)

سب سے پہلے شخص جنہوں نے قبول روایت میں احتیاط کا طریقہ جاری کیا وہ ابوبکر صدیق ہیں جیسا کہ زہری بن شہاب نے قبیصۃ بن ذؤیب سے روایت کیا ہے کہ ایک عادی اپنے پوتے کی میراث مانگتے حضرت ابوبکر کے پاس آئی حضرت ابوبکر نے فرمایا میں تیرے بارے میں نہ تو کتاب اللہ میں کوئی حکم پاتا ہوں اور نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی فرمان اس بارے میں مجھے معلوم ہے پھر آپ نے لوگوں سے دریافت کیا تو حضرت مغیرہؓ اٹھ کھڑے ہوئے اور عرض کیا کہ میں نے سنا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عادی کو چھٹا حصہ دلاتے تھے حضرت ابوبکر نے فرمایا کیا تمہارے ساتھ اسی پر کوئی اور بھی شاہد ہے تو محمد بن مسلمہ نے اس پر شہادت دی اپنے ان کی شہادت پر عادی کو چھٹا حصہ دلوادیا۔

حافظ ذہبی نے واقعی سچ کہا قبول روایت میں احتیاط کا یہ طریقہ جاری کرنے والے پہلے آدمی حضرت ابوبکر ہی ہیں بعد کے زمانوں میں احادیث کے لیے چھان بین، تحقیق و تلاش اور تنقید و تمیص کے جتنے علوم وجود میں آئے ان سب کا منبع حضرت ابوبکر کے جاری کردہ اسی چشتے سے پھوٹا نظر آتا ہے اسی طرح بعد کے زمانوں میں روایتوں میں قوت پیدا کرنے کے لیے

محدثین کے درمیان توابع و شواہد کو جمع کرنے کا جو عظیم الشان سلسلہ جاری ہوا اس کی ابتدا گویا اسی دن ہو گئی تھی جس دن حضرت ابوبکر کی زبان سے اہل معادہ کے الفاظ نکلے تھے اور حضرت محمد بن مسلمہ نے کھڑے ہو کر حضرت میسرہ کی بیان کردہ روایت کے لیے اولین متابعت و شہادت مہیا کر دی تھی۔

**شہادت کی اصل حقیقت** | مگر اس سے یہ نتیجہ نکالنا درست نہ ہو گا کہ جس طرح انصاف خصوصیات کے لیے کم از کم دو گواہوں کا ہونا ضروری

ہے اسی طرح قبول حدیث کے لیے بھی حضرت ابوبکر کے اس طرز عمل نے کم از کم شہادت کا انصاف دو مقرر کر دیا ہے اس لیے کہ خود حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے متعدد روایتیں ایسی مروی ہیں جن کے تنہا وہی راوی ہیں جیسے خدک کی تقسیم کے مطالبے پر انبیاء کی میراث سے متعلق روایت یا وہ روایت جس میں ذکر ہے کہ جس جگہ اللہ کے نبی کی روح قبض ہوتی ہے اسی جگہ اس کو دفن کیا جاتا ہے۔ یہ دونوں حدیثیں تنہا حضرت ابوبکر سے ہی مروی ہیں اور کون نہیں جانتا کہ ان دونوں حدیثوں کی بنیاد پر تاریخ کے کتنے اہم فیصلے طے کیے گئے گویا بغیر کسی دوسری شہادت کے تمام صحابہ نے ان حدیثوں کو قبول کیا۔ اور یہ دو حدیثیں ہی کیا کتنی حدیثیں ہیں جن کو حضرت ابوبکر ہی نہیں آپ کے علاوہ باقی خلفائے راشدین اور دیگر تمام صحابہ صریح ایک صحابی کے بیان پر بھروسہ کر کے عموماً مانتے رہے ہیں ایسی تمام حدیثوں کو اگر جمع کیا جائے تو ایک مستقل کتاب تیار ہو سکتی ہے۔

علاوہ انہیں سوچنے کی بات ہے کہ اس نوعیت کی حدیثوں پر اعتماد کرنے کے لیے کم از کم دو راویوں کی موجودگی کو اگر قانونی انصاف کی شکل دے دی جائے تو ہمیں ثابت کرنا پڑے گا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس نوعیت کی حدیثوں کی تبلیغ کے لیے کم از کم دو آدمیوں کو ضرور روانہ فرماتے تھے حالانکہ یہ امر واقعہ کے خلاف ہے۔ روایات کا ایک معتد بہ ذخیرہ ایسا موجود ہے جن کے متعلق خود راوی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے سوا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اور کسی دوسرے آدمی سے اس بات کا ذکر نہ کیا تھا نیز جس طرح دنیا کے عام کاروبار میں دستور ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

بھی عموماً ضرورتوں کے لیے ایک ہی آدمی کو روانہ فرمایا کرتے تھے لیکن کوئی ایک واقعہ بھی ایسا نہیں جس سے یہ معلوم ہوتا ہو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بھیجے ہوئے اس آدمی پر لوگوں نے یہ اعتراض کیا ہو کہ تم تنہا اکیلے آدمی ہو جب تک تم کوئی دوسرا گواہ نہ پیش کر رہے ہو کیسے مان لیں کہ جو کچھ تم کہہ رہے ہو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا فرمان ہے۔ صدقہ وغیرہ وصول کرنے کے لیے بھی عموماً ایک ہی آدمی روانہ کیا جاتا تھا مگر کبھی کسی نے اس سے اس بات پر گواہی طلب نہیں کی کہ وہ واقعی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرستادہ ہے۔

**مزید اطمینان کی ایک تدبیر** | غرض حضرت میخرو کی روایت پر حضرت ابوبکر کا گواہی مانگنا اعتماد کی شرط کے طور پر نہ تھا

بلکہ محض مزید اطمینان کی ایک تدبیر تھی۔ حضرت ابوبکرؓ اپنے طرز عمل سے یہ سبق سکھانا چاہتے تھے کہ دین کا وہی حصہ کیوں نہ ہو جس کی بنیاد اخبار احاد پر ہے اس کے رد کرنے یا قبول کر لیتے ہیں لاپرواہی سے کام نہیں لینا چاہیے۔ آخر ایک صحابی کی روایت پر بھی اگر تائید کا مطالبہ کیا جاسکتا ہے تو آئندہ آنے والوں کو سوچ لینا چاہیے کہ ان کی روایتوں کے قبول کرنے میں کس درجہ احتیاط کی ضرورت ہے اور حق یہ ہے کہ آئندہ آنے والوں نے اس سبق کو خوب سیکھا صحابہ سے روایت کرنے والوں کے بارے میں جو ہم سنتے ہیں کہ وہ حتی الوسع اس کی کوشش کرتے تھے کہ ایک ہی روایت جن جن صحابیوں سے سننا ممکن ہو اس میں کمی نہ کی جائے وہ حضرت ابوبکرؓ کے پڑھائے ہوئے اسی سبق کی عملی تفسیر تھی۔ اس لحاظ سے حفاظت حدیث کے سلسلے میں حضرت ابوبکرؓ نے یہ ایک انتہائی گرانتہ اور عادت انجام دی کہ روایتوں میں قوت پیدا کرنے کے لیے متابعت و شہادت کے طریقے کی بنا ڈال دی حقیقت یہ ہے کہ تواریخ و شواہد کی جو بلند وبالا اور عظیم الشان عمارت تدوین حدیث کی تاریخ میں بعد کے دور میں تعمیر ہوئی اس کی پہلی اینٹ حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھوں ہو رکھی گئی۔

**حفاظت حدیث اور حضرت عمرؓ** | حفاظت حدیث کے سلسلے میں جہاں تک حضرت عمرؓ کی خدمات کا تعلق ہے تو آپ کی ترجیح

زیادہ تر اس بات پر مرکوز رہی کہ حضرت ابو بکرؓ اپنے مختصر عہد خلافت میں حفاظت حدیث کے لیے جن جن کاموں کی ابتدا کر گئے تھے ان میں استحکام پیدا کیا جائے۔ گزشتہ اوراق میں معمر بن حدیث کے لگائے گئے الزامات کی تردید کرتے ہوئے جو کچھ کہا گیا ہے اس میں حضرت عمرؓ کی جانب سے حفاظت حدیث کے سلسلے میں کیے جانے والے اقدامات کا بھی اگرچہ مفصل تذکرہ آگیا ہے تاہم اب بھی انہی اقدامات کے حوالے سے ہم حضرت عمرؓ کی خدمات کا مختصر اذکر کرتے ہیں :

**کثرت روایت میں احتیاط** | حضرت عمرؓ نے اس بات کی بطور خاص نگرانی فرمائی کہ لوگ روایت حدیث میں اکثر سے کام نہ لیں کثرت روایت سے روکنے میں آپ کو اگر سختی سے بھی کام لینا پڑا تو آپ نے اس سے بھی دیہ رخ نہ کیا مقصود اس سے یہ تھا کہ کثرت روایت کی بنا پر کہیں خبر احاد کی روایتوں میں عمومیت کی ایسی کیفیت پیدا نہ ہو جائے جس کی وجہ سے دین کے بیناتی حصّہ کے مطالبوں میں جو قوت ہے وہی قوت لوگ ان روایتوں کے مطالبوں میں بھی محسوس کرتے لگیں۔ آپ دین کے ان دونوں حصّوں کے مطالبوں میں قوت و ضعف کے اس فرق کو برقرار رکھنا چاہتے تھے جو دین اسلام کی سہولت پسندانہ خصوصیت کے پیش نظر بہت ضروری تھا اس فرق کو برقرار رکھنے میں حضرت عمرؓ نے اس قدر احتیاط سے کام لیا کہ احادیث بنویہ کو کتابی شکل دینے کی شدید خواہش رکھتے ہوئے بھی آپ انہیں قلم بند کرانے سے احتراز ہی فرماتے رہے ایک مرتبہ لکھوانے کا ارادہ بھی کر لیا صحابہ سے مشورہ کیا تو انہوں نے بھی اجازت دے دی مگر پھر اسی فرق کو برقرار رکھنے کی خاطر نہ صرف خود اپنے ارادہ سے باز رہے بلکہ دوسرے لوگوں کے لکھے ہوئے مجموعے بھی منگوا کر ان کو جلادیا۔ دین کے بیناتی و غیر بیناتی حصّوں کے مطالبوں میں اس فرق کو برقرار رکھنے کے علاوہ حضرت عمرؓ کے پیش نظر یہ بات بھی تھی کہ کثرت روایت کی صورت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف غلط بات منسوب ہو جانے کا خدشہ زیادہ تھا حضرت عمرؓ کو فکر یہ تھا کہ کہیں کثرت روایت کی بنا پر بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث میں جھوٹ پر سچ کی آمیزش نہ ہو جائے۔ یہ سب کچھ دراصل سنت بنوی اور طرز صدیقی کا استحکام ہی تھا۔

اپنے عہد نبوت میں بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں باتوں کی پوری طرح نگرانی فرمائی آپ کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے اپنے زمانے میں ان کو برقرار رکھنے پر پورا زور دیا اور اب یہی غرض حضرت عمرؓ کے پیش نظر تھی آپ انہی دو باتوں کو یقینی بنانے کے لیے کثرت روایت سے منع فرماتے رہے ۛ

تحقیق حدیث کے لیے تائید  
مزید کا مطالبہ

دوسرا کام حفاظت حدیث کے سلسلے میں حضرت عمرؓ نے یہ کیا کہ تحقیق حدیث کے لیے جس اُصول شہادت کی بنیاد حضرت ابوبکرؓ رکھ گئے تھے اس کو زیادہ سے

زیادہ مستحکم کرنے کی کوشش فرمائی۔ سنت صدیقی کی پیروی کرتے ہوئے آپ نے بھی بعض صحابیوں کی روایت پر مزید تائید کا مطالبہ کیا بلکہ اپنی خاص فطری طبیعت کے لحاظ سے اس مطالبے میں کچھ شدت کی راہ بھی اختیار کی۔ جیسا کہ استیذان والی اس مشہور روایت میں ہے جو نسائی کے سوا صحاح ستہ کی ہر کتاب میں موجود ہے کہ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کے ساتھ سخت طرز عمل اختیار کرتے ہوئے آپ نے دھکی آمیز لہجے میں کہا تھا کہ تم کو شہادت پیش کرتی پڑے گی ورنہ میں تمہارے ساتھ کچھ کرگزروں گا بلکہ بعض روایتوں میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے کہا تھا میں تمہیں دوسروں کے لیے باعث عبرت بنادوں گا۔ بہر حال یہ بھی تو حضرت عمرؓ کے مزاج کا ایک حصہ تھی دین کے دوسرے شعبوں میں بھی آپ کے مزاج کی یہ سختی نمایاں ہے تو حدیث کا شعبہ بھی اس سے کیوں محروم رہتا تاہم بتلانا یہ تھا کہ حضرت عمرؓ بھی حضرت ابوبکرؓ کے طریقے کی پیروی کرتے ہوئے صحابہ کی روایت پر مزید تائید کا مطالبہ کیا کرتے تھے۔ روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابوموسیٰؓ کے علاوہ بعض دیگر صحابہ کے ساتھ بھی حضرت عمرؓ نے کئی دفعہ اپنے اسی طرز عمل کو دہرایا۔ مسجد نبویؐ کی توسیع کے سلسلے میں حضرت عباس بن عبدالمطلبؓ کے مکان کے داخل کرنے کے جھگڑے میں جب حضرت ابی بن کعبؓ نے وہ حدیث سنائی جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت داؤد علیہ السلام کے ماحقروں بیت المقدس کی تعمیر کا واقعہ ذکر کیا ہے تو اس حدیث کی روایت پر بھی حضرت عمرؓ نے حضرت ابی بن کعبؓ سے گواہ طلب کیا اور جب تک حضرت ابوذر غفاریؓ نے





پیدا ہوا یعنی ایک ہی حدیث ممکنہ حد تک جتنے زیادہ طریقوں سے مل سکتی ہو ان طریقوں کے تلاش کرنے اور جمع کرنے کا جو اہمانہ ذوق ہمیں ان میں نظر آتا ہے وہ سنت صدیقی اور طرز فاروقی ہی کا یہ تو تھا حضرت ابو بکر صدیقؓ نے اس کی بنیاد رکھی حضرت عمر فاروقیؓ نے اسے خوب مستحکم کیا اور بعد کے دور میں محدثین نے اس پر ایک بلند بالا عمارت تعمیر کر دی۔ حافظ ذہبیؒ نے حضرت عمرؓ کے تذکرے میں حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کی مذکورہ بالا استیذان والی روایت اور اس پر حضرت عمرؓ کی جانب سے تائید طلب کرنے کا واقعہ درج کرنے کے بعد لکھا ہے :

حدیثوں کے طرق میں جس کثرت کا خیال (بعد میں لوگوں کو) ہوا اس واقعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس پر لوگوں کو (حضرت عمرؓ کے) اس طرز عمل نے ہی آمادہ کیا۔

وَفِي ذَلِكَ حَقٌّ عَلِيٌّ  
تَكْثِيرُ جُلُوقِ الْحَدِيثِ  
(تذکرہ الحفاظ)

حافظ ذہبیؒ نے بالکل درست کہا مگر اس طرز فاروقی کی بنیاد حضرت ابو بکرؓ کے ہاتھوں ہی رکھی جا چکی تھی حضرت عمرؓ نے اس بنیاد کو اس قدر استحکام اور استواری عطا فرمائی کہ آنے والوں کے لیے اس پر عمارت کھڑی کرنا نہایت آسان ہو گیا۔

حفاظت حدیث اور حضرت عثمانؓ | حفاظت حدیث کے سلسلے میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے متعلق کسی خاص

واقعہ کا ذکر تاریخ حدیث کی کتابوں میں اگرچہ ہمیں نہیں ملتا لیکن ایسی روایتیں موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؓ نے شیخین رضی اللہ عنہما کے قائم کیے ہوئے طریقے کو باقی رکھا۔ آپؓ کثرت روایت سے پرہیز کرتے رہے اور اس بات کی کوشش فرماتے رہے کہ اخبار احاد کا جو مقام عہد نبویؐ اور عہد شیخین میں متعین ہو گیا ہے وہ بحال رہے چنانچہ سند احمد کی ایک روایت میں ہے کہ حضرت عثمانؓ فرمایا کرتے :

مَا لِي مَنَعَنِي أَنْ أَحَدَّثَ عَنْ رَسُولٍ | رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کے

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان لا  
اکون اوعی اصحابہ عنہ ولکنی  
اشہد لسمعہ ليقول من قال  
علی ما لہ اقل فلیتوا مقعدہ  
من النار (مسند احمد)

بیان کرنے میں مجھے یہ چیزیں روکتی کہ دوسرے  
صحابیوں سے حدیثوں کے بار رکھنے میں میں کچھ  
کم ہوں لیکن بات یہ ہے کہ میں نے رسول اللہ  
صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ جس نے میری طرف  
کوئی ایسی بات منسوب کی جو میں نے نہ کی ہو تو میرا پیسہ  
کہ وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے۔

معلوم ہوا کہ حضرت عثمان غنیؓ کثرت روایت سے ہمہ پہن کرتے تھے اگرچہ دوسرے صحابہ کی  
طرح آپ کو بھی احادیث خوب یاد تھیں مگر حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کی طرح آپ  
بھی بہت کم حدیثیں روایت کرتے تھے ظاہر ہے اس کی وجہ یہی تھی کہ آپ اخبار احاد  
کی عام اشاعت کو پسند نہ فرماتے تھے آپ نے یہ فرما کر کہ احادیث بنو یہ یاد رکھنے میں دوسرے  
صحابہ سے میں کچھ کم نہیں ہوں یہ بھی واضح فرمادیا کہ کثرت روایت سے میرے ہمہ پہن کی یہ  
وجہ نہیں ہے کہ مجھے اپنے حلفے پر اعتماد نہیں بلکہ ڈر ہے تو یہ ہے کہ ان حدیثوں کی عام  
اشاعت کے بعد یہ خدشہ قوی ہو جائے گا کہ سن کر روایت کرنے والے کیس کوئی غلط بات  
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب نہ کر دیں۔ اس کے ساتھ ہی حضرت عثمان  
کی نظر سے یہ حقیقت بھی مخفی نہ تھی کہ خلیفہ رسول کی جانب سے ان احادیث کی عام اشاعت  
انہیں قطعیت کا وہ رنگ پیدا کرنے کا بھی موجب ہو سکتی ہے جو ان احادیث سے شارع  
علیہ السلام کا مقصود نہیں ہے چنانچہ ایک موقع پر ایسی ہی ایک حدیث بیان کرتے ہوئے  
آپ نے اس حقیقت کا اظہار واضح الفاظ میں فرمایا کہ یہ حدیث میں اس سے پہلے نہیں سنانے  
سے محض اس لیے کہ یہ کرتا رہا کہ کہیں تم سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر محض اسی کی تعمیل کو ضروری نہ  
سمجھنے لگو پھر فرمایا کہ حدیث کو سننے کے بعد تمہیں اختیار ہے کہ اپنے لیے جس پہلو کو بہتر سمجھو  
اختیار کرو مسند احمد کی روایت ہے :

حضرت عثمان کے غلام ابو صالح سے مروی ہے وہ

عن ابی صالح مولى عثمان

بن عقان رضی اللہ عنہ یقول  
 إِلَيْهَا النَّاسُ إِنِّي كَتَمْتُكُمْ  
 حَدِيثًا سَمِعْتُهُ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ  
 صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَرَاهِيَةً  
 تَفَرَّقَكُمْ عَنِّي ثُمَّ بَدَأَ أَنْ  
 أَحَدٌ ثَكْوَةً لِيَخْتَارَ أَمْرًا  
 لِنَفْسِهِ - مَا بَدَأَ اللَّهُ سَمِعْتُ رَسُولَ  
 اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ  
 رِبَاطٌ يَوْمَ مِغْزَى سَبِيلُ اللَّهِ تَعَالَى  
 خَيْرٌ مِنْ أَلْفِ يَوْمٍ فَيَأْتِي سَوَاقَا  
 مِنَ الْمَنَازِلِ -

(مسند احمد - ج ۱)

کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عثمان کو بہکتے سنا  
 کہ اے لوگو ایک حدیث جو میں نے رسول اللہ  
 صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہے اسے تم لوگوں سے  
 اب تک اس لیے چھپاتا رہا کہ تم کو یہ حدیث  
 مجھ سے جدا کر دے گی مگر مجھے ہی محسوس ہوا کہ  
 میں اس حدیث کو تم سے بیان کر ہی دوں پھر اسکو  
 سننے کے بعد آدمی جس پہلو کو چاہے اختیار کرے  
 رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ اللہ کی  
 راہ میں ایک دن کا رباط (بہ نیت ہمارا قیام)

دوسری جگہوں میں ہزارہ دن گزارنے سے بہتر ہے۔

حضرت عثمان نے یہ کہہ کر کہ آدمی کو اختیار ہے اپنے لیے جس پہلو کو چاہے پسند کر لے دراصل  
 خبر احاد کی حدیثوں کے اصل مقام کی وضاحت کی ہے کہ عزم و ہمت رکھنے والے اگر چاہیں  
 تو اس قسم کی حدیثوں کے مطالبوں پر عمل کر کے محبوبیت حق میں نرقی کرتے چلے جائیں اور بڑے  
 لوگ اس قدر عزم و ہمت سے بہرہ ور نہ ہوں ان کو اجازت ہے کہ وہ اللہ کی دی ہوئی  
 رخصتوں اور سہولتوں سے فائدہ اٹھائیں۔

اگرچہ حضرت عثمان کا خود اپنا حال یہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی منشاء  
 مبارک کی اطلاع خواہ آپ کو خبر واحد ہی کی راہ سے کیوں نہ پہنچی ہو اس کی تعمیل کو اپنی سعادت  
 خیال فرماتے تھے۔ احرام کی حالت میں شکار کے گوشت سے لافہ کھینچ لینے کا شرع ردائے

اس کے ثبوت میں پیش کیا جاسکتا ہے اگرچہ وہ شکار نہ حضرت عثمان نے خود  
 کیا تھا نہ اس کے شکار کرنے کا آپ نے حکم دیا تھا قدید نامی گاؤں کے رہنے والوں  
 نے جو احرام کی حالت میں نہ تھے اس کو شکار کیا تھا۔ اور انہی لوگوں نے حضرت عثمان  
 کو کھانے کے لیے بھیجا تھا یہی وجہ تھی کہ حضرت عثمان خود اپنے اجتہاد اور تفقہ کی روشنی  
 میں اس کے کھانے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے تھے مگر جب حضرت علیؑ نے بنی کریم صلی  
 اللہ علیہ وسلم کے ایک ایسے فعل کی خبر دی جو بظاہر حضرت عثمان کے اپنے اجتہاد کے خلاف  
 نظر آتا تھا تو حضرت عثمان فوراً دستبرخاست ہو گئے۔ یہ تھا خبر واحد کی تعمیل میں  
 حضرت عثمان کے عزم و شوق کا انداز۔

روایت حدیث میں متذکرہ تمام تراویحات کے باوجود حضرت عثمان کی اپنی روایت  
 کی تعداد اچھی خاصی ہے امام احمد نے اپنی مسند میں جن روایات کو جمع کیا ہے ان کی  
 تعداد ایک سو چھیالیس ہے۔

**حفاظت حدیث اور حضرت علیؑ** | حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے بھی ابتدا

میں اپنے پیش رو و خلیفائے راشدین کے طرز پر اس بات کا خیال رکھا کہ خبر احادیث کی حدیثوں میں عمومیت کا رنگ نہ پیدا ہو جہاں  
 تک ممکن تھا آپ نے بھی اس کی نگرانی میں کوئی کمی نہیں کی چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ رسول  
 اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو باتیں احادیث کی شکل میں آپ تک پہنچی تھیں اور جن کا ایک  
 حصہ مکتوبہ شکل میں آپ کے پاس موجود تھا آپ نے ان کی اشاعت عام سے حتیٰ الامکان  
 احتراز ہی فرمایا۔ حضرت علیؑ نے یہ حدیثیں کس نہی نے میں فلم بند فرمائی تھیں اس کے  
 بارے میں تو یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا تاہم اتنی بات یقینی ہے کہ آپ کے پاس لکھی ہوئی شکل  
 میں کچھ حدیثیں تھیں ضرور۔ آپ نے یہ نوشتہ اپنی تلوار کی نیام میں رکھا ہوا تھا۔ لوگوں کے اصرار  
 کے باوجود آپ ان حدیثوں کی اشاعت سے انکار ہی کرتے رہے لیکن جب لوگوں کی طرف سے

اصرار میں شدت برہتی چلی گئی نیز آپ کے انکار سے لوگوں کے درمیان غلط فہمیاں پھیلنے لگیں کہ شاید نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صیغہ راز میں رکھتے ہوئے کچھ خاص رموز و اسرار کی نوعیت کی چیزیں آپ کو عطا فرمائی تھیں حضرت عثمان کے زمانے میں جن لوگوں نے فتنہ و فساد کا باضابطہ پردہ گرام تیار کیا تھا ان کو موقع ملنے لگا کہ اس سے مختلف قسم کے خود تراشیدہ مغالطوں میں لوگوں کو مبتلا کر دیں تو آپ نے اس مکتوب میں جو حدیثیں لکھی ہوئی تھیں ان پر لوگوں کو مطلع کر دیا مگر اس کے باوجود کسی روایت سے یہ ثابت نہیں ہے کہ حضرت علیؑ نے اپنے اس صحیفے کی نقل لینے کی عام اجازت لوگوں کو دے دی ہو۔ مسند احمد میں ہے کہ آپ نے فسادیوں کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں کا ازالہ کرتے ہوئے فرمایا:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عام لوگوں سے علیحدہ مجھ سے کوئی ایسی بات بطور عہد کے نہیں فرمائی سوائے اس کے کہ میں نے آپ سے چند باتیں سنی ہیں وہ اس صحیفے میں ہیں جو میری تلوار کی بنیاد میں ہے۔

فَاعْهَدِ إِلَى رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ شَيْئًا خَاصَّةً دُونَ النَّاسِ إِلَّا شَيْئًا سَمِعْتُهُ مِنْهُ فَهُوَ فِي صَحِيفَةٍ فِي قُرَابِ سَيْفِي (مسند احمد)

مگر لوگوں کی اس پر بھی تسلی نہ ہوئی اور وہ اس صحیفہ کو دکھانے پر مصر رہے تو حضرت علیؑ نے صحیفہ نکال کر یہ بھی دکھا دیا چنانچہ آگے چل کر راوی کا بیان ہے:

لوگ اس کے (دکھانے) پر مصر رہے یہاں تک کہ آپ نے اس کو نکال لیا۔

فَلَمْ يَذْوَ الْغَيْبُ حَتَّى أَخْرَجَ الصَّحِيفَةَ (مسند احمد)

مسند احمد میں ہی طارق بن شہاب کے حوالے سے یہ بھی ہے کہ آپ نے فتنہ پردازوں کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں کے ازالے کے لیے لوگوں کو واضح طور سے یہ بھی بتلایا کہ اس صحیفے میں صدقہ و نہ کوہ سے متعلق چند مسائل ہیں۔ طارق کی روایت کے الفاظ ہیں:

میں نے منبر پر حضرت علیؑ کو خطبہ دیتے ہوئے دیکھا ان کی کمر میں تلوار تھی جس کا قبضہ لوہے سے بجا ہوا تھا میں نے سنا آپ فرمادے تھے اللہ کی قسم

رَأَيْتُ عَلِيًّا رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ عَلَى الْمَنْبَرِ يَخْطُبُ وَعَلَيْهِ سَيْفٌ حَلِيقَتُهُ مِنْ حَدِيدٍ فَمِنْ حَتَّةٍ لِقَوْلِ وَاللَّهِ مَا

ہمارے پاس کتاب اللہ اور اس صحیفے کے سوا  
کوئی ایسی کتاب نہیں ہے جسے تم لوگوں کے آگے پیش  
اور یہ صحیفہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے  
مجھے عطا فرمایا ہے اس میں صدقہ کے حصّوں  
کی تفصیل ہے۔

عَمَّا كُنَّا نَقْرَأُ عَلَيْكُمْ إِلَّا كِتَابُ اللَّهِ  
تَعَالَى وَهَذِهِ الصَّحِيفَةُ أَعْطَانِيهَا  
رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيهَا  
فَرَأَيْتُ الصَّدَقَةَ - (مسند احمد جلد ۱)

موتق پرستوں کی فریب کاریوں کا پردہ چاک کرنے کے لیے حضرت علیؑ نے برسرِ منبر اس بات کی  
تو پوری طرح وضاحت کر دی کہ ان کے پاس رموز و اسرار کی قسم کی کوئی چیز نہیں بلکہ عام دینی  
مسائل ہیں لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد بھی آپؑ نے اس کی اجازت کسی کو نہ دی کہ  
وہ ان کے پاس موجود صحیفے کی نقل لے لے کیونکہ اپنے صحیفے کی عام نقول لے لینے کی اجازت  
اگر آپؑ نے دے دی ہوتی تو آج معاملہ یہ نہ ہوتا کہ اس صحیفے کے مضامین جن متعدد راویوں  
سے حدیث کی کتابوں میں منقول ہیں ان میں ایک راوی جن احسنہ اکاذ کہہ کر تا ہے دوسرا راوی  
ان کے ذکر سے خاموش ہے بلکہ بجائے اس کے وہ دوسرا کاذ کہہ کر تا ہے اگرچہ بعض اجزا  
سادہ روایتوں میں مشترک ہیں۔ اجزا کا یہ اختلاف اس بات کی دلیل ہے کہ ان راویوں میں  
سے کسی راوی کے پاس بھی حضرت علیؑ کے صحیفے کی نقل موجود نہ تھی سن سنا کر جو باتیں بارہ  
گئی تھیں وہ ان ہی کو بیان کرتا تھا :

عرض ابتدا میں حضرت علیؑ نے اس بات کا خاص خیال رکھا کہ خبر  
احاد کی حدیثوں میں عمومیت کا رنگ پیدا نہ ہو چنانچہ جو باتیں  
احاد کی شکل میں آپؑ تک پہنچی تھیں ان کی عام اشاعت سے  
شرع شروع میں آپؑ نے احتراز ہی فرمایا مگر معلوم ہوتا ہے جوں جوں زمانہ گزرتا گیا حضرت علیؑ  
کم ام اللہ و جہ کو احساس ہوتا گیا کہ اب تحلیل روایت کا طریقہ ترک کر دینا چاہیے کیونکہ ہم دیکھتے  
ہیں کہ رفتہ رفتہ روایت حدیث کے معاملے میں حضرت علیؑ کے طرزِ عمل میں تبدیلی آتی چلی گئی  
کو ذہ منتقل ہو جانے کے بعد تو آپؑ کا عالم یہ تھا کہ لوگوں کو پکڑ پکڑ کر ایک طرف لے جاتے اور  
نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے جو علم آپؑ کو پہونچا تھا اس کی تبلیغ فرماتے تذکرۃ الحفاظ میں

روایت حدیث کے  
طرزِ عمل میں تبدیلی

حافظ ذہبی نے کیل بن زیاد کے ساتھ حضرت عثمانؓ کی جس طویل گفتگو کا تذکرہ کیا ہے اس میں زیاد کا بیان ہے کہ

<p>اَخَذَ عَلِيٌّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ بِيَدَيْ فَاَخْرَجَنِي اِلَى فَا حِيَةِ الْجَبَّانِ - (تذکرۃ الحفاظ جلد نمبر ۱)</p>	<p>بیرے دونوں ہاتھوں کو حضرت علیؓ نے پکڑا اور صحرائی میدان کی طرف مجھے نکال کر لے گئے۔</p>
--	--

کبھی آپؐ کسی کو مخاطب کر کے کہتے کہ پوچھ لو جو کچھ پوچھنا ہے اس لیے کہ اللہ اور اس کے رسولؐ کی باتوں کو آپؐ ہم سے زیادہ جاننے والا کوئی نہیں رہا چنانچہ ابن سعد نے طبقات میں مصنف عامری کا بیان نقل کیا ہے کہ ایک مرتبہ وہ حضرت علیؓ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپؐ نے اسے خطاب کر کے فرمایا :

<p>يَا اَخَا بَنِي عَامِرٍ سَلْنِي عَمَّا قَالَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ فَاَنَا اَهْلُ الْبَيْتِ اَعْلَمُ بِمَا قَالَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ - (ابن سعد جلد ۶)</p>	<p>اے بنو عامر سے تعلق رکھنے والے بھائی مجھ سے اللہ اور اس کے رسولؐ کے ارشادات کے بارے میں پوچھ لے کیونکہ میں اہل بیت میں سے ہوں اللہ اور اس کے رسولؐ کی باتوں کو زیادہ جانتا ہوں۔</p>
---	--

کیا تو حضرت علیؓ کا حال یہ تھا کہ لوگوں کے شدید اصرار کے باوجود اپنے صحیفے میں مرقوم احادیث کے بارے میں کسی کو کچھ بتلانے پر تیار نہ ہوتے تھے کہاں لوگ دیکھ رہے تھے کہ کوثر کے منبر پر کھڑے حضرت علیؓ لوگوں کو پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ مجھ سے جو کچھ پوچھنا ہے پوچھ لو خدا کی قسم جس چیز کے متعلق مجھ سے دریافت کرو گے میں اس کے متعلق بتاؤں گا۔ ایک طرف ہم دیکھتے ہیں کہ اپنا تلوار والا صحیفہ حضرت علیؓ کسی کو دکھانے تک کے روادار نہیں ہیں دوسری طرف یہی کوفے کا منبر ہے اور حضرت علیؓ اعلان کرتے نظر آ رہے ہیں کہ ایک درم میں کون مجھ سے علم خریدتا ہے لانے والے ایک درم کے کاغذ خرید کر لا رہے ہیں اور آپؐ اپنے ہاتھ سے حدیثیں لکھ لکھ کر ان کے حوالے کر رہے ہیں۔ طبقات ابن سعد میں ہے :

أَنَّ عَلِيَّ بْنَ أَبِي طَالِبٍ خُطِبَ  
النَّاسَ فَقَالَ مَنْ يُشْتَرَى عِلْمًا  
بِدُرْهِمٍ فَاشْتَرِ الْحَارِثَ الْأَعْوَرَ  
صَحْفًا بِدُرْهِمٍ ثُمَّ جَارَ بِهَا  
عَلِيًّا نَكَبَ لَهُ عِلْمًا كَثِيرًا -

(ابن سعد جلد - ۶)

ایک دن حضرت علی نے خطبہ دیا تو فرمایا ایک درہم  
میں کون علم خریدنا چاہتا ہے عمارت اعمور نے ایک  
درہم میں کچھ کاغذ خریدے اور حضرت علی کے  
پاس لے کر آئے آپ نے ان کاغذوں پر عمارت کے  
لیے بہت سا علم لکھ دیا۔

طبقات ابن سعد ہی کی بعض دوسری روایتوں سے پتہ چلتا ہے کہ عمارت اعمور کے علاوہ  
بھی چند دیگر حضرات کو اپنی مرویات حضرت علی نے لکھوا دی تھیں مثلاً حضرت حجر بن عدی  
کے بارے میں ہے کہ ایک موقع پر انہوں نے ایک صحیفہ نکال کر پڑھتے ہوئے کہا یہ وہ روایتیں  
ہیں جنہیں میں نے علی بن ابی طالب سے سنا۔ اسی طرح حضرت علیؑ کے صاحبزادے  
حضرت محمد بن الحنفیہ کے پاس بھی معلوم ہوتا ہے حضرت علی کی حدیثوں کا کوئی مجموعہ تھا  
کیونکہ عبدالاعلیٰ بن عامر کے ترجمہ میں آتا ہے کہ

كُلُّ شَيْءٍ رَوَى عَبْدُ الْأَعْلَى  
عَنِ ابْنِ الْحَنْفِيَّةِ أَلَّا هُوَ كِتَابٌ  
أُخْذَ بِهِ لَمْ يَسْمَعْهُ -

(ابن سعد جلد - ۶)

عبدالاعلیٰ محمد بن حنفیہ سے جو کچھ روایت کرتے  
تھے وہ دراصل ایک کتاب تھی اور عبدالاعلیٰ نے  
براہ راست محمد بن حنفیہ سے ان روایتوں کو  
نہیں سنا تھا۔

حضرت امام جعفر صادق کے جو حالات رجال کی کتابوں میں ملتے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ  
کے پاس بھی حضرت علی کی روایات کا کوئی مجموعہ تحریری شکل میں موجود تھا۔ ہر مال بات یہ ہو  
مہی تھی کہ کوفہ پہنچنے کے بعد حضرت علیؑ کی نقلیں روایت کے اصول پر زیادہ دیر تک قائم نہ رہ  
سکے اور روایتوں کی عمومیت کے جس دروازے کو بنجین رضی اللہ عنہما کے عہد میں سوختی کے



ساتھ بند رکھنے کی کوشش کی گئی تھی وہ دروازہ کھل گیا۔

حضرت علی کا یہ طرز عمل بظاہر اپنے پیش رو خلفاء کے مقابلے میں عجیب محسوس ہوتا ہے مگر جن حالات میں حضرت علیؑ نے یہ طرز عمل اختیار کیا تھا ان کو اگر نظر میں رکھا جائے تو یہ طرز عمل عین صواب نظر آتا ہے حضرت علیؑ کو وہی کچھ کرنا چاہیے تھا جو آپؐ نے کیا۔

**طرزِ عمل کی تبدیلی کا پس منظر** | حقیقت یہ ہے کہ حضرت علیؑ کو اپنے طرزِ عمل میں یہ تبدیلی کوفہ تشریف لانے کے بعد ہی کرنی پڑی یہ رہی

زمانہ ہے جس سے کچھ ہی عرصہ پیشتر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کے آخری دور میں ایک عجیب غریب اندرونی تحریک دشمنانِ اسلام کی سازشوں کی پشت پناہی میں مسلمانوں کے اندر عام طور پر پھیلانے کی کوشش جاری ہو چکی تھی اس تحریک کے پیچھے دشمنوں کے بہت سے مقاصد کام کر رہے تھے مگر اس تحریک کا اصل محرک صحابہ کرام کی جماعت کو بدنام کرنا تھا دشمنوں نے اس جوہری قوت کو قطعی طور پر ختم کرنے کا ارادہ کر لیا تھا جو اسلام کی نصرت کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد صحابیت کی شکل میں قدرت کی طرف سے جمع کر دی گئی تھی۔ اسلام کے دشمن عہدِ عثمانی کے آخری دور میں یہی ارادہ لے کر اُٹھے تھے کہ صحابیت کی اس قوت پر ایسی کاری ضرب لگائی جائے کہ یہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے منتشر ہو جائے تاکہ اسلام اپنے دینی اور دنیوی دونوں سرمایوں کے اعتبار سے خود بخود صفر ہو کر رہ جائے۔ اس کے لیے انہوں نے صحابہ کو طرح طرح سے بدنام کرنا شروع کیا اور گتے چنے چند صحابیوں کو مستثنیٰ کر کے کہنا شروع کر دیا کہ صحابہ کی اکثریت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مخلص نہ تھی۔ مگر ظاہر ہے صحابہ کے خلافت عام مسلمانوں کو اس حد تک کھینچ کر لے آنا کہ صحابیت کی قوت عدم محض ہو کر رہ جائے کچھ آسان کام نہ تھا کوفہ کی چھاؤنیوں میں بسنے والوں کی اکثریت مانا ان لوگوں پر مشتمل تھی جو ہجرت کی صحبت سے فیض یاب نہ تھے مانا کہ صحرا سے عرب کے یہ بدو ہونے کو تو مسلمان ہو گئے تھے مگر اب بھی ان میں بدویانہ خوبیاں باقی تھیں مگر اس سب کے باوجود وہ لوگ بحال تھے تو مسلمان یہی بنی کر تم صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا کا سچا پیغمبر اور اسلام کو خدا کا سچا دین مان چکے تھے ان لوگوں کو یہ یاد رکھنا آسان نہ تھا کہ صحابیت کی ساری قوت اسلام اور پیغمبر اسلام کی مخالفت

پر ختم ہو جاتی رہی۔ اپنی تمام تر علمی و کرداری کمزوریوں کے باوجود کوئی ایک مسلمان بھی یہ بات ماننے کے لیے تیار نہ ہوتا کہ صحابہ کی پوری جماعت میں سے محدود سے چند افراد کے علاوہ کوئی بھی نہ اسلام ہی کا درست تھا اور نہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے کسی اخلاص و عقیدت کا تعلق رکھتا تھا۔ اس حقیقت سے دشمنان اسلام بھی بخوبی واقف تھے چنانچہ انہیں اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے اس کے سوا کوئی تدبیر کارگر نظر نہ آئی کہ جھوٹ کا دھواں اٹھایا جائے اور اس کے ذریعے ایسی تاریکی پھیلادی جائے کہ دن اور رات کی تمیز مشکل ہو جائے۔ اسی واحد تدبیر کو دشمن کام میں لائے اور اپنی طرف سے جھوٹی حدیثیں گھڑ گھڑ کر ان چند صحابہ کے حوالے سے بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرنے لگے جن کو انہوں نے اپنی مقصد برآری کی خاطر پہلے ہی صحابہ کی عام جماعت سے مستثنیٰ کر کے ان کے متعلق یہ مشہور کرنا شروع کر دیا تھا کہ بس یہی چند اصحاب ایسے ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مخلصانہ تعلق رکھتے تھے۔ سب سے پہلی جھوٹی حدیث گھڑنے والا عبد اللہ بن سبا ہی تھا جس کے بارے میں کون نہیں جانتا کہ صحابہ کی عام جماعت کے خلاف تحریک چلانے والوں کا سرغنہ تھا حافظ ابن حجر عسقلانی نے عامر شیبی کے حوالے سے لکھا ہے کہ

أَوَّلُ مَنْ كَذَبَ عَبْدُ اللَّهِ بْنَ سَبَا | سب سے پہلے جس نے جھوٹی حدیث بنائی وہ  
 عبد اللہ بن سبا ہے۔

لسان المیزان جلد ۱۳

عبد اللہ بن سبا کی سرگرمیاں اس قدر بڑھ گئی تھیں کہ وہ علیؑ کا اعلان بڑی ڈھٹائی سے بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر کے جھوٹی حدیثیں گھڑ گھڑ کر بیان کرتا چلا جاتا آخر ایک روز حضرت علیؑ کی جماعت کے مشہور بزرگ مسیب بن نجبه نے عبد اللہ بن سبا کو گردن سے پکڑ لیا اور گھسیٹتے ہوئے کوفہ کی جامع مسجد میں منبر کے سامنے لا کھڑا کیا اور بلند آواز میں اعلان فرمایا ہذا یکذب علی اللہ ورسولہ (یہ شخص اللہ اور اس کے رسول کی طرف جھوٹی باتیں بنا کر منسوب کرتا ہے) مگر بات صرف عبد اللہ بن سبا تک محدود نہ رہی کئی اسکے

کازندے کوثر، بصرہ، شام، حجاز اور مصر وغیرہ تمام بڑے بڑے شہروں میں پھیلے ہوئے تھے یہ لوگ صحابہ کے خلاف سب سے بڑا حربہ یہی استعمال کرتے تھے کہ تمہاری ٹھکانیں گھڑتے اور جہاں ضرورت ہوتی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر کے لوگوں میں پھیلا دیتے۔ جعل سازی اور افترا پردازی کی اس مہم میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے علاوہ حضرت ابوذر غفاریؓ، حضرت سلمان فارسیؓ اور حضرت مقداد بن اسودؓ وغیرہ کے ناموں سے کام لیا جاتا سیدھے سادے مسلمان ان جلیل القدر صحابہ کا نام سنتے تو فوراً یقین کر لیتے اور پھر خود بھی ان گھڑی ہوئی بے سرو پا روایتوں کا تذکرہ ان کی اصل حقیقت سے بے خبر دوسرے لوگوں کے سامنے پورے اعتماد کے ساتھ کرتے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سامنے یہی سب سے بڑا سوال تھا کہ آخر اس فتنے کا سد باب کس طرح کیا جائے ردایتوں میں آتا ہے کہ خود حضرت علی کی طرف منسوب کر کے جن باتوں کو عبد اللہ ابن سبا اور اس کے ساتھی مسلمانوں کے درمیان پھیلاتے پھرتے تھے وہ سب حضرت علی کے علم میں آتیں تو بے چین ہو جاتے اور بے ساختہ آپ کی زبان مبارک پر یہ الفاظ آ جاتے کہ

ما لِحِ وَلَا هَذَا الْخَبِيثُ الْأَسْوَدُ	اس سیاہ کالے گندے خبیث کو نجد سے
(لسان المیزان جلد ۳)	کیا تعلق۔

اور پھر جن بے سرو پا باتوں کی تشہیر کی جاتی تھی اس کی تردید فرماتے مگر قصہ کسی ایک جگہ کا نہ تھا مسلمانوں کے تمام بڑے بڑے شہروں اور اہم چھانوہیوں میں یہ لوگ پھیلے ہوئے تھے جھوٹ کا ایک سیلاب تھا جو ہر طرف چھا گیا تھا ہر صحابی اپنی جگہ حیران تھا ان لوگوں کی خود تراشیدہ باتیں احادیث بنویہ کے نام سے جب ان کے کانوں میں پڑتیں تو ان کی سمجھ میں نہ آتا کہ یہ سب کچھ ہے کیا۔ بعض صحابہ نے تو اس صورت حال سے گھبرا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر کے حدیثوں کا بیان کرنا ہی چھوڑ دیا تھا ان کی سمجھ میں اس فتنے کے مقابلے کی یہی ایک شکل تھی۔ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ اس فتنے کا ذکر کر کے فرماتے :

ہم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں  
اس زمانے میں بیان کیا کرتے تھے جب آپؐ پر  
جھوٹ گھڑنے کا رواج نہ ہوا تھا مگر جب لوگ  
ہر سرکش اور غیر سرکش (ادنیوں) پر سوار ہونے لگے  
تو ہم نے حدیثوں کا بیان کرتا ہی چھوڑ دیا۔

إِنَّا كُنَّا نَحَدِّثُ عَنْ رَسُولِ  
اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ  
إِذَا لَمْ يَكُنْ يَكْذِبُ عَلَيْهِ  
فَأَمَّا إِذَا رَكِبَ النَّاسُ الصَّعْبَ  
وَالذَّلُولَ تَرَكَنَا الْحَدِيثَ عَنْهُ

(مقدمہ مسلم)

حضرت عبداللہ ابن عباسؓ نے صیغہ واحد کے بجائے جمع کا صیغہ استعمال کرتے ہوئے  
ترکنا الحدیث کہا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نکتے کے بعد حدیثوں کی روایت  
کے متعلق جو طرز عمل حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے اختیار کیا تھا اس میں وہ تنہا نہیں تھے  
اس روش کے اختیار کرنے میں ان کے ساتھ دوسرے بھی شریک تھے۔

اب حضرت علیؓ کے سامنے دوہرا مسئلہ کھڑا ہو گیا تھا پہلے تو یہی تھا کہ ان جھوٹی  
حدیثوں کے نہہرے اڑالے کے لیے کیا کیا جلے اب یہ سوال بھی سامنے تھا کہ اس  
نہہرے بچنے کی خاطر یہ رجحان جو بڑھتا جا رہا ہے کہ قطعی طور پر حدیثوں کی روایت کا  
سلسلہ ہی بند کر دیا جائے اس کو روکنے کی کیا تدبیر لی جائے ؟

اسی دوہرے مسئلے کے حل کے لیے اور اسی صور  
بحوثی حدیثوں کا سدّ باب | حال کے مقابلے کے لیے حضرت علیؓ کو اپنے

اس رویہ میں تبدیلی کی ضرورت محسوس ہوئی جو حدیثوں کی تقلیل روایت سے متعلق آپ  
اب تک اختیار کیے ہوئے تھے ظاہر بات تھی کہ براہِ راست خود حضرت علیؓ کی آنکھوں  
دیکھی اور کانوں سے سنی روایات کے مقابلے میں ان بے نہہریا اور جھوٹی روایتوں کی بجلا  
مسلمانوں کی نظر میں کیا وقت باقی رہ سکتی تھی جو ابن سبا اور اس کے کارندوں نے  
پھیلائی تھیں۔ اسی صورت حال کے پیش نظر حضرت علیؓ کرم اللہ وجہہ نے روایت  
حدیث کے بارے میں اپنا طرز عمل بدل دیا اور یہی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ سے  
متعلق جو معلومات بھی آپ کے پاس تھیں ان کی عام اشاعت تحریر اور تقریر دونوں

ذریعوں سے وسیع پیمانہ پر آپ نے شروع کر دی۔ اس کے علاوہ اس صورت حال کی اصلاح کے لیے اس سے بہتر اور کوئی تدبیر ہو بھی نہ سکتی تھی ۛ

**روایت حدیث پر قسم کا مطالبہ** | ایک طرف حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اپنی مرویات کی عام اشاعت کا طریقہ اختیار کیا جس کا مفصل حال گزر رہی چکا ہے دوسری طرف آپ نے اپنی یہ عادت بنالی کہ جب بھی کوئی شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر کے کوئی بات آپ کے سامنے بیان کرتا تو آپ اس سے قسم لیتے۔ قسم کے بغیر آپ کوئی روایت قبول نہ کرتے۔ حافظ ذہبی تذکرۃ الحفاظ میں لکھتے ہیں :

<p>وكان (ای علی کرم اللہ وجہہ) اماماً متحرراً فی الاخذ بحیث انہ یستحلف من یحدثہ بالحديث (تذکرۃ الحفاظ)</p>	<p>حضرت علی کرم اللہ وجہہ روایت کے قبول کرنے میں اس قدر محتاط تھے کہ حدیث بیان کرنے والے سے قسم لیا کرتے تھے۔</p>
--	---

عبداللہ بن سبا اور اس کے ساتھیوں کا زور توڑنے کے لیے آپ بار بار منبر سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ ارشاد دہراتے جس میں جھوٹی حدیثیں گھڑنے والے کے لیے جہنم کی وعید ہے آپ فرماتے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے :

<p>لا تکذبوا علی فانہ من ینکذب علی ینلج فی النار (مسند احمد جلد ۱)</p>	<p>میری طرف جھوٹی بات ہرگز منسوب نہ کیا کرو جو میری طرف منسوب کر کے جھوٹی بات بیان کرے گا۔ وہ آگ میں جھونکا جائے گا۔</p>
--	--

کبھی اسی حدیث کی اہمیت واضح کرنے کے لیے خود اپنی طرف اشارہ کر کے فرماتے :

<p>لَا اَنْ اَخْرَجَ مِنَ السَّامِ اَحَبُّ اِلَيَّ مِنْ اَنْ اَكْذِبَ عَلٰی رَسُولِ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم (مسند احمد)</p>	<p>میں آسمان سے گر پڑوں یہ میرے لیے زیادہ آسان ہے اس بات سے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر کے کوئی غلط بات کہوں۔</p>
--	---

غرض حضرت علی نے اپنی مرویات کی عام اشاعت کے ساتھ ساتھ احادیث نبویہ پر اعتماد میں قوت پیدا کرنے کے لیے اپنی یہ عادت بنالی تھی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کوئی بات اس وقت تک قبول نہ کرتے جب تک بیان کرنے والے سے قسم نہ لے لیتے۔ نہ صرف دوسروں سے قسم لیتے بلکہ آپ سے بھی اگر کوئی کسی حدیث کے بارے میں استفسار کرتا تو آپ خود بھی جواب میں قسم کھاتے ہوئے فرماتے :

ای وزیت الکعبۃ (مسند احمد جلد ۱) | ہاں! رب کعبہ کی قسم (حضور نے ایسا ہی فرمایا ہے)

طریعہ عمل میں تبدیلی کے دیگر عوامل | روایت حدیث کے سلسلے میں حضرت علیؑ کے طرز عمل میں یہ تبدیلی کہ ابتدا میں آپ نے اپنے

پیشرو خلفاء کی طرح تقلید روایت کا طریقہ اختیار کیا رکھا مگر بعد میں یہ طریقہ ترک فرما دیا اور حدیثوں کی عام اشاعت پر زور دینے لگے اس کی اصل وجہ تو وہی حالات تھے جن کا ذکر اوپر گزرا ہے مگر ان حالات کے علاوہ کچھ اور بھی ایسے عوامل تھے جو ہیں حضرت علیؑ کے طرز عمل کی تبدیلی میں محرک عنصر کے طور پر کام کرتے نظر آتے ہیں۔ مثلاً حضرت علیؑ کو اللہ ربہ کو کوفے میں ایسے لوگوں سے واسطہ زیادہ پڑا جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کی دلت سے تو سرفراز ہوئے تھے لیکن شرف صحابیت سے محروم تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے انوال و افعال کو اپنے کانوں سے سننے اور اپنی آنکھوں سے دیکھنے کی سعادت انہیں حاصل نہ تھی۔ ان کے دلوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی باتوں کو جاننے کا شوق اور ولولہ فطری طور پر بہت زیادہ تھا جب صحابہ کرام کی ایک کثیر تعداد کو خیمہ بوہجی تو یہ لوگ اپنے پیغمبر کے حالات جاننے کے لیے بتیا بانہ ان پر ٹوٹ پڑے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ وہ لوگ جنہوں نے اپنے محبوب پیغمبر کو صرف سنا تھا اپنی آنکھوں سے دیکھا نہ تھا وہ جب ان ہستیوں سے ملتے ہوں گے جن کی آنکھیں دیدار نبوی سے مشرف رہی تھیں اور جنہیں براہ راست مجلس نبوی میں حضوری کی سعادت میسر آئی تھی تو کس کس طرح وہ ان حضرات پر اپنے سوالوں کی بارش نہ کرتے ہوں گے صحابہ تو صحابہ تابعین کے گرد لوگ اس طرح جمع رہتے کہ ان کو لیتا بیٹھنا محال ہو گیا تھا۔ ابن سعد نے طبقات میں حسن بصریؒ کے متعلق ثابت البنانیؒ کی

شہادت بیان کی ہے کہ

ان کو لوگ نہ دن کو لیٹے کا موقع دیتے  
نہ سونے کا۔

مَنْعُوا الْقَائِلَةَ وَ مَنْعُوا النَّوْمَ

(ابن سعد جلد ۷)

جب تابعین کے ساتھ مشائخ انصاری کا یہ حال تھا تو صحابہ کو تو کیا کیا تنگ نہ کرتے ہوں گے۔  
حضرت عبداللہ ابن عون بن ابی جہل بھی نہیں تبع تابعین میں سے ہیں خود اپنا حال سناتے ہوئے  
فرمایا کرتے :

لوگوں نے میرا راستہ روک رکھا ہے کسی ضرورت  
سے بھی میں نہیں نکل سکتا یعنی لوگ مجھ سے حدیث  
پوچھنا شروع کر دیتے ہیں۔

قَدْ قَطَعُوا عَلَيَّ الطَّرِيقَ مَا أَتَدِرُ

أَنَّ أَخْرَجَ لِحَاجَةٍ يَعْنِي حَتَّى

لَسْتُ مِنْهُ عَنِ الْحَدِيثِ (ابن سعد جلد ۷)

غرض معلوم ہوتا ہے تعلیل روایت کے معاملے میں حضرت علی کے طرز عمل کی تبدیلی میں کچھ اس صورت  
حال کو بھی دخل تھا مدینہ منورہ میں جب تک رہے تو وہاں احادیث بنویہ کے بارے میں نہ  
پوچھنے والوں کی اتنی کثرت تھی اور نہ بتانے والوں کی کوئی کمی مگر کوفے میں صورت حال بالکل  
مختلف تھی۔ پوچھنے والے بے شمار اور بتانے والے ان کے مقابلے میں محدود۔ ایسا معلوم  
ہوتا ہے کہ شروع شروع میں حضرت علیؑ نے اپنے پیش رو خلفائے کے طرز کو نبھانا چاہا اور  
کثرت روایت سے پرہیز ہی فرماتے رہے مگر زیادہ عرصہ تک یہ معاملہ متذکرہ بالا صورت  
حال کی موجودگی میں نبھ نہ سکا۔

اب یہ سوال کہ حضرت علیؑ کے طرز عمل کی اس تبدیلی سے کیا وہ مصلحت فوت نہیں ہوئی  
جس کی وجہ سے عہد نبوت اور حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے زمانے میں حدیثوں کی عام  
اشاعت و کتابت کی حوصلہ شکنی کی جاتی رہی تھی۔ علام اشاعت کی بنا پر یہ خطرہ کہ آئندہ  
آتے والوں کے درمیان ان روایتوں کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہو جائے گی کیسا  
اب باقی نہ رہا تھا تو اس کا جواب یہ ہے کہ اگرچہ حضرت علیؑ کی خلافت کا زمانہ عہد  
نبوت سے کچھ آٹھاد دور نہ تھا لیکن ایک طرف تو سیاسی حالات کی وہ پیش رفت جس  
نے حضرت عثمان کے آخری دور میں فتنے کی شکل اختیار کر لی تھی اور جس کی بنا پر

تقدس واحترام کے وہ جذبات جو امت مسلمہ کے اہلکار کے متعلق شیخین رضی اللہ عنہما کے عہد میں لوگوں کے اذہان میں پائے جاتے تھے اضمحلال پذیر ہونے لگے تھے دوسری طرف عبداللہ بن سبا اور اس کے کارندوں کی پیدا کردہ وہ صورت حال جس کا اُپر ذکر ہو چکا ہے جس نے مسلمانوں کی اجتماعی وحدت کو ہلا کر رکھ دیا تھا ان دونوں باتوں نے مل کر واقعی اس خطرے کا وجود باقی نہ رہنے دیا تھا جس کے پیش نظر روایت حدیث کی عام اشاعت سے پرہیز کیا جاتا تھا۔ چنانچہ آج ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی خلافت کے زمانہ میں یا اس کے بعد جو چیزیں لکھی گئیں یا جن کی زبانی عام اشاعت کی گئی ان کو امت مسلمہ میں وہ اہمیت حاصل نہیں ہوئی جس کا اندیشہ تھا:

**مکتوب مجموعوں کی تیاری** | بہر حال روایت حدیث میں حضرت علیؑ کے طرز عمل کی اس تبدیلی کا ایک سب سے بڑا ثائدہ یہ ہوا کہ صحابہ کو احادیث بنوہ کو تحریری شکل میں لانے کا خوب خوب موقع ملا جہاں حال یہ ہو کہ خود رسول کا خلیفہ راشد اپنے ہاتھ سے لکھ لکھ کر لوگوں کو احادیث کے مجموعے دے رہا ہو وہاں بھلا دوسروں کو اس کام سے روکنے والی کیا چیز ہو سکتی تھی۔ ہم نے کتابت حدیث اور صحابہ کے عنوان کے تحت جن جن صحابہ کرام کے بارے میں تفصیل کے ساتھ یہ بتلایا ہے کہ انہوں نے اپنی اپنی مرویات کے مکتوب مجموعے تیار کیے ہوئے تھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے اکثر نے یہ حدیثیں حضرت علیؑ کے طرز عمل کی اس تبدیلی کے بعد ہی قلم بند کی تھیں۔ ان میں سے صرف دو اصحاب یعنی حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص اور حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہما تو یقیناً اس سے مستثنیٰ ہیں اس لیے کہ ان دونوں اصحاب نے بنی کرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت پر بلکہ اگر یوں کہا جائے تو غلط نہ ہو گا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نگرانی میں احادیث کو قلم بند کیا تھا۔ بہر حال ان دو مستثنیات کو چھوڑ کر باقی جن جن صحابیوں کی طرف بھی یہ منسوب کیا گیا ہے کہ ان کی زندگی ہی میں ان کی روایتیں قلم بند ہو چکی تھیں اور جن کا ذکر



گذشتہ اوراق میں تفصیل سے ہو چکا ہے ان سب نے یہ کام بظاہر حضرت علیؓ کے طرز عمل میں متذکرہ تبدیلی ہی کے بعد کیا تھا۔ حضرت ابو ہریرہؓ کا پانچ ہزار سے اربڑ احادیث پر مشتمل کتابی ذخیرہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی ایک اونٹ کے بوجھ کے برابر کتابیں، حضرت عائشہؓ کے علم کے ان کے شاگردوں کے ہاتھوں تیار شدہ مکتوب مجموعے، حضرت عبداللہ ابن عمرؓ اور حضرت جابرؓ کے صحیفے وغیرہ یہ سب علیؓ نے بظاہر حضرت علیؓ کے طرز عمل میں تبدیلی کے بعد ہی وجود میں آئے۔ اس لحاظ سے حضرت علیؓ کے طرز عمل کی یہ تبدیلی وقت کا ایک اہم تقاضا اور قدرت کی طرف سے ایک انمول عطیہ ثابت ہوئی ۛ

---

# حفاظتِ حدیث اور تابعین و تبع تابعین

حفاظتِ حدیث سے متعلق اصل حقیقتِ حال کی وضاحت میں اب تک جو کچھ  
کہا گیا ہے وہ اگرچہ اپنی جگہ پر اس قدر کافی ہے کہ اب مزید کسی تفصیل و بیان کی ضرورت  
باقی نہیں رہی تاہم اب ہم مختصر طور پر ان کوششوں کا تذکرہ کرنا چاہتے ہیں جو  
تابعین اور تبع تابعین نے حفاظتِ حدیث کے سلسلے میں انجام دیں۔ قارئین نے  
اب تک محسوس کر لیا ہوگا کہ زیرِ نظر تحریر کا مقصد حدیث کی تاریخ مرتب کرنا نہیں ہے  
بلکہ ابتداء ہی سے ہمارے پیشِ نظر صرف یہ رہا ہے کہ منکرینِ حدیث کی جانب سے  
حدیث کے ذخیرے کو بے اعتماد بنانے کے لیے حفاظتِ حدیث کے ضمن میں شکوک و  
شہات کے جو پسائے کھڑے کیے گئے ہیں ان کا بے بنیاد اور اندر سے کھوکھلا  
ہونا ثابت کر دیا جائے اور قارئین گواہی دیں گے کہ الحمد للہ ہم اپنے اس مقصد  
میں پوری طرح کامیاب رہے ہیں۔

یہ بات کسی ثبوت کی محتاج نہیں ہے کہ حدیث کی حفاظت کے لیے تابعین  
اور تبع تابعین نے بھی صحابہ کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے حفظ اور کتابتِ دونوں  
سے کام لیا ہے۔

حفظِ حدیث کا اہتمام | جہاں تک حفظ سے کام لینے کا تعلق ہے قارئین دیکھ  
چکے ہیں کہ صحابہ کے زمانے سے ہی حفظِ حدیث کا  
رواج عام ہو چکا تھا یہ رواج بعد میں بھی نہ صرف قائم رہا بلکہ اور زیادہ ترقی

کرتا گیا لوگ جس طرح قرآن کو سبتاً سبتاً یاد کرتے تھے اسی طرح حدیث کے حفظ کا بھی اہتمام کرتے تھے۔ قرآن کے حفظ کے لیے جس طرح شروع ہی سے بچوں کو قرآن یاد کرنے پر لگا دیا جاتا ہے اسی طرح قرآن کے ساتھ ساتھ حدیث بھی زبانی یاد کرنے کے لیے لوگ اپنے بچوں کو اساتذہ کے پاس بھیجا کرتے تھے چنانچہ روایات سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے پاس بعض لوگ اپنے بچوں کو اسی مقصد کے لیے بھیجا کرتے تھے۔ محمد بن سیرین کو ان کے والد نے بچپن ہی سے حضرت ابو ہریرہ کے سپرد کر دیا تھا۔ محمد بن سیرین کے ایک بھائی یحییٰ نامی بھی تھے وہ بھی حضرت ابو ہریرہ کے پاس حدیث پڑھنے آیا کرتے تھے۔ حضرت عبداللہ ابن عباس کے غلام عکرمہ اپنی تعلیمی سرگزشت بیان کرتے ہوئے کہا کرتے تھے:

<p>حضرت ابن عباس میرے پاؤں میں قرآن اور حدیث کی تعلیم دینے کے لیے بیٹری ڈال دیتے تھے۔</p>	<p>كان ابن عباس يضع الكبد فـ رجل على تعليم القرآن والسنن - (تذكرة الحفاظ ص ۹)</p>
---	---

حضرت عبداللہ ابن عباس کا اپنے شاگردوں کے ساتھ یہ طرز عمل دراصل اس فکر اور اس توجہ کی نشاندہی کرتا ہے جو احادیث کو زبانی یاد کرانے میں اساتذہ اپنے شاگردوں پر صرف کرتے تھے۔ یہی نہیں بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح قرآن حفظ کرنے والوں کا آموختہ سنا جاتا ہے حدیث یاد کرنے والوں کا آموختہ بھی لوگ اسی طرح سنتے تھے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے بھانجے اور خصوصی شاگرد حضرت عروہ بن زبیر کے بارے میں ہے کہ وہ اپنے صاحبزادوں کو جو حدیثیں پڑھتے اور زبانی یاد کرتے ان کا آموختہ باقاعدہ سب بیٹوں کو سامنے بٹھا کر سنا کرتے تھے چنانچہ آپ کے بیٹے بیٹے ہشام بن عروہ اپنے تعلیمی دور کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کرتے کہ میرے والد مجھے

اور میرے دوست بھائیوں عبداللہ، عثمان اور اسماعیل وغیرہ کو حدیثیں پڑھا دیتے تو پھر ان کو ہم سے دوبارہ سنتے اور کہتے :

کَمْ رَوَا عَلِيٌّ وَكَانَ لِعَجَبٍ مِنْ | (جو کچھ یاد کیا ہے) مجھے سناؤ اور وہ میری یادداشت  
حفظی تاریخ کبیر بخاری ص ۱۱۱ | کو دیکھ کر بہت خوش ہوتے۔

حضرت عبداللہ ابن عباس بھی اپنے شاگردوں سے فرمایا کرتے کہ جو کچھ تم نے مجھ سے سُن کر یاد کیا ہے وہ میرے سامنے دوہراؤ۔ آپ کے شاگرد حضرت سعید ابن جبیر بتلاتے ہیں کہ حضرت عبداللہ ابن عباس مجھ سے کہا کرتے :

اَنْظُرْ كَيْفَ تَحَدِّثُ عَنِّي فَاِنَّكَ | مجھے بتاؤ تم مجھ سے حدیثیں کس طرح  
قَدْ حَفِظْتَ عَنِّي حَدِيثًا كَثِيرًا | روایت کر دگے کیونکہ تم نے حدیثوں کا  
(ابن سعد جلد ۲ ص ۱۱۱) | ایک کثیر ذخیرہ مجھ سے سُن کر یاد کیا ہے۔

**مذکورہ حدیث** | جس طرح قرآن کا ایک مرتبہ یاد کر دینا کافی نہیں سمجھا جاتا بلکہ بار بار اس کا دُور کرتے رہنا ضروری ہے اسی طرح نہ بانی یاد کرانی ہوتی  
احادیث کے بارے میں بھی ہر استاد اپنے شاگردوں کو یہی تاکید کرتا رہتا تھا کہ انہیں بار بار دُور ہر اتے رہو۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے مروی ہے وہ اپنے شاگردوں سے فرمایا کرتے تھے :

اَكْثِرُوا ذِكْرَ الْحَدِيثِ فَاِنَّكُمْ | حدیث کو بار بار دوہراتے رہو اگر ایسا نہ کرو  
اَنْ تَمُوتُوا تَفْعَلُوا يَدْرُسُ عَلَيْكُمْ | گے تو تمہارا علم فرسودہ ہو کر مٹ جائے گا۔  
(جامع بیان العلم جلد ۱ ص ۱۱۱)

حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ ان الفاظ میں بیان فرماتے :

تَذَاكُرُوا الْحَدِيثَ فَاِنْ حَيَاتُكُمْ | بار بار حدیث کو دوہراتے رہو۔ رسد اس کو  
مَذَكْرَتُهُ زَمْرَةٌ مَعَهُ الْحَدِيثُ لِلْحَاكِمِ | زندہ رکھنے کی بھی ایک شکل ہے۔

حدیث کا مذکورہ اصل میں قرآن کے دُور کی طرح ہے جس طرح حفاظ قرآن باہم مل کر ایک دُور سے کو اپنا یاد کیا ہوا قرآن بنایا کرتے ہیں اسی طرح باہم مل کر نہ بانی یاد

کی ہوئی احادیث کا اعادہ کرنے کو مذاکرہ سے تعبیر کیا جاتا تھا۔ احادیث کے باہمی مذاکرے کا طریقہ صحابہ ہی کے زمانے میں رواج پا گیا تھا چنانچہ حضرت جابر بن عبد اللہ کے حلقہ درس حدیث کا ذکر کرتے ہوئے عطا کہتے ہیں۔

<p>ہم حضرت جابر بن عبد اللہ کے پاس ہوتے اور وہ ہمیں حدیثیں سناتے بھر جب ان کے پاس سے باہر آتے تو ان کی بیان کردہ حدیثوں کو ہم باہم دوہراتے۔</p>	<p>كَانُوا يَكُونُ عِنْدَ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ فَيُحَدِّثُنَا فَاِذَا خَرَجْنَا مِنْ عِنْدِهِ تَذَاكُرْنَا حَدِيثَهُ (ابن سعد جلد ۵ صفحہ ۳۵۴)</p>
---	--

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ اپنے شاگردوں کو تاکید کرتے رہتے تھے کہ تذاکرہ الحدیث (ان سعد) | حدیث کا مذاکرہ کرتے رہو۔  
بلکہ حضرت ابوسعید خدریؓ تو یہاں تک فتویٰ دیتے کہ

<p>مذاکرۃ الحدیث افضل من قراءۃ القرآن (تدریب صفحہ ۱۸)۔</p>	<p>حدیث کا مذاکرہ قرآن پڑھنے سے بہتر ہے۔</p>
--	--

اسی طرح حضرت عبد اللہ بن عباس حدیث کا مذاکرہ کرتے رہنے کو شب بیدار رہ کر عبادت کرنے سے زیادہ افضل قرار دیتے تھے۔ تدریب الراوی ہی میں ہے کہ حضرت ابن عباسؓ اپنے تلامذہ کو مذاکرہ حدیث کی تاکید کرتے ہوئے فرماتے :

<p>مذاکرۃ العلم ماعنا خیر من احياء لیلۃ (تدریب صفحہ ۱۸)</p>	<p>علم کا مذاکرہ کرنا شب بیداری کی عبادت سے زیادہ بہتر ہے۔</p>
---	--

جاننے والے جانتے ہیں کہ اس زمانہ میں علم نام ہی حدیث کا تھا۔ غرض حدیث کے مذاکرے کا رواج صحابہ کے زمانے میں ہی عام ہو چکا تھا اور جس طریقے کو صحابہ نے پسند کیا تھا اس طریقے کو بھلا ان کے شاگرد کیسے چھوڑ دیتے بعد میں تو یہ طریقہ تعلیم حدیث کا ایک لازمی جزو بن گیا ہر استاد اپنے شاگردوں کو مذاکرہ حدیث کی تاکید کرتے

رہنا اپنا فرض خیال کرتا تھا حضرت حسن بصری اپنے شاگردوں کو فرماتے :

<p>علم کی آنت اس کا بھول جانا اور اس کا مذاکرہ چھوڑ دینا ہے۔</p>	<p>غَالِمَةُ الْعِلْمِ النَّيَانُ وَ تَوَلَّى الْمَذَاكِرَةَ (جامع بیان العلم ص ۱۳)</p>
--	---

عبدالرحمن بن ابی لیلیٰ اپنے تلامذہ سے کہتے :

<p>حدیث کو زندہ رکھنا اس کو دہراتے رہتے ہیں ہے پس دہراتے رہو۔</p>	<p>إِنَّ أَحْيَاءَ الْحَدِيثِ مَذَاكِرُهُ فَتَذَاكِرُوا (جامع ص ۱۳)</p>
---	---

عرض حدیث کا مذاکرہ کرتے رہنا حدیث کے پڑھنے پڑھانے والوں کے فرائض میں داخل سمجھا جاتا تھا۔ صرف تعلیم ہی کے دوران نہیں بلکہ ایام تعلیم کی مشغولیوں سے فارغ ہونے کے بعد بھی محدثین اپنی پڑھی ہوئی اور یاد کی ہوئی حدیثوں کو دہراتے رہتے۔ تھے باطل اس طرح جس طرح قرآن کے حافظ حفظ سے نادم ہوتے کے بعد بھی اس کا ذکر کرتے رہتے ہیں بعض محدثین کو اگر سننے والا کوئی نہ ملتا تو مذاکرہ حدیث کا فرض پورا کرنے کے لیے مکتب خانے چلے جاتے اور چھوٹے چھوٹے بچوں کو جمع کر کے انہیں اپنی یاد کی ہوئی حدیثیں سناتے۔ اسماعیل بن رجاہ کے بارے میں آتا ہے کہ

<p>اسماعیل مکتب خانے کے بچوں کو اکٹھا کرتے اور ان سے حدیثیں بیان کرتے تاکہ بھول نہ جائیں۔</p>	<p>إِنَّهُ كَانَ يَجْمَعُ حُصْبَانَ الْكِتَابِ فَيَجِدُّ لَهُمْ لِمَا يَنْسِي (جامع بیان العلم ص ۱۴)</p>
---	--

عطار خراسانی کے متعلق بھی بیان کیا گیا ہے کہ ان کی بھی یہی عادت تھی کہ جب کوئی نہ ملتا تو قریب جوار کے غریب کو جمع کرتے اور ان کو اپنی یاد کی ہوئی حدیثیں سناتے مقصود یہی ہوتا کہ تویاد کیا ہے وہ ذہن سے نکل نہ جائے۔ جامع بیان العلم ہی میں ایک روایت ہے کہ عطار خراسانی کی یہ عادت تھی کہ

<p>جب کوئی ان کو نہ ملتا تو مسالین کی جماعت میں</p>	<p>إِذَا لَمْ يَجِدْ أَحَدًا أَحْتِ</p>
---	---

الساکین فحدّثهم یومئذ بذلك | آکر ان بیٹ بیان کرتے مطلب حدیثوں  
محفظ (جامع بیان العلم جلد ۱ ص ۱۱۱) | کو یاد رکھنا تھا۔

بت ابراہیم نخعی اپنے شاگردوں کو مشورہ دیتے ہوئے کہا کرتے :

إذا سمعت حدیثاً فحدّث به | جب تم کوئی حدیث سنو تو سننے ہی دو سو دن  
حین تسمعه ولو أن تحدّث | سے بیاد، نرنا شذر نہ کرو خواہ کسی ایسے  
بد من لا یشہید۔ | ہی کے سنے کیون نہ ہو جو تم سے حدیث

(جامع بیان العلم ص ۱۱۱) | سنا نہ جاتا ہو۔

مقصود یہی تھا کہ کوئی سننے نہ سننے جو ماثبیں یاد کی ہیں وہ سنانے سے اور زبان سے  
دور ہراتے رہنے سے ذہن میں خوب محفوظ ہو جائیں۔

قرآن ہی کی طرح حدیث کے | غرض یہ تمام روایات اس پر شاہد ہیں کہ  
بھی حفظ کا اہتمام | محدثین کے درمیان قرآن ہی کی طرح  
بعض لوگوں سے تو صراحتہً اس قسم کے الفاظ میں منقول ہیں کہ ہمیں احادیث نبویہ  
قرآن کی طرح اہتمام کے ساتھ یاد کرنا چاہیے مثلاً ابن عباس نے اسماعیل بن عبد الرحمن  
کا قول نقل کیا ہے وہ کہا کرتے تھے :

ینبغی لنا أن نحفظ حدیث | ہم لوگوں کو چاہیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم  
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم | کی حدیثوں کو اسی طرح یاد کریں جس امرت ہم  
كما نحفظ القرآن۔ | قرآن یاد کرتے ہیں۔

(تاریخ دمشق جلد ۲ ص ۱۱۱)

مشہور حافظ حدیث ابن خزیمہ کے بارے میں تذکرۃ الحفاظ میں ذہبی نے ابراہیم نیشاپوری  
کے حوالے سے لکھا ہے کہ

كان ابن خزيمة يحفظ الفقهيات | فقہی حدیثوں کو ابن خزیمہ اسی طرح یاد کرتے

من حدیثہ کما یحفظ العتاری | تھے جس طرح قاری قرآنی سورتوں کو یاد  
السورۃ (تذکرہ جلد ۲ ص ۲۶۱)۔ | کرتا ہے۔  
اسی طرح اسرائیل بن یونس اپنے دادا ابواسحاق کی روایت کردہ حدیثوں کے متعلق  
خود کہا کرتے تھے :

كنت احفظ حدیث الجی | میں ابواسحاق کی روایتوں کو اسی طرح یاد کرتا  
اسحاق کما احفظ السورۃ من | تھا جس طرح میں قرآن کی سورت یاد  
القرآن (تذکرہ الحفاظ جلد ۲ ص ۱۹۱) | کرتا تھا۔

بہر حال اس میں کسی شک کی گنجائش نہیں ہے کہ راویان حدیث نے احادیث بنویہ زبانی  
یاد کرتے ہیں اسی طرح پوری توجہ اور محنت صرف کی جس طرح حفاظ قرآن کلام اللہ یاد  
کرتے ہیں پوری جانفشانی سے کام لیتے ہیں عام طور پر صحیح حدیث کی شرائط کو بیان  
کرتے ہوئے عدالت اور حفظ وغیرہ کے جو الفاظ ہمیں ملتے ہیں اس میں حفظ سے مراد  
یہ نہیں ہے کہ راوی کا حافظہ غیر معمولی طور پر قوی ہو تو صحیح حدیث کا راوی بن سکتا ہے  
بلکہ مراد یہی ہے کہ راوی نے حدیث کے یاد کرنے میں پوری توجہ اور محنت صرف کی ہو  
خواہ قوت حافظہ اس کی معمولی ہو یا غیر معمولی۔ یاد کر لینے کے بعد معمولی حافظے والے آدمی  
کی یاد کی ہوئی چیز اسی طرح بھروسے اور اعتماد کے قابل ہو جاتی ہے جس طرح کسی غیر معمولی  
حافظے والے کی۔ آخر یاد کرنے سے قرآن کے تیس پارے حفظ ہو جاتے ہیں اور ہر کوئی  
حفاظتِ سمان پر اعتماد کرتا ہے تو اسی لگن اور اسی محنت سے محدثین اگر حدیث کا ذخیرہ  
ذہن میں محفوظ کر لیتے تھے تو ان پر بے اعتمادی کا کیا سوال۔

محدثین کی قوتِ حافظہ اور یادداشت کے جو حیرت انگیز واقعات ہمیں رجال  
کی کتابوں میں ملتے ہیں وہ اس وقت تک ہی عجیب نظر آتے ہیں جب تک ہم انہیں  
محض غیر معمولی یادداشت کا کرشمہ سمجھتے۔ ہیں لیکن جب ہم اس حقیقت پر غور کرتے ہیں  
کہ محدثین احادیث بنویہ کو مبتدأً بمتأً ایک ایک دو در حدیث کر کے بڑی جانفشانی سے یاد



کرتے تھے اور پھر اپنا یاد کیا ہوا محفوظ رکھنے میں پوری توجہ اور محنت سے کام لیتے تھے تو ان واقعات میں تعجب اور حیرانی کی کوئی وجہ باقی نہیں رہتی اگرچہ اس کا بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ یہ نسبت پچھلوں کے اگلوں کا حفظ زیادہ قوی تھا تاہم قوت حفظ و یادداشت میں زیادہ تر دخل محدثین کی توجہ محنت اور جانفشانی کو تھا۔

**کتابت حدیث میں شغف کا عالم** | احادیث نبویہ کو اس قدر محنت اور توجہ سے حفظ کر لینے کے بعد اگرچہ اس

بات کی کوئی اہمیت نہیں رہتی کہ حفاظت حدیث کے لیے فن کتابت سے کام لیا گیا تھا یا نہیں تاہم ہم دیکھتے ہیں کہ حفظ کے ساتھ ساتھ تابعین و تبع تابعین نے احادیث کو قلم بند کرنے کا بھی اسی طرح اہتمام کیا جس طرح صحابہ کرام کو اپنے زمانے میں انہوں نے کرتے دیکھا اور سنا تھا۔ اس سلسلے میں جو جو خدمات تابعین و تبع تابعین کے ہاتھوں انجام پائیں ان کا تفصیلی ذکر تو آپ کو تاریخ و تدریس حدیث کی کتابوں میں ملے گا تاہم یہاں بھی ہم مختصراً ان خدمات کے پس منظر کے طور پر اپنے قارئین کو یہ دکھلانا چاہتے ہیں کہ تابعین و تبع تابعین کے زمانے میں حفاظت حدیث کے لیے فن کتابت سے کام لینے میں کسی قسم کی کوتاہی کو روا نہیں رکھا گیا۔

احادیث کو قلم بند کرنے میں محدثین کے شغف کا کیا عالم تھا اس کا اندازہ صرف اسی ایک واقعے سے کیا جاسکتا ہے کہ حضرت سعید بن جبیر کے بارے میں آتا ہے کہ لکھتے لکھتے جب ان کے کاغذ بھر جاتے تو جو کچھ سامنے آتا وہ اسی پر لکھنا شروع کر دیتے حتیٰ کہ اور کچھ نہ ملتا تو دارمی کی روایت کے مطابق اپنے ہاتھوں پر ہی لکھنا شروع کر دیتے۔ ہاتھ تو ہاتھ ان کو اور کچھ نظر نہ آتا تو اپنے جوتے پر ہی لکھنے لگتے یہاں تک کہ وہ بھی بھر جاتا چنانچہ طبقات ابن سعد کی ایک روایت میں ہے

سعید بن جبیر حضرت عبداللہ بن عباس سے سن کر لکھا کرتے تھے جب صحیفہ بھر جاتے

کان سعید بن جبیر یکتب عن ابن عباس فاذا ما اتمت

صحفہ، کتب فی لعلہ حق | تراپنے جوتے پر لکھتے حتی کہ وہ بھی  
ببلاہاد (ابن سعد جلد ۲ ص ۱۸) - | بھر جاتا -

حضرت سید ابن جبیر حضرت عبداللہ بن عباس کے ممتاز ترین شاگردوں میں سے ہیں  
حضرت عبداللہ بن عمر کے پاس بھی تحصیل حدیث کے لیے جایا کرتے تھے کبھی کبھی خود  
اپنی تعلیمی سرگزشت سناتے ہوئے لکھا کرتے تھے کہ

كنت أسير بين ابن عمرو ابن | میں عبداللہ بن عمر اور عبداللہ بن عباس کے  
عباس فكنت اسمع الحديث | پاس جاتا تو ان دونوں سے حدیث سن کر اونٹ  
منها فأكتبها على واسطة | کے کجاوے کی تختیوں پر لکھ لیتا پھر جب  
الرجل حتى أنزل فأكتبه - | اترتا تو اسے لکھ لیتا -  
(جامع بيان العلم جلد ۱ ص ۱۸)

محدثین اساتذہ اپنے شاگردوں کو تاکید کرتے رہتے تھے کہ جو حدیث سنوا سے قید  
تحریر میں لے آؤ۔ حضرت انس اپنے بیٹوں سے فرمایا کرتے یا بُنَّيْ قَيْدٌ وَاهَذَا لَعَلَّه  
(میرے بچو اس علم حدیث کو قید تحریر میں لے آ کر دو۔ دامی) یہی نہیں کہ احادیث کو قلم بند کرنے  
کی تاکید کرنے پر ہی اکتفا کرتے بلکہ روایات اس پر شاہد ہیں کہ اپنے سامنے بٹھا  
بٹھا کر لکھواتے چنانچہ دارمی ہی میں ہے راوی کہتا ہے کہ

رَأَيْتُ ابَانَ يَكْتُبُ عِنْدَ أَنَسٍ | میں نے ابان کو دیکھا کہ حضرت انسؓ کے  
(دامی) | پاس بیٹھ لکھ رہے ہیں۔

اسی طرح حضرت عبداللہ بن عمر کے مولیٰ حضرت نافعؓ کے بارے میں ہے کہ وہ اپنے  
شاگردوں کو اپنے سامنے بٹھا لیتے اور جو حدیثیں حضرت نافعؓ سناتے جاتے شاگرد لکھتے  
جاتے۔ دارمی ہی کی ایک روایت میں ہے بلکہ طبقات ابن سعد میں بھی یہ روایت موجود  
ہے سلمان بن موسیٰ کہتے ہیں کہ انہوں نے

أَنَّهُ رَأَى نَافِعًا مَوْلَى ابْنِ عَمَرَ | ابن عمرؓ کے مولیٰ نافعؓ کو دیکھا کہ لوگ انکے  
سامنے بیٹھ لکھ رہے ہیں۔ |

ہی نہیں کہ شاگرد اپنے طور پر لکھتے تھے بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت نافع باقاعدہ اپنے شاگردوں کو املا کرتے تھے ایک روایت میں اس کی تصریح موجود ہے سنن داری ہی کی روایت ہے کہ

نافع ہونانی ابن عمر بنی العلاء  
علیٰ طلابہ وطلابہ یکتبون  
بین یدیدہ - سنن داری جلد ۱۲۲ تا ۱۲۹

نافع مولیٰ ابن عمر اپنے طالب علموں کو علم (حدیث) کا املا کرتے اور طالب علم ان کے سامنے بیٹھ کر لکھا کرتے تھے۔

حضرت عطاء بن ابی رباح مشہور تابعی ہیں داری ہی کی ایک روایت کے مطابق وہ خود بھی احادیث لکھتے بچوں کو بھی لکھاتے اور طلبہ بھی ان کے سامنے بیٹھ کر لکھتے رہتے۔ کتابت حدیث کے لیے ان کی لگن کا عالم یہ تھا کہ بچوں کو بلا بلا کر بٹھاتے اور کہتے کہ حدیثیں لکھو جن کو لکھنا نہ آتا ان کو خود لکھ کر دیتے جن کے پاس کاغذ نہ ہوتا ان کو کاغذ بھی اپنے پاس سے دیتے چنانچہ ابی حکیم الہمدانی کہتے ہیں :

کنت عند عطاء بن ابی رباح  
ونحن غلمان فقال یا غلمان اقلوا  
اكتبوا فمن كان منكم لا يحسن  
کتبنا له ومن لم یکن معه  
قرطاس اعطینا من عندنا۔  
(الحدث الفاضل)

میں عطاء بن ابی رباح کے پاس تھا اور ہم اس وقت بچے تھے آپ نے فرمایا بچو ادھر آؤ اور لکھو تم میں جو اچھا نہیں لکھتا اسے ہم لکھ دیں گے اور جس کے پاس کاغذ نہیں ہے ہم اسے اپنے پاس سے کاغذ دیں گے۔

حضرت عامر الشعمیؓ جو کوفے کے بلند پایہ تابعین میں سے ہیں اور جنہوں نے حضرت علیؓ حضرت ابو ہریرہؓ حضرت عائشہؓ اور دیگر متعدد صحابہ سے روایت کی ہے اپنے شاگردوں کو کتابت حدیث کی تاکید کرتے ہوئے کہا کرتے :

إذا سمعتم منی شیئاً فاکتوبوا  
ولو فی حالط (جامع جلد ۱ ص ۳۳)

جب تم مجھ سے سنو تو لکھ لو خواہ دیوار پر ہی کیوں نہ ہو۔

”قنادہ بن دعامة السدوسی کے بارے میں ہے کہ جب کوئی ان سے کتابت حدیث کے بارے میں سوال کرتا تو جواب میں بڑے ہی پتے کی بات ارشاد فرماتے آپ سائل سے مخاطب ہو کر کہتے :

<p>تجھے لکھنے سے کون منع کرتا ہے جبکہ لطیف و نجیر کہتا ہے کہ وہ لکھتا ہے (پھر یہ آیت پڑھتے) فرمایا اس کا علم میرے رب کے پاس لکھا ہوا ہے۔</p>	<p>وَمَا يَمْنَعُكَ أَنْ تَكْتُبَ وَاخْبُرْ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ إِنَّهُ يَكْتُبُ قَالَ عَلَيْهَا عِنْدَ رَبِّي فِي كِتَابِ الْآيَةِ (تفہیم العلم ص ۱۳۱)</p>
--	---

**مکتوب مجموع** | غرض اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ کتابت حدیث کے ساتھ اس درجے کے شغف کی موجودگی میں احادیث کے کتنے مجموعے کتابی شکل میں تیار ہو گئے ہوں گے امام نہری کے علاوہ جن کی کتابیں کئی اونٹوں کا بوجھ بنتی تھیں دیگر وہ لوگ جن کے بارے میں تصریح کے ساتھ روایات میں یہ آتا ہے کہ ان کے پاس احادیث کے مکتوب مجموعے موجود تھے ان میں عروہ بن زبیر (۹۳ھ) خالد بن معدان الکلاعی (۱۰۴ھ) ابو قلابہ عبد اللہ بن زید الجری (۱۰۴ھ) حسن بصری (۱۱۰ھ) مکحول شامی (۱۱۲ھ) محمد باقر علی بن الحسن (۱۱۴ھ) بکیر بن عبد اللہ بن الاشج (۱۱۷ھ) قیس بن سعد المالکی (۱۱۷ھ) اور قنادہ بن دعامة السدوسی (۱۱۸ھ) کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان حضرات کے علاوہ بھی متعدد تابعین اور ان کے تلامذہ کے بارے میں یہ ذکر رجال کی کتابوں میں ملتا ہے کہ ان کے پاس احادیث نبویہ کے مکتوب ذخیرے تھے ۔

**صحیفہ ہمام ابن منبہ** | حضرت ہمام ابن منبہ کے بارے میں گذر ہی چکا ہے کہ انہوں نے اپنے استاد حضرت ابو ہریرہ کی روایات کا مجموعہ تیار کیا تھا۔ اگرچہ یہ مجموعہ صحیفہ ہمام ابن منبہ کے نام سے مشہور ہے مگر بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مجموعے کا نام الصحیفۃ الصیغۃ ہے۔

اپنی عمر کے آخری ایام تک حضرت ہمام ابن منبہ اپنے اس صحیفے کا باتا علاوہ درس دیتے رہے اور املا کراتے تھے آپ کے بعد آپ کے شاگرد عمر بن راشد یمنی نے اس صحیفے سے روایت کا سلسلہ جاری رکھا پھر عمر سے ان کے تلمیذ رشید عبدالرزاق بن نافع الحمیری اور پھر ان سے ان کے شاگرد ابوالحسن احمد بن یوسف السلمی اس صحیفے کو روایت کرتے رہے اور پھر اسی طرح نسف و نسل یہ صحیفہ روایت ہوتا رہا۔ عبدالرزاق بن نافع الحمیری کا سے امام احمد بن حنبل نے اس صحیفے کو روایت کیا اور اسے اپنی مسند کے باب ابو ہریرہ کی ایک خاص فسل میں جو کاتوں میں ضم کر دیا ۛ

**حضرت عمر بن عبدالعزیز کی مساعی** | علاوہ ازیں حضرت عمر بن عبدالعزیز کی مساعی سے جمع و تدوین حدیث کا جو

مہتمم بالشان کام انجام پایا وہ سب کے سامنے ہے۔ آپ نے جمع و تدوین حدیث کا کام جن لوگوں کے سپرد کیا تھا ان میں نمایاں لوگ حضرت ابوبکر بن محمد بن عمرو بن خرم تھام بن محمد بن ابی بکر اور محمد بن مسلم بن شہاب زہری ہیں۔

ابوبکر بن محمد عامل مدینہ تھے ان کو احادیث بنویں جمع کرنے کا حکم دیتے ہوئے حضرت عمر بن عبدالعزیز نے لکھا تھا:

جو کچھ تمہارے ہاں حدیث رسول میں سے ہے یا حدیث عمرہ سے ثابت ہے وہ مجھے لکھ بھیج کر کہ علم کے مٹ جانے اور غائب ہو جانے کا ڈر ہے۔

اَكْتَبَ إِلَى مَا ثَبَتَ عِنْدَكَ مِنَ  
الْحَدِيثِ مِنْ رَسُولِ اللَّهِ وَبِحَدِيثِ  
عُمَرَ فَإِنِّي خَشِيتُ مَدْرَسَ  
الْعِلْمِ وَذَهَابَهُ۔

(سنن دارمی جلد ۱ ص ۱۲)

یہ عمرہ جن کا اس روایت میں ذکر ہے عمرہ بنت عبدالرحمان ہیں جنہوں نے حضرت عائشہ کے پاس پرورش پائی تھی اور جو حضرت عائشہ کے علم کی امین سمجھی جاتی تھیں۔ یہ خالہ تھیں

حضرت ابو بکر بن محمد کی ۔

اسی قسم کا حکم حضرت عمر بن عبدالعزیز نے قاسم بن محمد بن ابی بکر کو دیا تھا جو مدینہ کے فقہا میں سے تھے یہ بھی اپنی پھوپھی حضرت عائشہؓ کے علم کے امین خیال کیے جاتے تھے کیونکہ انہوں نے بھی حضرت عائشہؓ ہی کی آغوش میں پرورش پائی تھی اور ان سے ہی علم حاصل کیا تھا ۔

تیسرے شخص جن کو حضرت عمر بن عبدالعزیز نے جمع حدیث کا کام سونپا تھا امام ابن شہاب زہری ہیں ۔ احادیث جمع کرنے میں ان کے ضعف کا عالم یہ تھا کہ گھر گھر جاتے اور جو شخص ملتا اس سے حدیث نبوی کے بارے میں سوال کرتے ۔ جوانوں اور چھڑ عمر کے لوگوں اور بوڑھوں سے حتیٰ کہ پردہ دار خواتین تک سے احادیث معلوم کر کے قلم بند کرتے جاتے ۔ احادیث جمع کرنے میں ان کی اس لگن کا حال بیان کرتے ہوئے ابراہیم بن سعد بن ابراہیم اپنے والد کے حوالے سے کہتے ہیں کہ

میں نے والد صاحب سے کہا کہ زہری کو کیسے فوقیت ہوئی تو کہنے لگے کہ وہ مجالس میں پہلے آتے اور مجلس میں بوڑھے جوان ہر ایک سے سوال کرتے پھر وہ انصاء کے گھروں میں سے کسی گھر جاتے تو وہاں بوڑھے جوان ، بوڑھی اور ادھیڑ عمر کی عورت جو بھی ملتا اس سے پوچھتے تھے کہ پردہ دار خواتین سے بھی ۔

قلت لابی بن قاصم ابن شہاب  
قال کان یأتی المجالس من صغرها  
ولا یلقی فی المجالس کھلاً الا سألہ  
ولا شاباً الا سألہ ثم یأتی  
الدار من دور الانصار فلا یلقی  
فیہا شاباً الا سألہ ولا کھلاً ولا  
عجوزاً ولا کھلة الا سألہ حتی  
یحاول ربات المجالس ۔

(تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۴۳۹)۔

امام ابن شہاب زہریؒ کی اپنی کوششوں کے نتیجہ میں وہ مکتوب ذخیرہ تیار ہوا تھا جس کے بارے میں آتا ہے کہ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے کے لیے کئی اونٹ

درکار ہوتے تھے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز نے ان تین حضرات کے علاوہ بھی اپنے تمام عمال کے نام یہ فرمان جاری کر دیا تھا کہ بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جو حدیث ملے لے کر آ کر لو۔ سننِ داری میں ہے کہ آپ نے اپنے عمال کو لکھا :

<p>رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کو دیکھو تو اس کو لکھ لو کہ علم کے مٹ جانے اور اہلِ علم کے اٹھ جانے کا اندیشہ ہے۔</p>	<p>الظروف احديث رسول الله صلى الله عليه وسلم فاكثروا فاني خفت مدونتي العلم وذهاب اهلها (دکھا جدا ص ۱۱)</p>
---	--

غرض حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اس واقعہ کو جو طریقہ بھی ممکن تھا وہ اختیار کیا۔ اس طرح جو ذخیرہ اکٹھا ہوا اس کو ابن شہاب زہری نے ترتیب و تہذیب سے مرتب کیا۔ یہ وہ ترتیب و تہذیب ہے جسے ہم تدوین حدیث کا پہلا قدم قرار دیتے ہیں یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز کی ان کوششوں کے نتیجے میں حدیث کا جو مکتوب ذخیرہ تیار ہوا اسے ہم تدوین حدیث کا پہلا قدم قرار دے رہے ہیں کتاب حدیث کا نہیں۔ حکمران حدیث اپنی مقصد برآری کی خاطر تدوین اور کتابت دونوں کو گڈا کر دیتے ہیں اس لیے مخالفت حدیث کے سلسلے میں ان دونوں کے فرق کو ابھی طرح ذہن نشین کر لینے کی ضرورت ہے۔ تاہم دیکھ چکے ہیں کہ جہاں تک کتابت حدیث کا تعلق ہے وہ بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے زمانے میں شروع ہو چکی تھی بعد میں وہ روز افزوں ترقی کرتی گئی اور حدیث کے لاتعداد مکتوب مجموعے تیار ہوئے حضرت عمر بن عبدالعزیز کے زمانے میں جو کچھ ہوا وہ ان مکتوب مجموعوں کی باقاعدہ تدوین تھی جس کی آخری شکل ابن شہاب زہری کے ہاتھوں وجود میں آئی اور اسی لیے ان کو اولین مدون حدیث کے لقب سے یاد کیا گیا۔ علمائے حدیث کا قول ہے :

<p>اول من دقن العلم ابن شہاب (مقدم احادیث ص ۱۲)</p>	<p>پہلا شخص جس نے علم (حدیث) کو مدون کیا وہ ابن شہاب ہیں۔</p>
---	---

امام ابن شہاب زہری خود بھی اپنے بارے میں کہا کرتے تھے :

<p>اس علم کو مجھ سے پہلے کسی نے مدون نہیں کیا۔</p>	<p>لَمْ يَدُونْ هَذَا الْعِلْمَ أَحَدٌ قَبْلَ تَدْوِينِي (تدوين الراوی ص ۱۸)۔</p>
--	---

غرض امام ابن شہاب زہری کے ہاتھوں تدوین شدہ حدیث کے اس ذخیرے کو مختلف رسائل کی شکل میں حضرت عمر بن عبدالعزیز نے تمام ملک میں پھیلا دیا چنانچہ امام زہری ہی کا بیان ہے :

<p>ہمیں عمر بن عبدالعزیز نے احادیث جمع کرنے کا حکم دیا تو ہم نے مختلف رسائل لکھے حضرت عمر نے ان تمام علاقوں میں جن پر ان کا اقتدار تھا یہ رسائل بھیجے۔</p>	<p>أَمْرًا عُمَرَ بْنَ عَبْدِ الْعَزِيزِ لَجَمِيعِ الْمَسْنَنِ فَكُتِبَتْهَا دَفْتَرًا دَفْتَرًا فَبُعِثَتْ إِلَى كُلِّ أَرْضٍ لَهُ عَلَيْهَا سُلْطَانٌ دَفْتَرًا۔ (جامع بیان العلم جلد ۱ ص ۱۸)</p>
--	---

امام زہری کی اس تالیف کے بعد تو پھر مختلف تالیفات کا تانا بانا بندھ گیا۔ امام زہری کی راہ پر چلتے ہوئے مختلف شہروں کے بڑے بڑے جلیل القدر محدثین تدوین حدیث کے کام میں مشغول ہو گئے۔ چنانچہ مکہ معظمہ میں ابن جریج نے، مدینہ طیبہ میں امام مالک بن انس اور صاحب المغازی محمد بن اسحاق نے، بصرہ میں ربیع بن صبیح اور سعید بن عروبہ نیز حماد بن سلمہ نے کوفہ میں سفیان ثوری نے، شام میں امام اوزاعی نے، یمن میں معمر نے، مصر میں یسٹ بن سعد نے، واسطہ میں شمیم نے، رے میں جریر بن عبدالحمید نے اور خراسان میں عبداللہ بن مبارک نے تدوین حدیث کے میدان میں بڑی قابل قدر خدمات انجام دیں۔ تدوین حدیث کا یوں سمجھ لیجئے یہ پہلا دور تھا جو دوسری صدی ہجری کے اواخر تک جاری رہا کیونکہ اس سلسلے کے سب سے آخری آدمی حضرت عبداللہ بن مبارک ہیں جن کی وفات ۱۸۱ھ میں ہوئی۔ اس دور کے مدونات میں سے ہم تک فقط مرطا امام مالک پہنچی ہے۔ اس دور میں دو قسم کی تالیفات مرتب ہوئیں ایک قسم وہ



جس میں صحیح اسناد کا التزام نہیں کیا گیا بلکہ جو حدیث پہنچی درج کر دی گئی اور دوسری قسم وہ جس میں صحت کا التزام کیا گیا مگر پھر بھی مرفوع احادیث کا التزام کرنا ضروری نہیں سمجھا گیا بلکہ مرسل، منقطع اور آثار صحابہ حتیٰ کہ اقوال تابعین کو بھی مرفوع احادیث کے ساتھ مخلوط رکھا گیا۔

تیسری صدی ہجری کی ابتدا میں جب تدوین حدیث کا دوسرا دور شروع ہوا تو محدثین نے ضرورت محسوس کی کہ احادیث مرفوعہ کو مراسیل و آثار سے بالکل الگ کر دیا جائے چنانچہ اس دور کی تصانیف میں مرفوع احادیث کو دوسری تمام چیزوں سے علیحدہ کر دیا گیا اور احادیث کو صحابہ کی ترتیب پر جمع کیا گیا۔ اس قسم کے مجموعوں کو مسند کا نام دیا گیا۔ مشہور بلاد اسلامیہ میں بڑے بڑے محدثین نے مسانید تالیف کیں چنانچہ کوفہ میں عبداللہ بن مرسل نے، بصرہ میں مسدود بن مسرید نے اور مصر میں یعقوب بن شیبہ مالکی نے صحابہ کی ترتیب پر نزائیف تالیف کیں۔ یعقوب بن شیبہ مالکی نے تو اتنا ضخیم مسند لکھنا شروع کیا تھا کہ اگر اختتام تک پہنچتا تو تقریباً دو سو جلدوں کا ذخیرہ ہوتا۔ علی ہذا القیاس سمرقند میں حافظ حسن بن احمد بن محمد نے مسانید لکھیں امام فہرستی نے لکھا ہے کہ انہوں نے اتنی بڑی کتاب لکھی تھی کہ اس میں ایک لاکھ بیس ہزار احادیث کا ذخیرہ تھا اسی قبیل سے مسند امام احمد بن حنبل ہے اس میں انہوں نے اپنی حفظ کی ہوئی سترہ لاکھ پچاس ہزار احادیث میں سے انتخاب کر کے ایک لاکھ چالیس ہزار احادیث اپنی مسند میں جمع کیں ائمہ اربعہ میں سے امام شافعی اور امام ابو حنیفہ کے مسند بھی ہیں لیکن علماء کا خیال ہے کہ یہ دونوں مسند

۱۔ مرفوع وہ حدیث ہے جس میں کوئی صحابی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی فعل یا قول کی خبر دے جبکہ مرسل وہ حدیث ہے جس میں تابعی پہلے صحابی راوی کا ذکر نہ کرے اور منقطع وہ حدیث ہے جس کی اسناد میں مختلف راوی مختلف مقامات سے حذف کر دیے گئے

خود اماموں کے تالیف کردہ نہیں ہیں بلکہ بعد میں کسی نے جمع کیے ہیں۔ بہر حال تدوین حدیث کے اس دوسرے دور کی تصانیف میں مرفوع احادیث غیر مرفوع احادیث سے علیحدہ ہو گئیں تاہم ایک کام اس دور کی تصانیف میں بھی باقی رہا وہ یہ کہ احادیث مرفوعہ کی تخریج میں صحت کا پورا پورا التزام نہیں کیا گیا صحیح، حسن اور ضعیف سب ملی جلی رہیں۔

یہ کام تدوین حدیث کے تیسرے دور میں انجام پایا جو تیسری صدی ہجری کے تقریباً نصف سے شروع ہوتا ہے اس دور میں سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے امام بخاری کو اس خدمت کے لیے منتخب کیا۔ امام بخاری نے اپنی حفظ کی ہوئی پچھ لاکھ احادیث میں سے انتخاب کر کے صحیح بخاری مرتب کی۔ ہر حدیث کے انتخاب میں پورے حزم و احتیاط اور غایت اہتمام سے کام لیا اول ہر حدیث کی صحت کو مکمل غور و فکر سے جانچا پھر ہر حدیث کی تخریج سے پہلے غسل کیا اور دو رکعت صلوٰۃ الاستخارہ پڑھی اس کے بعد جب اس حدیث کی تخریج پر پوری طرح رائے جم گئی تب اس کو اپنی صحیح میں درج کیا اسی اہتمام کے ساتھ پوری کتاب کی تصنیف سے سولہ سال کی مدت میں فارغ ہوئے وہ حدیثیں جو اس کتاب میں جمع ہوئیں ان سب کی مجموعی تعداد مکررات، تعلقات اور مقابلات سب ملا کر نو ہزار بیاسی بنی۔

امام بخاری کے بعد امام مسلم نے اپنی صحیح مرتب کی۔ انہوں نے اپنی صحیح کا انتخاب تین لاکھ ایسی روایات سے کیا جن کو انہوں نے براہ راست اپنے شیوخ سے سنا تھا پھر اس میں بھی صرف اپنی ذاتی تحقیق پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ مزید احتیاط کے پیش نظر صرف وہی حدیثیں درج کیں جن کی صحت پر مشائخ وقت کا بھی اتفاق تھا اس پر بھی مزید یہ کہ کتاب مکمل ہونے پر اپنے زمانے کے زیر دست حافظ حدیث حضرت ابو زرہ عسکریؒ کی خدمت میں اسے پیش کیا حضرت ابو زرہ علی حدیث اور فن جرح و تعدیل کے امام مانے جاتے تھے۔ صحیح مسلم کی جس جس روایت کے بارے میں انہوں نے کسی علت کی طرف اشارہ کیا امام مسلم نے اسے اپنی کتاب سے خارج کر دیا اس طرح پندرہ سال کی محنت شاقہ کے بعد

بارہ ہزار احادیث صحیحہ پر مشتمل یہ مجموعہ تیار ہوا۔

علمائے کرام کا اس بات پر اتفاق ہے کہ قرآن کریم کے بعد اصح الکتاب یعنی تمام کتابوں میں سب سے زیادہ صحیح ہی دو کتابیں صحیح بخاری اور صحیح مسلم ہیں۔ ساری امت ان دونوں کتابوں کے قبول و استناد پر متفق ہے۔ صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی اشاعت کے بعد تو مدونات حدیث کا کبھی نہ ختم ہونے والا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا جن کے بارے میں تفصیلی معلومات کے لیے تاریخ حدیث کی کتابوں کی طرف رجوع کیا جاسکتا ہے چونکہ ان کتابوں کی اشاعت کے بعد ان روایتوں کی حیثیت جن پر حدیث کی یہ کتابیں مشتمل ہیں متواتر روایتوں کی ہو گئی ہے اور اپنے مصنفین کی طرف نسبت کے اعتبار سے یہ تمام کتابیں ہر قسم کے تسکوک و شبہات سے بالاتر ہو چکی ہیں اس لیے حفاظت حدیث کے سلسلے میں جو زیر نظر تحریر کا اصل موضوع تھا اب مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہیں رہی۔

جُزْءِ دُوم

مَحْمُودِیٰ حَیْث

# هُوَ الَّذِي

بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِنْهُمْ  
يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ  
وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ.

(الجمعة، ٢)

# قرآن کی جامعیت

منکرین حدیث کی جانب سے حفاظت حدیث کے سلسلے میں جو شکوک و شبہات عام سادہ لوح مسلمانوں کے ذہنوں کو مسموم کرنے کے لیے اٹھائے جاتے ہیں ان سب کا تفصیلی جائزہ زیر نظر تحریر کے پہلے حصے میں لیا جا چکا ہے۔ اب ہم منکرین حدیث کے ان اعتراضات کی طرف رخ کرتے ہیں جو حجیت حدیث کو مشکوک بنانے کے لیے ان لوگوں کی جانب سے طرح طرح کے انداز بدل کر بار بار پیش کیے جاتے ہیں۔

منکرین حدیث کا دعویٰ اور دلائل

وہ بات جو اس سلسلے میں نہایت شد و مد کے ساتھ اور بہت ہی نمایاں انداز میں پیش کی جاتی ہے یہ ہے کہ قرآن اپنے آپ میں ایک جامع اور مفصل و مکمل کتاب ہے اس کی موجودگی میں ہمیں کسی دوسری چیز کی ضرورت نہیں۔ منکرین حدیث اس بات کو زیادہ سے زیادہ جاذب توجہ بنانے کے لیے نئے نئے انداز اختیار کرتے ہیں کبھی کہتے ہیں کہ ہم عامل بالقرآن ہیں ہم سے زیادہ قرآن پر عمل کرنے والا کوئی نہیں کبھی کہتے ہیں ہمارے لیے جو کچھ ہے قرآن ہے تمام احکام شریعت کا منبع وہی ہے اور کبھی بڑے ہی فصیح و بلیغ انداز میں یہ ثابت کرتے ہیں کہ ماخذ دین ہونے کی حیثیت سے قرآن ہمیں ہر کسی دوسری چیز سے بے نیاز کر دیتا ہے۔ یہ تمام باتیں اپنی جگہ پر بڑی جاذب توجہ ہیں اور ظاہر نظر میں بڑی حسین نظر آتی ہیں خصوصاً جب یہ باتیں ایک عام آدمی کے سامنے بڑے ہی منطقی انداز میں اور پورے خطیبانہ رنگ کے ساتھ پیش کی جاتی ہیں تو فوراً ان کے دل و دماغ کو متاثر کرتی ہیں کون مسلمان ایسا ہے جو اس بات سے انکاری ہو سکتا ہے کہ قرآن ایک جامع اور مکمل و مفصل

کتاب ہے کون ایسا ہے جو قرآن کو تمام احکام شریعت کا منبع نہیں مانتا یا کون مسلمان ایسا ہے جو قرآن کے ماخذ دین ہونے کی حیثیت کو چیلنج کرتا ہو لیکن دیکھنا تو یہ ہے کہ ان تمام باتوں سے کیا منکرین حدیث کی وہی مراد ہے جو سید سے سادے طریقے سے ان باتوں سے ایک عام آدمی کی سمجھ میں آتی ہے۔ بے چارے سادہ لوح عام مسلمانوں کو کیا پتہ کہ ان خوبصورت الفاظ کے پیچھے معاذ دین حدیث نے خود تراشیدہ معانی کا کیسا تانا بانا بنا ہوا ہے۔ انہیں کیا معلوم کہ منکرین حدیث دراصل کہنا یہ چاہتے ہیں کہ قرآن کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کے لیے ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات کی اتباع اور آپ کے طریقہ کار کی پیروی کی کوئی ضرورت نہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آیات قرآن کی تفسیر میں جو کچھ فرمایا، احکام قرآنی پر جس طرح عمل کر کے دکھایا اور قرآنی نظام پر مبنی جس طرح ایک مکمل معاشرہ قائم کر کے دکھایا ان سب کو ایک طرف رکھ دو اس لیے کہ یہ سب کچھ اس وقت کے حالات و واقعات کے مطابق تھا جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کو اس وقت کی زندگی پر منطبق کر کے دکھایا اسی طرح ہم بھی آج کی زندگی پر اپنی سمجھ اور اپنی عقل کی مدد سے قرآن کو منطبق کر سکتے ہیں۔ منکرین حدیث کا دراصل دعویٰ یہ ہے کہ ہم صاحب وحی کی مدد کے بغیر ہی وحی الہی کی اصل مراد معلوم کر لینے کی صلاحیت سے اسی طرح بہرہ ور ہیں جس طرح خود صاحب وحی تھا ان کی نظر میں اللہ کا پیغام پہنچا دینے کے بعد نبی کا کام ختم ہو جاتا ہے اس کے بعد سے لوگوں سے کچھ کہنے سننے کا کوئی حق نہیں رہتا اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچا دینے کے بعد نبی کی حیثیت ایک عام آدمی کی سی رہ جاتی ہے۔

قرآن کی بامعیت اور اس کے منبع احکام شریعت ہونے کا اگر یہی مفہوم ہے جو منکرین حدیث پیش کرتے ہیں تو ہر صادق القول مسلمان یقیناً اس سے بہرہ رسانی کا اظہار کرے گا کوئی سچا مسلمان یہ تصور بھی نہیں کر سکتا کہ وہ ہادی برحق حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کا رسول اور نبی تو تسلیم کرے مگر آپ کے اقوال

اور آپ کے افعال کو حجت ماننے سے انکار کر دے۔

قرآن کی جامعیت کا اصل مفہوم کیا ہے اس پر گفتگو کرنے سے پہلے مناسبت معلوم ہوتا ہے کہ ان دلائل کا جائزہ لے لیا جائے جو منکرین حدیث کی طرف سے اس سلسلے میں اپنے مزعومہ مفہوم کو ثابت کرنے کے لیے پیش کیے جاتے ہیں :

**قرآن مفصل ہے** | منکرین حدیث اپنے دعوے کے ثبوت میں جن آیات قرآنی کو بطور استشہاد پیش کیا کرتے ہیں ان میں نمایاں حیثیت ان آیات کو حاصل ہے جن میں قرآن کے لیے تفصیلاً لَکُلِّ شَیْءٍ اَوْ رَبِّیْنَآ اِلَکُلِّ شَیْءٍ کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں مثلاً سورہ نحل میں ہے :

وَنَزَّلْنَا عَلَیْكَ الْكِتَابَ تِبْیَانًا لِّکُلِّ شَیْءٍ (النحل ۸۹) | اور ہم نے آپ پر کتاب اتاری جو ہر چیز کا کھلا بیان ہے۔

منکرین حدیث کا کہنا یہ ہے کہ جب قرآن نے اپنے بارے میں خود اعلان کر دیا ہے کہ وہ ہر چیز کی پوری تفصیل اور ہر شے کے پورے بیان کا حامل ہے تو پھر قرآن سے باہر جانے کی کیا ضرورت ہے۔ قرآن میں ہر مسئلہ کی تفصیل موجود ہے قرآن نے تمام اصول و فروع اور تمام کلیات و جزئیات کو مفصل طور سے اور کھول کھول کر بیان کر دیا ہے تو پھر حدیث کی ضرورت ہی کیا رہ گئی۔ منکرین حدیث کے نزدیک تفصیلاً لَکُلِّ شَیْءٍ اَوْ رَبِّیْنَآ اِلَکُلِّ شَیْءٍ کے الفاظ اس بات کا ثبوت ہیں کہ شریعت کا کوئی معمول سے معمولی مسئلہ بھی ایسا نہیں ہے جو قرآن میں تفصیل و وضاحت سے نہ ملتا ہو۔

قرآن کی جامعیت کے بارے میں منکرین حدیث کا یہ دعویٰ اس قدر مضحکہ خیز ہے کہ خود آپ اپنی تردید کر رہے ہیں اسی کتاب کا وجود ممکن ہی نہیں جس میں تمام جزئیات محصور ہوں۔ جزئیات تو لامحدود ہیں اور ہر ہر قدم پر نئی نئی حاجتیں پیش آتی رہتی ہیں۔ جزئیات کا عالم تو یہ ہے کہ قرآن کو نازل ہوئے آج چودہ سو سال ہونے کو آئے اور آج تک اس کی تمام جزئیات کا احاطہ نہیں ہو سکا قرآن کی جزئیات



بیان کرنے کے لیے حدیث کی سینکڑوں جلدیں وجود میں آ گئیں تفسیر وفقہ کے کمرلوں صفحات پر مشتمل ضخیم ذخیرے مرتب ہو گئے مگر کوئی نہیں کہہ سکتا کہ ان سب میں مل کر بھی تمام جزئیات محصور ہو گئی ہیں اگر ان چودہ صدیوں میں صرف ان مسائل کو جمع کیا جائے جو وضو اور غسل و طہارت کے لیے پیش آتے ہیں تو قرآن کریم سے کم ضخیم جلد تیار نہ ہو۔ ایسا ہی معاملہ دیگر مسائل کا ہے اور ابھی بہت سی جزئیات ایسی بھی ہوں گی جو ابھی وجود ہی میں نہیں آئیں قیامت تک نہ جانے کتنی مزید جزئیات سے واسطہ پڑے گا۔ غرض یہ دعویٰ تو بالکل ہی بدیہی البطلان ہے کہ قرآن تمام اصول و فروع اور تمام کلیات و جزئیات کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔

تفصیلاً لکل شیء کا اگر یہی مطلب ہے جو منکرین حدیث سمجھے ہیں تو پھر ہمیں ماننا پڑے گا کہ موسیٰ علیہ السلام کو جو سات یا دس تختیاں اللہ نے عطا کی تھیں ان میں بھی دُنیا کی تمام ضروریات و جزئیات مذکور تھیں کیونکہ قرآن نے ان تختیوں کے لیے بھی تفصیلاً لکل شیء کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ ملاحظہ ہو سورہ اعراف کی یہ آیت :

اور ہم نے اس کو (موسیٰ کو) تختیوں پر ہر چیز لکھ دی نصیحت کی بات اور ہر چیز کی تفصیل۔

وَكُنَّا لَهُ فِي الْأَوَّلِ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَوْعِظَةً وَتَفْصِيلاً لِّكُلِّ شَيْءٍ (الاعراف ۱۴۵)۔

کیا تصور کیا جاسکتا ہے کہ ان تختیوں میں دُنیا کی تمام جزئیات و فروع کا بیان ہوگا۔ ان کے بارے میں بائبل کا بیان ہے کہ ان میں احکام عشرہ تھے۔ کیا یہ کہنا عقل کی بات ہوگی کہ ان دس احکام میں انسانی زندگی کی تمام ضروریات و جزئیات سمائی ہوئی تھیں۔ منکرین حدیث سے کوئی پوچھے کہ کیا قرآن کریم میں جہاں کہیں کُلُّ شَا لفظ آیا ہے ہمیشہ استفراق حقیقی کے لیے آیا ہے یعنی کُلُّ کے لفظ سے کیا ہمیشہ وہ عموم مراد لیا

گیارہے جو تمام افراد کو شامل ہو۔ قرآن نے شہد کی مکتبی کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے :

ثُمَّ كَلَّمَكَ مِنَ كُلِّ الشَّارِبِ (اعمل - ۶۹) | پھر تو ہر قسم کے پھلوں سے (دیں) چوستی پیر۔

تو کیا منکرینِ حدیث کے تاعد سے کے مطابق یہاں یہ سمجھا جائے گا کہ شہد کی مکتبی کو اللہ کی جانب سے یہ امام کیا گیا تھا کہ دنیا کا کوئی پھل اتار چھوڑے بھلا ایک شہد کی مکتبی کے لیے یہ ممکن ہی کہاں ہے کہ دنیا کے تمام پھلوں سے اس پتوس کر اپنے چھتے میں جمع کرے۔ اسی طرح قرآن نے جب یہ کہا کہ

وَإِذْ أَخَذْنَا مِنَ النَّاسِ بَآلِجَ يَأْتُونَكَ رِجَالًا  
وَعَلَى كُلِّ ضَامِرٍ (الحج - ۲۷) | اور لوگوں میں حج کا اعلان کر دو لوگ تمہارے پاس  
پیدل بھی آئیں گے اور ہر قسم کی دہلی اونٹنیوں پر بھی۔

تو کیا کل ضامروں سے دنیا کی تمام دہلی اونٹنیاں مراد تھیں۔ ظاہر ہے کوئی بھی صاحبِ عقل کل کے لفظ سے اس معاملے میں نہیں پڑ سکتا ہر کوئی یہی کہے گا کہ یہاں مقصود صرف یہ بتانا ہے کہ لوگ ہر طرح حج کے لیے پونچیں گے خواہ انہیں پیدل آنا پڑے اور خواہ ان کی سواریاں مشقت سفر سے ہلکاں ہو ہو جائیں۔

غرض کل کا لفظ ضروری تو نہیں کہ ہمیشہ استغراقِ حقیقی کے لیے استعمال ہوا ہو جس طرح پہلی آیت میں کل کے لفظ سے دنیا کے تمام پھل مراد نہیں لیے جاسکتے اور جس طرح دوسری آیت میں دنیا کی تمام دہلی اونٹنیاں مراد لینا درست نہیں اسی طرح تبسیانا لکل شئی یا تفصیلا لکل شئی میں کل کے لفظ کو شریعت اسلامیہ کے تمام اصول و فروع اور کلیات و جزئیات پر حاوی سمجھنا ہرگز درست نہیں۔ کل کے صحیح مفہوم کو مزید اچھی طرح سمجھنے کے لیے ایک اور مثال ملاحظہ کیجئے کون نہیں جانتا کہ قرآن میں ملکہ سبا اور حضرت سلیمان علیہ السلام کا جو قصہ مذکور ہوا ہے اس کی روشنی میں یہ بات یقینی ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس لوازمات حکومت و سلطنت ملکہ سبا سے کہیں نہ زیادہ تھے مگر دیکھئے قرآن ملکہ سبا کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے :

وَأَوْفَيْتُ مِنَ كُلِّ شَيْءٍ (النحل: ۷۳) | اور اسے ہر چیز دی گئی ہے۔  
اب بتلائیے یہاں کل کو آپ کس معنی میں لیں گے۔ لازماً آپ یہی کہیں گے کہ یہاں 'کل' استغراق حقیقی کے لیے استعمال نہیں ہوا، یہاں کل 'شئی' کے عموم میں اس کے تمام افراد شامل نہیں۔

لہذا جس طرح کل السموات سے تمام قسم کے پھل کل ضامر سے دُنیا کے تمام اُونٹ اور کل شئی سے دُنیا کی تمام اشیاء مراد نہیں ہیں اسی طرح تبیاناً لکل شئی سے قرآن کا شریعت کی تمام کلیات و جزئیات کو شامل ہونا مراد نہیں لیا جاسکتا اس لیے کہ یہ ممکن ہی نہیں کہ کوئی کتاب تمام انسانی ضروریات و جزئیات کا احاطہ کرے۔

اس کے علاوہ یہ دعویٰ کہ قرآن تمام اصول و فروع اور کلیات و جزئیات کو تفصیلاً بیان کرتا ہے حقیقت اور شاہدے کے بھی خلاف ہے۔ قرآن میں بہت سے ایسے احکام ہیں جن کے متعلق مسائل کا قرآن میں کوئی ذکر نہیں قرآن نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیتا ہے مگر نمازوں کے اوقات رکوع و سجود وغیرہ اور زکوٰۃ کی مفادیر و مدت وغیرہ جیسی تفصیلات سے بالکل خاموش ہے۔ روزے کا حکم تو قرآن میں موجود ہے مگر اس سے متعلق بہت سے ایسے احکام ہیں جن کا قرآن میں صراحتہً کوئی ذکر نہیں۔ اسی طرح حج اور مناسک حج کا حال ہے۔ ذبیحہ، نکاح، خرمید، فروخت اور قصاص کی کوئی تفصیلات قرآن میں نہیں ملتیں۔ اب بتلائیے قرآن ہر قسم کی تمام تفصیلات بیان کرنے والا کہاں رہا۔

غرض تفصیلاً لکل شئی یا تبیاناً لکل شئی کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ قرآن میں شریعت کے ہر مسئلے کی تفصیل موجود ہے بلکہ اس قسم کی آیات قرآنی کا یہاں مفہوم یہ ہے کہ قرآن نے دین کے تمام بنیادی اصول اور تمام مہمات شریعت کو بنیہ کسی اچھ پیچ کئے پوری وضاحت و تفصیل سے اس طرح بیان کر دیا ہے کہ اشتباہ و ابہام کا شائبہ تک باقی نہیں رہا۔

**قرآن نے کچھ نہیں چھوڑا** | منکرینِ حدیث کی طرف سے اپنے دعویٰ کے ثبوت میں سورۃ الانعام کی یہ آیت بھی پیش کی جاتی ہے :

مَا فَرَقْنَا فِي الْكِتَابِ مِنْ شَيْءٍ (الانعام - ۳۸) | ہم نے کتاب میں کسی چیز کو بھی نہیں چھوڑا ۔

اور کہا جاتا ہے کہ کتاب سے مراد قرآن ہے اور جب اللہ تعالیٰ نے بڑی صراحت کے ساتھ یہ فرمادیا ہے کہ ہم نے قرآن میں کسی چیز کو بھی نہیں چھوڑا سب کچھ اس میں لکھ دیا ہے تو پھر قرآن کے علاوہ کسی چیز کی خواہ وہ حدیثِ رسول ہی کیوں نہ ہو کیا ضرورت رہی ۔ آیت قرآنی کے اس ٹکڑے کو سیاق و سباق سے علیحدہ کر کے اپنے دعویٰ کے ثبوت میں پیش کرنا منکرینِ حدیث کی علمی بددیانتی کا شاہکار ہے ۔ ان الفاظ کا صحیح مفہوم اس وقت تک پوری طرح سمجھ میں نہیں آسکتا جب تک پوری آیت کے ساتھ ملا کر ان کو نہ پڑھا جائے ۔ پوری آیت اس طرح ہے :

اور جو بھی زمین پر چلنے والا جانور ہے اور جو بھی اپنے دونوں بازوؤں سے اڑنے والا پرندہ ہے سب تمہارے ہی طرح کے گروہ ہیں اور ہم نے اپنی کتاب میں کوئی چیز (بے لکھے) نہیں چھوڑی پھر یہ سب اپنے پروردگار کے پاس جمع کیے جائیں گے ۔

وَمَا مِنْ حَيَّةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا طَائِرٍ يَطِيرُ يُجَاوِزُ أَهْمًا لَكُمْ مَا فَرَقْنَا فِي الْكِتَابِ مِنْ شَيْءٍ ثُمَّ إِلَىٰ رَبِّكُمْ تُحْشَرُونَ ۔

(الانعام - ۳۸) ۔

اب پوری آیت پڑھنے سے بات کھل کر سامنے آگئی ۔ سیاق و سباق صاف بتلا رہا ہے کہ یہاں کتاب سے مراد قرآن نہیں ہے اور کتاب میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس کا تعلق شریعت کے مسائل و احکام سے نہیں ہے دراصل یہاں کتاب سے مراد لوح محفوظ ہے جو علمِ الہی کی امین ہے ۔ اس آیت اور اس سے ماقبل کی آیات میں قیامت کے روز تمام مخلوق کے جمع کیے جانے کا ذکر ہو رہا ہے اور بتلایا جا رہا ہے کہ حشر کے میدان میں انسانوں کے ساتھ ساتھ ہر قسم کے جانور بھی دوبارہ زندہ کر کے اٹھائے جائیں گے اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ قیامت کے دن زندہ ہو کر اٹھنے میں جانور بھی اسے انسانو تمہاری ہی طرح کے گروہ ہیں اور

اگرچہ یہ سب جانور اپنی کثرت کی وجہ سے عرفاً بے انتہا ہوں لیکن ہمارے حساب میں سب منضبط ہیں کیونکہ ہم نے اپنے رجسٹر یعنی لوح محفوظ میں کوئی چیز بھی جو قیامت تک ہونے والی ہے بے لکھے نہیں چھوڑی۔

ذرا سوچ کر بتلائیے آیت کے اس مفہوم کو کوئی دُور کی بھی نسبت ہے اسی مفہوم سے جو منکرین حدیث سیاق و سباق سے بے نیاز ہو کر اپنی مقصد برداری کے لیے اس آیت سے نکلنے لگتے ہیں۔

الکتاب کا لفظ اور بھی متعدد جگہ قرآن میں لوح محفوظ اور علم الہی کے لیے استعمال ہوا ہے مثلاً سورۃ النعام ہی میں ہے :

اور وہ جانتا ہے جو کچھ خشکی اور تری میں ہے  
اور کوئی پتہ نہیں کہ تا مگر یہ کہ وہ اسے جانتا ہے  
اور کرنی دانہ زمین کی تارکیوں میں نہیں پڑتا اور  
نہ کوئی تر اور خشک چیز نگاہ یہ کہ (یہ سب) روشن  
کتاب میں (موجود) ہیں۔

وَيَعْلَمُ مَا فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَمَا  
تَسْقُطُ مِنْ وَرَقَةٍ إِلَّا يَعْلَمُهَا  
وَلَا حَبَّةٌ مِنْ ظِلْمَتِ الْأَرْضِ وَلَا  
رَطْبٌ وَلَا يَابِسٌ إِلَّا فِي كِتَابٍ  
مبين.

(النعام - ۵۹)۔

ظاہر ہے روشن کتاب سے مراد لوح محفوظ ہی ہے کائنات کے ذرے ذرے کا علم جس میں منضبط ہے۔ اسی طرح سورۃ سبا کی اس آیت میں بھی کتاب مبین کے الفاظ لوح محفوظ ہی کے لیے استعمال ہوتے ہیں :

اس سے کوئی درہ برابر بھی غائب نہیں نما سارا  
میں اندر نہ زمین میں اور نہ کوئی پھر اس سے  
چھوٹی اور نہ کوئی بڑی مگر (یہ کہ یہ سب) کتاب  
مبین میں (درج) ہے۔

لَا يَعْزُبُ عَنْهُ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ فِي  
السَّمَوَاتِ وَلَا فِي الْأَرْضِ وَلَا  
اصْفَرُّ مِنْ خَلْقٍ وَلَا أَكْبَرُ إِلَّا فِي  
كِتَابٍ مبين - (سبا - ۳)۔

غرض کتاب سے ضروری نہیں کہ قرآن ہی مراد لیا جائے۔ کتاب کے لفظ کو قرآن نے لوح محفوظ اور علم الہی کے لیے بھی استعمال کیا ہے چنانچہ منکرین حدیث کی پیش کردہ اس

آیت مافزطنا فی الکتاب من شئی نہیں بھی الکتاب سے لوح محفوظ ہی مراد ہے قرآن مراد نہیں۔

**قرآن کافی ہے** | ایک اور آیت جو منکرین حدیث اس سلسلے میں پیش کیا کرتے ہیں سورہ عنکبوت کی یہ آیت ہے :

کیا ان لوگوں کے سوا یہ کافی نہیں ہے کہ ہم نے آپ کے اوپر کتاب نازل کی ہے جو ان کو سنائی جاتی رہتی ہے بے شک اس کتاب میں ایمان والوں کے لیے بڑی رحمت اور نصیحت ہے۔

أَوَلَمْ يَكْفِهِمْ أَنَّا أَنزَلْنَا عَلَيْكَ  
الْكِتَابَ يُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ إِنَّ فِي  
ذَٰلِكَ لَرَحْمَةً وَذِكْرَىٰ لِقَوْمٍ  
يُؤْمِنُونَ - (عنکبوت - ۵۱) -

اس آیت سے استشماذ کرتے ہوئے منکرین حدیث کہا کرتے ہیں کہ جب قرآن خود کہہ رہا ہے کہ وہ ہمارے لیے کافی ہے اور سراپا رحمت و نصیحت ہے تو پھر حدیث کے سہارے کی کیا ضرورت ہے۔

اس آیت کو بھی منکرین حدیث نے اپنے ماہر اند فن کا کمال دکھلاتے ہوئے اصل سیاق و سباق سے علیحدہ کر کے پیش کیا ہے اس آیت میں کما کچھ اور جارہا ہے اور منکرین حدیث کچھ اور بھی معنی اپنی طرف سے اسے پہنائے جا رہے ہیں منکرین حدیث کا یہ استدلال بالکل الیاء ہی ہے جیسے کوئی قرآن کی آیت لَا تَقْرَءُوا الصَّلَاةَ وَأَنْتُمْ سُكَارَىٰ میں سے صرف لَا تَقْرَءُوا الصَّلَاةَ کے الفاظ لے کر کہے کہ قرآن تو کہتا ہے نماز کے قریب بھی مت جاؤ۔ جس قدر مضحکہ خیز یہ استدلال ہے اس سے زیادہ مضحکہ خیز بلکہ احمقانہ یہ استدلال ہے کہ سورہ عنکبوت کی متذکرہ بالا آیت سے حدیث کی عدم احتیاج ثابت ہوتی ہے۔ اس آیت سے پہلے جو آیت ہے وہ ذرا پڑھیے اس سے پہلے کی آیت میں مشرکین مکہ کے اس مطالبے کو نقل کیا گیا ہے کہ یہ نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) ناشائیاں کیوں نہیں دکھلاتے۔

وَقَالُوا لَوْلَا أُنزِلَ عَلَيْهِ آيَاتٌ | انہوں (مشرکین مکہ) نے کہا اس (نبی) پر اس کے

مِنْ رَبِّهِ قُلْ إِنَّمَا الْآيَاتُ عِنْدَ  
اللَّهِ وَإِنَّا أَنْذِرُكُمْ مَبِينٍ -

رعد ۵۰ -

رب کی طرف سے نشانیاں کیوں نہیں نازل  
ہوئیں کہ دیکھتے نشانیاں اللہ کے اختیار میں  
ہیں میں تو بس کھلا ہوا دروازہ والا ہوں -

اس کے فوراً بعد مشرکین مکہ کے اس مطالبے کا رد کرتے ہوئے فرمایا اَوَلَمْ يَكْفِهِمُ الْحُجَّةُ  
یعنی یہ لوگ اور کوئی نشانی کیوں طلب کرتے ہیں ان کے پاس تو سب سے بڑی نشانی  
اللہ کی کتاب آپ کی کیا وہ ان کے لیے کافی نہیں ہے اس روشن اور عظیم ترین معجزے  
کے ہوتے ہوئے جو سراپا رحمت و نصیحت ہے دوسرا معجزہ طلب کرنا سراپا بے عقلی  
کی بات ہے اس سیاق و سباق کو سامنے رکھتے ہوئے ہر کوئی خود فیصلہ کر سکتا  
ہے کہ یہاں سنت و حدیث کا کوئی ذکر ہی نہیں ہے ان آیات میں تو مشرکین مکہ کے  
ایک غیر معقول مطالبے کا رد کرنا مقصود ہے۔ حیرت ہوتی ہے منکرین حدیث حقائق  
قرآنی کو کس جرأت کے ساتھ توڑتے مروڑتے رہتے ہیں انہیں نہ خدا کا خوف ہے  
اور نہ اس بات کا کوئی خیال کہ علمی دیانتداری بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔

کیا حدیث کی مشغولیت گمراہی ہے؟ | مذکورہ بالا استدلال کے بارے  
میں تو حسن ظن سے کام لیتے ہوئے

بر حال یہ کہا جاسکتا ہے کہ شاید کسی غلط فہمی کی بنا پر یا ماہرانہ علمی صلاحیت سے محرومی کی بنا پر ان آیات  
سے سنت و حدیث کے خلاف استشہاد کر لیا گیا ہو مگر ہم منکرین حدیث کا ایک اور  
استدلال پیش کرنے لگے ہیں جو قرآنی تحریف اور حدیث دشمنی کا کھلا شاہکار ہے۔ اس  
استدلال میں جو طرز عمل اختیار کیا گیا ہے اس کے پیش نظر تو یقین نہیں آتا کہ ان لوگوں  
کی طرف سے سنت و حدیث کی مخالفت دیانتدارانہ طور پر محض کسی غلط فہمی کی بنا پر کی  
جاری ہے۔ اپنے دعوے کے ثبوت میں یہ لوگ سورہ لقمان کی یہ آیت پیش کرتے ہیں۔

لوگوں میں سے کوئی انسان ایسا بھی ہے جو اللہ  
سے غافل کر گیا یا جس پر یہ ماسہ تاکہ بے سمجھے ہو جسے  
اللہ کی راہ سے لوگوں کو بھٹکاتے اور اس راہ کی  
ہنسی اڑاتے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنُ لِيَشْتَرِيَ لَهَا الْهَدْيَ  
لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ  
يَتَّخِذُ مَا هُوَ زُورٌ (لقمان - ۶) -

اور بڑی دیدہ دلیری سے کہتے ہیں کہ دیکھئے اس آیت میں حدیث کی مشغولیت کو گراہی قرار دیا گیا ہے۔ العیاذ باللہ کہاں لھو الحدیث اور کہاں حدیث نبوی۔ حدیث دشمنی میں یہ لوگ کتنی دُور نکل گئے ہیں قسراں کے اندر محضی تحریف کرتے ہوئے ہیں انہیں شرم نہیں آتی۔ ان لوگوں کی کتابوں میں اس آیت کا جو ترجمہ ملتا ہے وہ قرآنی آیات میں بلا واسطہ محضی تحریف کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ حافظ اسلم صاحب جو ان لوگوں کی صفوں میں بہت بڑے عالم سمجھے جاتے ہیں اس آیت کا ترجمہ ان الفاظ میں کرتے ہیں :

”اور لوگوں میں سے وہ ہیں جو حدیث کے مشغولیت کے خریدار ہوتے ہیں تاکہ اللہ کی راہ سے بھٹکا دیں۔“ (مقام حدیث جلد ۱ ص ۱۵۶)

حالانکہ ہم نہیں سمجھتے کہ حافظ صاحب اتنی بات بھی نہ جانتے ہوں کہ حدیث کے معنی عربی زبان میں بات کے ہیں اس لغوی معنی کے اعتبار سے حدیث کا لفظ خدا کی بات، رسول کی بات، صحابہ اور عام مسلمانوں کی بات بلکہ کافروں کی بات حتیٰ کہ شیطان کی بات پر بھی بولا جاسکتا ہے۔ ان میں سے ہر ایک معنی کے لیے حدیث کا لفظ خود قرآن میں استعمال ہوا ہے مثلاً

اللہ نَزَّلَ أَحْسَنَ الْكِتَابِ (الزمر: ۲۳) | اللہ نے بہترین کلام نازل کیا ہے۔

اس آیت میں حدیث کا لفظ کلام الہی کے لیے استعمال ہوا ہے۔ اسی طرح ایک آیت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سرگوشی کو حدیث کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے جیسا کہ ارشاد ربانی ہے :

وَإِذَا مَرَّ النَّبِيُّ إِلَىٰ بَعْضِ أَزْوَاجِهِ | جب پیغمبر نے ایک بات اپنی کسی بیوی سے  
حَدَّثَ۔ (التحویم : ۳) | چپکے سے فرمائی۔

صحابہ اور عام مسلمانوں کی گفتگو پر لفظ حدیث کا اطلاق اس آیت میں ہوا ہے :

وَلَا مَسْتَأْنِسِينَ لِحَدِيثٍ۔ | اور باتوں میں جی لگا کر مت بیٹھے رہا کرو۔  
(الاحزاب : ۵۳)۔

۱۰ علماء اسلام اور کفار و مشرکین کی گفتگو پر لفظ حدیث کے اطلاق کے لیے یہ آیت



پیش کی جاسکتی ہے۔

متفق بخوضوا فی حدیث | یہاں تک کہ وہ کسی اور بات میں مشغول ہو جائیں۔  
(الفسار: ۱۴۰)

یعنی کافر اور مشرک اگر اپنی مجالس میں اسلام کا مذاق اڑا رہے ہوں تو مومنین کو چاہیے کہ ان کی ہم نشینی سے اجتناب کریں حتیٰ کہ وہ کسی دوسری بات میں مشغول ہو جائیں۔

ان تمام آیات میں آپ دیکھ رہے ہیں کہ حدیث کا لفظ جہاں کہیں بھی استعمال ہوا ہے بات ہی کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اس اصطلاحی معنی میں حدیث کا لفظ کہیں بھی استعمال نہیں ہوا جو محدثین اور فقہاء کے درمیان معروف ہے۔ منکرین حدیث کی طرف سے پیش کردہ زیر بحث آیت میں بھی ہوا الحدیث سے وہ تمام شیطانی باتیں مراد ہیں جن میں مشغول ہو کر انسان خدا سے غافل ہو جاتا ہے اور رفتہ رفتہ انسانیت کے لیے گمراہی اور فساد کا باعث بن جاتا ہے۔ اس آیت کی تفسیر میں حضرت عبداللہ ابن عباس کا قول ہے :

لہو الحدیث هو الخیار والشیاء (قرطبی) | ہوا الحدیث سے مراد گانا اور اس کے شاہ جزی ہیں  
گو یا ہر بیکار اور غیر مفید مشغلہ جو حق کی طرف سے غفلت اور بے رغبتی پیدا کرنے والا ہو ہوا الحدیث کے تحت داخل ہے اس طرح اس آیت کو حدیث کے اس اصطلاحی معنی سے دور کا بھی تعلق نہیں جو محدثین اور فقہاء کے توسط سے امت میں شروع سے منقول ہونا چلا آیا ہے۔ منکرین حدیث کی جسارت پر تعجب ہوتا ہے وہ لفظ جو شیطانی باتوں اور بیکار مشغلوں کے لیے قرآن میں استعمال ہوا تھا اپنی مذموم مقصد برآری کی خاطر اس لفظ کو حدیث رسول جیسے پاک و مطہر کلام پر چسپاں کر دیا اور ان لوگوں کی علمی بے خبری کا عالم یہ ہے کہ اپنے حق میں دلیل دینے کے جوش میں بہت تک بھول گئے کہ یہ آیت مکی ہے یا مدنی۔ سورہ لقمان مکی سورتوں میں سے ہے مکی دور میں مشرکین مکہ کے ظلم و ستم کا جو حال تھا اس سے کون واقف نہیں مسلمان بے چارے مکی دور میں ایسی کس مہر سی کے عالم میں تھے کہ حدیث تو کجا قرآن کی کتابت و ترتیب کا موقع بھی انہیں بسہولت میسر نہ

تھا۔ مکی زندگی کے پُر آشوب زمانے میں یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ مسلمان حدیث کے مشغلے یا مجموعے خریدتے پھرتے سچی بات یہ ہے کہ قرآن نے تو یہودیوں کے لیے کہا تھا کہ یَحْزَرُوا الْكَلِمَةَ عَنْ مَوَاضِعِهِ (وہ کلام کو اس کے اصل مقام سے بدل دیتے ہیں) مگر آج اللہ کا یہ قول منکرین حدیث پر حرف بحرف صادق آ رہا ہے۔

**قرآن کی جامعیت کا اصلی مفہوم** | غرض منکرین حدیث کی کسی بھی دلیل سے قرآن کی جامعیت کا یہ مفہوم کسی طرح بھی ثابت نہیں ہوتا

کہ قرآن میں شریعت کے تمام اصول و فروع اور تمام کلیات و جزئیات مفصلاً مذکور ہیں اور اس لیے ماخذ دین ہونے کے لحاظ سے حدیث رسول اور سنت رسول کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہی۔ اس سلسلے میں منکرین حدیث کی طرف سے پیش کیے جانے والے دلائل کا حشر تو قارئین نے دیکھ ہی لیا۔ آئیے اب ہم قرآن کی جامعیت کا اصل مفہوم معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

قرآن کی جامعیت کا یہ مفہوم تو کسی طرح عقل میں آنے والا نہیں کہ اس نے احکام دین کے تمام غیر متناہی جزئیات کا احاطہ کر لیا ہے فرائض و واجبات، مستحبات و منن کی تمام حدود اس نے قائم کر دی ہیں، ارکان و شرائط اسباب و مانع کی تمام تفصیلات اس میں مذکور ہیں یہ بات بھی سمجھ میں آنے والی نہیں کہ قرآن کی کسی آیت پر کوئی 'جمال' کسی عموم میں کوئی 'تقیید' اور کسی مراد میں کوئی 'ابہام' نہیں رہا۔ کسی کتاب کے جامع ہونے کا نہ یہ مطلب ہوتا ہے نہ عقلاً یہ ممکن ہے اگر درحقیقت قرآن کی جامعیت اور اس کی وضاحت تفصیل اسی درجہ کی ہوتی تو رسول کی بعثت بے فائدہ رہتی قرآن کے ساتھ ساتھ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا مبعوث فرمانا خود اس بات کی دلیل ہے کہ قرآن اپنے آپ میں جامع ہونے کے باوجود تعلیم و ترویج کا محتاج ہے نبی کا کام یہ ہے کہ وہ اس کتاب کے مطالب سمجھائے اور اس پر عمل کرنا سکھلائے۔

قرآن اس لحاظ سے یقیناً جامع ہے کہ اس نے عقائد، عبادات، معاملات اور اخلاق سے متعلق تمام کلیات کھول کھول کر بیان کر دی ہیں وہ ماضی کی خبروں، مستقبل کی

اطلاعوں اور حال کے احکام کا احاطہ کیے ہوئے ہے وہ جہاں بانی کے رموز و اسرار کے لیے مکمل آئین ہے گدائی کے عمیق و دقیق اصول بھی اس نے انتہائی سادہ اور جامع الفاظ میں بیان کر دیے ہیں۔ یہی نہیں کہ دینیات کا کوئی گوشہ اپنی اصولیت اور کلیت کے لحاظ سے اس سے باہر نہیں بلکہ سیاست، معیشت، معاشرت، مسائل، اخلاق اور دینیات کے تمام اصول و قوانین بھی وہ اپنے اندر سمونے ہوئے ہے۔

مگر قرآن کی یہی جامعیت اس بات کی متقاضی ہے کہ اس کی تعبیرات اصولیت اور کلیت کی انتہا کو پہنچی ہوئی ہوں اس کے لفظ لفظ میں حقائق و معارف کے دریا پورید ہوں اس کا ایک ایک اشارہ معارف الہیہ کا مخزن ہو اس کا ایک ایک لفظ اعجازی فصاحت و بلاغت کا اعلیٰ نمونہ ہو۔ قرآن کی جامعیت ہی کے نتیجے میں لازم ہے کہ قرآنی آیات میں سے کوئی کثرت خفی ہو تو کوئی بخل کوئی مشکل ہو تو کوئی کتاب کا پہلو لیے ہوئے ہو۔

**حدیث رسول کی احتیاج** | اور قرآن کی جامعیت کے نتیجے میں پیدا ہونے والی انہی اصولی و کلی تعبیرات کی اصل مرادات ستین

کرنے کے لیے ہم حدیث رسول کے محتاج ہیں۔ نبی کا واسطہ درمیان میں نہ ہو تو کس کے بس کی یہ بات ہے کہ وہ ان حقائق و معارف پر مطلع ہو سکے جو قرآن کے جامع ہونے کی وجہ سے اس کے ایک ایک لفظ میں پوشیدہ ہیں۔ نبوت کی رہنمائی کے بجز ان اشارات کو کون سمجھ سکتا ہے جو قرآن نے اپنی جامعیت کی بنا پر اپنے وجود میں سمونے ہوئے ہیں اگر یہ صحیح ہے کہ عاشق کی رمزیں صرف عشق آشنا ہی جان سکتا ہے تو یہ بھی ایک کھلی حقیقت ہے کہ اشارات ربانی کی اصل مراد کو صرف رب آشنا ہی پاسکتا ہے۔ قرآن جو اپنے جامع ہونے کی بنا پر اعجازی فصاحت و بلاغت کا اعلیٰ نمونہ ہے جس کے ہدایت کی ایک ایک تہ اور ایک ایک شکن میں صد ہا علوم پلٹے ہوئے ہیں اس کے حقائق و حقائق پر اطلاعات پلنے کے لیے ایک ایسے واسطے کا ہونا لازمی ہے جو ایک لحاظ سے ذات حق سے قریب تر ہو اور ایک لحاظ سے بندوں میں شامل ہو وہ لامحدود ذات و صفات کی حامل ہستی سے صادر ہونے والے کلام کے علوم و معارف پر

بلا واسطہ خود اسی ہستی سے اطلاع پائے اور پھر اسی کی رہنمائی میں عامر و خلاق کو ان پر مطلع کرے۔ اس کلام میں کوئی خفا ہو تو وہ اس کا اظہار کرے کوئی اجمال ہو تو اس کی تفصیل کر دے کوئی ابہام ہو تو اس کو کھول دے۔ اس کلام کے کسی حصے سے مختلف احتمالات مفہوم ہوتے ہوں تو اصل احتمال متعین کر دے۔ اس کلام میں جتنے احکام بیان کیے گئے ہیں ان میں سے جس حکم کی توجیہ بیان کرنا ضروری ہو اس کی توجیہ بیان کرے جس حکم کی حدود کا تعین ضروری ہو اس کی حدود متعین کرے۔ کسی حکم کے خواص و آثار بتلانے ضروری ہوں تو ان خواص و آثار پر مطلع کرے۔ غرض قرآن کی جامعیت کے نتیجے میں پیدا ہونے والی تمام اصولی و فنی تعبیرات کی اصل مرادات متعین کر دے :

**بعثت کے تین اہم مقاصد** | قرآن کے ساتھ ساتھ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرما کر درحقیقت اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر بڑا احسان فرمایا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے ہماری تعلیم و ہدایت کا سامان نہ کرتا تو ہم یقیناً مدت العمر قرآن کی صحیح مراد حاصل نہ کر پاتے۔ اللہ تعالیٰ اسی احسان کو یاد دلاتے ہوئے فرماتا ہے :

اللہ نے مومنین پر احسان فرمایا کہ ان کے اندر خود انہی میں سے ایک رسول مبعوث کیا جو انہیں اس کی آیات پڑھ کر سنا تا ہے اور ان کا تزکیہ کرتا ہے اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

لَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ  
بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِنْ أَنْفُسِهِمْ  
يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ  
وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ -  
(آل عمران - ۱۶۴)

اس آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے تین اہم مقاصد بتلائے گئے ہیں ایک یہ کہ آپ اللہ کی کتاب لوگوں کو پڑھ کر سنائیں دوسرے یہ کہ آپ لوگوں کا فرد کے لحاظ سے بھی اور اجتماعی ہیئت کے لحاظ سے بھی تزکیہ کریں یعنی اپنی تربیت سے ان کی

انفرادی اور اجتماعی خرابیوں کو دور کریں اور تیسرے یہ کہ آپ لوگوں کو کتاب کی تعلیم دیں اور اس کی منشا کے مطابق کام کرنے کی حکمت سکھائیں۔ غور کرنے کی بات ہے کہ اگر قرآن کی جامعیت کا وہی مطلب ہوتا جو منکرین حدیث بیان کرتے ہیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا صرت ایک ہی مقصد ہونا چاہیے تھا کہ وہ اللہ کی کتاب لوگوں کو بڑھ کر سنادیں اور بس۔ بلکہ اس کی بھی ضرورت نہ تھی قرآن کریم لکھا لکھایا ایک کتاب کی صورت میں لوگوں کے ہاتھ میں بٹھا دیا جاتا اور اس کے لیے ظاہر ہے کسی رسول کے مبعوث کہنے کی بھی کوئی ضرورت نہ تھی کسی یہاڑ یا اُونچے درخت پر نازل کر دیا جاتا جہاں سے لوگ خود اٹھا کر اسے لے آتے۔ اگر ایسا نہیں کیا گیا اور طریقہ یہ اختیار کیا گیا کہ پہلے ایک فخر ارسل کو مبعوث فرمایا پھر وحی کے ذریعہ قرآن کو اس پر نازل کیا اور پھر اس کے ذمے متقل طوع پر یہ کام لگایا کہ وہ لوگوں کو کتاب کی تعلیم دے اور اس کے مطابق زندگی گزارنے کا طریقہ سکھلائے تو اس کا مطلب اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ قرآن جامع ہونے کے باوجود تعلیم و ترویج کا محتاج ہے۔ اور اس بات کے ثبوت کے لیے کسی دلیل کی ضرورت نہیں کہ کسی کتاب کی تعلیم و ترویج کتاب سے ظاہراً علیحدہ ہوتے ہوئے بھی حقیقتاً اس کتاب سے کوئی جدا اور علیحدہ چیز نہیں ہوا کرتی۔ کسی کتاب کا متن اور اس کی شرح اگرچہ لفظاً مختلف ہوتے ہیں مگر معنایاً دونوں باہم متحد ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کی تعلیم و ترویج کے لیے جو کچھ فرمایا اور جو کچھ کر کے دکھایا اور جسے ہم سنت یا حدیث کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں وہ اگرچہ اپنے وجود کے اعتبار سے قرآن سے علیحدہ ہے مگر انہی حقیقت کے اعتبار سے وہ قرآن ہی کا ایک حصہ ہے اس سے زائد یا اس سے باہر کوئی چیز نہیں کہ قرآن کی جامعیت کے منافی ہو۔ قرآن متن ہے اور حدیث اس کی شرح۔

تعلیم و ترویج قرآن | قرآن کی تعلیم و ترویج کی ذمہ داری بعثت کے مقاصد میں سے  
 کتنا اہم مقصد ہے اس کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے

کہ اللہ تعالیٰ نے جہاں کہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے منصب رسالت و نبوت کی تفصیل بیان کی وہاں دیگر مقاصد کے ساتھ ساتھ اس مقصد کا بطور خاص ذکر فرمایا۔ حتیٰ کہ ہم دیکھتے ہیں کہ سورہ بقرہ میں جب حضرت ابراہیم و اسمعیل علیہما السلام کی اس دُعا کا ذکر آیا جس میں انہوں نے اپنی اولاد میں سے ایک رسول مبعوث کیے جانے کی خواہش کا اظہار کیا تھا تو اس وقت بھی حالانکہ وہ محض ایک دُعا تھی بعثت کے اس مقصد کو خاص طور سے دُعا کے الفاظ کا ایک مستقل جز بنا دیا گیا۔ ارشاد ہے :

اور جب ابراہیم و اسمعیل اس گھر (کعبہ) کی بنیادیں اٹھا رہے تھے تو انہوں نے دُعا کی..... اے ہمارے پروردگار ان لوگوں میں خود اپنی کسے اندر سے ایک رسول مبعوث فرما جو انہیں تیری آیات پڑھ کر سنائے اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور ان کا تزکیہ کرے۔

وَإِذْ يَرْفَعُ إِبْرَاهِيمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ  
الْبَيْتِ وَإِسْمَاعِيلُ... رَبَّنَا وَابْعَثْ  
فِيهِمْ رَسُولًا مِنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ  
آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ  
وَيُزَكِّيهِمْ۔ (البقرة : ۱۲۹)

اسی طرح ایک اور مقام پر تحویل قبلہ کے حکم کی حکمتوں کے ضمن میں بتلانا صرف یہ ہے کہ جس طرح تحویل قبلہ کا حکم دے کر ہم نے تم پر انعام کیا ہے اسی طرح تم ہی میں سے ایک رسول بھیج کر تم پر اتمام نعمت کر دیا ہے مگر اس موقع پر بھی بعثت کے یہی تینوں مقاصد علیحدہ علیحدہ اہتمام کے ساتھ بیان فرمائے۔ ارشاد ہے :

جس طرح ہم نے تمہارے اندر خود تمہیں میں سے ایک رسول بھیجا جو تم کو ہماری آیات پڑھ کر سناتا ہے اور تمہارا تزکیہ کرتا ہے اور تم کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور تمہیں وہ باتیں سکھاتا ہے جو تم نہیں جانتے تھے۔

كَأَآرَسُولًا فَيُكَرِّمُكُمُ  
يَتْلُوا عَلَيْكُمْ آيَاتِنَا وَيُزَكِّيكُمْ  
وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ  
وَيُزَكِّيكُمْ مَا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ  
(البقرة : ۱۵۲)

سورہ جمعہ میں بھی اپنی ہاکی و برتری کے بیان کے فوراً بعد جب اللہ تعالیٰ نے العزیز الحکیم کہہ کر اپنا حکیم ہونا ظاہر فرمایا اور اپنی حکمت کو اس طرح پر جمادیا :

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا  
مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَ  
يُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَ  
الحكمة (المجمعة : ۲)

دی ہے جس نے انہوں کے درمیان خود انہیں میں سے  
ایک رسول بھوث کیا جو ان کو اسی کی آیات پڑھ کر  
متاثر ہے اور ان کا تزکیہ کرتا ہے اور ان کو کتاب اور  
حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

تربعت کے مقاصد بطور خاص گناہوں اور ان میں تعلیم کتاب کو علیحدہ ذکر فرمایا  
غرض ہماں کہیں بھی بعثت کا ذکر آگیا تو اس کے مقاصد گناہ سے ہوئے اللہ تعالیٰ نے  
تعلیم و ترویج قرآن کا ضرور ذکر فرمایا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تعلیم و ترویج قرآن کے بغیر بعثت کا  
مقصد پورا نہ ہوتا تھا دوسرے لفظوں میں قرآن اپنی ذات میں جامع اور مفصل ہونے کے  
باوجود تعلیم و ترویج کے بغیر اپنے مقصد نزول کے اعتبار سے نامکمل رہتا تھا۔

اب اس میں تو کسی کو کلام ہی نہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بعثت کے تمام  
مقاصد با حسن و جوہ پورے فرمائے۔ آپ نے قرآنی آیات سنا دینے پر ہی اکتفا نہیں فرمایا بلکہ اپنے  
اقوال اپنے افعال اور اپنے طرز عمل سے لوگوں کو کتاب کی تعلیم بھی دی اس کتاب کی منشاء کے  
مطابقی کام کرنے کی حکمت بھی سکھائی اور ان کی انفرادی و اجتماعی خرابیوں کو دور کر کے  
ان کے اندر اچھے اوصاف و اطوار بھی پیدا کیے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم و ترویج قرآن کا قریضہ کس طرح انجام دیا اس کی  
وضاحت کے لیے چند ایک مثالیں پیش خدمت ہیں تاکہ بات اچھی طرح سمجھ میں آجائے اور قرآن  
کی جامعیت کا اصل مفہوم پوری طرح کھل کر سامنے آجائے نیز قرآن اور حدیث کا باہم ربط واضح  
ہو جائے۔

**مجمعات کی تفصیل** | تعلیم و ترویج قرآن کے کام کی پہلی قسم وہ ہے جس میں قرآن نے بعض محفل  
احکام صادر کیے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی تفصیل  
بیان فرمائی۔ مثال کے طور پر قرآن نے جا بجا نماز قائم کرنے کا حکم دیا ہے ستر سے زیادہ مقامات پر  
کئی کئی ہیرائے ہیں اس کا ذکر ہے مگر نماز کے تفصیلی احکام اور اس کے اوقات وغیرہ کے ذکر  
سے قرآن خاموش ہے قرآن نے یہ کہیں نہیں بتایا کہ اللہ تعالیٰ کے اس تاکید حکم کی تعمیل آخر

کس طرح پر کی جانے اس کے لیے کیا کچھ کرنا ہوتا ہے اس میں قیام ہے تو اس کی کیا ہیئت ہے اس کے دوران کیا کچھ پڑھنا ہے رکوع کی کیا کیفیت ہے رکوع ایک ہے کہ دو رکوع کے دوران پڑھے جانے والے کلمات کیا ہیں، سجدوں کی تعداد کتنی ہے، نماز میں بیٹھ کر بھی کچھ پڑھنا ہے یا نہیں، رکوع و سجدہ قیام و قعود کی باہم ترتیب کیا ہے نماز سے باہر آنے کا طریقہ کیا ہے، نماز کے ارکان، 'فرائض' سنن اور مستحبات وغیرہ کا بھی قرآن نے کوئی ذکر نہیں کیا۔ نماز میں سہو ہو جانے تو کیا کرے کن کن صورتوں میں نماز فاسد ہو جاتی ہے مکروہات نماز کی ہیں کن کن اوقات میں نماز پڑھنا مکروہ ہے اور کن اوقات میں حرام نماز کے اوقات کی صحیح تعیین کیا ہے۔ یہ اور اسی قسم کے نماز سے متعلق دیگر احکام اور مختلف تفصیلات کے بارے میں قرآن بالکل خاموش ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تمام باتوں کی تعلیم دی ان تمام تفصیلات کو بتایا سمجھایا اور سکھایا۔

اسی طرح روزے کا حکم قرآن میں موجود ہے مگر اس کے تفصیلی احکام کے ذکر سے قرآن خاموش ہے قرآن آپ کو یہ نہیں بتاتے گا کہ کن کن حالات میں روزہ فاسد ہو جاتا ہے اور کن صورتوں میں کفار لازم آتا ہے۔ ندیہ دینے کی اجازت ہے تو کن لوگوں کے لیے وہ کیا حالات ہیں جن میں روزہ نہ رکھنے کی اجازت ہے وہ کونسی صورتیں ہیں جن میں رکھا ہوا روزہ توڑ دینے کی اجازت ہے۔ اس قسم کی جتنی تفصیلات روزے سے متعلق ہیں قرآن نے ان کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ یہ تمام تفصیلات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم کیں۔

نماز اور روزے ہی کی طرح دوسرے دوا رکاز دین حج اور زکوٰۃ کا بھی حال ہے حج اور زکوٰۃ کا حکم تو قرآن میں مل جاتے گا مگر مناسک حج اور مسائل زکوٰۃ کی تفصیلات قرآن میں نہیں ملیں گی۔ حج ادا کرنے کا طریقہ، احرام کے پٹروں کی تعداد، عدد مہلت کا تعیین، طواف کے چکڑوں اور سعی کے اشواط کی تعداد، رمل اور سعی کا طریقہ، قربانی کے تفصیلی احکام اور حج کی جنایات وغیرہ غرض حج سے متعلق تمام تفصیلی احکام نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہی نے تعلیم فرمائے۔ زکوٰۃ کے متعلق بھی تمام تفصیلات آپ ہی نے بتائیں۔ زکوٰۃ کا انصاف اسکی ثمرہ اس کی مدت، مختلف قسم کے اموال پر زکوٰۃ کے مختلف نصاب، ہر ایک مال پر زکوٰۃ کی مختلف



شرح، حیوانات کی ذکوۃ کے تفصیلی احکام زمین کی پیداوار کی صورتیں اور عشر و خراج کے مسائل وغیرہ یہ سب تفصیلات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم سے ہمیں معلوم ہوئیں۔  
یہی حال شریعت کے اور بہت سے مسائل کا ہے مثلاً ذبیحہ، نکاح و طلاق، خرید و فروخت اور قصاص وغیرہ کی تمام تر تفصیلات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کے ذریعے ہی ہم تک پہنچیں قرآن میں بنیادی طور پر ان کے احکام ضرور موجود ہیں مگر ان کی بہت سی ضروری تفصیلات سے قرآن خاموش ہے۔

اب ان تمام تفصیلات کی عدم موجودگی کی بنا پر کیا قرآن کو غیر جامع خیالی کیا جائیگا یا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کے ذریعے معلوم شدہ یہ تمام تفصیلات کیا قرآن سے باہر یا قرآن سے زائد کوئی چیز سمجھی جائیں گی۔ ظاہر ہے دونوں باتوں کا جواب نفی میں ہے۔ اس لیے کہ نہ صورت یہ ہے کہ قرآن ان احکام کے ذکر سے یکسر خاموش ہے کہ اس کی جامعیت میں کوئی فرق آئے اور نہ یہ صورت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ تفصیلات بیان کی ہیں جن کی اصل قرآن میں موجود نہیں کہ ان تفصیلات کو زائد قرآن کوئی چیز قرار دیا جائے بلکہ اصل صورت حال یہ ہے کہ قرآن نے جو احکام اپنی جامعیت کی بنا پر مجمل طور پر بیان کیے تھے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے محض ان کی تفصیلات کی نشاندہی کر دی ہے۔ اس لیے یہ تمام تفصیلات قرآن سے علیحدہ ہوتے ہوئے بھی قرآن ہی کا ایک حصہ ہیں۔

یہی بات بالکل اسی انداز میں مشہور صحابی حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ نے اس شخص کو سمجھائی تھی جس نے آپ کے سامنے یہ مطالبہ پیش کر دیا تھا کہ

لَا تَحْدِثُونَا بِالْقُرْآنِ | قرآن کے سوا ہمارے سامنے اور کچھ نہ بیان کرو۔

حضرت عمران بن حصین نے اس شخص کو اپنے قریب بلایا اور اس کو سمجھانا شروع کیا۔  
آپ نے فرمایا :

أَرَأَيْتَ لَوْ وَكَلَّتْ أَنْتَ وَاصْحَابُكَ | کیا تم سمجھتے ہو کہ تم اور تمہارے رفقاء صرف قرآن پر

تکبیر کر کے تو کیا قرآن میں تمہاں سکتے ہو کہ ظہر کی نماز  
چار رکعتوں پر اور عصر کی بھی چار اور مغرب کی نماز  
تین رکعتوں پر مشتمل ہے۔

إِلَى الْقُرْآنِ أَكُنْتَ تَجِدُ فِيهِ صَلَاةً  
الظُّهْرَ أَرْبَعًا وَصَلَاةَ الْعَصْرِ  
أَرْبَعًا وَالْمَغْرِبَ ثَلَاثًا

(الوفات جلد ۲ ص ۲۷۰ جامع بیان العلم ۲ ص ۱۹۱)

پھر اسی طرح آپ نے مناسک حج کا ذکر کرتے ہوئے اس شخص سے پوچھا

کیا تم سمجھتے ہو کہ تم اور تمہارے رفقاء صرف قرآن پر تکبیر  
کر لو گے تو کیا قرآن میں تمہاں سکتے ہو کہ بیت اللہ کا  
طواف سات دفعہ کرنا چاہیے اور منہا مردہ کا طواف  
بھی سات دفعہ کرنا چاہیے۔

أَوَأَيْتَ نَوَّكَمْتُ أَنْتَ وَاصْبَابَكَ  
إِلَى الْقُرْآنِ أَكُنْتَ تَجِدُ اسْطَوَافَ  
بِالْبَيْتِ سَبْعًا وَالْطَّوَافَ بِالصَّنَا  
وَالْمَرْوَةِ سَبْعًا۔ (ایضاً)

ایک روایت میں ہے کہ حضرت عمران بن حصینؓ نے مناسک حج کا ذکر کرتے ہوئے عرفات میں  
وقوف اور رمی جمار کے مسئلے کے بارے میں بھی اس شخص سے پوچھا کہ کیا ان کی تفصیلات تمہیں کہیں  
قرآن میں ملتی ہیں۔ اس کے بعد چور کے ہاتھ کاٹنے کے حکم کا حوالہ دیتے ہوئے آپ نے اس  
کو سمجھاتے ہوئے پوچھا کہ بھلا بتاؤ قرآن میں چور کے ہاتھ کاٹنے کا اسلامی حکمرانوں کو جو  
ذمہ دار بنایا گیا ہے تو کیا اس کا تعین بھی قرآن میں کہیں کیا گیا ہے کہ ہاتھ کس طریقے سے  
اور کہاں سے کاٹا جائے۔ آپ نے فرمایا

اور ہاتھ کہاں سے کاٹا جائے، یہاں سے  
یا وہاں سے۔

وَالْيَدِ مِنْ أَيْنَ تَقْطَعُ أَيْمَنَ  
هُمَّنَا أَوْ مِنْ هَهُنَا۔ (ایضاً)

راوی کا بیان ہے کہ حضرت عمران بن حصینؓ نے پہلے گٹے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا کہ کیا یہاں سے ؟  
پھر گٹنی پر اور پھر اس کے بعد کندھے کے قریب ہاتھ لے جا کر پوچھا کہ کیا یہاں سے ؟  
غرض حضرت عمران بن حصینؓ نے مختلف احکام کا حوالہ دے کر اس شخص کو سمجھانے  
کے انداز میں پوچھا کہ کیا ان احکام کی تفصیلات قرآن میں مذکور ہیں اور پھر آخر میں فرمایا یہ

احکام خدا کی کتاب میں مجمل ہیں اور سنت ان کی تفصیل پیش کرتی ہے۔ آپ کے الفاظ ہیں

انَّ كِتَابَ اللَّهِ اَبْلَهُمْ هَذَا وَاِنَّ  
السَّنَةَ تَفْسَرُ ذَلِكَ (ایضاً)

کتاب اللہ نے اس کو مبہم رکھا پھر سنت رسول  
نے اس کی تفسیر کر دی۔

**مبہمات کی توضیح** | مجمل احکام کی تفصیل بیان کرنے کے علاوہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم

نے بعض ان شبہات کا ازالہ بھی فرمایا جو قرآنی آیات کی صحیح  
مراد سمجھنے میں صحابہ کرام کو پیش آتے تھے یا آئندہ آنے والوں کو پیش آ سکتے تھے  
مثلاً یہ بتایا کہ قرآنی آیت **الَّذِينَ آمَنُوا وَلَمْ يَلْبِسُوا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولَٰئِكَ لَهُم**  
**الْاُثْمُنُ وَهُمْ مُّحْتَدُونَ** (جو لوگ ایمان لائے پھر انہوں نے اپنے ایمان میں کوئی ظلم شامل نہیں کیا

یہی لوگ ہیں جن کو امن ملے گا اور یہی ہدایت یافتہ ہیں) میں ظلم سے مراد شرک ہے۔ یا یہ کہ  
**حَتّٰى يَتَّبِعُوْا لَكُمْ اَلْخَيْطَ اَلْاَبْيَضُ مِنَ اَلْخَيْطِ اَلْاَسْوَدِ** (کھاتے پیٹے رہو) یہاں تک سیاہ و  
سفید دھاگے میں تمہیں فرق معلوم ہونے لگے) میں سیاہ و سفید دھاگوں سے شب کی تاریکی اور  
دن کی سفیدی مراد ہے۔ اس قسم کی متعدد مثالیں ہم نے حفاظت حدیث پر گفتگو کرتے وقت  
حدیث اور حفاظت خداوندی کے عنوان کے تحت تفصیل سے بیان کی ہیں تاہم ان پر  
دوبارہ نظر ڈال لیں :

**مشکلات کی تفسیر** | علاوہ انہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض قرآنی مشکلات کا  
حل بھی فرمایا مثلاً

۱) قرآن میں بار بار آتا ہے کہ مرنے کے بعد ایک مرتبہ پھر زندہ ہوتا ہے اب ذہن  
میں یہ اشکال پیدا ہوتا ہے کہ مٹی ہو کر ریزہ ریزہ ہو کر پھر نئے سرے سے زندگی کیوں کر  
ہوگی۔ صحابہ کے استفسار پر اس اشکال کو حل فرماتے ہوئے آپ نے فرمایا کبھی بارش  
سے قبل تم نے زمین کی حالت دیکھی ہے کیسی خشک اور کیسی بے آب و گیاہ نظر آتی ہے مگر  
بارش کے بعد وہی زمین پھر سے سرسبز اور تروتازہ دکھائی دینے لگتی ہے وہ تنکے جو ابھی  
زمین پر مردہ لیٹے ہوئے تھے ایک چھینٹا پڑتے ہی اکڑتے ہوئے کھڑے ہو جاتے ہیں اسی

طرح مرنے کے بعد تم بھی پھر جی اٹھو گے۔

(۲) تقدیر کے مسئلے میں شبہ پیدا ہوتا ہے کہ جب ہمارے اعمال پہلے سے طے شدہ اور لکھے جا چکے ہیں تو اب آئندہ عمل کی جدوجہد کرنا بے کار ہے یا تمہارے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر یوں نہ بیٹھ رہیں صحابہ نے اس مشکل کا حل دریافت کیا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر تم سجد لکھے جا چکے ہو تو تم سے یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ تم نیک کام نہ کرو اور اگر خدا نخواستہ تقدیر دوسری طرف جا چکی ہے تو نیک عمل کرنے کی تم ہزار کوشش کرو تم کو یہی نہ پاؤ گے۔ تم سمجھتے ہو کہ عمل کی جدوجہد کرنا تقدیر سے باہر کوئی بات ہے ایسا نہیں بلکہ تقدیر جس طرح سزا و جزا کو محیط ہے اسی طرح اعمال صالحہ و اعمال بد کو بھی محیط ہے لہذا عمل کیے جاؤ تم سے وہی عمل صادر ہوں گے جو تمہاری تقدیر کے موافق ہیں۔ پھر آپ نے اس حقیقت پر متنبہ کرنے کے لیے کہ نیکی کی توفیق اور بدی سے احتراز سب اللہ تعالیٰ کے فضل و انعام سے میسر آتا ہے یہ آیت پڑھی **فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰی وَ اَتَقٰی وَ صَدَقَ بِالْحَسَنٰتِ فَيُسِّرُهَا لَيْسُرٰی وَ اَمَّا مَنْ بَخِلَ وَ اسْتَخْنٰی وَ كَذَّبَ بِالْحَسَنٰتِ فَيُسِّرُهَا لِّلْحَسَرٰی** (سو جس نے دیا اور اللہ سے ڈرا اور اچھی بات کو سچا سمجھا سو ہم اس کے لیے راحت کی چیز آسان کر دیں گے اور جس نے

غل کیا اور لا پر دانی ہوتی اور اچھی بات کو جھٹلایا سو ہم اس کے لیے مصیبت کی چیز آسان کر دیں گے)۔  
یہ اجمال و ابہام اور اشکالات قرآنی وغیرہ سے متعلق ایک ایک دو مثالوں پر اکتفا صرف اس خیال کے پیش نظر ہے کہ تفہیم کے لیے اتنا ہی کافی ہے ورنہ قرآن سے ایسی بہت سی مثالیں ہر ہر عنوان کے تحت پیش کی جاسکتی ہیں۔

**اشارات کی تشریح** | قرآن نہی کے سلسلے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کی مثالوں میں ایک قسم ان اشارات کی تشریح بھی ہے جو

قرآن میں متفرقا موجود ہیں۔ مثلاً

(۱) قرآن میں بہت سی آیات ایسی ہیں جو قصہ طلب ہیں جب تک وہ واقعہ پورا معلوم نہ ہو ان آیات کا صحیح مفہوم ہی سمجھ میں نہیں آتا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان قصوں کی تفصیل بیان فرمائی۔ مثال کے طور پر سورہ توبہ میں ہے **وَعَلَى الثَّلَاثَةِ الَّذِينَ خَلَوْا**

(اور ان تینوں پر بھی (توجہ فرمائی) جو پیچھے رہ گئے تھے) اب جب تک جنگِ تبوک کا سارا واقعہ اور بعض غلص صحابہ کا جنگ میں شامل نہ ہو سکنے کا قصہ معلوم نہ ہو یہ سمجھ میں نہیں آسکتا کہ وہ تین اصحاب کون تھے جن کا اس آیت میں حوالہ دیا گیا ہے۔ قرآن کریم میں اس قسم کی قصہ طلب بہت سی آیات ہیں۔

(۲) قصصوں کے علاوہ قرآن کے بعض تفسیری اجزا بھی ایسے ہیں جن کا علم صحابہ وحی کے بتلائے بغیر نہیں ہو سکتا اور ان کو معلوم کیے بغیر متعلقہ آیات قرآنی کا پورا مفہوم ہی واضح نہیں ہوتا۔ مثلاً سورہ بقرہ میں ہے قَبَّلَ الَّذِينَ ظَلَمُوا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِي قِيلَ لَهُمْ (جنہوں نے ظلم کیا تھا انہوں نے جو کلمات کہنا انہیں بتائے گئے تھے وہ بدل ڈالے) قرآن میں اس سے ما قبل کی آیت میں ان کلمات کا ذکر موجود ہے جو بنی اسرائیل کو شہر مود میں داخل ہوتے وقت پڑھتے رہنے کے لیے بتلائے گئے تھے وَتَوَلَّوْا حِطَّةً (یعنی جب دروازے میں داخل ہو تو حِطَّةً (اے اللہ ہمارے گناہ بخش دے) کہتے ہوئے داخل ہونا لیکن قرآن نے ان نمل اور گستاخانہ کلمات کا کوئی ذکر نہیں کیا جو ضد ہیں اگر بنی اسرائیل نے بلکے تھے۔ قرآن ان کا ذکر کرتا بھی کیوں وہ اس قابل ہی کب تھے کہ انہیں نقل کیا جاتا۔ بہر حال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بیان کر کے اس قوم کی نافرمانی و سرکشی کا حال ظاہر فرمایا آپس نے بتلایا کہ انہوں نے حِطَّةً کہے۔ جیسے حِطَّةً فِي شَعْبَةٍ کے نمل کلمات بکنے شروع کر دیے۔

تاریخین ان مثالوں کو محض سرسری نظر سے دیکھتے نہ چلے جاتیں بلکہ اچھی طرح غور کرتے جاتیں کہ قرآن سے متعلق یہ تمام توضیحات و تشریحات نبوی لفظاً اپنے الگ وجود کی حامل ہوتے ہوئے بھی معنایاً کسی طرح بھی قرآن سے زائد یا قرآن سے باہر نہیں ہیں اور اسی بنا پر کسی لحاظ سے بھی قرآن کی جامعیت کے منافی نہیں ہیں بلکہ فی الحقیقت قرآن کی جامعیت کا ثبوت ہیں۔

متقابلین میں تخصیص | تعلیم و توضیح قرآن ہی کے ضمن میں وہ احکام بھی آتے ہیں جن کو قرآن دو متقابل حیثیتوں سے صادر کرتا

ہے اور کوئی چیز ایسی ہوتی ہے جس کے بارے میں یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوتا ہے کہ وہ ان متقابلین میں سے کسی ایک میں داخل و شامل سمجھی جائے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس چیز کے بارے میں فیصلہ فرما دیتے ہیں کہ یہ چیز ان دو حکموں سے فلاں حکم کے تحت شمار ہوگی۔ مثلاً

(۱) قرآن نے طہیات کو حلال اور خباثت کو حرام قرار دیا ہے لیکن بعض اشیاء ایسی ہیں جن کے بارے میں قطعی فیصلہ نہیں کیا جاسکتا کہ وہ طہیات میں شامل ہیں یا خباثت میں مثلاً درندے اور شکاری پرند نیز خرگوش ناخن اور بیڑ وغیرہ کے متعلق قطعی طہ پر کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ کس قسم میں داخل ہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے واضح فرمایا کہ اپنی قسم طہیات میں اور دوسری قسم خباثت میں شامل ہے۔ آپ کے الفاظ ذی ناپ من السباع اور ذی مخالب من الطیر نے اس الجھن کو سلجھا دیا۔

(۲) قرآن نے مردار کو حرام اور ذبیحہ کو حلال قرار دیا ہے اب سوال یہ پیدا ہے کہ جو ذبیحہ ذبیحہ کے پیٹ سے ذبح کرتے وقت مردہ حالت میں نکل آئے اس کو حلال سمجھا جائے کہ حرام۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فیصلہ فرمادیا کہ ”ماں کو ذبح کرنا اس کے بچے کو ذبح کرنا ہے“ یعنی ماں کو ذبح کرنے سے پیٹ میں موجود بچہ بھی ذبیحہ ہی کے حکم میں ہو جاتا ہے :

**قیاسی ملحقات کی تعین** | بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ قرآن کسی علت کی بنا پر ایک حکم صادر کرتا ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بعض دوسری جزئیات میں وہی علت پائے جانے کی بنا پر ان جزئیات کو بھی اُس حکم کے تحت درج کر دیتے ہیں :

(۱) قرآن نے دو بہنوں کو بیک وقت نکاح میں جمع کرنے کو حرام قرار دیا ہے اس حکم میں علت یہ تھی کہ اس وجہ سے ان میں قطع رحمی پیدا ہو جائے گی۔ دو بہنوں کے درمیان جو شرعاً صلہ رحمی واجب تھی اس کو نقصان پہنچتا تھا اس علت کو دیکھتے ہوئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض دوسرے رشتوں کو بھی اسی حکم میں درج فرمادیا جن میں یہی قطع

رحمی کا خطرہ موجود تھا مثلاً پھوپھی بھتیجی یا خالہ بھانجی ۔

(۲) قرآن نے بلا اور سود کو حرام قرار دیا ہے۔ زمانہ جاہلیت میں یہ عام رواج تھا کہ قرض کی مہلت بڑھا کر اصل رقم میں اضافہ کر دیا کرتے تھے۔ قرضخواہ کہتا کہ یا تو رقم ادا کر دو ورنہ رقم میں سود کو شامل کر لو۔ قرآن نے اس کو اس لیے حرام قرار دیا تھا کہ قرض کی رقم میں جو اضافہ کر دیا جاتا تھا وہ کسی چیز کے عوض میں نہیں ہوتا تھا وہ ایک قسم کا ناجائز نفع تھا۔ تھانہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس علت کے پیش نظر قرض میں ہر قسم کا ناجائز نفع حاصل کرنا منع فرما دیا مثلاً ایک شخص کسی کا مقروض ہے تو قرضخواہ کو یہ حق نہیں کہ وہ اس دباؤ میں مقروض کے مکان میں مفت رہا کرے کیونکہ یہ بھی ایک قسم کا ناجائز نفع ہے جو وہ اپنے قرض کے دباؤ میں بلا وجہ حاصل کر رہا ہے۔

بات کچھ طویل ہو گئی مگر تفہیم مقصود کے لیے یہ طوالت بھی ضروری تھی تاہم کون اندازہ ہو گیا ہو گا کہ مجمل احکام کی تفصیلات ہوں یا مبہم آیات کی توضیحات قرآنی مشکلات کی تشریحات ہوں یا قرآنی اشارات کی تشریحات و متقابل احکام کے درمیان تخصیصات ہوں یا قیاس کے طریقے پر تعین شدہ قرآنی آیات کے ملحقات ہوں یہ تمام تفصیلات تعلیم و ترویج قرآن میں داخل و شامل ہونے کی بنا پر قرآن سے باہر یا قرآن سے زائد کئی چیز نہیں ہیں بلکہ دراصل قرآن ہی کا ایک حصہ ہیں اور انہیں سے یہ حقیقت بھی واضح ہو گئی ہو گی کہ قرآن کی جامعیت احادیث رسول کے تسلیم کرنے سے مانع نہیں ہے بلکہ خود قرآن کی جامعیت ہی اس کی متقاضی ہے کہ اس کے اصولی احکام کی تفریحات اور اس کے کلی امور کی جزئیات بیان کی جائیں کیونکہ کسی کتاب کے جامع ہونے کا مفہوم ہی یہ ہوتا ہے کہ اس میں منتشر اور مختلف جزئیات کے احکام کو اصول اور کلیات کی شکل میں جمع کر دیا گیا ہو۔

**جامعیت قرآن کی مزید وضاحت** | قرآن کی جامعیت کے اصل مفہوم کی وضاحت کرتے ہوئے امام شاطبی فرماتے ہیں :

قرآن کریم مختصر ہونے کے باوجود جامع کتاب ہے

القرآن علی اختصار جامع ولا

یكون جامعاً لآلاف المجموع فيه امور  
کلیات۔ (الوافقات ج ۳ ص ۳۶۷)

اور یہ جامعیت اسی وقت ہو سکتی ہے جبکہ اس میں  
کلیات مذکور ہوں۔

کسی کلام کے جوامع الکلم ہونے کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ اس میں ایسی کلیات مذکور ہوتی ہیں جو اپنی تمام ماتحت انواع و افراد کو پوری طرح حاوی ہوتی ہیں اس کے ساتھ ہی وہ ان افراد کے حکم پر بھی دلالت کرتی ہیں جو اس کے الفاظ کی قید سے خارج ہو گئے ہیں۔ تاہم جوامع الکلم کے الفاظ میں ایسی تنگی بھی نہیں ہوتی کہ مراد کے خلاف کچھ اور وہم پیدا ہونے لگے۔ اس کے علاوہ اس کے الفاظ اتنے مبہم بھی نہیں ہوتے کہ جو مراد ان کی بتلائی جائے وہ ان سے ظاہر نہ ہو۔ کلام کی جامعیت کا کمال اس میں ہے کہ اپنے تمام تر اختصار کے باوجود اس کے الفاظ اتنے صاف ہوں کہ جب ان کی تفصیل و تشریح کی جائے تو ہر تفصیل اور ہر تشریح پر وہ اس طرح صادق نظر آئیں گویا اسی کے لیے وضع کیے گئے تھے۔ قرآن کے علاوہ کوئی بھی کلام جامعیت کے ان اوصاف پر پورا نہیں اترتا۔ قرآن کے علاوہ ہر کلام میں دو غامیوں میں سے ایک غامی ضرور نظر آتی ہے وہ اگر شان جامعیت میں ممتاز ہوگا تو اس میں اخلاق و ابہام کا عیب ضرور نظر آئے گا اور اگر واضح اور صاف ہوگا تو اس میں شان جامعیت مفقود ہوگی۔ ان دو متضاد صفتوں کا اجتماع آیات قرآنیہ ہی میں نظر آتا ہے البتہ بعض احادیث بنویہ بھی اس کی منظر ہیں۔

**متن اور شرح کی نسبت** | غرض قرآن کی جامعیت کا یہ مفہوم ہرگز نہیں ہے کہ اسے تفصیل و تشریح کی حاجت نہیں ہے یا وہ اتنا واضح ہے کہ اس کے لیے کسی معلم و مفسر کی ضرورت نہیں۔ اوپر جو تفصیلات تسلیم و توضیح قرآن کی ہم نے دی ہیں ان کو سامنے رکھ کر دیکھئے آپ لازماً اسی نتیجے پر پہنچیں گے کہ قرآن اور حدیث میں متن اور شرح کی نسبت ہے پھر یہ متن شرح میں اور شرح متن میں اس طرح درج ہے کہ ایک کا افراد و انکار دوسرے کا اقرار و انکار میں جاتا ہے۔ قرآن اور حدیث میں ہر ایک الہامی رابطہ ہے کہ قرآن کو تسلیم کر کے حدیث کا انکار ممکن نہیں اور حدیث کا انکار کر کے قرآن کو ماننے کی کوئی صورت نہیں بلکہ اگر آپ متن اور شرح کے درمیان جو نسبت اور



تعلق ہے اس پر غور کریں گے تو حدیث کی اہمیت فزوں سے فزوں تو نظر آئے گی۔ جس طرح متن شرح کا محتاج ہے اسی طرح قرآن کو حدیث کی ضرورت ہے۔ امام اوزاعی کا جو قول ہے :

<p>الکتاب أحوج إلى السنة من السنة إلى الكتاب (جامع بیان العلم ۲ ص ۱۹)</p>	<p>کتاب اللہ سنت کی طرف زیادہ محتاج ہے بہ نسبت سنت کے کتاب اللہ کی طرف۔</p>
---	---

تو اس کا یہی مطلب ہے کہ قرآن بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم و توضیح کا محتاج ہے۔ ہم قرآن کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کا طریقہ جاننے کے لیے اس ہستی کے یقیناً محتاج ہیں جو قرآن کو سب سے زیادہ جاننے والا تھا۔ شیخ مطرف بن یحز سے کسی شخص نے کہا کہ آپ ہم سے قرآن کے سوا اور کچھ مت بیان کیجئے آپ نے جواب دیا :

<p>فَاللّٰهُ مَا تُزِيدُ بِالْقُرْآنِ بَدَلًا وَلَكِنْ تُزِيدُ مَنْ هُوَ أَعْلَمُ بِالْقُرْآنِ۔ (جامع بیان العلم ۲ ص ۱۹)</p>	<p>خدا کی قسم قرآن کے بدلے ہم بھی کوئی اور کتاب نہیں چاہتے لیکن ہم اس سے قطع نظر نہیں کر سکتے جو قرآن کا سب سے زیادہ جاننے والا تھا۔</p>
--	--

مطلب یہی ہے کہ ہم قرآن کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد کے بغیر سمجھنے کے اہل ہی نہیں ہیں۔ امام اوزاعی کے متذکرہ بالا قول کی مراد بیان کرتے ہوئے حافظ ابو عمر فرماتے ہیں :

<p>يُرِيدُ أَنَّهُ تَقْضَىٰ عَلَيْهِ وَتُبَيَّنَ الْمُرَادُ مِنْهُ (المجملات ج ۲ ص ۱۹)</p>	<p>امام اوزاعی کا مطلب ہے کہ سنت قرآن کے لیے فیصلہ ہے اور اس کی مراد بیان کرتی ہے۔</p>
--	--

**قرآنی احکام کے لیے فیصلہ** | سنت قرآن کے مجملات کی تفصیل اس کے مبہمات کی توضیح اور اس کی مشکلات کی تیسیر کرتی ہے اور اس لحاظ سے قرآنی احکام کے لیے واقعی فیصلہ کے مقام پر ہے۔ حافظ ابو عمر نے امام اوزاعی کے قول کی بھرپور بیان کی ہے اس کی تائید خود امام اوزاعی کے اس قول سے بھی ہوتی ہے جو انہوں نے

حسان بن عطیہ سے نقل کیا ہے کہ

كَانَ الْوَحْيُ يَنْزِلُ عَلَى رَسُولِ اللَّهِ  
صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَيَحْضُرُ  
جِبْرِيلُ بِالسَّنَةِ الَّتِي تَفْسِّرُ  
ذَلِكَ (الموافقات ج ۲ ص ۱۰۷)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی اترا کرتی تھی  
اور پھر جبریل آپ کے پاس وہ سنت لے کر آتے  
جو اس کی تفسیر کر دیتی تھی۔

امام اوزاعی کے اس قول کو کہ کتاب اللہ سنت کی زیادہ محتاج ہے منکرین حدیث اپنی کم فہمی  
کی بنا پر نہ جانے کیا کیا معنی پہناتے ہیں۔ امام اوزاعی کے اس قول کا یہ مطلب ہرگز نہیں  
کہ اس طرح وہ سنت کو قرآن پر فوقیت دینا چاہتے ہیں بلکہ حقیقت یہ ہے وہ یہ بات  
کہہ کر قرآن کی جامعیت ثابت کرنا چاہتے ہیں تشریح کا محتاج وہی کلام ہوا کرتا ہے جو جامع  
ہوتا ہے جیسا کہ ہم ابھی اوپر بتا چکے ہیں کہ جامع کلام اپنے تمام افراد و انواع کو حاوی ہوتا  
ہے۔ اب ظاہر ہے ان افراد و انواع کا علم حاصل کرنے کی ضرورت ہمیشہ آئے گی جو چیز  
بھی اس ضرورت کو پورا کرے گی ہم کہیں گے کہ وہ جامع کلام اس چیز کا محتاج ہے۔ اس  
کے علاوہ یہ بات بھی ذہن میں رکھنے کی ہے کہ یہ احتیاج کلام کے نفس مضمون کے اعتبار سے  
نہیں بلکہ کلام کے مخاطبین کے اعتبار سے ہوتی ہے جب ہم یہ کہتے ہیں کہ قرآن  
سنت کا محتاج ہے تو دراصل ہم یہ کہتے ہیں کہ قرآن کے مخاطبین قرآن کو سمجھنے کے  
یہ سنت کے محتاج ہیں۔

امام شاطبی امام اوزاعی کے قول کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

لِأَنَّ الْكِتَابَ يَكُونُ مُحْتَمَلًا لِأَمْرَيْنِ  
فَاكْتَفَيْنَا فِي السَّنَةِ بِتَعْيِينِ أَحَدِهِمَا  
فَمُوجَعُ الْحَقِّ السَّنَةِ وَيَتَوَلَّى  
مَقْتَضَى الْكِتَابِ -

قرآن کی عبارت میں کبھی دو باتوں کا اور کبھی اس سے  
بھی زیادہ کا احتمال ہوتا ہے حدیث اگر ان میں سے  
ایک احتمال کو متعین کر دیتی ہے پس سنت کی طرف  
رجوع کیا جاتا ہے اور قرآن کے دوسرے احتمال  
کو ترک کر دیا جاتا ہے۔

(الموافقات ج ۱ - ص ۱۰۸)

یعنی جب سنت کتاب اللہ کی مراد متعین کر دے تو پھر کتاب اللہ کے اجمال اور لغظی احتمالات  
پر عمل نہ کیا جائے گا مثال کے طور پر قرآن نے کہا وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوا

اُیڈا لیکھما (اور چوری کرنے والا مرد اور چوری کرنے والی عورت دونوں کے ہاتھ کاٹ ڈالو۔ المائدہ: ۳۸) مگر یہ نہیں بتلایا کہ ہاتھ کاٹنے کی یہ سزا کتنا مال چراتے پر ہے نیز اس کی بھی کوئی تفصیل نہیں کی کہ سزا دینی ہو تو ہاتھ کس قدر کاٹا جائے۔ اب قرآن کے اس حکم میں کئی احتمالات ہیں ممکن ہے ہاتھ کاٹنے کی سزا صرف اس وقت دی جاسکتی ہو جب خاصی کثیر مقدار میں کوئی مال چوری کیا جائے مگر ساتھ ہی یہ بھی احتمال ہے کہ ہر چوری پر ہاتھ کاٹ دیا جائے خواہ چھوٹی چوری ہو خواہ بڑی۔ اسی طرح سزا کی کیفیت میں بھی ہو سکتا ہے کہ ہاتھ بالکل جڑ سے یعنی مونڈھے کے قریب سے ہی کاٹ دینے کا حکم دیا گیا ہو یا ممکن ہے کہ کھنی سے کاٹنا مراد ہو اور یہ بھی امکان ہے کہ صرف پونچے پر سے کاٹنے کے لیے کہا گیا ہو۔ سنت نے ان تمام احتمالات کو صاف کر کے بتلادیا کہ جس مال کی چوری پر ہاتھ کاٹا جاسکتا ہے اس کی مقدار کم از کم دس درہم کے برابر ہونی چاہیے نیز ضروری ہے کہ وہ مال محفوظ بھی ہو تاکہ اس پر چوری کا لفظ صادق آسکے۔ اسی طرح سزا کی کیفیت و مقدار کے بارے میں بتایا کہ جب ہاتھ کاٹا جائے تو پونچے پر سے کاٹا جائے۔ اب غور کیجئے قرآن نے ایک حکم دیا جس میں کئی احتمالات تھے سنت نے ایک احتمال متعین کر دیا اب اس تعین کے بعد اس قرآنی حکم کے دوسرے احتمالات کو ترک کر دیا جائے گا اور سنت کے متعین کردہ احتمال کو قول فیصل کے طور پر قبول کر لیا جائے گا۔

یہی بات ہے جس کو حافظ ابن عبد البر نے ان الفاظ میں ادا کیا ہے

<p>سنت کتاب کے (احکام کے) بارے میں فیصلہ کرنے والی ہے۔</p>	<p>السنۃ قاضیۃ علی الکتاب۔ (جامع بیان العلم)</p>
--	--

اس کا مطلب معاذ اللہ یہ تو نہیں ہے کہ سنت کتاب اللہ کے احکام کے صحیح یا غیر صحیح ہونے کے بارے میں فیصلہ کرنے والی ہے بلکہ قاضی علی الکتاب کا مطلب یہی ہے کہ سنت قرآن کی اصل مراد کے بارے میں قول فیصل کی حیثیت رکھتی ہے جیسا کہ اوپر کی مثال میں ہم نے دیکھا کہ چوری کی سزا کے حکم میں سنت نے اگر فیصلہ کیا کہ قرآن کی اصل مراد کیا ہے۔

غرض قرآن اور حدیث میں متن اور شرح کی نسبت ہے اور اس حیثیت سے حدیث قرآن کی جامعیت کے منافی نہیں اس کی مؤید ہے۔ بقول امام شاطبی

فكان السنّة بمنزلة التفسير والشرح | گویا سنت کتاب اللہ کے احکام کے لیے بمنزلہ  
لمعانی احکام الكتب (الموافقات ج ۱ ص ۱۷۸) | تفسیر اور شرح کے ہے۔

### حدیث کی مستقل حیثیت

رہی وہ احادیث جو بظاہر ایسے احکام پر دلالت کرتی نظر آتی ہیں جن سے قرآن خاموش ہے اور نفیاً یا اثباتاً کسی طرح بھی ان کا ذکر نہیں کرتا۔ مثلاً وہ احادیث جن میں شفعہ کے احکام مذکور ہیں یا وہ احادیث جن سے شادی شدہ زانی کو سنگسار کرنے اور غیر شادی شدہ کو جلاوطن کرنے کا حکم ہے یا اسی طرح دادی کی وراثت کے حکم پر مشتمل حدیث تو ان احادیث کو ہم قرآن کی تفسیر اور شرح کیونکر کہیں گے اس سلسلے میں پہلی بات تو یہ ہے کہ ایسی احادیث سے جن احکام کا اثبات ہوتا ہے وہ اگرچہ صراحتاً و عبارتاً قرآن میں مذکور نہیں ہوتے تاہم وہ کسی نہ کسی طرح نصوص قرآن ہی کے زمرے میں آتے ہیں۔ کسی صحیح حدیث سے کوئی ایسا حکم ثابت نہیں ہوتا جو قرآن میں وارد نہ ہو وہ کسی نہ کسی نص یا قاعدے کے تحت ضرور داخل ہوتا ہے امام شاطبی فرماتے ہیں :

ليس في السنّة الا واصلها | حدیث میں کوئی حکم ایسا نہیں جس کی اصل  
القرآن (الموافقات ج ۲ ص ۱۷۸) | قرآن میں نہ ہو۔

اس کے علاوہ قرآن نے ایک کلی اصول بتلادیا ہے کہ

وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُمَا | جو کچھ رسول تمہیں دے اسے لے لو اور جس سے  
نہکم عنہا فانتهوا (الحشر - ۷) | منع کر دے اس سے رک جاؤ۔

اس آیت نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر حکم کوئی الحقیقت قانون خداوندی کا ایک حصہ بنا دیا ہے اب آپ جس کام کے بھی کرنے کا حکم دیں گے یا جس کام سے بھی روکینگے

نوادہ اس کی اصل تفسران میں صراحتاً ہو خواہ مخفی ہر سالت میں رہ اس آیت کے تحت داخل ہو کر تفسران ہی کا حکم بن جائے گا۔

اسی اصول کو سامنے رکھتے ہوئے تو حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے جسم گدوانے والی عورتوں پر لعنت بھیجنے کو قرآنی حکم سے تعبیر کیا تھا۔ ایک مرتبہ قبیلہ بنی اسد کی ایک عورت حضرت عبداللہ بن مسعود کے پاس آئی اور کہنے لگی اے ابو عبد الرحمن! میں نے سنا ہے آپ ان عورتوں پر لعنت بھیجتے ہیں جو اپنے اعضا کو گود کران میں رنگ بھراتی ہیں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے جواب میں فرمایا ہاں! میں اس پر لعنت کیوں نہ بھیجوں جس پر اللہ اور اس کے رسول نے لعنت کی ہو اور جو خود تفسران میں بھی مذکور ہو، اس عورت نے کہا قرآن تو از ادل تا آخر میں نے بھی پڑھا ہے مگر یہ بات تو قرآن میں مجھے کہیں نہیں ملی آپ نے فرمایا اگر تو قرآن کو کچھ کر پڑھتی تو تجھے اس میں یقیناً یہ بات مل جاتی کیا قرآن میں یہ آیت نہیں ہے وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے اس آیت کا حوالہ دے کر قرآن کی جامعیت کا اصل مفہوم گویا واضح کر دیا (الموافقات ج - ۴ ص ۲۶)

اسی طرح حضرت عبدالرحمن بن یزیدؓ نے ایک شخص کو حالت احرام میں سلے ہوئے کپڑے پہنے دیکھا تو اسے منع فرمایا اس نے کہا قرآن کی کسی آیت میں حکم دکھلائیے آپ نے جواب میں یہی آیت تلاوت فرمادی۔

اس قسم کے تمام آثار اسی حقیقت کا پتہ دے رہے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر حکم قابل اتباع ہے اس لیے کہ آپ کا کوئی حکم تفسران سے باہر نہیں ہے آپ کے ہر حکم کی اصل قرآن میں موجود ہے اور یہی قرآن کی جامعیت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

قرآن کی جامعیت کے مفہوم میں یہ تو معذور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ارشاد سے بھی ثابت ہے۔ ایک بار ایک دیہاتی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ میرے لڑکے نے زنا کر لیا ہے میں نے اس کی سزا کے متعلق لوگوں سے دریافت کیا تو کچھ لوگوں نے مجھے بتلایا کہ اسے رجم کر دینا چاہیے میں نے اس کے

بدلے میں سو بکریاں اور ایک باندی ادا کر دی اس کے بعد کچھ لوگوں نے مجھ سے کہا کہ تمہارے لڑکے کے لیے تو سو کوڑے اور سال بھر جلا وطنی کی سزا ہے آپ نے یہ سُن کر فرمایا لَا تَقْضِيَنَّ بَيْنَكُمْ بِلِکْتَابِ اللّٰهِ میں کتاب اللہ کے مطابق تمہارے درمیان فیصلہ کروں گا پھر اس کے بعد فرمایا کہ تیری باندی اور بکریاں تجھے واپس ہیں اور تیرے لڑکے پر سو کوڑے اور سال بھر جلا وطنی کی سزا۔ اس کے ساتھ ہی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابی حضرت انیس کو حکم دیا کہ تم اس عورت کے پاس جاؤ جس سے یہ زنا کا فعل منسوب کرتا ہے اگر وہ اقرار کر لے تو اسے رہنم کر دو انیس گئے اس نے اقرار کر لیا اور زچم کر دی گئی۔  
(بحوالہ ترجمان السیرۃ)۔

اس واقعے میں غور کرنے کی بات یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے فیصلے کو کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ قرار دیا ہے حالانکہ کتاب اللہ میں رجم اور جلا وطنی کی سزا کہیں مذکور نہیں اسی سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک قرآن کی جامعیت کا مفہوم کیا تھا :

**قرآن کی جامعیت اور اسوۂ رسول** | قرآن کی جامعیت کے مفہوم کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے یہ امر بھی ملحوظ رہنا چاہیے کہ قرآن صرف ایک علمی کتاب ہی نہیں ہے بنی نوع انسانی کے لیے ایک دستور العمل بھی ہے گویا قرآن کی دو حیثیتیں ہیں ایک علمی دوسری علمی۔ علمی حیثیت سے قرآن کو سمجھنے کے لیے اگر ہمیں ایک معلم کی تعلیم کی ضرورت ہے تو علمی حیثیت سے قرآن کے مطابق زندگی بسر کرنے کے لیے ہمیں ایک ہادی کے نقشہ عمل کی بھی ضرورت ہے۔ اس لحاظ سے قرآن کی جامعیت کے تقاضے کے تحت ہم تعلیم بنوی کے ساتھ ساتھ اسوۂ بنوی کے بھی محتاج ہیں۔ دینی علوم میں بھی بہت سے علم ایسے ہیں جو اول تو عملی مشق کے بغیر سمجھ ہی نہیں آتے اور اگر سمجھ میں آ بھی جائیں تو جب تک کوئی عملی نمونہ سامنے نہ ہو ان کو عمل میں لانا ممکن نہیں ہوتا مثلاً طب اور طباطبائی ہی کا علم ہے اس علم میں ہمارے حاصل کرنے کے لیے صرف کتابوں کا پڑھ لینا کافی نہیں سمجھا جاتا بلکہ عملی تجربہ اس کا ایک لازمی جزو سمجھا جاتا ہے اسی طرح انجینئرنگ کا فن ہے یا دیگر سائنسی علوم

ہیں ان کا صرف پڑھ لینا ان کی پوری حقیقت سمجھنے کے لیے اور ان علوم میں پوری مہارت حاصل کرنے کے لیے قطعاً ناکافی ہے۔ یہی حال قرآن کا ہے قرآن صرف ایک علمی کتاب ہی نہیں عملی ہدایت نامہ بھی ہے اس کے لیے تعلیم کے ساتھ ساتھ ایک ایسے نقشہ عمل کی بھی ضرورت ہے جس کو دیکھ دیکھ کر ہم قرآن کے عملی تقاضوں کو پورا کر سکیں۔ یہ نقشہ عملی ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کی صورت میں عطا فرمایا گیا ہے۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ  
حَسَنَةٌ (احزاب - ۲۱) - تمہارے لیے اللہ کے رسول میں ایک عمدہ نمونہ  
تقلید ہے۔

اور قرآن چونکہ ایک جامع کتاب تھی اس لیے اس کے نقشہ عمل کو بھی تمام نقشوں میں جامع تر بنایا گیا۔ قرآن کے ہر چھوٹے بڑے عمل کی ایک مکمل تصویر اس نقشہ میں تھیا کر دی گئی قرآن کریم میں اگر نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کے احکام مذکور تھے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ میں ان عبادات کا مکمل نقشہ ہم پہنچا یا گیا۔ قرآن اگر امارت، امامت، غزوات و جہاد، نظم و نسق اور فصل خصومات سے متعلق ہدایات کا حامل تھا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کو ان ہدایات کی مکمل تفصیلات کا آئینہ بنایا گیا۔ قرآن نے ازدواجی زندگی، باہمی معاملات اور جنگ و صلح کی تدابیر جیسے مسائل کی نشاندہی کرنا انسانیت کی تکمیل کے لیے اگر ضروری سمجھا تو ان مسائل کی نزاکتوں کے تمام رنگ اس نقشے میں ایک ایک کر کے بھرے گئے تھے کہ قرآن نے انسان کو صحیح انسانی زندگی گزارنے کا ایک بنیادی لائحہ عمل عطا کیا تھا تو اس کے عملی نقشے میں انسانی زندگی کے معمولی گوشوں مثلاً بول و براز، طعام و شراب، رفتار و گھبراہٹ و گریہ اور نوم و بیداری وغیرہ تک کے خطوط واضح کیے گئے۔ غرض قرآن جامع تھا اسی لیے اس کے عملی نقشے کو بھی انتہائی جامع بنایا گیا جو کچھ قرآن میں اصولی اور کلی طور پر کہا گیا تھا وہ سب تمام جزئیات و تفصیلات کے ساتھ اس نقشے میں دکھلا دیے گئے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اسی حقیقت کی نشاندہی کی تھی جب کسی شخص نے ان سے سوال کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کیا تھے تو آپ نے فرمایا

كَانَ خَلْقَهُ الْقُرْآنَ (قرآن ہی آپ کا خلق تھا) خلق میں اقوال اور افعال سب داخل ہیں مطلب یہ تھا کہ آپ کا کوئی قول اور کوئی فعل ایسا نہ تھا جو قرآن سے باہر ہو۔

خلاصہ یہ ہے کہ قرآن کی جامعیت کا یہ مفہوم ہرگز نہیں ہے کہ اسے کسی تفصیل و تشریح کی حاجت نہیں یا وہ اتنا واضح ہے کہ اس کے لیے کسی معلم و مفسر کی ضرورت نہیں بلکہ اس کا مفہوم جیسا کہ ہماری اہل تک کی گفتگو سے واضح ہو چکا ہے مختصراً یہ ہے کہ قرآن خدا تعالیٰ اور آدابِ عبادت کے تمام اصولوں پر مادی ہے اس نے انسانی زندگی سے متعلق تمام اصول ایسے جامع اور سادہ الفاظ میں بیان کیے ہیں کہ دنیا کے مختلف نسلوں کی مختلف ضروریات میں سے کبھی کوئی ضرورت ایسی پیش نہیں آ سکتی جس کے متعلق قرآن کریم کے ان الفاظ میں پوری روشنی نہ ملے۔ قرآن جامع ہے اس معنی میں کہ اس نے عقائد، عبادات، معاملات اور اخلاق سے متعلق تمام کلیات کھول کھول کر بیان کر دی ہیں۔ قرآن جامع ہے ایسے کہ وہ ماضی کی خبروں، مستقبل کی اطلاعی اور حال کے احکام کا احاطہ کیے ہوتے ہے۔ قرآن جامع ہے اس لحاظ سے کہ وہ سیاست، معیشت اور معاشرت کے مسائل کے لیے ایک مکمل آئین کی حیثیت کا حامل ہے اور قرآن جامع ہے اس طور پر کہ اس کے ایک ایک لفظ میں حقائق و معارف کے دریا پوشیدہ ہیں جن پر اطلاع پانے کے لیے ہم حدیث رسول کے محتاج ہیں۔





# حدیث کی تشریحی حیثیت

**احادیث کی تین قسمیں |** علماء اس بات پر متفق ہیں کہ احادیث بنوہ کی تین قسمیں ہیں:

(۱) اول وہ احادیث جو قرآنی احکام کی مؤید اور اجمال و تفصیل میں ان کے موافق ہیں ہوتا یہ ہے کہ قرآن کریم میں پہلے سے کوئی حکم موجود ہوتا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی مزید تائید و حمایت فرمادیتے ہیں۔ مثلاً نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کی فرضیت کے احکام قرآن میں پہلے سے موجود تھے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرما کر ان احکام کی مزید تائید و توثیق فرمادی کہ اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر رکھی گئی ہے لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی شہادت دینا، نماز قائم کرنا، زکوٰۃ ادا کرنا، ماہ رمضان کے روزے رکھنا اور بیت اللہ کا حج کرنا۔

(۲) دوسری قسم کی وہ احادیث ہیں جو قرآنی احکام کی وضاحت کرتی ہیں جن سے قرآن کے مطلق احکام کی تفسیر، محلات کی تفصیل اور عام احکام کی تخصیص ہوتی ہے۔ اسی قسم میں وہ احادیث بھی شامل ہیں جو مہمات قرآنی کی توضیح اس کی مشکلات کی تیسیر اور اس کے اشارات کی تشریح کرنے والی ہیں۔ اس قسم کی احادیث کی مثالیں ”ہم قرآن کی جامعیت کے عنوان کے تحت ابھی بیان کر چکے ہیں۔

(۳) تیسری قسم کی احادیث وہ ہیں جو ایسے احکام پر دلالت کرتی ہیں جن سے قرآن خاموش ہے اور نہایت اثباتاً کسی طرح بھی ان کا ذکر نہیں کرتا مثلاً وہ احادیث جن میں مذکور ہے کہ بھوپتی بھتیجی اور خالہ بھانجی کو بیک وقت ایک شخص کے نکاح میں جمع نہیں کیا جاسکتا۔ یا وہ احادیث جن میں شفیعہ کے احکام بیان کیے گئے ہیں۔ اسی طرح وہ احادیث جن میں شادی شدہ زانی کو سنگسار کرنے اور غیر شادی شدہ زانی کو جلاوطن کرنے کے حکم یا دادی کی شہادت کے حکم اور اسی قسم کے دیگر احکام پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

احادیث بنویہ کی یہ تقسیم محض نفسِ مضمون کے اعتبار سے ہے ورنہ جہاں تک حدیث کے تشریحی مقام کا تعلق ہے علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ حدیث کی یہ تینوں قسمیں دین میں برابر کی حیثیت سے حجت ہیں اگرچہ حدیث کی تیسری قسم بعض علماء کے نزدیک اپنے معنی و مفہوم کے اعتبار سے راجح الی الکتاب ہو کر حجت ہے جبکہ بعض علماء اسے ایک الگ مستقل ماخذ تشریح قرار دے کر حجت مانتے ہیں ظاہر ہے یہ محض لفظی نزاع ہے۔ ورنہ اپنے ثبوت کے اعتبار سے دونوں فریق کے نزدیک احادیث کی تیسری قسم بھی اسی طرح حجت ہے جس طرح اول الذکر دو قسمیں۔

مگر اللہ ہدایت دے منکرین حدیث کو وہ حدیث کی ان تینوں قسموں میں سے کسی قسم کو بھی دین میں حجت مانتے کو تیار نہیں ہیں۔ حدیث کی آخری دو قسمیں تو ان کے نزدیک قابل اعتناء ہیں ہی نہیں پہلی قسم کی احادیث کے بارے میں بھی وہ اپنا معروف گوہر کا طرز عمل اختیار کرتے ہیں بنیادی طوہر تو وہ اس قسم کی احادیث کو جو قرآن کی مؤید ہیں تسلیم کرتے ہیں کیونکہ ان احادیث کا انکار بلا واسطہ اور بالکل بدیہی طوہر قرآن کا انکار بن جاتا ہے مگر جب احادیث کے ذخیرے کو مشکوک اور ناقابل اعتماد قرار دینے پر اترتے ہیں تو ہر قسم کی احادیث کو پٹیتے پیٹے چلے جاتے ہیں اور اس طرح قرآن کی مؤید احادیث بھی خود بخود حجیت کے خاتمے سے خارج ہو جاتی ہیں۔

اور یہ کہہ کر تو وہ حدیث کی حجیت کا خواہ اس کا تعلق مذکورہ تینوں قسموں میں سے کسی بھی قسم سے ہو جھگڑا ہی چکا دیتے ہیں کہ رسول کا کام صرف اتنا ہے کہ اللہ کے بندوں کو اللہ کا کلام سنا دے قرآن سنا کر رسالت کی حیثیت ختم ہو جاتی ہے۔ رسالت کا حق ہم پر صرف یہ ہے کہ جو قرآن رسول نے پڑھ کر ہمیں سنایا ہے اس کو ہم رسول کے اعتماد پر اللہ کا کلام تسلیم کر لیں اس کے بعد رسول اور ہم برابر ہیں جس طرح ان کے پاس عقل ہے ہمارے پاس بھی ہے جس طرح وہ قرآن سمجھتے ہیں ہم بھی سمجھ لیتے ہیں۔ دین کے معاملات میں رسول کی رائے کا بھی وہی وزن ہے جو ہماری رائے کا۔ مختصر یہ کہ قرآن سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کے لیے ہمیں رسول کی رہنمائی کی کوئی ضرورت نہیں۔

الحیاذ باللہ نقل کفر کفر نباشد ۔

اب اس کے بعد حدیث کی کوئی قسم ایسی رہ گئی جو منکرین حدیث کے نزدیک قابل حجت سمجھی جاتی ہو۔ چلے منکرین حدیث کو ان کے حال پر چھوڑتے ہیں اور اب اس بات کا جائزہ لیتے ہیں کہ یہ تینوں قسم کی احادیث ماخذین ہونے کی حیثیت سے کبھی مقام پر ہیں ؟

**مؤید قرآن احادیث کی حجیت** جہاں تک پہلی قسم کی احادیث کا تعلق ہے وہ قرآنی احکام کی مؤید اور اجمال و تفصیل میں

ان کے موافق و مطابق ہونے کے لحاظ سے عین قرآن ہیں اس لیے ان احادیث کو تو ماخذ دین ماننے بغیر چارہ نہیں جو ان کو ماخذ دین نہیں مانتا وہ دراصل قرآن ہی کو ماخذ دین تسلیم نہیں کرتا اور جو قرآن کو دین کی بنیاد نہیں مانتا وہ اس وقت ہمارا مخاطب ہی نہیں ؟

**موضح قرآن احادیث کی حجیت** یہ دوسری قسم کی احادیث جو قرآنی احکام کی وضاحت کرتی ہیں اور قرآن کا بیان ہونے کی حیثیت کی

حامل ہیں ان کی حجیت و عدم حجیت پر گفتگو کرنے سے پہلے دراصل اس بات کا فیصلہ ہو جانا چاہیے کہ کیا ہم بھی قرآن کی مرادات صحیح صحیح متعین کرنے کی اہلیت سے اسی طرح بہرہ ور ہیں جس طرح ایک رسول یا نبی ہوتا ہے کیونکہ دعویٰ عدم حجیت کا اصل معنی فی الحقیقت یہی ہے کہ قرآن نہیں ہے اس لیے رسول کی رہنمائی کی ضرورت ہی کو تسلیم نہیں کیا جاتا۔

**مرادات قرآنی کا صحیح تعین اور ہم** کیا کوئی شخص اس بات سے انکار کر سکتا ہے کہ قرآن کریم اپنی ذات میں ایک معجزہ ہے

اور اس کی یہاں مجازی شان صرف الفاظ ہی کے لحاظ سے نہیں معانی کے لحاظ سے بھی ہے نہ الفاظ کی ترکیب و ترتیب اور انداز بیان ہی میں مخلوق کے ہاتھوں اس کا مثل لایا جانا ممکن ہے اور نہ ہدایت و احکام کی جامعیت ہی کے لحاظ سے اس کی نظیر کا بنالیا جانا مخلوق کے قبضہ قدرت میں ہے چنانچہ قرآن کے بار بار چیلنجوں کے باوجود دنیا آج تک قرآن کی ایک چھوٹی سے چھوٹی آیت کی مثل نہ لاسکی الفاظ کی طرح ہی قرآن کی معنوی وسعتوں

نے بھی دنیا کو عاجز کر کے رکھ دیا قرآن جیسی جامع علوم و معارف کوئی کتاب یا اس کے کسی چھوٹے سے چھوٹے جزو جیسا کوئی جزو چودہ سو سال گزرنے کے بعد بھی تیار نہ کیا جاسکا۔ ذرا سوچ کر بتائیے ایسا کیوں ہوا۔ جن والنس مل کر بھی قرآن جیسا کوئی کلام کیوں نہ بنا سکے اس کا جواب لازماً آپ ہی دیں گے کہ ان کے ذہن و ذکا اور ان کی فہم و عقل میں وہ ہمدگیری اور لامحدودیت نہیں ہے جو ایسے اعجازی کلام کے لیے درکار ہے۔ بس آپ کے اسی جواب میں ہماری مراد بھی مضمحل ہے اسی تنگی فہم، محدودیت ذہن اور اسی قلت علم کی بنا پر جن والنس اس قابل بھی نہیں ہیں کہ وہ قرآن جیسے وسیع و عمیق معجزانہ کلام کے تمام مشمولات کو بلا کسی ایسی رہنمائی کے جو صاحب کلام ہی کی جانب سے ہوا نہ خود سمجھ سکیں۔ صاحب کلام کی طرف سے یہ رہنمائی بنوت کی صورت میں مہیا کی گئی قرآن کے الفاظ میں سمونے ہوئے لاتعداد معارف اور قرآنی کلمات میں چھپے ہوئے بے شمار علوم کا ادراک بنوت و رسالت کی رہنمائی کے بغیر ممکن نہیں تھا اس لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن نازل کرنے کے ساتھ ساتھ ایک نبی بھی بھیجا جو وحی الہی ہی کی روشنی میں قرآنی علوم و معارف اللہ کے بندوں کو سمجھا سکے۔

اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی غور کرنے کے قابل ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ کی ذات لامحدود ہے اسی طرح اس کی صفات بھی لامحدود ہیں اور انہی لامحدود صفات میں سے اللہ تعالیٰ کی ایک صفت صفت کلام بھی ہے اس صفت کا بھی دوسری صفات الہیہ کی طرح لامحدود ہونا لازمی ہے دوسری طرف انسان اپنے ظاہر و باطن، جسم و روح، قلب و دماغ، فکر و فہم اور عقل و فراست غرض ہر لحاظ سے محدود اور متناہی ہے بھلا اس کے لیے کیسے ممکن ہے کہ وہ اپنی اس محدودیت کے ساتھ ایک لامحدود و لاتناہی ذات سے صادر ہونے والے ایسے کلام کو جو لامحدود و المعارف ہے محض اپنے طویل و بصر سمجھ سکے اس کے لیے تو کسی ایسی ہی ہستی کی ضرورت ہے جو ایک لحاظ سے اللہ تعالیٰ کی لامحدود ذات سے قریب تر ہو اور ایک لحاظ سے بندوں میں شامل رہے۔ اسی ہستی کو ہم نبی کہہ کر پکارتے ہیں اسی ہستی نے لامحدود ذات حق کو پہچان کر اس کے کلام کے

علوم و معارف پر اطلاع پائی اور پھر اسی کی زیر نگرانی عامہ خلافت کو وہ علوم و معارف سمجھائے اور سکھائے بنی کا واسطہ درمیان میں نہ ہو تو ایک عام آدمی کے بس کی یہ بات ہی نہیں کہ وہ قرآنی علوم پر اطلاع پاسکے۔

قرآن ہمارے پاس ایسے علوم لے کر آیا ہے جو نسل انسانی کو آخری معراج تک پہنچانے کے ضامن ہیں ہماری سیاست، معیشت، معاشرت، اخلاق، دین، مذہب، غرض ہماری زندگی کا ہر گوشہ قرآن کی روشنی کا محتاج ہے ایسی صورت میں ذرا سوچئے تو سہی اگر قرآن کو عام انسانی فہم پر پھونک دیا جاتا تو کیا ہوتا ہر شخص اپنی اقتدار طمع اپنے علم، اپنے نظریات اور اپنے حالات کے مطابق قرآن کی شرح بیان کرتا اور ہر کوئی یہ اصرار کرتا کہ قرآن کی جو مرادات میں نے متعین کی ہیں وہی درست ہیں انہی کو مانو اور انہی پر عمل کرو۔ ہر شخص کا یہ دعویٰ ظاہر ہے بلا دلیل ہوتا اور ہمارے پاس کوئی معیار نہ ہوتا جس پر پرکھ کر ہم کہہ سکتے کہ فلاں نے قرآن کی صحیح مراد کو پایا اور فلاں اس کو بیا لیتے ہیں ناکام رہا۔ کتاب اللہ محض راستے زنی اور دماغی مشافی کا میدان بن کر رہ جاتی اور حقیقت کا سراغ لگانا ناممکن ہو جاتا۔ اللہ کا دین جیسا کہ کتاب اللہ کے نزول سے پہلے مجہول تھا نزول کے بعد اس سے زیادہ مجہول بن جاتا اور قرآن کے نزول کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ظاہر بات ہے جو کتاب خالصتاً عمل کرنے کے لیے نازل ہوئی ہو وہ اگر محض دماغی کدو کا دوش کا مشغلہ بن کر رہ جائے تو اس کے نازل کرنے کا جو اصل مقصد تھا وہ تو باقہ سے جاتا رہا ۛ

**بیان قرآن کی ذمہ داری اور رسول** | راستے زنی اور دماغی مشافی کا تختہ مستم بننے سے حفاظت ہی منظور تھی کہ کتاب اللہ

کے بیان کی ذمہ داری بطور خاص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد کی گئی۔ ارشاد ہوا

ہم نے آپ پر قرآن اتارا ہے تاکہ وہ (ہدایات) جو ان کے لیے اتری ہیں آپ لوگوں پر خوب واضح کر دیں۔

وَأَنزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ  
لِلنَّاسِ مَا نَزَّلَ إِلَيْهِمْ مِنَ الْغَمْلِ (۲۴)

اگر ہر انسان قرآن کے احکام کو حسب منشاء غذا و نڈی سمجھنے پر تیار رہتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بیان و تشریح کی خدمت سپرد کرنے کے کوئی سمعی نہیں رہتے۔ ”لِلنَّاسِ“ کا لفظ بتلا رہا ہے کہ قرآن کے بیان کو ہر شخص سمجھنے سے تاصر ہے۔ اس قصور کی وجہ سے ہی قرآنی احکام کی تشریح و توضیح کے لیے رسول بھیجا جاتا ہے اور اس کے ذمے یہ خدمت سپرد کی جاتی ہے کہ جو چیز لوگ خود نہیں سمجھ سکتے آپ ان کو سمجھا دیں۔

اب اگر احادیث کے اس ذخیرے کو آپ قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں جو قرآن کے بیان پر مشتمل ہے تو آپ کے اس انکار کی بنیاد وہی باتیں ہو سکتی ہیں۔ یا تو آپ کنا یہ چاہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے معاذ اللہ اس حکم کی خلافت و رزی کی کہ اللہ نے آپ کے ذمے قرآن کو بیان کر دینے کی جو ذمہ داری سونپی تھی اسے پورا نہ کیا یا پھر آپ کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کے بیان کی ذمہ داری پوری تو کی تھی مگر جو کچھ آپ نے بیان کیا تھا وہ محفوظ نہیں رہا۔ دونوں صورتوں میں ذرا سوچ لیجئے آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ پہلی صورت تو انتہائی خطرناک ہے اس کے کہنے سے پہلے اس کے مضمرات پر غور کر لیجئے جو شخص یہ کہنے کی جسارت کرتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے معاذ اللہ اپنی ذمہ داری پوری نہیں کی اسے اپنے ایمان کی فکر کرنی چاہیے۔ دوسری صورت بھی کچھ کم خطرناک مضمرات کی حامل نہیں ہے۔ دوسری صورت کا ماننا والا گویا مان رہا ہے کہ قرآن بحیثیت معنی و بیان محفوظ نہیں رہا اس کا صاف مطلب یہ نکلے گا کہ اللہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے قرآنی احکام کی وضاحت تو کرادی مگر اس کی حفاظت نہ کی اور اس طرح معاذ اللہ خود اپنے وعدے کے خلاف کیا کہ ایک طرف ”وَإِنَّا لَنَحْصِي الْقُتُون“ کا اعلان بھی کیا جاتا رہا اور دوسری طرف اسے ان لوگوں کے ہاتھ میں دے دیا گیا جو اس کی حفاظت نہ کر سکے۔ (حفاظت کے موضوع پر تفصیلی گفتگو ہم زیر نظر تحریر کے پہلے حصے میں کر چکے ہیں قارئین دوبارہ نظر ڈالیں) بہر حال یہ دونوں صورتیں حدیث کے انکار کی نہیں قرآن اور رسالت کے انکار کی صورتیں بنتی ہیں۔

اس سے پہلے بھی ہم کہیں کہہ چکے ہیں کہ بیان قرآن کی ذمہ داری کا قرآن نے

جا، بجا مقاصد بخت میں سے ایک مقصد کے طور پر ذکر کیا ہے۔ اب جو شخص بیان قرآن پر مشتمل احادیث کو نہیں مانتا وہ دراصل مقاصد بخت میں سے ایک مقصد کو تسلیم کرنے سے انکار کرتا ہے۔ سورۃ بقرہ، سورۃ آل عمران اور سورۃ جمعہ کی ان متعدد آیات کا انکاری ہے جن میں قرآن کے بیان کو تعلیم کتاب کے الفاظ سے تعبیر کرتے ہوئے بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بخت کا ایک مقصد بتلایا گیا ہے۔

حیرت ہوتی ہے اپنی غفل کے بل پر قرآن نہی کا دعویٰ کرنے والوں کو اتنی ہی بات بھی سمجھ کیوں نہیں آتی بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کو درمیان سے علیحدہ کر دیا جائے تو قرآن کی صحیح مرادات تک پہنچنا ناممکن ہو جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہم پر بڑا ہی احسان فرمایا کہ اپنے کلام کی مرادات کی تلاش ہمارے ذمے نہیں ڈالی بلکہ ہم میں اپنا ایک رسول بھیج دیا جس نے اس کلام کو پہلے خود صاحب کلام سے پڑھا، اس کے مولیٰ و

۱۔ سورۃ بقرہ کی آیت ہے کَمَا اَرْسَلْنَا نَبِيًّا سِوَاكَ مِنْكُم بِتِلْكَ الْآيَاتِ تَاوِيذًا وَيُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ (جس طرح ہم نے تمہارے اندر خود تمہیں میں سے ایک رسول بھیجا جو تم کو ہماری آیات سناتا ہے اور تمہارا تزکیہ کرتا ہے اور تم کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے) اور سورۃ آل عمران کی آیت ہے لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُولًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ (اللہ نے مومنین پر احسان فرمایا کہ ان کے اندر خود انہی میں سے ایک رسول مبعوث کیا جو انہیں اس کی آیات پڑھ کر سناتا ہے اور ان کا تزکیہ کرتا ہے اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے) اسی طرح سورۃ جمعہ کی آیت ہے هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِيْ الْاَوَّلِيْنَ سِوَاكَ مِنْهُمْ نَبِيًّا يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ (وہی ہے جس نے ان میں سے پہلے انہی میں سے ایک رسول مبعوث کیا جو ان کو اس کی آیات سناتا ہے ان کا تزکیہ کرتا ہے اور کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔ ۲)

مطالب کو خود صاحب کلام سے سمجھا اور پھر خود صاحب کلام ہی کی ہدایت خاص اور حفاظت خاص کے سایے میں اپنے امتیوں کو پڑھایا سمجھایا اس کی اصل مرادات کو متعین کیا اور اس کے احکام پر عمل کر کے دکھلایا۔ اگر اللہ تعالیٰ اس طرح ہماری تعلیم و ہدایت کا سامان نہ کرتا تو ہم یقیناً تاقیامت قرآن کی صحیح مراد حاصل نہ کر پاتے۔

اب بات صاف ہو گئی جب قرآن کی صحیح مرادات متعین کرنے کی ہم میں اہلیت ہی نہیں اور قرآن کو سمجھنا موقوف ہے بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سمجھانے پر تو حدیث کی ضرورت سے ہم بے نیاز نہ کیے ہو سکتے ہیں۔ حدیث کی یہ دوسری قسم جس کی حجیت و عدم حجیت اس وقت زیر بحث ہے ان کی حیثیت قرآن کے بیان ہی کی تو ہے قرآن اگر حجیت ہے تو اس کا بیان حجیت کیوں نہیں۔ جس کتاب کے متن کو ماخذین ہونے کی حیثیت حاصل ہے اس کتاب کی شرح کو ہم کس دلیل کے تحت ماخذین ماننے سے انکار کر سکتے ہیں اور شرح بھی وہ شرح کہ اس کے علاوہ کوئی دوسری شرح ممکن ہی نہیں اس لیے کہ وہ شرح بھی اسی کی طرف سے ہے جس کی طرف سے متن ہے۔ جو ماقن ہے وہی خارج بھی ہے۔ کسی کلام کی جو شرح خود صاحب کلام متعین کر دے وہی درست اور اصل شرح ہے اس کے علاوہ کسی کو یہ حق حاصل نہیں کہ صاحب کلام کے اصل مقصود سے ہٹ کر اپنی طرف سے اس کلام کی شرح کرتا پھر اگر کرے گا تو کسی صاحب عقل کے نزدیک وہ شرح صاحب کلام کی شرح کے مقابلے میں کبھی قابل قبول نہ ہوگی۔

**بیان قرآن بھی منزل من اللہ ہے** | ادنیٰ بات کسی ثبوت کی محتاج نہیں کہ بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کی جو مرادات

متعین فرمائیں وہ اپنی طرف سے نہیں فرمائیں بلکہ جس طرح قرآن منزل من اللہ تھا اسی طرح اس کی مرادات کا تعین بھی منزل من اللہ تھا۔ چنانچہ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم آیات قرآنی کو سامنے رکھ کر غور فرماتے ہوں کہ اس آیت کا ایک مطلب یہ ہو سکتا ہے اور ایک یہ ان میں سے نلاں مطلب چونکہ اس آیت کے الفاظ پر زیادہ چسپاں ہے اس لیے یہی مراد خداوندی ہو گا۔ جس طرح قرآن کے الفاظ آپ پر وحی کیے جاتے



تھے اسی طرح اس کے معانی اور اس کی شرح بھی آپ کے قلب مبارک پر وحی کی جاتی تھی جس طرح قرآن کے الفاظ منزل من اللہ تھے اسی طرح اس کے جملات کی تفصیل اس کے مبہمات کی توضیح اور اس کی مشکلات کی تیسیر بھی منزل من اللہ تھی۔ جس طرح اللہ تعالیٰ نے اپنا قانون اور اپنا کلام خود ہی انارنے کا ذمہ لیا کہ مخلوق اس قسم کا جامع اور اعلیٰ قانون بنانے پر قادر نہ تھی اسی طرح اس کے شرح و بیان کی ذمہ داری بھی اللہ تعالیٰ نے خود ہی لی کیونکہ مخلوق بلا بتائے اس قانون کی اصل مرادات کو اند خود پا لینے پر قادر نہ تھی۔ چنانچہ اس حقیقت کا قرآن کریم میں واضح طور سے اعلان فرمایا گیا۔ ارشاد ہوا :

إِن عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ ۚ فَإِذَا  
قُرْآنُهُ قَاتِلٌ تَرَانَهُ ۚ ثُمَّ إِنَّا  
عَلَيْنَا بَيَانَهُ -

(القصۃ ۱۷ : ۱۹)

اس قرآن کا (آپ کے سینے میں) جمع کر دینا اور  
آپ کی زبان سے اسے پڑھوانا ہمارے لئے  
ہے جب ہم اس قرآن کو پڑھیں تو آپ صرت  
سننے رہتے پھر ہمارے ہی ذمے اس قرآن کا بیان  
بھی ہے۔

ان آیات میں پہلے الفاظ قرآن کے بارے میں اطمینان دلایا گیا کہ ان کو بلا کم و کاست سینہ نبوت میں اتار دینا اور محفوظ کر دینا ہمارے ذمے ہے پھر الفاظ قرآنی کے معانی و بیان اور ان کی مرادات واضح کر دینے کے بارے میں تسلی دی کہ اس کا ذمہ بھی ہم نے ہی لیا ہوا ہے۔ ثُمَّ إِنَّا عَلَيْنَا بَيَانَهُ یعنی پھر اس قرآن کا بیان بھی ہمارے ہی ذمے ہے۔ اب بتلائیے بیان قرآن کے منزل من اللہ ہونے میں کیا شک رہ جاتا ہے۔ گویا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جس طرح الفاظ قرآنی کے صرف نقل کرنے والے ہیں اسی طرح معانی قرآنی کے بھی صرف ناقل ہی ہیں۔ نہ قرآن کے الفاظ آپ کے اپنے ہیں نہ ان الفاظ کے معانی آپ نے اپنی طرف سے متعین کر لیے۔ الفاظ کا نزول بھی اللہ تعالیٰ ہی کی جانب سے ہوا اور معانی و مطالب کی تعیین بھی اللہ تعالیٰ ہی نے فرمائی۔ جب یہ بات ہے تو پھر اس طرز عمل کا کیا جواز ہے کہ دو چیزیں جو منزل من اللہ ہیں ان میں سے ایک کو تو دین میں حجت تسلیم کیا جائے مگر دوسری کی حجت سے انکار کر دیا جائے۔ حجت

ماننا ہے تو دونوں کو ماننا پڑے گا ورنہ پھر دونوں کا انکار کیسے بغیر چارہ نہیں درمیان کا کوئی راستہ نہیں ہے۔

یہاں یہ کہنا کسی طرح درست نہیں کہ ثمران علیہ السلام میں بیان سے مراد الفاظ قرآنی کو سنا دینا ہے اس لیے کہ الفاظ کے سنا دینے کو بیان نہیں کہتے قرأت کہتے ہیں جس کی ذمہ داری ان علیہ السلام جمعہ و قرآن کہہ کر پہلے ہی علیحدہ بیان فرمادی گئی بیان تو کسی پوشیدہ بات کو کھول دینے یا کسی غیر معلوم بات کو علم میں لے آنے کا نام ہے۔ بیان کے لفظ کو اگر الفاظ سنا دینے کے معنی میں لیا جائے تو اس کا ذکر ہی بیکار ٹھہرتا ہے اس لیے کہ الفاظ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے علم میں پہلے سے موجود ہیں جیسا کہ سابقہ آیات میں بتلادیا گیا ہے اس کے بعد الفاظ کے معانی و مطالب ہی ہیں جو الفاظ سن لینے کے بعد بھی مخفی رہ سکتے ہیں۔ معلوم ہوا بیان کا لفظ معانی و مطالب ہی کے لیے لایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اس پر بھی تو غور کیجئے کہ یہ قرأت اور بیان کو علیحدہ علیحدہ بیان کرنا پھر دونوں کے لیے الگ الگ علیہ السلام لاکر اپنی ذمہ داری کا اعلان کرنا اور پھر دونوں کے درمیان فصل کے لیے ثمر کا لانا کلام کا یہ انداز اس امر کی کھلی دلیل ہے کہ الفاظ قرآن کی ذمہ داری اور بیان قرآن کی ذمہ داری دونوں جدا جدا حیثیت کی حامل ہیں ایک ذمہ داری کا دوسری سے کوئی تعلق نہیں اگر یہ بات نہ ہوتو ان دو آیتوں کے درمیان فصل بھی بلا ضرورت قرار پائے گا علیہ السلام کی تکرار بھی عبث ہوگی اور ثمر کا لانا بھی بے کار ٹھہرے گا اور یہ کلام الہی میں محال ہے اس لیے لازماً ماننا پڑے گا کہ قرآن کی قرأت اور قرآن کا بیان دونوں علیحدہ علیحدہ ہیں اور متذکرہ آیت کا ردی میں دونوں منزل من اللہ ہیں۔

**بیان قرآن کے نزول کی صورت** | اب رہا یہ سوال کہ قرآن کا بیان بھی اگر منزل من اللہ ہے تو اس کے نزول کی

صورت کیا تھی تو اس سلسلے میں اتنی بات تو واضح ہے کہ قرآن کے الفاظ اگر بذریعہ قرأت ہو چکے تھے تو قرآن کا بیان بذریعہ تحلیم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سینہ مبارک

بہر اتفاق کیا گیا تھا چنانچہ ارشادِ ربانی ہے :

وَعَلَّمَ مَالِكًا تَكُنَّ تَعْلَمُ (النساء ۱۱۳) | اور ہم نے تم کو وہ باتیں تعلیم کیں جو تم نہیں جانتے تھے۔

مگر اس تعلیم کے سینہ نبوی میں اتفاق کے جانے کی کیفیت کیا تھی اس سے ہمیں کوئی بحث نہیں اس لیے کہ وہ سینہ نبوی میں خواہ کسی طرح بھی اتفاق کی گئی ہو اس نے لازماً نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سینہ مبارک میں پہنچ کر بالآخر کسی ملفوظ ہی کی شکل اختیار کی ہوگی۔ تعلیم کی یہ آخری شکل ہی قرآن کا بیان ہے اور اسی کا نام حدیث نبوی ہے۔

غرض متذکرہ بالا دوسری قسم کی احادیث کو بھی جو قرآنی احکام کی وضاحت کرتی ہیں اور قرآن کا بیان ہونے کی حیثیت کی حامل ہیں دین میں حجت مانے بغیر چارہ نہیں۔ جو شخص قرآن کا ماخذ دین ہونا تسلیم کر چکا ہے اس کے لیے اس کے سوا کوئی راستہ نہیں کہ وہ قرآن کے بیان کو بھی ماخذ دین کی حیثیت سے تسلیم کرے۔ ایک کو مان کر دوسرے کے انکار کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہے۔

**مستقل تشریعی حیثیت کی حامل احادیث** | اب آئیے تیسری قسم کی ان احادیث کی طرف جو بظاہر ایسے احکام پر

دلالت کرتی نظر آتی ہیں جن سے قرآن خاموش ہے۔ ان کے بارے میں جیسا کہ اس سے پہلے بھی ہم وضاحت کر چکے ہیں پہلی بات تو یہی ہے کہ یہ احادیث صرف ظاہر نظر میں ہی قرآن سے باہر نظر آتی ہیں ورنہ محققین کے نزدیک کوئی ایک حدیث بھی ایسی نہیں جس کی اصل قرآن میں موجود نہ ہو کسی بھی صحیح حدیث سے کوئی ایسا حکم ثابت نہیں ہوتا جو کسی نہ کسی نص یا قاعدے کے تحت قرآن میں وارد نہ ہو۔ اس کے علاوہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر حکم خود قرآن ہی کی مدد سے قانونِ خداوندی کا ایک حصہ ہے۔ قرآن نے بڑی صراحت کے ساتھ اپنے ماننے والوں کو ایک مستقل ہدایت کے طور پر یہ حکم سنا دیا ہے کہ

وَمَا أَمَرَ الرَّسُولُ أَنْ يُتَّخَذَ مِنْكُمْ  
نَهْكَ عَنْهُ فَاَتْتَهُمْ (الحشر - ۷)

جو کچھ رسول تمہیں دے اسے لو اور جس سے  
منہ کر دے اس سے رک جاؤ۔

رسول کا حکم قرآن ہی کا حکم ہے | یعنی بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جو حکم بھی دیں وہ

قابل اطاعت ہے۔ گویا آپ انسانی زندگی کے جس مسئلے کے بارے میں جو حکم صادر فرمادیں گے وہ اس آیت کے تحت داخل ہو کر قرآن ہی کا حکم بن جائے گا اگرچہ اس کی اصل قرآن میں صراحتاً موجود نہ ہو۔ یہ آیت اگرچہ مال و فے کی تقسیم کے سلسلے میں نازل ہوئی ہے مگر چونکہ آیت کے الفاظ عام ہیں اس لیے مفسرین کا اس پر اتفاق ہے کہ یہ آیت صرف اموال کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ احکام بھی اس میں داخل ہیں اور آیت کا مفہوم یہ ہے کہ جو کوئی حکم یا مال یا اور کوئی چیز آپ کسی کو عطا فرمادیں وہ اس کے لیے لینا چاہیے اور اس کے مطابق عمل کے لیے تیار ہو جانا چاہیے اسی طرح جس کام اور جس چیز سے آپ کہہ دیں اس سے رک جانا چاہیے۔ یوں بھی آتی کے بالمقابل معنی کا لفظ لانا اس امر کی دلیل ہے کہ یہاں آتی دراصل امر کے معنی میں ہے جو معنی کا صحیح مقابل ہے صحابہ کرام نے اسی مفہوم کو اختیار کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر حکم کو اس آیت کی بنا پر قرآن ہی کا حکم قرار دیا ہے اس کی چند مثالیں ہم قرآن کی جامعیت کے عنوان کے تحت آئندہ صحابہ میں سے پیش کر چکے ہیں۔ امام شافعی کے بارے میں بھی منقول ہے کہ انہوں نے ایک مرتبہ لوگوں سے کہا کہ تمہارے ہر سوال کا جواب قرآن سے دے سکتا ہوں پوچھو جو کچھ پوچھنا ہے ایک شخص نے عرض کیا کہ ایک محرم نے زینورہ (تنتیا) مانگا تو اس کا کیا حکم ہے امام شافعی نے محولہ بالا آیت پڑھ کر حدیث سے اس کا حکم بیان فرمادیا۔

منکرین حدیث نے اس آیت کے شان نزول کو بنیاد بنا کر اپنی قرآن دانی کا ایک اور عجیب غریب ثبوت یہاں کیا ہے ان کا کہنا ہے کہ ”ما آتا کم۔۔۔ الخ“ کی آیت صرف

مال فئے کی تقسیم کے بارے میں ہے حدیث سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ نھی کے بالمقابل رات ہونے کی بنا پر آتی کو اَصْر کے معنی میں لینا ان کے نزدیک محض ایک غلط فہمی ہے۔ اپنے اس دعوے کو ثابت کرنے کی خاطر منکرین حدیث دلیل دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ آتی کا لفظ قرآن میں بہاں کہیں آیا ہے دینے ہی کے معنی میں آیا ہے اور حدیثیں اقوال ہیں اس لیے ان پر دینے کے لفظ کا اطلاق درست نہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو چیز دی ہے وہ قرآن ہے۔

منکرین حدیث کا یہ استدلال خود اپنے اندر ہی تضاد بیانی کا شکار ہے ایک طرف وہ اس آیت کو صرف مال فئے کی تقسیم کے ساتھ خاص کرتے ہیں اور دوسری طرف وہ کہتے ہیں کہ آتا کہہ سے قرآن کا دینا مراد ہے حدیثوں کا نہیں کیونکہ وہ اقوال ہیں۔ اگر اس آیت کا تعلق صرف مال کے دینے نہ دینے سے ہے تو پھر قرآن یا حدیث کے دینے نہ دینے کا کیا ذکر خود ہی ایک بات کہتے ہیں اور خود ہی اس کے خلاف دلیل قائم کرتے ہیں اس بواجبی کی آخر کیا توجیہ کی جائے۔ کیا یہ تصور کیا جائے کہ بے چارے بات کہہ کر بھول جاتے ہیں لیکن اس پر لوگوں کی زبان پر بے ساختہ آگیا کہ دروغ گو را حافظہ باشد تو پھر کیا جواب ہوگا اور اگر بھول جانے والی بات نہیں ہے تو پھر ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ جادو وہ جو سر چڑھ کر بولے۔ آپ نے اپنے قول پر خود ہی ہماری طرف سے دلیل قائم کر دی۔ اتنی بات تو آپ نے خود ہی تسلیم کر لی کہ آتا کہہ کا لفظ قرآن دینے کے معنی میں استعمال ہو سکتا ہے گویا اس پر تو آپ ہم سے متفق ہیں کہ یہ آیت مال فئے کی تقسیم کے ساتھ ہی خاص نہیں دیگر معنی کو بھی شامل ہے اب ذرا یہ بتلائیے کہ آتا کہہ کا لفظ اگر قرآن دینے کے معنی میں مستعمل ہو سکتا ہے تو حدیث دینے کے معنی میں کیوں نہیں ہو سکتا آپ کا کہنا یہ ہے کہ حدیثیں تو اقوال ہیں ان کو دیا نہیں جاتا بلکہ کہا جاتا ہے۔ تو کیوں صاحب کیا آپ کے نزدیک قرآن اقوال کا مجموعہ نہیں ہے اگر اقوال

کے اس مجموعے کو دیا جاسکتا ہے تو اقوال کے دوسرے مجموعے حدیث کو کیوں نہیں دیا جاسکتا کیا آپ نے قرآن کریم کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نہ ماننے میں بھی ایسی ہی ایک جلد بندھی بندھائی کتاب تصور کر لیا ہے جیسی ہمارے زمانے میں اب کتب خانوں میں دستیاب ہے یا پھر کہیں آپ یہ خیال تو جماتے نہیں بیٹھے کہ قرآن بھی تورات کی طرح ایک کتاب کی صورت میں نازل ہوا تھا اگر ایسا نہیں ہے بلکہ امر واقعہ یہ ہے کہ قرآن کی متفرق آیتیں متفرق اوقات میں نازل ہوتی تھیں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کے سامنے ان آیتوں کو پڑھ کر ہی سنا تے تھے اس کے باوجود آپ کی زبان مبارک سے نکلی ہوئی آیات قرآنی پراگر آتی کا لفظ بولا جاسکتا ہے تو اسی زبان مبارک سے نکلی ہوئی احادیث پر آتی کا لفظ کیوں نہیں بولا جاسکتا۔

اس کے علاوہ منکرین حدیث کا یہ کہنا بنیادی طعن پر ہی غلط ہے کہ اقوال کے لیے آتی کا لفظ نہیں بولا جاتا اس لیے کہ خود قرآن نے اقوال کے لیے آتی کا لفظ استعمال کیا ہے۔ سورہ ص میں ہے :

وَأَنذِرْنَاكَ الْحِكْمَةَ وَفَصَّلِ | اور ہم نے انہیں حکمت اور فیصلہ کرنے والی  
الْخِطَابَ۔ (ص: ۲۰۱) | بات عطا کی تھی۔

خطاب کے معنی بات، قول اور تقریر کے ہیں اس آیت اور اس سے ماقبل کی آیات میں اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد پر کیے گئے کچھ انعامات کا ذکر کیا ہے انہی میں سے ایک انعام یہ بھی تھا کہ آپ بڑے اور بچے درجے کے خطیب تھے ان کے زورِ بیان اور ان کی توتِ خطابت کے اظہار کے لیے فصل الخطاب کا لفظ استعمال کیا گیا یعنی ایسی تقریر جو نہایت واضح اور جامع ہو۔ تقریر ظاہر ہے اقوال کا مجموعہ ہوتا ہے اور اس کے لیے قرآن نے آتی کا لفظ استعمال کیا ہے :

مزید برآں آتی کا لفظ قرآن میں جا بجا ایسے معنی میں مستعمل ہوا ہے جو حدیث پر بھی پوری طرح صادق آتے ہیں۔ مثلاً متعدد جگہ آتی کا لفظ علم کے لیے استعمال ہوا ہے۔ سورہ مجادلہ میں ہے۔

وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعِلْمُهُمْ رَحَاتٍ | اور ان کے جنہیں علم دیا گیا ہے درجات  
(المجادلہ: ۱۱) | (بلند کرے گا)۔

اگر علم کے لیے آتی کا لفظ بولا جاسکتا ہے تو حدیث بھی ایک علم ہے۔ اسی طرح قرآن نے ایک جگہ حکمت کے لیے بھی یہ لفظ استعمال کیا ہے اور حدیث کے حکمت ہونے میں تو کوئی شبہ ہی نہیں اس لیے کہ خود قرآن نے حدیث کو حکمت سے تعبیر کیا ہے اپنے مقام پر اس کی تفصیل آ رہی ہے۔ غرض قرآن میں حکمت کے لیے آتی کا لفظ استعمال کرتے ہوئے ارشاد ہوا :

وَلَقَدْ آتَيْنَا لُقْمَانَ الْحِكْمَةَ (لقمان-۱۲) | اور ہم نے لقمان کو حکمت عطا کی۔  
اسی طرح قرآن نے عقل و فہم کے لیے بھی آتی کا لفظ استعمال کیا چنانچہ سورہ مریم میں ہے۔  
وَأَتَيْنَاهُ الْحِكْمَ صَبِيًّا | اور ہم نے اس کو بچپن ہی میں عقل و فہم  
(مریم ۱۲) | دے دی تھی۔

بہر حال اگر علم کے لیے حکمت کے لیے اور عقل و فہم کے لیے آتی کا لفظ بولا جاسکتا ہے تو حدیث پر بھی بولا جاسکتا ہے جو یقیناً علم بھی ہے حکمت بھی ہے اور عقل و فہم کا سرچشمہ بھی ہے۔ مختصر یہ کہ ما آتاکم الرسول فخذوه وما نهيكم عنه فانتهوا کے الفاظ عام ہیں اور اس لیے آیت کا مفہوم یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو حکم اور جو چیز بھی تمہیں دیں اسے لے لو اور جس سے روک دیں اس سے روک جاؤ۔ بنا بریں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر حکم قابل اطاعت ہے آپ انسانی زندگی کے جس مسئلے کے بارے میں جو حکم صادر فرمادیں گے وہ اس آیت کے تحت داخل ہو کر قرآن ہی کا حکم بن جائے گا اور اس طرح وہ احادیث جو لفظ ہر ایسا حکام پر دلالت کرتی ہیں جن سے قرآن خاموش ہے اس آیت کی رو سے قرآن ہی کے احکام میں سے ایک حکم کی منظر و ثبت بن جائیں گی :

اطاعت رسول کے وجوب کی مستقل حیثیت | علاوہ ازیں قرآن کریم کی متعدد آیات میں رسول کی اطاعت کو

مستقل حیثیت سے واجب قرار دیا گیا ہے۔ قرآن کریم میں تقریباً بیس جگہ اطاعت رسول کا

حکم ہے اور اکثر آیات ہیں اللہ کی اطاعت اور رسول کی اطاعت دونوں کا ذکر ایک ساتھ مگر اس طرح علیحدہ علیحدہ کر کے بیان کیا ہے کہ دونوں اطاعتوں کی علیحدہ اندہ مستقل حیثیت پوری طرح واضح ہو جاتی ہے۔ مثلاً سورہ نساء کی مشہور آیت ہے :

<p>يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اطِيعُوا اللَّهَ وَاطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولَى الْأَمْرِ مِنْكُمْ فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ (النساء: ۵۹)</p>	<p>اے لوگو جو ایمان لائے ہو اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور ان لوگوں کی جو تم میں سے اولو الامر ہوں پھر اگر تمہارے درمیان کسی بات میں نزاع ہو جائے تو اس کو پھر رسول اللہ کی طرف اور رسول کی طرف اگر تم اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہو</p>
--	---

اس آیت میں اطیعوا اللہ سے مراد قرآن ہے اور اطیعوا الرسول احادیث نبوی کا واجب اطاعت ہونا ثابت کر رہا ہے اس آیت میں غور کرنے کی بات ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کا حکم دیتے ہوئے امر کا سینہ اطیعوا بلند بار دہرایا گیا ہے جس صاف مطلب یہ ہے کہ قرآن کی نظر علی ہول کی اطاعت اللہ کی اطاعت کی طرح ایک مستقل حیثیت رکھتی ہے۔ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت اپنی جگہ کوئی امتیازی تغفل حیثیت نہ رکھتی ہوتی تو اطیعوا کے لفظ کو دربارہ لانے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی بلکہ جس طرح اولو الامر کی اطاعت کو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کے ماتحت درج کیا گیا ہے اسی طرح رسول کی اطاعت کے لیے بھی جدا گانہ امر فرمانے کے بجائے اللہ کی اطاعت کے تحت درج کیا جاتا اور کہا جاتا اطیعوا اللہ والرسول واولی الامر منکم مگر ایسا نہیں کیا گیا بلکہ وہ دو اطاعتیں جو مستقل حیثیت رکھتی ہیں ان کو علیحدہ علیحدہ مستقل حیثیت سے بیان کیا گیا اور تقریری اطاعت جس کی حیثیت غیر مستقل تھی اس کو پہلی دو اطاعتوں کے تابع بنا کر بیان کیا گیا۔

**مرجع نزاع** | اطاعت رسول کی مستقل حیثیت اور زیادہ واضح کرنے کے لیے اسی آیت میں یہ بھی بتلایا گیا کہ اگر کسی معاملے میں کوئی نزاع برپا ہو جائے تو

فیسلے کے لیے آخری سند حضرت اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں  
فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ (پھر اگر تمہارے درمیان کسی بات میں نزاع ہو



جائے تو اس کو اللہ کی طرف اور رسول کی طرف پھیر دو) ظاہر ہے اگر اطاعت رسول کی مستقل حیثیت نہ ہوتی تو نزاعات میں فیصلے کے لیے مرجع صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہوتی اور صرف فِرْدَوْسِ اِلٰہی اللہ کا جاتا۔ یہ رسول کا صراحت کے ساتھ علیحدہ ذکر کرنا صاف بتلا رہا ہے کہ مرجع نزاع ہونے کے لحاظ سے رسول کی ذات بھی مستقل حیثیت کی حامل ہے یعنی نزاعات کے موقع پر رسول کا فیصلہ بھی حکم آخر ہو گا رسول سے نزاع نہیں ہو سکتی۔ ہمیں سے یہ بات بھی معلوم ہو گئی کہ اولوالامر کی ذات مورد نزاع بن سکتی ہے کیونکہ ہرج نزاع بتلاتے وقت اس کے ذکر کو حذف کر دیا گیا ہے اور تاریخ بھی اس پر تباہ ہے کہ خلفاء اولیائے کرام کو اپنی اطاعت کے لیے قرآن و حدیث پیش کرنا پڑی ہیں بلکہ بعض مواقع پر انہیں اپنے قول سے رجوع بھی کرنا پڑا ہے اس کے مقابلے میں تاریخ میں ایسی مثال ایک بھی نہیں ملتی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے بعد صحابہ نے کبھی آپ سے اس پر دلیل پیش کرتے کا مطالبہ کیا ہو۔

معلوم ہوا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث واجب الاطاعت ہے خواہ اس کی اصل قرآن میں نہیں معلوم ہو سکے یا نہ ہو سکے اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ بعض احادیث کی اصل قرآن میں موجود نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کے لیے اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس کا مکلف ہی نہیں بنایا کہ اس کی اصل کتاب اللہ میں تلاش کی جائے۔ ہم سے تو مطالبہ یہ ہے کہ ہم اللہ کے رسول کی اطاعت اللہ ہی کا ایک حکم سمجھ کر کریں۔

اس سلسلے میں یہ بات البتہ خوب اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے **اطاعتیں دو مگر مطاع ایک** کہ اللہ اور اس کے رسول کی علیحدہ علیحدہ دو اطاعتیں

واجب ہونے کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ مطاع بھی دو بن گئے مطاع دراصل دونوں جگہ خدا ہی کی ذات رہتی ہے قرآن نے اس حقیقت کو بڑے واضح الفاظ میں جتلا یا ہے اور تبادر ربانی ہے :

جو رسول کی اطاعت کرے اسی نے اللہ کی اطاعت کی۔

مَنْ يَطِيعِ الرَّسُولَ فَقَدْ اطاع الله۔ (النساء : ۸۰)۔

یعنی رسول کی اطاعت کی صورت میں بھی اطاعت دراصل خدا ہی کی ہوگی اطاعت کے تعدد سے مطاع میں تعدد نہ سمجھنا چاہیے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ رسول کا کوئی بھی حکم جس کی اطاعت کی جائے ہی ہے اس لحاظ سے اگرچہ ایک مستقل حیثیت کا حامل ہے کہ قرآن میں اس تفصیل کے ساتھ مذکور نہیں جس تفصیل کا احاطہ بیان رسول نے کیا ہے تاہم اس اعتبار سے کہ یہ تمام تفصیل بعینہ قرآن ہی کی کسی اصل کی فرشا ہے اس کی حیثیت مستقل ہونے کے بجائے قرآن ہی کے تابع ہو جاتی ہے۔ پہلی حیثیت کے لحاظ سے مطاع بظاہر رسول کی ذات نظر آتی ہے مگر فی الحقیقت دوسری حیثیت کے اعتبار سے مطاع خدا ہی کی ذات رہتی ہے۔ پس احادیث رسول پر عمل کرنے والا لحاظ بیان و تفصیل تو رسول کا مطیع کہلاتا ہے لیکن بلحاظ اصل و مراد خدا ہی کا مطیع ہوتا ہے گویا احادیث پر عمل کرنے والا دراصل قرآن ہی پر عمل کرنے والا رہتا ہے فرق ہے تو صرف اتنا کہ قرآن پر عمل کرنے والا اللہ تعالیٰ کے الفاظ پر عمل کرتا ہے اور حدیث پر عمل کرنے والا اللہ تعالیٰ کی مراد پر عمل کرتا ہے اس بنا پر اطاعتیں اگرچہ دو نظر آتی ہیں مگر مطاع دراصل ایک ہی رہتا ہے۔

منکرین حدیث کو دراصل سب سے بڑا مخالطہ ہی لگا ہے کہ وہ دواطاعتوں کی وجہ سے یہ سمجھ بیٹھے کہ مطاع بھی دو بن گئے۔ رسول کی اطاعت میں یہ سمجھنا کہ مطاع اللہ تعالیٰ کی ذات نہیں ہوتی بڑی غلط فہمی ہے نیز قرآن سے نادافقی کی دلیل ہے۔ اسی غلط فہمی اور نادافقی کی بنا پر منکرین حدیث کو ہر اس آیت میں کھینچا تانی کرنا پڑی جس میں رسول کی اطاعت کو اللہ کی اطاعت کے ساتھ مستقل حیثیت سے بیان کیا گیا تھا۔

**رسول کے لفظ سے قرآن مراد لینا** | مثلاً محولہ بالا آیت ہی کے بارے میں کہا گیا کہ رسول سے مراد آیات الہیہ یعنی خود قرآن ہے

پیغمبر مراد نہیں ہے مگر یہ کہنا ظاہر ہے بالکل ہی بلا دلیل تھا۔ قرآن میں کہیں بھی رسول کا لفظ کتاب آیات الہیہ کے لئے نہیں آیا جہاں کہیں بھی آیا ہے پیغمبر کے لئے آیا ہے یا پھر فرشتے کے لئے آیا ہے۔ بلکہ ایسی آیات بھی متعدد موجود ہیں جن میں ایک ساتھ رسول کا بھی ذکر ہے اور آیات کا بھی ذکر ہے جس کا مطلب ہے کہ یہ دو جدا جدا چیزیں ہیں وہ تمام آیات

جن میں تلاوت قرآن کو رسول کا منصب بتلایا گیا ہے اسکی تفسیر میں پیش کی جاسکتی ہیں: اسکے علاوہ ذیل کی آیت تو اس باب میں اتنی صریح ہے کہ کسی شک و شبہ کی کوئی گنجائش ہی نہیں رہتی۔ ارشادِ ربانی ہے:

وَإِذْ أُنزِلَ إِلَيْنَا الْقُرْآنُ لَمَكُنَّا بِهٖ تُبٰرٰكًا ۚ  
اللّٰهُ وَآلِیْہٖ الرَّسُوْلُ رَاٰیْنَا الْمُنٰفِقِیْنَ  
یَسْتُوْدُوْنَ عَنٰکَ صُدُوْدًا (النساء: ۶۱)

اور جب انکو دکھایا جاتا ہے کہ آؤ اللہ کی نازل کردہ کتاب کی طرف اور رسول کی طرف تو تم منافقوں کو دیکھتے ہو کہ وہ تم سے کٹی کڑتے ہیں۔

اس آیت میں ما انزل اللہ سے مراد قرآن ہے اس کا ذکر کرنے کے بعد رسول کا ذکر مستقل حیثیت سے کیا گیا ہے اور صاف بتلادیا گیا ہے کہ دین میں اصل مرجع دو ہیں۔ ایک قرآن اور دوسرا رسول۔ دونوں مستقل حیثیت سے واجب الطاعت ہیں ان دونوں سے منہ موڑنا منافق کا کام ہے نہ کہ مؤمن کا۔ گویا رسول کو مستقل حیثیت سے دین کا مرجع ماننا ملحدانہ ایمان ہے۔ اس آیت میں کسی طرح بھی رسول کو قرآن کے معنی میں نہیں لیا جاسکتا۔ کیا منکرینِ حدیث یہاں بھی رسول کو قرآن کے معنی میں لیکر یہ ثابت کرنے کی کوشش کریں گے کہ قرآن میں بلا ضرورت تکرارِ غلطی سے کام لیا گیا ہے۔ بھلا کوئی پوچھے رسول سے مراد اگر قرآن ہے تو پھر اس آیت کے آپ کیا معنی بیان کریں گے لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ سُرْسُوْلُهٗ الْکَرِیْمُ بِالْحَقِّ (اللہ نے اپنے رسول کا خواب سچا کر دکھایا۔ ۱۷) کیا آپ یہ کہیں گے کہ اللہ نے اپنی کتاب کا خواب سچا کر دکھایا۔ خواب انسان دیکھا کرتا ہے کتاب نہیں دیکھا کرتی۔ اسی طرح قرآن کتاب ہے یَا اَیُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَا اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَبِّکَ (اے رسول پونچھا دے جو تجھ پر نازل کیا گیا ہے۔ المائدہ - ۶۷) رسول کا مطلب اگر کتاب ہے تو ذرا سوچئے کتاب پر بھی کچھ نازل کیا جاتا ہے؟

اطاعت کو موافقت کے معنی میں لینا | جب کسی طرح بات بنتی نظر نہ آئی تو کہا گیا کہ اطیعوا الرسول میں دراصل اطاعت سے مراد

موافقت ہے مطلب یہ ہے کہ اللہ کی اطاعت کرنے میں رسول کی موافقت اختیار کرو۔ یہ بات پہلے سے بھی زیادہ عجیب تھی اطاعت کے معنی اگر موافقت کے ہیں تو آیت میں دونوں جگہ ایک ہی معنی لینے چاہئیں اطیعوا اللہ کا بھی پھر یہی ترجمہ کرنا چاہیئے کہ اللہ کی موافقت اختیار کرو ایک ہی آیت میں ایک ہی لفظ کے دو معنی بیک وقت کیسے قبول کیے جاسکتے ہیں۔

اطاعت رسول کو اطاعت الہیہ کی تفسیر قرار دینا | جب یہ بات بھی نہ چلی تو کہنے لگے کہ اطیعوا اللہ کی تفسیر اطیعوا الرسول سے کی جا رہی ہے یعنی اللہ کی اطاعت کا حکم دیکر اسکی تشریح کی جا رہی ہے سمجھایا جا رہا ہے کہ اللہ کی اطاعت کا مطلب کیا ہے لیکن ہوا یہ تو جینہ بھی کسی طرح ذہن کو اپیل نہ کر سکی ظاہر بات ہے کہ واؤ تفسیر یا دوہم مصداق غفلوں یا غفروں کے درمیان آنا

ہے اور یہاں ایسا نہیں ہے اللہ اور رسول کو کسی طرح بھی باہم مراد و ثابت نہیں کیا جاسکتا اور پھر تفسیر کی ضرورت تو وہاں ہوتی ہے جہاں کوئی بات مبہم ہو جو بات پہلے ہی سے واضح ہو اس کی تفسیر کی حاجت نہیں ہوا کرتی اُطیعوا اللہ (اللہ کی اطاعت کرو) میں کونسا ابہام ہے جاہل سے جاہل آدمی کو بھی اس کے سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہو سکتی پھر آخر اس تفسیر کی ضرورت ہی کیا پیش آئی۔ اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی بڑی عجیب ہے کہ جو لفظ پہلے سے واضح ہے اس کی تفسیر ایک ایسے لفظ سے کی جا رہی ہے جو اس کے مقابلے میں مبہم ہے طریقہ تو یہ ہے کہ مبہم کی تفسیر واضح سے کی جاتی ہے مگر یہاں معاملہ الٹ ہے اللہ بالکل واضح ہے ہر کوئی جانتا ہے کہ یہ خدا کا نام ہے اس کے دو ستر کوئی معنی ہی نہیں اللہ کے معنی میں کسی قسم کے بھی ابہام کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اب کیسے یہ بات قبول کر لیا جائے کہ اس واضح کی تفسیر ایک ایسے لفظ سے کی جا رہی ہے جو مقابلہ میں مبہم ہے رسول کے کئی معنی ہیں مختلف معانی کی محتملات نے اسے اللہ کے لفظ کے مقابلے میں مبہم بنا دیا ہے۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی سوچنے کی ہے کہ تھوڑی دیر کے لیے اللہ کے لفظ کو مبہم مان بھی لیا جاسکتا ہے اور اس لیے اس کی تفسیر کی ضرورت کو تسلیم بھی کر لیا جائے تب بھی ایک دو جگہ اس مبہم کی تفسیر کر دینا کافی تھا قرآن میں بیسیوں جگہ اُطیعوا اللہ کو اُطیعوا الرسول کے ساتھ ملا کر اسی طرح بیان کیا گیا ہے آخر ہر جگہ بالالتزام اس تفسیر کی کیا ضرورت تھی معمولی سے معمولی مصنف بھی اس قسم کا تکرار اپنی تصنیف میں روا نہیں رکھتا۔

آپ نے دیکھا اپنی بات کی پیچ نبھانے کے لیے منکرین  
 حدیث کو آیات قرآنی میں کیسی کیسی دور از کار تاویلات  
 کا سہارا لیتا پڑا۔ اسی پر بس نہیں جب مذکورہ بالا مفتوحہ غیز  
 توجیہات میں سے کوئی توجیہ بھی عقل کے معیار پر پوری اترتی نظر نہ آئی تو منکرین حدیث نے  
 ایک اور رخ پلٹا۔ اگرچہ دیانت کا تقاضا تو یہ تھا کہ اپنی غلطی کا احساس ہوتے ہی اس کا  
 اعتراف کر لیتے اور اپنے غلط خیال سے رجوع کر لیتے مگر انہوں نے دوسرا راستہ اختیار  
 کیا اور کمنا شروع کر دیا کہ اطاعت رسول کا حکم صرف آپ کی حیات تک تھا اس لیے کہ

اطاعت رسول کے لیے  
 حیات نبوی کی شرط

اطاعت کا لفظ صرف نندوں کے لیے مستعمل ہوتا ہے گزیرے انسانوں کی اطاعت نہیں کی جایا کرتی پیروی کی جایا کرتی ہے منکرینِ حدیث کے نزدیک اطاعت انسانوں کی ہوا کرتی ہے اقوال کا نہیں اقوال کے لیے اطاعت کا نہیں پیرامی کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔

**اقوال کی اطاعت** کرنے کو تو منکرینِ حدیث نے یہ اعتراض کر دیا مگر یہ تک نہ سوچا کہ قرآن بھی تو اقوالِ الہی کا مجموعہ ہے تو پھر اس

کے لیے بھی اطاعت کا لفظ استعمال نہیں کیا جانا چاہیے تھا۔ اللہ تعالیٰ کی اطاعت بھی تو ہم براہِ راست نہیں کر سکتے وہاں بھی تو اطاعت کے معنی یہی ہیں کہ اللہ کے کلام کی اطاعت کی جائے۔ اگر اللہ کے کلام کے لیے اطاعت کا استعمال درست ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام کے لیے اطاعت کا استعمال کیوں درست نہیں۔ اس کے ساتھ ہی اس پر بھی غور کیجئے کہ اسی زیر بحث آیت میں نذاعات کے وقت

فیصلے کے لیے دو مرجع تیار کئے گئے یہاں ایک اللہ دوسرا رسول۔ پھر جب اللہ کی طرف رجوع کرنے سے مراد کتاب اللہ کی طرف رجوع کرنے کے سوا اور کچھ نہیں ہے تو رسول کی طرف رجوع کرنے کا مطلب بھی اس کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا کہ جب تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حیات میں اس وقت تک خود آپ کی ذات مبارک کی طرف رجوع کیا جائے اور جب آپ دنیا سے رحلت فرما جائیں اور براہِ راست آپ سے استفادہ کی صورت باقی نہ رہے تو آپ کے اقوال و افعال کی طرف رجوع کیا جائے بلکہ اگر منظر غائب دیکھا جائے تو آپ کی حیات میں بھی مرجعِ نزاع بڑی حد تک آپ کے اقوال و افعال ہی تھے اس لیے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے آخر زمانے میں اسلامی حکومت دس بارہ لاکھ مربع میل کے وسیع و عریض علاقے یعنی پورے جزیرہ عرب پر پھیلی ہوئی تھی۔

اتنے وسیع ملک میں پھیلے ہوئے مسلمانوں کے لیے ہر معاملے کا فیصلہ براہِ راست نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کرنا کسی طرح ممکن نہ تھا لامحالہ اس زمانے میں بھی معاملات کے فیصلے کرنے کے لیے قرآن کے بعد جس طرف رجوع کیا جاتا تھا وہ آپ کے اقوال و افعال ہی تھے۔ غرض یہ کہ کسی طرح درست نہیں کہ اقوالِ رسول براہِ اطاعت کا اطلاق نہیں کیا

جاسکتا اور اس لیے اطاعتِ رسول کا حکم صرف اس وقت تک تھا جب تک براہِ راست آپ کی اطاعت ممکن تھی یعنی جب تک آپ بقید حیات تھے۔ لغت عرب میں بھی اطاعت کے معنی میں اس قسم کی کوئی تحدید ثابت نہیں کہ یہ لفظ صرف زندہ انسانوں پر بولا جاتا ہو یا اقوال کے لیے اس کا استعمال درست نہ ہونے کی کوئی نظیر ملتی ہو۔ منکرینِ حدیث اس قسم کی کوئی نظیر قرآن سے یا مستند لغتِ عرب سے پیش نہیں کر سکتے جو ان کے دعوے کو ثابت کرنے والی ہو اس کے برعکس ہمارے پاس اس بات کے ثبوت ہیں کہ اطاعت کا استعمال صرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات تک ہی محدود نہ تھا خلیفہٗ اول حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی نظیر موجود ہے آپ نے مسند خلافت پر متمکن ہونے کے بعد جو سب سے پہلا خطبہ دیا اس میں اپنی اطاعت کی حدود واضح کرتے ہوئے فرمایا اَطِيعُوا نِي مَا اطَعْتُ اللَّهَ وَرَسُولَهُ (اس وقت تک میری اطاعت کرو جب تک میں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتا رہوں) دیکھ لیجئے یہاں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ جیسے اہل زبان نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رحمت فرما جانے کے بعد آپ کی پیروی کے لیے لفظ اطاعت استعمال کیا ہے۔ ہر مذہب کا بہترین زمانہ وہ ہوتا ہے جو صاحبِ مذہب سے قریب ہو اس زمانے کے لوگ صاحبِ مذہب کے مقصد کو جتنا زیادہ سمجھ سکتے ہیں زمانہ بعید کے لوگ اتنا نہیں سمجھ سکتے اور صاحبِ مذہب کی لالی ہوئی ہدایت کی تشریح جو اس کے اصحاب یا قریب زمانے کے لوگ کرتے ہیں وہی صحیح ہوتی ہے اس لیے قرآن و حدیث کا جو ترجمہ جو مطلب صحابہ کرام اور سلفِ صالحین بتا گئے ہیں درست صرف اسی کو تسلیم کیا جائے گا یہ کیسے مان لیا جائے کہ تیرہ چودہ سو برس تک اَطِيعُوا اللَّهَ وَاطِيعُوا الرَّسُولَ کا صحیح مطلب کوئی بھی نہ سمجھ سکا حتیٰ کہ وہ لوگ بھی جو قرآن کے مخاطبِ اول تھے۔

غرض اس امر میں کوئی شبہ نہیں کہ قرآن نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کو مستقل حیثیت سے واجب قرار دیا ہے۔ بتا بریں قرآن ہی کا ہم سے یہ مطالبہ ہے کہ ہم

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر قول اور ہر فعل کو ایک مستقل اور علیحدہ حیثیت سے واجب الطاعت تسلیم کریں۔ گویا قرآن پر اس وقت تک پورا غلبہ ممکن ہی نہیں جب تک ہم حدیث رسول کو بھی قانون خداوندی کا ایک حصہ نہ مان لیں۔

**اطاعت رسول کی مستقل حیثیت اور قرآن**

حدیث رسول کی مستقل حیثیت قرآن کی نظر میں کتنی اہم ہے اس کا اندازہ اس بات سے لگائیے کہ رسول پر اس کی اطاعت کے بغیر ایمان

وہا قرآن کے نزدیک ایمان ہی نہیں ہے۔ سورۃ نساء میں ارشاد ہے :

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ  
يُحْكَمُوا لَكَ وَبَيْنَا شَجَعِيذِهِمْ ثُمَّ  
لَا يَجِدُوا فِي الْفَيْهِمْ حَرَجًا مِّمَّا  
قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا السَّلَامَ۔  
(نساء : ۶۵)۔

پس (اے نبی) تیرے رب کی قسم وہ ہرگز مومن نہ ہوں گے جب تک کہ وہ اپنے جھگڑاؤں میں تجھے فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں اس کے بعد تیرے فیصلے سے اپنے دل میں کوئی شک بھی محسوس نہ کریں اور پوری طرح اس کے سامنے سر جھکا دیں۔

یعنی رسول پر ایمان لانے کے لیے صرف اتنا کافی نہیں ہے کہ زبان سے بس آمین کہہ لیا جائے بلکہ کوئی شخص اس وقت تک مومن ہی نہیں ہو سکتا جب تک وہ ہر معاملے میں رسول کو اپنا حاکم نہ بنا لے۔ یا بھی جو اختلاف بھی ہو اس میں اسی کا فیصلہ صرف آخر نہ جانے ہی نہیں بلکہ وہ فیصلہ اپنے مخالفت ہو تو بھی اپنے دل میں کوئی شک محسوس نہ کرے۔

رسول کا فیصلہ سننے کے بعد قرآن کسی کو یہ حق بھی نہیں دیتا کہ وہ اس فیصلے کے بارے میں کسی قسم کی پوچھ چرا کرے بلکہ ایمان لانے والوں سے اس کا مطالبہ یہ ہے کہ رسول کا فیصلہ سنتے ہی وہ کہہ دیں کہ بس ہم نے سنا اور مان لیا چنانچہ سورۃ نور میں ہے ۔

إِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِينَ إِذَا دُعُوا  
إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ  
أَنْ يَقُولُوا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا (النور : ۵۱)۔

مومنوں کا کام تو یہ ہے کہ جب وہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف بلائے جائیں تاکہ رسول ان کے درمیان فیصلہ کرے تو وہ کہیں کہ ہم نے سنا اور مان لیا۔

کریا مومن کا ایمان اس وقت تک کامل نہیں جب تک وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کے سامنے سمع و طاعت کا رویہ اختیار نہ کرے۔ قرآن کے نزدیک رسول تین بات کا فیصلہ کر دے تو اس کے بعد کسی کو اس معاملے میں خود کوئی فیصلہ کرنے کا اختیار باقی نہیں رہتا چنانچہ ارشاد ہے :

<p>جب خدا اور اس کا رسول کسی معاملے کا فیصلہ کر دیں تو کچھ مومن مرد یا عورت کو پھر اپنے معاملے میں کوئی اختیار باقی نہیں رہتا۔</p>	<p>مَا كَانَ لِلْمُؤْمِنِينَ وَلَا الْمُؤْمِنَاتِ إِذَا خِفِيَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَنْ يَكُونَ لَهُمُ الْخَبِيرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ.</p>
--	--

(۱۱ حزب: ۲۶۰)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سمع و طاعت اور خود پسردگی کا یہ رویہ صرف ایمان یا عبادات وغیرہ ہی کے ساتھ خاص نہیں بلکہ اس کے تحت معمولی معمولی اطاعتیں بھی درج ہیں چنانچہ سورہ نور کی یہ آیت ملاحظہ ہو :

<p>جو لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جلتے ہیں یہی لوگ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھتے ہیں۔</p>	<p>إِنَّ الَّذِينَ يَأْتُونَكَ لَا يَزِيدُكَ إِلَّا خَلْفًا أَوَّلَيْكَ الَّذِينَ يَوْمِنُونَ بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ.</p>
--	--

(اللہ: ۶۲)

معلوم ہوا استیذان جیسی معمولی اطاعت بھی اتنی اہم ہے کہ ایمان باللہ والی رسول کی حدود میں داخل ہے۔ غور کیجئے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے بغیر کچھ کرنا بھی درست نہیں تو آپ کے کسی شرعی حکم کی حدود سے باہر نکلنا کیسے درست ہوگا۔

بہ حال یہ مانے بغیر چارہ نہیں کہ اطاعت رسول کی مستقل حیثیت کو تسلیم کرنا دراصل قرآن ہی کے ایک حکم کو تسلیم کرنا ہے اس لیے جس حکم کے بارے میں ہمیں یہ ثابت ہو جائے کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا حکم ہے تو پھر ہمیں اس تلاش کی ضرورت نہیں کہ اس کی اصل تفسیر میں صراحتاً موجود ہے یا نہیں ہمارے لیے اسکی اطاعت فرضی مختصر یہ کہ تیسری قسم کی وہ احادیث بھی جو بلا ہر لیے احکام پر دلالت کرتی نظر آتی ہیں جن سے تفسیر خاموش ہے دین میں اسی طرح حجت ہیں جس طرح وہ احادیث جو قرآنی



احکام کی تائید یا قرآنی احکام کا بیان ہیں۔

رسول کا ہر عمل وحی الہی کی اتباع میں ہے

در اصل حدیث رسول کی تشریحی حیثیت کا تعین کرتے وقت اس حقیقت کو نہیں بھولنا چاہیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ ارشاد فرمایا اور جو کچھ کر کے دکھایا خواہ

اس کی حیثیت قرآن کی تائید کی ہو خواہ وہ قرآن کا بیان ہو اور خواہ اس کا تعلق ان مسائل و احکام سے ہو جن سے قرآن بظاہر خاموش ہے وہ سب کا سب وحی الہی کی اتباع میں ہے سورہ نجم میں ہے :

اور وہ اپنی خواہش سے باتیں نہیں بناتے  
وہ تو تمام تر وحی ہی ہے جو ان پر بھیجی جاتی ہے۔

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ ۖ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ (الحجم: ۲۰-۲۱)

وحی متلو وغیر متلو علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جو وحی نازل ہوتی تھی وہ دو قسم کی تھی ایک تو قرآن کریم کی آیات جن کے الفاظ اور معانی دونوں منزل میں اللہ تھے اس وحی کو علماء کی اصطلاح میں وحی متلو کے نام سے یاد کیا جاتا ہے یعنی وہ وحی جس کی تلاوت کی جاتی ہے دوسری قسم وحی کی وہ ہے جو قرآن کریم کا حصہ نہیں بنی لیکن اس کے ذریعے آپ کو بہت سے احکام عطا فرمائے گئے اس وحی کو وحی غیر متلو کہتے ہیں یعنی وہ وحی جس کی تلاوت نہیں کی جاتی۔ وحی کی اس قسم میں عموماً صرف مصلحتیں آپ پر نازل کیے گئے ان مضامین کی تعبیر کے لیے الفاظ کا انتخاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود فرمایا۔ یہ وحی غیر متلو صحیح احادیث کی شکل میں محفوظ ہے۔

قرآن کے علاوہ وحی کا نزول یہ بات کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن کے علاوہ بھی وحی نازل ہوتی تھی اس پر خود قرآن

گواہ ہے۔ سورہ نساء میں ہے :

وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَیْكَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ  
وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ (النساء: ۱۱۳)

اور اللہ نے تجھ پر نازل کی کتاب اور حکمت  
اور تجھے سکھایا وہ کچھ جو تو نہیں جانتا تھا۔

معلوم ہوا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر کتاب کے علاوہ ایک چیز حکمت بھی نازل کی گئی تھی اس سے انکار نہیں کہ قرآن بھی سراپا حکمت ہے لیکن وا عطف کے ساتھ کتاب کے بعد حکمت کا بطور خاص ذکر اس بات کا ثبوت ہے کہ یہاں قرآن کے علاوہ دوسری شے مراد ہے اب ظاہر ہے کہ قرآن کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے علاوہ اور کیا چیز ہے جسے حکمت قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ قرآن کے علاوہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ حکمت و دانائی بھی وحی کی گئی تھی جس کی روشنی میں آپ قرآن کریم کے لائے ہوئے لائحہ حیات کو عملی جامہ پہنانے کا کام انجام دیتے تھے۔ قرآن کریم کی دیگر متعدد آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ اس حکمت کی لوگوں کو تعلیم بھی دیتے تھے قرآن کریم نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائض نبوت گنواتے ہوئے جا بجا کہا ہے **وَلِيُعَلِّمُكُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ** (وہ لوگوں کو کتاب کی اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے) **وَلِيُعَلِّمُكُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ** (وہ تمہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے) کتاب کے بعد یہ حکمت کی تعلیم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ حسنہ کے سوا اور کیا ہے یہ حکمت دراصل وہ علم و دانش اور وہ بصیرت و فراست ہے جو قرآن کے ساتھ ساتھ آپ پر وحی کی گئی اور جس کے ذریعے آپ نے زندگی کی راہوں میں صحیح اور غلط کا فرق واضح فرمایا جس کی مدد سے زندگی کے مسائل حل کیے اور جس کی روشنی میں آپ نے اخلاق و روحانیت، تہذیب و تمدن، معیشت و معاشرت اور قانون و سیاست کی دنیا میں انقلاب عظیم برپا کر دیا۔

یہاں یہ کہنا کسی طرح بھی درست نہیں کہ حکمت کے لفظ سے بھی

**حکمت کا صحیح مفہوم** قرآن ہی مراد ہے اور الکتاب اور الحکمت کے درمیان جو واڑ

ہے وہ تفسیری ہے عطف کا نہیں۔ اس لیے کہ جو شخص عربی زبان کی معمولی سی شہرہ بدلتا بھی رکھتا ہے وہ بھی اتنی بات جانتا ہوگا کہ واؤ کو تفسیری صرف اسی صورت میں قرار دیا جاسکتا ہے جبکہ دو لفظ جن کے درمیان یہ حرف آیا ہو باہم مترادف المعنی ہوں یا قرینے سے یہ معلوم ہو رہا ہو کہ مشکلم انہیں مترادف قرار دینا چاہتا ہے لیکن جہاں یہ صورت نہ ہو وہاں واؤ کا استعمال یا تو دو الگ الگ چیزوں کو جمع کرے کے لیے ہوگا یا عام کو خاص پڑ یا خاص کو عام پر عطف کرنے کے لیے ہوگا ایسے مقامات پر واؤ کے تفسیری ہونے کا دعویٰ بالکل مہمل ہے۔ اب یہاں دیکھئے جہاں تک لغت کا تعلق ہے ظاہر ہے کتاب اور حکمت دو مترادف الفاظ نہیں ہیں دونوں کے معنی ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں نہ ہی قرآن کی بات تو وہ بھی حکمت کو کتاب کے ہم معنی قرار نہیں دیتا۔ قرآن نے جگہ جگہ حکمت کا لفظ استعمال کیا ہے لیکن کہیں بھی اس کو کتاب کے معنی میں نہیں لیا۔ غور کیجئے سورہ نحل میں ہے :

ادعِ إِلَى سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحُكْمَةِ | اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت کے  
(نحل: ۱۲۵)

کیا آپ اس آیت کا یہ ترجمہ کریں گے کہ اپنے رب کے راستے کی طرف قرآن کے ساتھ دعوت دو۔ اسی طرح سورہ بقرہ میں ہے :

وَمَنْ يُولِ الْحُكْمَةَ فَقَدْ أَوْحِیَ | جسے حکمت دی گئی اسے بڑی دولت  
خَيْرًا كَثِيرًا۔ (بقرہ: ۲۶۹)

ذرا بتلائیے کیا یہاں حکمت سے کتاب مراد لی جاسکتی ہے۔ سورہ لقمان میں حکیم لقمان کے متعلق فرمایا گیا :

وَأَقْدَأْتِنَا لِقْمَانَ الْحُكْمَةَ (لقمن: ۱۲) | ہم نے لقمان کو حکمت عطا کی تھی۔

کیا اس کے معنی یہ ہیں کہ حکیم لقمان کو اللہ تعالیٰ نے کتاب عطا کی تھی۔ دراصل قرآن میں کہیں بھی کتاب بول کر حکمت مراد نہیں لی گئی اور حکمت بول کر کتاب مراد نہیں لی گئی۔ کتاب کا

لفظ جہاں کہیں بھی آیا ہے آیات الہی کے مجموعے کے لیے آیا ہے اور حکمت کا لفظ جہاں کہیں استعمال ہوا ہے اس دانائی اور فہم و بصیرت کے معنی میں استعمال ہوا ہے جس سے انسان حقائق کے سمجھنے اور فکر و عمل میں صحیح رویہ اختیار کرنے کے قابل ہوتا ہے۔ یہ چیز کتاب میں بھی ہو سکتی ہے، کتاب کے ساتھ بھی ہو سکتی ہے اور کتاب کے باہر بھی۔ چنانچہ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے جہاں کہیں قرآن یا کتاب کے لیے حکم کی صفت استعمال کی ہے اس کے معنی یہ تو ضرور ہیں کہ کتاب کے اندر حکمت ہے مگر یہ معنی نہیں ہیں کہ کتاب خود حکمت ہے یا حکمت صرف کتاب میں ہے اور اس کے باہر کوئی حکمت نہیں ہے جیسا کہ منکرین حدیث مخالفہ دینے کی کوشش کرتے ہیں۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اِذْ تَقُوْلُْنَ اَللّٰهُمَّ اِنَّا نَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْغُلُوْلِ وَ الْحُمْقَةِ کَاِیَّہِ مُطَلَبِیْنَ اِنَّا کُنَّا مِنْکُمْ لَمُتَّعِیْنَ  
نہ ہوگا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر صرف کتاب نازل کی گئی بلکہ اس کے صحیح معنی بھی ہوں گے کہ آپ پر کتاب کے ساتھ وہ دانائی بھی نازل کی گئی جس سے آپ اس کتاب کا منشاء ٹھیک ٹھیک سمجھیں اور انسانی زندگی میں اس کو بہترین طریقے سے نافذ کر کے دکھا دیں اسی طرح یعلمہم الکتاب والْحُکْمَۃَ کے معنی یہ ہرگز نہیں ہیں کہ آپ صرف کتاب کے الفاظ پڑھوا دیں بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ لوگوں کو کتاب کا مطلب سمجھائیں اور انہیں اس دانش مندی کی تعلیم دے دیں جس سے وہ دنیا کے نظام زندگی کو کتاب اللہ کے مطابق ڈھالنے کے قابل ہو جائیں۔

غرض کتاب کے ساتھ حکمت کے نزول کا ذکر اس بات کا ثبوت ہے کہ قرآن ہی کی شہادت کے مطابق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن کے علاوہ بھی وحی آتی تھی۔ قرآن ہی کی ایک اور شہادت اس باب میں اس سے بھی زیادہ صریح ہے۔ قرآن نے ایک مقام پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل ہونے کی تین صورتیں بتائی ہیں ان میں سے قرآن ہی ہمیں بتلاتا ہے کہ وہ صرف ایک قسم کی وحیوں پر مشتمل ہے۔ ظاہر ہے باقی دو صورتیں قرآن کے علاوہ ہیں۔

## وحی کے نزول کی تین صورتیں | نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل ہونے کی تین صورتوں کا ذکر سورہ شوریٰ کی

اس آیت میں کیا گیا ہے :

وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَكَلِمَهُ اللَّهُ إِلَّا وَحْيًا أَوْ مِنْ وَرَاءِ حِجَابٍ أَوْ يَرْسُلَ رَسُولًا فَيُوحِي بآيَاتِهِ مَا يَشَاءُ  
(الشوریٰ : ۵۱)

کسی بشر کے لیے یہ نہیں ہے کہ اللہ اس سے گفتگو کرے مگر (۱) یا تو (۲) وحی کے طریقے پر یا پردے کے پیچھے سے یا کسی قاصد (رشتے) کو بھیج دے اور وہ اللہ کے اذن سے وحی کرے جو کچھ اللہ چاہتا ہے۔

اس آیت کے مطابق وحی کی ایک صورت تو یہ تھی کہ براہ راست نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب میں کوئی بات ڈال دی جاتی تھی۔ اس قسم کی وحی میں نہ فرشتے کا کوئی واسطہ ہوتا تھا اور نہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قوت سامعہ اور حواس کا۔ اس میں کوئی اراد آپ کو سنائی نہیں دیتی تھی بلکہ بس ایک بات قلب میں جاگزیں ہو جاتی تھی اور ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہو جاتا تھا کہ یہ بات اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئی ہے وحی کی اس قسم کو وُحْیاً کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ دوسری قسم کی وحی کو اُذْهِنْ وَاذْهَبْ حِجَابِ کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے یعنی پردے کے پیچھے سے۔ اس کی صورت یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ براہ راست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی ہم کلامی کا شرف عطا فرماتا تھا اس میں بھی کسی فرشتے کا واسطہ نہیں ہوتا تھا لیکن آپ کو اُذْهِنْ وَاذْهَبْ دیتی تھی۔ تیسری قسم کی وحی یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ اپنے فرشتے جبریل علیہ السلام کے ذریعے آپ تک اپنا پیغام پہنچاتا تھا۔

صرف ایک قسم کی وحی قرآن ہے | اب آپ قرآن ہی سے سنے کہ وحی کی ان تینوں صورتوں میں سے صرف

تیسری قسم کی وحیاں قرآن میں جمع کی گئی ہیں۔ سورہ بقرہ میں ہے :

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيلَ فَإِنَّهُ  
نَزَّلَهُ عَلَى قَلْبِكَ بِإِذْنِ اللَّهِ ... الخ

اے بنی کہہ دیجئے کہ جو کوئی دشمن ہو جبریل کا  
اسی بنا پر کہ اس نے یہ قرآن اللہ کے حکم سے  
آپ کے قلب پر نازل کیا ہے.....

(البقرہ: ۱۹۷)

بعض یہودی بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ منکر کہ قرآن جبریل علیہ السلام نے کر لائے  
ہیں یہ کہا کرتے تھے کہ ان سے تو ہماری عداوت ہے اگر میکائیل وحی لایا کرتے تو ہم مان  
لیتے ان کی رد فرماتے ہوتے اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ کوئی شخص اگر جبریل سے عداوت  
رکھتا ہے تو اس عداوت کو قرآن کے نہ ماننے میں کیا دخل۔ کیونکہ جبریل علیہ السلام تو سفیر  
محض ہیں سو سفادت کے طور پر انہوں نے یہ قرآن آپ کے قلب تک پہنچا دیا ہے۔  
بحر حال اس آیت نے یہ بتلادیا کہ قرآن جبریل علیہ السلام کے ذریعے نازل کیا گیا ہے۔  
یہی بات اس سے بھی زیادہ صراحت کے ساتھ سورہ شوریٰ میں کہی گئی ہے:

اور بے شک یہ (قرآن) پروردگار عالم کا  
اتارا ہوا ہے اسے روح الامین نے آپ  
کے قلب پر اتارا ہے تاکہ آپ ڈرانے والوں  
میں سے ہوں صاف عربی نہ بان میں۔

وَإِنَّهُ لَنَزْلٌ رَّبِّ الْعَالَمِينَ  
نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ ۖ عَلَى  
قَلْبِكَ لِتَكُونَ مِنَ الْمُنْذِرِينَ ۖ  
بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُبِينٍ ۝

(الشعراء: ۱۹۵-۱۹۷)

نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ کے الفاظ بتلا رہے ہیں کہ قرآن پورے کا پورا روح الامین  
یعنی حضرت جبریل علیہ السلام کے ذریعے اتارا گیا ہے تو ظاہر ہے رسول اللہ صلی اللہ  
علیہ وسلم پر وحی کیسے جانے کی باقی دو صورتیں جن کا ذکر سورہ شوریٰ میں کیا گیا ہے وہ  
قرآن کے علاوہ ہیں۔

یہاں یہ کہنا کسی طرح بھی درست نہیں کہ سورہ شوریٰ  
والی آیت میں صرف بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے  
نہیں بلکہ ہر بشر کے ساتھ اللہ کے ہم کلام ہونے کے

عام انسانوں سے اللہ کی  
ہم کلامی اور وحی

طریقوں کا ذکر تفسیر منکر بن حدیث اس آیت کی یہی توجیہ کرتے ہیں وہ کہتے ہیں اس آیت کے

پہلے دو حصوں میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہم کلام ہونے کے دو طریقوں کا ذکر ہے جبکہ آخری حصے میں عام انسانوں سے بات کرنے کا طریقہ بتایا گیا ہے۔ یہ بات اسی لیے درست نہیں کہ اس آیت کے فوراً بعد اللہ نے اس بات کی تصریح کر دی ہے کہ بندے سے اللہ کی ہم کلامی کے متذکرہ تینوں طریقوں کا تعلق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی پہنچنے سے ہے۔ قرآن اٹھا کر دیکھ لیجئے اس آیت کے فوراً بعد ارشادِ ربانی ہے :

اور اسی طرح (اے نبی) ہم نے تمہاری طرف وحی کی اپنے حکم کی روح تم کو پہنچانے کا کتاب کیا ہے لعلیماں کیا ہے مگر ہم نے اس کو ایک نور بنا دیا جس کے ذریعے ہم اپنے بندوں میں سے جس کی چاہتے ہیں رہنمائی کرتے ہیں اور یقیناً تم راہِ راست کی طرف رہنمائی کرتے ہو۔

وَكَذَلِكَ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ رُوحًا مِنْ  
أَمْرِنَا مَا كُنْتَ تَدْرِي مَا الْكِتَابُ وَلَا  
الْإِيمَانُ وَلَكِنْ جَعَلْنَاهُ نُورًا هَدًى  
لِمَنْ شَاءَ مِنْ عِبَادِنَا وَإِلَيْكَ  
نَسْتَدِي إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ

(شوری: ۵۲)

وَكَذَلِكَ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ کے الفاظ اپنے مفہوم میں بالکل واضح ہیں۔ صاف معلوم ہو رہا ہے کہ اس آیت سے پہلے اللہ کی ہم کلامی کے جن تین طریقوں کا ذکر ہوا ہے ان تینوں کا تعلق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی پہنچنے سے ہے یعنی اللہ تعالیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتلایہ رہا ہے کہ انی تین طریقوں سے ہم نے اپنے فرمان کی روح تمہاری طرف وحی کی ہے۔ فرمان کی روح سے مراد وہ تمام ہدایات ہیں جو مذکورہ تینوں طریقوں سے آپ پر وحی کی گئی۔ یہاں روح کا لفظ دیکھ کر بلا سوچے سمجھے منکرینِ حدیث کہہ دیا کرتے ہیں کہ رُوحًا مِنْ أَمْرِنَا سے روح الامین یعنی حضرت جبرئیل علیہ السلام مراد ہیں بھلا کوئی پوچھے کہ کیا جبرئیل علیہ السلام کی ذات بھی وحی کی جاسکتی ہے۔ اگر روح کے لفظ سے حضرت جبرئیل علیہ السلام مراد ہوتے تو أَوْحَيْنَا کے بجائے أَرْسَلْنَا کہا گیا ہوتا۔

اسی طرح اس آیت سے پہلے والی آیت کے آخری حصے کو عام انسانوں سے اللہ کی ہم کلامی کے ساتھ مخصوص کرنا بھی قطعاً غلط ہے۔ منکرینِ حدیث کے خیال کے مطابق آیت کے آخری حصے میں یہ بتایا گیا ہے کہ عام انسانوں سے اللہ کی ہم کلامی کا طریقہ یہ ہے کہ وہ ان کی

طرف رسول بھیجتا ہے پھر اس رسول پر وحی نازل کرتا ہے اور اللہ کا رسول اس وحی کو عام انسانوں تک پہنچاتا ہے حالانکہ آیت کے الفاظ ہیں اَوْ يُرْسِلُ رُسُلًا فَيُتَوَحَّیْ بِاٰیٰتِہٖ مَا یَشَآءُ (یا کسی قاصد کو بھیج دے اور وہ اللہ کے اذن سے وحی کرے وہی کچھ جو اللہ چاہتا ہے) اس فقرے میں اگر ”رسول“ سے مراد فرشتے کے بجائے بشر رسول لیا جائے تو اس کے معنی یہ بن جائیں گے کہ رسول بھی عام انسانوں پر وحی کرتا ہے۔ کسی عجیب بات ہے وحی کے تو معنی ہی اشارۃً لطیف اور کلام ضمنی کے ہیں۔ یہ لفظ نہ تو لغت ہی کی رو سے اس تبلیغ کے لیے استعمال ہو سکتا ہے جو اللہ کا رسول علانیہ خلق خدا کے درمیان کرتا ہے اور نہ قرآن ہی میں کہیں اس لفظ کو اس معنی میں استعمال کیا گیا ہے یہاں تو رسول کا لفظ صاف طور پر اس فرشتے کے لیے استعمال ہوا ہے جو اللہ کے نبیوں اور رسولوں کی طرف وحی لانے کے کام پر مامور ہے یعنی حضرت جبرئیل علیہ السلام۔

**قرآن کے علاوہ وحی کے نزول پر قرآنی شہادتیں** | غرض قرآن کی ان آیات کی روشنی میں جو اس باب میں بالکل صریح ہیں کہ قرآن تمام تر حضرت جبرئیل علیہ السلام کے ذریعے نازل ہوا ہے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ قرآن صرف ایک قسم کی وحیوں پر مشتمل ہے۔ وحی کی باقی دو صورتیں جن کا ذکر سورہ شورہ والی آیت میں کیا گیا ہے وہ قرآن کے علاوہ ہیں۔ ان دو صورتوں سے جو ہدایات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کی جاتی تھیں ان کے بارے میں بھی شواہد خود قرآن ہی کے اندر موجود ہیں۔ مثلاً

۱، ہر کوئی جانتا ہے کہ قرآن کریم جس ترتیب کے ساتھ اس وقت موجود ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر اس ترتیب سے نازل نہ ہوا تھا بلکہ ضرورت اور حالات کے مطابق نزول کی ترتیب اس سے مختلف تھی ہوتا یہ تھا کہ جب کوئی آیت نازل ہوتی تو آپ کا تبیین وحی کو ساتھ ہی یہ بھی بتا دیتے تھے کہ یہ آیت فلاں سورت میں فلاں آیت کے بعد لکھی جائے گی چنانچہ وہ آپ کے بتائے ہوئے مقام پر درج ہو جاتی تھی اب قرآن کی اس نمونی ترتیب کو بدلنا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی مرضی سے تو ممکن نہیں اس لیے کہ قرآن نے



واضح طور سے فرما دیا تھا :

قَالَ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَنَا أَتَبْتِ  
بِقُرْآنٍ غَيْرِ هَذَا أَوْ يَدَّبْطَحُ  
مَا يَكُونُ لِي أَنْ أُبَيِّنَ لَهُ مِنْ مِثْلَيْ  
نَفْسِي إِنَّ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰ  
الْحَقَّ (يونس : ۱۵)

جن لوگوں کو ہمارے پاس آنے کا کوئی کھٹکا نہیں  
ہے وہ کہنے لگتے ہیں کہ اس کے سوا کوئی اور قرآن  
لاؤ یا اس کو بدل دو آپ کہہ دیجئے مجھ سے یہ کیسے  
ہو سکتا ہے کہ میں اسے اپنے جی سے بدل دوں میں  
تو ہیں اسی کی پیروی کروں گا جو میرے پاس وحی  
سے پہنچتا ہے۔

معلوم ہوا قرآن کی نزول کی ترغیب کی یہ تبدیلی وحی الہی کے مطابق تھی لیکن قرآن میں یہ وحی  
کہیں مذکور نہیں ہے ظاہر ہے یہ وحی قرآن کے علاوہ تھی۔

(۲) اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَإِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوا (الاعراف ۲۰۶)

یہ طرہی وہ چیز جاتی ہے جو لکھی ہوئی ہو مگر قرآن میں یہ کہیں نہیں ہے کہ اسے بنی جب  
قرآن نازل ہوا کرے تو لکھ لیا کرو ورنہ ثابت ہوا کہ بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا قرآنی  
آیات کو قید تحریر میں لانا وحی غیر قرآنی کے تحت تھا۔

(۳) مسجد حرام کو قبلہ بنائے جانے سے پہلے بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں نے  
تقریباً سترہ مہینے تک بیت المقدس کو قبلہ بنائے رکھا۔ تحویل قبلہ کا حکم دیتے وقت  
اللہ تعالیٰ نے اس بات کی توثیق فرمائی کہ بیت المقدس کا قبلہ بنایا جانا بھی بھلا  
ہی حکم سے تھا جیسا کہ ارشاد ہے :

وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنْتَ عَلَيْهَا  
الْأُولَىٰ مِمَّنْ يَتَّبِعُ الرَّسُولَ مِمَّنْ  
يَنْقَلِبُ عَلَىٰ عَقْبَيْهِ (بقرہ : ۱۴۳)

اور جس قبلہ پر آپ (اب تک) تھے اسے تو ہم  
نے اسی سے رکھا تھا کہ ہم پہچان لیں رسول کا اتباع  
کرنے والوں کو اے پاؤں واپس جہانے والوں میں۔

جب بیت المقدس کا قبضہ بنایا جانا وحی الہی کے تحت تھا تو قرآن تو اس حکم سے بالکل ساکت ہے سوال یہ ہے کہ اگر قرآن کے علاوہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر کوئی وحی نہیں آتی تھی تو یہ قبضے کا حکم آپ کو کس ذریعے سے ملا۔ کیا یہ اس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کچھ احکام ایسے بھی ملتے تھے جو قرآن کے علاوہ ہوتے تھے۔ یہ آیت جہاں اس امر کا صریح ثبوت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن کے علاوہ بھی وحی آتی تھی دلائل یہی آیت پوری صراحت کے ساتھ یہ بھی بتاتی ہے کہ مسلمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ان احکام کا اتباع کرنے پر بھی مامور ہیں جو قرآن میں مذکور نہ ہوں کیوں کہ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان کہ ہم نے یہ قبضہ مقرر ہی اس لیے کیا تھا کہ ہم دیکھیں کون رسول کی پیروی کرتا ہے اور کون اس سے منہ موڑتا ہے اسی بات پر دلالت کر رہا ہے گویا اللہ تعالیٰ کے یہاں مسلمانوں کے ایمان بالرسالت کی آزمائش ہی اس طریقہ سے ہوتی ہے کہ رسول کے ذریعے سے جو حکم بھی دیا جائے اس کے بارے میں دیکھا جائے کہ وہ اسے بے چون و چرا تسلیم کرتے ہیں یا نہیں۔

۱۴، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار اپنی ازواج مطہرات میں سے کسی کو ایک راز کی بات بتائی انہوں نے اس راز کی بات کا دوسروں سے ذکر کر دیا۔ آپ نے باز پرس فرمائی تو وہ پوچھنے لگیں کہ آپ کو یہ کیسے معلوم ہو گیا کہ میں نے یہ بات دوسروں سے کہ دی ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا مجھے علم وغیرہ خبر دی ہے۔ قرآن اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے :

اور جب نبی نے ایک بات اپنی کسی بیوی سے چھپے سے فرمائی پھر جب ان بیوی نے وہ بات کہی ہو کر (بتلا دی اور اللہ نے نبی کو اس کی خبر کر دی تو نبی نے اس کا کچھ حصہ بتلا دیا اور کچھ کو مال گئے پھر جب نبی نے ان بیوی کو وہ بات جلتی تو وہ بولیں آپ کو کس نے خبر دی آپ نے کہا مجھے علم وغیرہ

وَإِذْ أَسْرَأَ النَّبِيُّ إِلَىٰ بَعْضِ أَزْوَاجِهِ حَدِيثًا فَلَمَّا نَبَأَتْ بِهِ وَأَظْهَرَهُ اللَّهُ عَلَيْهِ عَرَفَ بَعْضُهُمْ أَعْرَضَهُمْ عَنْ بَعْضٍ فَلَمَّا نَبَأَهَا بِهِ قَالَتْ مِمَّنْ أَمَّا كَذًا قَالَ نَبَأَنِي

## الْعَلِيمُ الْخَبِيرُ

خدا نے بنایا۔

(التوہیم : ۳)

اس آیت میں وَأُظْهِرَ اللَّهُ عَلَيَّ (اور اللہ نے نبی کو اس کی خبر کر دی) کے الفاظ اپنے مفہوم میں بالکل واضح ہیں اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی اس ساری کارروائی پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مطلع کر دیا تھا قَالَ نَبَاكُنِي الْعَلِيمُ الْخَبِيرُ (آپ نے کہا مجھے علیم و خبیر خدا نے بتایا) کے الفاظ بھی اسی پر دلالت کر رہے ہیں کہ یہ سب کچھ وحی کے ذریعے ہی آپ کو معلوم ہوا۔ اب بتلائیے قرآن میں وہ آیت کہاں ہے جس کے ذریعے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ اطلاع دی گئی تھی کہ آپ کی بیوی نے آپ کی راز کی بات دوسروں سے کہہ دی ہے۔ اگر قرآن کریم میں یہ آیت موجود نہیں ہے تو اس کے علاوہ آپ اور کیا کہیں گے کہ یہ وحی قرآن کے علاوہ تھی۔

(۵) سورۃ حشر کی ایک آیت ہے:

فَاقْطَعُوا مِّنْ لَّيْسَةٍ اَوْ  
تُرْكُمُوها قَاتِلَةً عَلٰى  
اَصْحٰبِهَا فَبِاِذْنِ اللّٰهِ

کھجوروں کے جو درخت تم نے کاٹے اور جو کھڑے  
رہنے دئے یہ دونوں کام اللہ کی اجازت  
سے تھے۔

(الحشر : ۵)

اس آیت کا شان نزول یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودیوں کے قبیلے بنی نضیر کی مسلسل بدعہدیوں سے تنگ آکر جب مدینہ سے متصل ان کی بستیوں پر چڑھائی کر دی تو دوران محاصرہ اسلامی فوج نے گرد و پیش کے باغات کے بہت سے درخت کاٹ ڈالے تاکہ حملہ کرنے کے لیے راستہ صاف ہو جائے اس پر مخالفین نے شور مچا دیا کہ باغوں کو اجاڑ کر اور ہرے بھرے پھل دار درختوں کو کاٹ کر مسلمانوں نے فساد فی الارض بپا کیا ہے۔ مخالفین کے اس بے جا شور و غوغا کا جواب دینے کے لیے قرآن کی یہ آیت نازل ہوئی جس میں بتلایا گیا کہ اسلامی فوج نے جو کچھ کیا ہے اللہ کی اجازت سے کیا ہے۔ اب ذرا بتلائیے کہ اللہ کی یہ اجازت قرآن کی کس آیت میں ہے۔ اگر یہ اجازت قرآن میں نہیں دکھلائی

یا سکتی تو معلوم ہوا یہ اجازت اس وحی کے ذریعے تھی جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن کے علاوہ اترتی تھی۔

(۶) سورۃ انفال جیسا کہ معلوم ہے جنگِ بدر کے بعد نازل ہوئی ہے اس سورت میں پروردگار نے جنگِ بدر پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ اس تبصرے کا آغاز کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَلَا يَجِدُكُمْ اللَّهُ إِلَّا حَادِيَ  
الطَّافَتِينَ أَنَّهُمَا لَكُمْ وَلَدُونَ أَنَّ  
غَيْرَ ذَاتِ الشَّرَكَةِ تَكُونُ لَكُمْ  
يُؤَيِّدُ اللَّهُ أَنْ يَتَّخِذَ الْحَقُّ بِكَلِمَتِهِ  
وَيَقْطَعَ دَابِرَ الْكَافِرِينَ۔

(انفال: ۷)

اور جب اللہ تم سے وعدہ کر رہا تھا دو  
جماعتوں میں سے ایک کے لیے کہ وہ تمہارے  
ہاتھ آجائیں گی اور تم چاہ رہے تھے کہ غیر مسلم  
جماعت تمہارے ہاتھ آجائے دروغاً لیکر اللہ  
کو منظور یہ تھا کہ حق کا حق ہونا ثابت کر دے  
اپنے احکام سے اور کافروں کی جبر کا طعن۔

یہ آیت بتلا رہی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب مسلمانوں کو لیکر مدینہ سے  
نکلے تو اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی آپ کو یہ بتلا دیا تھا کہ قریش کے تجارتی قافلے اور  
مشرکین مکہ کے لشکر ان دونوں جماعتوں میں سے ایک جماعت مسلمانوں کے ہاتھ  
آجائے گی۔ اب پورے قرآن شریف میں اس آیت کی نشاندہی نہیں کی جاسکتی جس  
میں اللہ کے اس دعوے کا ذکر ہو ظاہر ہے۔ یہ وعدہ وحی غیر قرآن کے ذریعے کیا  
گیا تھا۔

(۷) قرآن میں نماز سے پہلے اذان دیے جانے کا ذکر آیا ہے مثلاً سورۃ مائدہ میں ہے:

وَإِذَا نَادَيْنَا لِلْحَمْدِ  
الصَّلَاةِ اتَّخَذُوا هَٰذَا قَوْلًا عَابًا۔

(مائدہ: ۵۸)

اور جب تم نماز کی طرف (بلانے کے لیے)  
اذان دیتے ہو تو وہ (مشرکین) اسے  
کھیل کود بنا لیتے ہیں۔

اسی طرح سورۃ جمعہ میں ہے:

اِذَا نَدَوْنِي لِلصَّلَاةِ مِنْ يَوْمٍ  
الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا إِلَى ذِكْرِ  
اللَّهِ - (الجمعة : ۹)

جب جمعہ کے دن نماز کے لیے اذان دی جائے  
تو اللہ کے ذکر کی طرف دوڑو۔

ان دونوں آیتوں میں نماز جمعہ اور عام نمازوں سے پہلے اذان دئے جانے کا ذکر ایک رائج  
شدہ نظام کی حیثیت سے کیا گیا ہے لیکن ہمیں قرآن میں وہ آیت کہیں نہیں ملتی جس میں  
حکم دیا گیا ہو کہ نماز کے لیے اذان دیا کر دلا محالہ ماننا پڑے گا کہ یہ حکم نبی کریم صلی اللہ علیہ  
وسلم کو اس وحی کے ذریعے دیا گیا تھا جو قرآن کے علاوہ تھی۔

(۸) قرآن صلوٰۃ خوف کا ذکر کرتے ہوئے جہاں یہ کہتا ہے کہ اگر عام قاعدے کے مطابق  
نماز یا جماعت ادا کرنے میں کسی دشمن کی طرف سے خوف ہو تو نماز جس طرح بھی ممکن ہو  
سکے پڑھ لو خواہ پیادہ یا ہو کر خواہ سواری کی حالت میں تو اس کے فوراً بعد کہتا ہے :

فَإِذَا أَمِنْتُمْ فَأَذْكُرُوا اللَّهَ كَمَا  
عَلَّمَكُمْ (بقرہ : ۲۳۹) | پھر جب تم امن میں آ جاؤ تو اللہ کو یاد کرو (یعنی  
نماز پڑھو) جس طرح اس نے تمہیں سکھایا ہے۔

نماز کی یہ تعلیم کیا کوئی بنا سکتا ہے اللہ نے قسداں کی کس اہمیت میں دی ہے۔ اگر قرآن  
میں یہ تعلیم موجود نہیں ہے تو پھر یہ ماننے بغیر چارہ نہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا بیان  
کیا ہوا اور سکھایا ہوا نماز کا طریقہ اللہ نے آپ کو اس وحی کے ذریعے تعلیم فرمایا تھا  
جو قرآن کے علاوہ تھی۔

بہر حال یہ چند آیات مثال کے طور پر پیش کر دی گئی ہیں اسی قسم کی اور متعدد آیات

اس بارے میں پیش کی جا سکتی ہیں۔ یہ تمام آیات قرآنی اس بات کا منہ بولتا ثبوت ہیں کہ نبی  
کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس قرآن کے علاوہ بھی وحی آتی تھی اور جب یہ بات ثابت  
ہو گئی تو پھر ایک قسم کی وحی کو قابل اطاعت سمجھنا اور دوسری قسم کی وحی سے انکار کر دینا  
کوئی معنی نہیں رکھتا۔

وحی پر ہمارے ایمان کی اصل بنیاد | معاملہ وحی قرآنی کا ہو یا غیر قرآنی کا  
اس سلسلے میں سب سے اہم بات غور

کرنے کی یہ ہے کہ وحی پر ایمان لانے اور اس کی اطاعت و اتباع کرنے کی اصل بنیاد کیا ہے۔ وحی خواہ کسی نوعیت کی بھی ہو سوال یہ ہے کہ کیا وہ ہمارے پاس براہ راست آئی ہے کہ ہم از خود اس کے منزل من اللہ ہونے یا نہ ہونے کو معلوم کر سکیں ظاہر ہے ایسا نہیں ہے وحی ہمارے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے سے آئی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی نے ہمیں بتایا ہے کہ یہ ہدایت میرے پاس خدا کی طرف سے آئی ہے گویا ہم وحی کے منزل من اللہ ہونے پر ایمان لانے سے پہلے رسول کے منزل من اللہ ہونے پر ایمان لاتے ہیں پھر اس کے بیان پر اعتماد کر کے اس پر اترنے والی وحی کو اللہ کی بھیجی ہوئی وحی مانتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ہمارے ایمان کی وجہ قسم آن نہیں ہے بلکہ قسم آن پر ہمارے ایمان کی وجہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ایمان ہے۔ یہ ایک ایسی کھلی حقیقت ہے کہ جس سے کوئی بھی محقول آدمی انکار نہیں کر سکتا۔ جب یہ بات ہے تو ذرا سوچئے کہ جس رسول کے اعتماد پر ہم نے قرآن کو وحی مانا ہے وہی رسول اگر ہمیں یہ بتلائے کہ قرآن کے علاوہ بھی مجھ پر وحی آتی ہے اور مجھے قرآن کے علاوہ بھی ہدایات و احکام ملتے ہیں تو اس کی تصدیق نہ کرنے کی آخر وجہ کیا ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑی تنبیہ کے انداز میں ارشاد فرمایا ہے:

خبردار رہو کہ مجھے قرآن دیا گیا اور اس کے ساتھ	أَلَا إِنِّي أُوْتِيتُ الْقُرْآنَ وَمِثْلَهُ
اس کا مثل بھی (دیا گیا)۔	(ابوداؤد)

پھر قرآن ہی کی طرح اس مثل کا بھی واجب الاطاعت ہونا ثابت کرتے ہوئے فرمایا:

جو کچھ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے حرام	وَإِنَّمَا حَرَّمَ رَسُولُ اللَّهِ كَمَا
کیا وہ (اطاعت میں) لایا ہی ہے جیسا	حَرَّمَ اللَّهُ - (ابوداؤد، ترمذی،
اللہ نے حرام کیا۔	ابن ماجہ)

ایک اور موقع پر اس سے بھی زیادہ وضاحت کے ساتھ یہ بتلایا کہ میں قرآن کے علاوہ بھی  
 تمہیں احکام سناتا ہوں اور تم پر اس کی اطاعت بھی اسی طرح واجب ہے جس طرح قرآن  
 میں دئے جانے والے احکام کی۔ ارشاد ہے:

<p>خبردار قسم ہے اللہ کی میں نے تمہیں حکم دیا ہے          نصیحت کی ہے اور مدد کا ہے بہت سی چیزوں          کے بارے میں۔ یہ چیزیں بقدر قرآن کے ہیں          بلکہ اس سے نائد بھی ہیں۔</p>	<p>أَلَا وَابْتَغُوا اللَّهَ قَدْ أَمَرْتُ          وَوَعظْتُ وَنَهَيْتُ عَنْ أَشْيَاءَ          إِنَّهَا كَمَثَلِ الْقُرْآنِ أَوْ أَكْثَرَ          (ابوداؤد)</p>
--	--

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے محولہ بالا ارشادات کو سامنے رکھ کر سوچئے کہ جب اللہ کا  
 رسول خود بتلا رہا ہے کہ قرآن کے علاوہ بھی اس پر وحی آتی ہے تو آخر اس پر اتاری  
 جانے والی ایک وحی اور دوسری وحی میں فرق کس بنا پر۔ جب ایسا ہالہ سالہ ہی وحی  
 پر ہمارے ایمان کی اصل بنیاد ہے تو اطاعت کرنے والے کے لیے اس سے کیا فرق پڑتا  
 ہے کہ رسولؐ نے خدا کا ایک حکم قرآن کی کسی آیت کی شکل میں ہمیں پہنچا دیا ہے یا اپنے  
 فرمان یا عمل کی شکل میں۔ اطاعت کرنے والے کے لیے تو دونوں وحیاں اس حیثیت  
 سے واجب الاتباع ہیں کہ وہ دونوں منزل من اللہ ہیں۔ اسی لیے قرآن کہتا ہے:

<p>جو کچھ تم پر تمہارے رب کی طرف سے نازل کیا          گیا ہے اس کی پیروی کرو۔</p>	<p>إِتَّبِعُوا مَا أَنْزَلَ إِلَيْكُم مِّنْ          رَبِّكُمْ - (اعراف : ۳) -</p>
---	--

”جو کچھ بھی نازل کیا گیا ہے“ کے الفاظ دیکھو۔ لیجئے اپنے مفہوم میں کس قدر واضح ہیں۔ یعنی  
 وہ تمام تعلیمات و ہدایات جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کی گئی ہیں خواہ وہ آیات  
 قرآنی کی صورت میں ہوں یا کسی اور صورت میں وہ سب کی سب واجب الاتباع ہیں۔  
 خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بار بار کتاب اللہ اور اپنی سنت کو علیحدہ  
 علیحدہ بیان کر کے دونوں کی اطاعت کا حکم دیا۔ حضرت مالک بن انس روایت کرتے ہیں  
 کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

میں تم میں دو چیزیں چھوڑ چلا ہوں جب تک انہیں  
تھامے رہو گے ہرگز گمراہ نہ ہو گے وہ اللہ کی کتاب  
اور میری سنت ہے۔

تَذَكُّرُكُمْ أَمْرَيْنِ لَنْ تَضِلُّوا  
مَا تَسْكُنُهُ بَهْمَا كَتَبَ اللَّهُ وَسُنَّةُ  
رَسُولِهِ (مولانا مالک)۔

اس حدیث کو بیہمتی نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ ہی سے ایک  
اور روایت امام بخاری بھی لائے ہیں اس میں سنت سے انکار کرنے والے کو نبی کریم صلی اللہ  
علیہ وسلم نے جنت سے محرومی کی وعید سنائی ہے۔ یہ ارشاد نبوی ہے :

انکار کرنے والے کے سوا میری امت میں سے  
ہر شخص جنت میں جلتے سا پوچھا گیا کہ انکار کرنے  
والا کون ہے آپؐ نے فرمایا جس نے میری اطاعت  
کی جنت میں داخل ہوا اور میں نے میری نافرمانی  
کی اس نے انکار کیا۔

كُلُّ أُمَّتِي يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ  
إِلَّا مَنْ أَجَبَ قِيلَ وَمَنْ أَجَبَ  
قَالَ مَنْ أَطَاعَنِي دَخَلَ الْجَنَّةَ  
وَمَنْ عَصَانِي فَقَدْ أَجَبَ

(بخاری)

ایک اور موقع پر آپؐ نے اختلافات کے موقع پر اپنی سنت اور اپنے صحابہ کے طریقے پر  
جسمے رہنے کی بڑے ہی پرتاثر انداز میں تاکید فرمائی چنانچہ حضرت عراب بن ساریہ رضی  
اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ایک روز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں فجر کی نماز  
پڑھائی پھر اس کے بعد ایسا اثر ایلز وعظ کرنا کہ آنکھوں سے آنسوؤں کے دھارے بہنے  
لگے اور جیل لرز نے لگے صحابہ نے عرض کیا حضور یہ تو آخری وعظ معلوم ہوتا ہے کچھ وصیت  
فرمادیجئے آپؐ نے فرمایا میں تمہیں اللہ سے ڈرتے رہنے اور صبح و طاعت پڑھنے  
کی وصیت کرتا ہوں خواہ میرے بعد تمہارا امیر حبشی غلام ہی کیوں نہ ہو میرے بعد  
میں کو جینا نصیب ہوا وہ بلکہ اختلاف دیکھے گا۔ اس کے بعد آپؐ نے فرمایا :

تم پر واجب ہے کہ میری سنت کو اور میرے  
ہدایت یافتہ خلفائے راشدین کے طریقے کو  
لازم پکڑو انہی پر بھروسہ کرو اور انہی کو  
مضبوط پکڑے رہو۔

فَعَلَيْكُمْ بِسُنَّتِي وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ  
الرَّاشِدِينَ الْمُهَدِّيِّينَ تَسْكُنُوا بِهَا  
وَعَصُوا عَلَيْهَا بِالنَّوَاجِذِ۔ (ترمذی،  
ابوداؤد، ابن ماجہ، جامع بیان العلم جلد ۲ ص ۱۸۲)



نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ان واضح ارشادات کے بعد بھی جو شخص آپ کی سنت کے واجب الاتباع ہونے سے انکار کرتا ہے وہ دراصل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت سے انکار کرتا ہے :

**صحابہ کے درمیان حدیث کی تشریحی حیثیت**

حدیث رسول کی تشریحی حیثیت پر غور کرتے وقت ایک اور مسلمہ حقیقت بھی پیش نظر رہنی چاہیے۔ وہ یہ کہ ہر مذہب کا بہترین زمانہ وہ ہوتا ہے جو صاحب

مذہب سے قریب ہو جیسا اس زمانہ کے لوگ صاحب مذہب کی مراد کو درست طور پر سمجھ سکتے ہیں زمانہ بعید کے آدمی نہیں سمجھ سکتے۔ ہندوؤں سے پوچھئے ان کے مذہب کا بہترین زمانہ وہ تھا جو بیکار اور اس کے شاگردوں کا تھا بیاس کے اقوال کو جتنا اس کے شاگرد سمجھتے تھے دوسرا کوئی نہ سمجھتا تھا یہودیوں سے استدعا کیجئے وہ اصحاب موسیٰ کو حضرت موسیٰ کی لائی ہوئی آسمانی تعلیمات و ہدایات کا بہتر طور پر سمجھنے والا قرار دیں گے۔ عیسائیوں سے سوال کیجئے وہ حضرت عیسیٰ کے حواریوں کو انجیل کا صحیح سمجھنے والا اور حضرت مسیح کی صحیح پیروی کرنے والا بتائیں گے غرض ہر مذہب کا بہترین زمانہ اس کا ابتدائی زمانہ ہوتا ہے۔ مذہبی احکام کی جو تعبیر اس زمانے کے لوگوں میں مستند قرار پا جائے وہی تعبیر صحیح اور درست مانی جاتی ہے اس مسلمہ حقیقت کو سامنے رکھتے ہوئے ہمیں اس بات پر غور کرنا چاہیے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اولین مخاطبین یعنی صحابہ کرام کے درمیان حدیث تشریحی حیثیت کی حامل مثنیٰ یا نہیں۔ اس نقطہ نظر سے جب ہم تاریخی مواد کا جائزہ لیتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ صحابہ کرام کے درمیان نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث ہمیشہ تشریحی حیثیت کی حامل رہیں۔ صحابہ کرام کے دور میں حدیث کی تشریحی حیثیت کا مسلم ہونا اس قدر واضح ہے کہ اس پر گفتگو کرنا بدیہی کو نظر ہی بنانا ہے۔ کتب احادیث اٹھا کر دیکھئے شریعت کے کسی ایک باب میں نہیں بلکہ قتال، حج، جنایت، بیع، وراثت، عدت، مزارعت، غرضیکہ شریعت کے تقریباً تمام ابواب میں ایسی حدیثیں ملتی ہیں جن سے ثابت ہوتا

ہے کہ صحابہ کے درمیان حدیث تشریحی حیثیت کی حامل تھی۔ حضرت ابوبکرؓ نے کہ حضرت عثمان اور حضرت علیؓ کی خلافت تک بلکہ اس کے بعد بھی ہر دور میں حلال و حرام کے مسائل میں ہمیشہ حدیثیں ہی پیش کی جاتی رہیں اور ہر نزاع و اختلاف کے مواقع پر سب احادیث ہی اوفیصل تسلیم کیا۔ ہم یہاں مختص نمونہ از خروار سے کے طور پر چند واقعات پیش کرتے ہیں جن سے ہمارے دعوے کی سچائی و زور و روشن کی طرح واضح ہو جانے لگی۔

(۱) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد سب سے پہلا اختلاف صحابہ کرام کے درمیان آپؐ کے دفن کے متعلق ہوا۔ لیکن کون نہیں جانتا کہ اس اختلاف کا فیصلہ ایک حدیث ہی کی بنیاد پر ہوا جو اس وقت حضرت ابوبکرؓ نے سنائی تھی آپؐ نے فرمایا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ جس جگہ اللہ کے نبی کی روح قبض ہوتی ہے اسی جگہ اس کو دفن کیا جاتا ہے۔ (موطا وابن ماجہ)

(۲) اسی طرح سفینہ نبی ساعدہ میں خلافت کے مسئلے پر جب جنگ کا ساماں تھا تو ایک صحابی حضرت بشیر انصاریؓ کی زبان سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد مبارک اَلْأَمَّةُ مِنْ قَرِيشٍ کے الفاظ نکلنے کی دیر تھی ہر طرف سناٹا چھا گیا اور ہر ایک کا سر اطاعت کے لیے جھکا ہوا نظر آنے لگا۔ (مسند دارمی)

(۳) حضرت ابوبکر صدیقؓ کے پاس ایک عورت آئی اور اپنے پوتے کے تہ لے میں سے حصّہ ملنے کی دعویدار ہوئی۔ حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا میں تیرا حصّہ کتاب اللہ میں نہیں پاؤں۔ حضرت منیر بن شبہؓ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دادی حصّہ دلویا۔ ہے فرمایا تمہارے اس قول پر کوئی شہادہ ہے محمد بن مسلمہ پورے میں شہادت دیتا ہوں آپؐ نے دادی کے حق میں فیصلہ دے دیا اور اس کو چھٹا حصّہ دلوا دیا۔ (تذکرہ اشراف جلد ۱ ص ۶۷)

(۴) حضرت عمرؓ کی بیہوشی کے بیوی و شوہر کی دیت کی رقم میں سے وراثت نہیں ملنی چاہیے لیکن جب حضرت ضحاک بن سفیانؓ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

نے اشیم انصاری کی بیوی کو شوہر کی دیت دلوانی تھی تو حضرت عمرؓ نے فوراً اپنے قول سے رجوع فرمالیا۔ (ابوداؤد دینار سارہ صحابہ کرامؓ ج ۱ ص ۲۶)

(۵) ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے اعلان فرمایا کہ کیا کسی شخص نے بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بارے میں کچھ سنا ہے کہ اگر جھگڑے میں کسی عورت کا حمل راقط ہو جائے تو اس کی جزا کیا دینی چاہیے۔ یہ سن کر حمل بن مالک کھڑے ہوئے اور فرمایا کہ ایک مرتبہ میری دونوں بیویوں میں رڑائی ہو گئی ایک نے دوسرے کے کدال دے ماری ہیں کے صدمے سے دوسری نونڈی کا حمل ساقط ہو گیا مقدمہ بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش ہوا آپؐ نے اس پر ایک نونڈی یا غلام بطور دیت لازم فرمائے۔ یہ سن کر حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اگر ہم یہ حدیث نہ سنتے اور اپنی رائے سے فیصلہ کرتے تو شاید اس کے خلاف فیصلہ دیتے۔ (الرسالۃ ص ۲۷)

(۶) حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے سامنے ایک بار عدت سے متعلق ایک معاملہ فیصلہ طلب تھا آپؐ نے حضرت فریحہ بنت مالک بن سنان کے پاس اپنا آدمی بھیجا اور ان سے دریافت کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اس سلسلے میں کیا حکم دیا تھا۔ انہوں نے بنایا کہ آپؐ نے اسی گھر میں عدت گزارنے کا حکم دیا تھا جس میں وہ اس وقت رہا تشر پذیر تھیں تو حضرت عثمانؓ نے اسی کے مطابق فیصلہ فرما دیا۔ (جامع بیان العلم جلد ۲)

(۷) حضرت علیؓ اور حضرت امیر معاویہ کے درمیان طویل جنگ کے دوران دونوں طرف سے اپنی مخالفت کے لیے حدیثیں ہی پڑھی گئیں۔ تمام تر اختلافات کے باوجود کسی طرف سے بھی یہ آواز کبھی نہیں اٹھی کہ احادیث تو قابل استناد ہی نہیں ان سے دلیل کیوں پکڑتے ہو۔

(۸) حضرت عبداللہ بن عمرؓ مزارعت میں معاویہ کے تامل تھے اور چنانچہ خود معاویہ کیا کرتے تھے لیکن جب حضرت ابن عباسؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی ممانعت روایت کی تو آپؐ نے معاویہ کو ناچھوڑ دیا اور اپنے

قول سے رجوع کر لیا۔ (جامع بیان العلم جلد ۲)

(۹) حضرت عبداللہ ابن عباس نے ایک مرتبہ فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمتع کیا ہے یہ سن کر حضرت عروہؓ کے منہ سے نکل گیا کہ شیخین تو تمتع کی ممانعت کرتے تھے اس پر حضرت عبداللہ بن عباس کو غصہ آگیا اور فرمایا میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث بیان کر رہا ہوں اور تم ابو بکر و عمر کا نام لیتے ہو میرا گمان یہاں بالوں سے نیا ہی آئے گی (ترجمان السنۃ از مولانا بدر عالم)

(۱۰) حضرت زید حائضہ کے لیے بھی طواف صدر کرتا واجب سمجھتے تھے لیکن جب حضرت عبداللہ بن عباس نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حائضہ کو طواف صدر ترک کرنے کی اجازت دی ہے تو حضرت زید نے فوراً اپنے قول سے رجوع کر لیا۔ (ترجمان السنۃ)

یہ چند واقعات نمونے کے طور پر پیش کر دیے گئے ہیں ورنہ اگر آثار صحابہ ہیں سے اس قسم کے واقعات تلاش کیے جائیں تو مستقل ایک تصنیف بن سکتی ہے بہر حال یہ چند واقعات بھی اس بات کے ثبوت کے لیے کافی ہیں کہ صحابہ کرام کے درمیان حدیث کی تشریحی حیثیت کو ایک عقیدے کا درجہ حاصل تھا۔ اس کے بعد جو شخص حدیث کی تشریحی حیثیت کا انکار کرتا ہے وہ ایسی بات کہہ رہا ہے جس کو ان حضرات کی سند حاصل نہیں ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اولین مخاطب تھے اور آپ سے انتہائی قریب ہونے کی بنا پر آپ کی لائی ہوئی ہدایت کے اصل مرتبہ و مقام کو درست طور پر سمجھنے کے سب سے زیادہ اہل تھے۔

اس موقع پر مناسب  
**عہد رسالت کے فیصلوں میں رد و بدل کا الزام** معلوم ہوتا ہے کہ ان

واقعات و اعتراضات کا بھی جائزہ لے لیا جائے جن کو برطانیہ کے شہر مدینہ کے ساتھ پیش کر کے منکرین حدیث یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ صحابہ کرام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کیے ہوئے فیصلوں کو تغیر حالات کے مطابق قابلِ ترمیم سمجھتے تھے

اور یہ بات ان کے نزدیک اس بات کا ثبوت ہے کہ صحابہ کرام کے درمیان حدیث کو تشریحی حیثیت حاصل نہ تھی۔

اس سلسلے میں اپنی مقصد برآدی کے لیے منکرین حدیث نے حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے دور کو اصل تحفہ مشق بنایا ہے۔ حجیت حدیث کے بارے میں حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے اصل طرز عمل پر ہم نے اس کتاب کے پہلے حصے میں اس مقام پر بڑی تفصیلی بحث کی ہے جہاں منکرین حدیث کے اس بے بنیاد الزام کا رد کیا گیا ہے کہ معاذ اللہ یہ دونوں حضرات انکار حدیث کے قائل تھے۔ تاہم اس بحث پر دوبارہ نظر ڈال لیں یہاں ہم صرف ان واقعات کا ذکر کرنے لگے ہیں جو سے بے سرو پا غلط نتائج اخذ کر کے یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ صحابہ کرام نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہوئے فیصلوں میں ترمیم و تبدل کو جائز سمجھتے تھے۔

**جلسہ اسامہ کی روانگی** | اس ضمن میں جو واقعات منکرین حدیث کی طرف سے پیش کیے جاتے ہیں ان میں سے ایک واقعہ

وہ ہے جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے فوراً بعد جلسہ اسامہ کو شام کی طرف بھیجے جانے کے موقع پر بعض صحابہ کرام کے اس اصرار کا ذکر ہے کہ ان خطرات کے پیش نظر جن کا طوفان اس وقت عرب میں اٹھنا ہوا نظر آ رہا تھا اس لشکر کشی کو ملتوی کر دیا جائے اور اس اصرار کے جواب میں حضرت ابوبکر نے کہا تھا کہ جس کام کا فیصلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی زندگی میں کر چکے تھے اسے بدل دینے کا میں کسی طرح مجازہ نہیں۔ اس واقعہ کو پیش کر کے منکرین حدیث کہتے ہیں کہ اس لشکر کشی کے اتوار پر صحابہ کا اصرار یہ ثابت کرتا ہے کہ حضرت ابوبکر کے سوا باقی تمام صحابہ اس بات کو جائز سمجھتے تھے کہ حالات کے تغیر کے ساتھ ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہوئے فیصلے کو بدلایا جاسکتا ہے۔ اسی طرح اس واقعے میں جب یہ ذکر آتا ہے کہ آخر میں حضرت عمرؓ نے یہ خواہش ظاہر کی کہ کم از کم اسامہؓ کو ہی اس لشکر کی قیادت سے ہٹا دیں کیونکہ بڑے بڑے

صحابہ اس نوجوان لڑکے کی ماتحتی میں رہنے سے خوش نہیں ہیں تو منکرین حدیث اس کا حوالہ دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عمر تک اس بات کے تائل تھے کہ حالات کے بدلنے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے بدلے جاسکتے ہیں بلکہ اس موقع پر تو تغیر حالات کا بھی سوال نہیں تھا حضرت عمر اس سالار لشکر کو جس کو اللہ کے رسول نے اپنی زندگی میں مقرر کیا تھا صرف اس لیے بدلنا چاہتے تھے کہ صحابہ اس نئے خوش نہیں تھے۔

اسی واقعہ سے منکرین حدیث جو غلط نتیجہ اخذ کرتے ہیں اس کا بے بنیاد ہونا تو ابھی ثابت ہوا جاتا ہے مگر اس بحث و تحقیق کے دوران اللہ نے ایک حق بات انہی کے منہ سے نکلوا دی کم از کم حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے بارے میں تو انہوں نے تسلیم کر لیا کہ وہ حجیت حدیث کے تائل تھے اور کسی صورت میں بھی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کیے ہوئے فیصلے کو بدل دینے کا کسی کو عجز نہ سمجھتے تھے رہا دوسرے صحابہ کرام کا سوال تو ان کے متذکرہ بالا اصرار سے وہ نتیجہ کسی طرح نہیں نکلتا جو منکرین حدیث نکلانے کی کوشش کرتے ہیں کیونکہ صورت حال یہ نہ تھی کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کیے ہوئے فیصلے کو بدلنے سے انکار کر رہے ہوں اور صحابہ اس پر مصر ہوں کہ اندرون شریعت و آپ اس فیصلے پر عمل کرنے کے پابند نہیں ہیں اس لیے بدلتے ہوئے حالات کے پیش نظر آپ اس فیصلے کو بدل دیجئے بلکہ اس نے برعکس رہا تو معاملہ یہ تھا کہ لشکر کشی کے التوا پر یہ اصرار اور تبدیلی قیادت کی خواہش کا یہ اظہار صرف اسی وقت تک تھا جب تک حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ کے فیصلے کا حوالہ نہیں دیا تھا جو نبی حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے کا حوالہ دیا سب صراحتاً اطاعت میں جھکے نظر آنے لگے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سمیت کسی نے بھی اس کے بعد ایک لفظ منہ سے نہیں نکالا جیسا اسامہ رضی اللہ عنہ رواہ ہوا، اسامہ ہی اس کے تائل رہے اور بڑے بڑے جلیل القدر صحابہ نے ان کی قیادت کو راضی خوشی قبول کر لیا ۛ

**طلاق ثلاثہ کے مسئلے میں**  
**حضرت عمرؓ کا فیصلہ**

دوسرا واقعہ جس سے منکرین حدیث استدلال کرتے ہیں یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ایک مجلس میں دی ہوئی تین طلاقیں کو ایک

شمار کر کے طلاق رجعی قرار دیا جاتا تھا حضرت عمرؓ نے اپنے زمانے میں اسے تین ہی شمار کر کے طلاق مغلطہ مثلثہ قرار دے دیا۔ منکرین حدیث کا کہنا ہے کہ حضرت عمرؓ کا یہ فیصلہ اس بات کی دلیل ہے کہ آپ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلوں کا حالات کے مطابق بدل دینا درست جانتے تھے۔

منکرین حدیث کا یہ استدلال بھی کسی طرح درست نہیں اس لیے کہ اس معاملے میں اصل صورت حال یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بھی تین طلاق تین ہی سمجھی جاتی تھیں چنانچہ احادیث شایہ ہیں متعدد مقامات میں آپؐ نے ایک مجلس میں دی گئی تین طلاقیں کو تین ہی شمار کر کے فیصلہ دیا ہے لیکن ہوتا یہ تھا کہ جو شخص تین مرتبہ طلاق کا الگ الگ تلفظ کرتا تھا وہ اگر یہ عذر پیش کرتا کہ اس کی نیت ایک ہی طلاق کی تھی اور باقی دو مرتبہ اس نے طلاق کا لفظ محض تاکید کے طور پر کہا تھا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس کا یہ عذر قبول فرما لیتے تھے۔ حضرت عمرؓ نے اپنے زمانے میں اس سلسلے میں جو کچھ کیا وہ صرف اتنا ہے کہ جب لوگ کثرت سے تین طلاقیں دے کر ایک طلاق کی نیت کا عذر پیش کرنے لگے تو انہوں نے طلاق کے معاملے کو کھیل بنائے جانے سے بچانے کی خاطر یہ اعلان کر دیا کہ اب یہ عذر قبول نہیں کیا جائے گا اور تین طلاقیں دینے کی صورت میں تین ہی طلاقیں نافذ العمل سمجھی جائیں گی اس کو تمام صحابہ نے بالائیکفاق قبول کر لیا ظاہر ہے حضرت عمرؓ کا یہ فیصلہ عہد رسالت کے کسی قانون میں ترمیم کی حیثیت کا حامل نہ تھا اس لیے کہ نیت کے عذر کو قبول کرنا قانون نہیں ہے اس کا انحصار تو قاضی کی اس رائے پر ہے کہ وہ نیت بیان کرنے والے کو صادق القول سمجھتا ہے یا نہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اس طرح کا عذر پیش کرنے والے جانے پہچانے چند گنے چنے لوگ تھے جن کی راستبازی اول تو

لوں بھی آپ کے نزدیک بے گمرد و غبار ہوگی دوسرا ذرہ روئے وحی بھی ان لوگوں کی راست ہارے سے آپ کے واقف ہو جانے میں کسی شک و شبہ کی کوئی گنجائش نظر نہیں آتی اس لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا عذر قبول کر لیا۔ لیکن حضرت عمر کے نہ ملنے میں ایران سے مصر تک اور یمن سے شام تک پھیلی ہوئی سلطنت کے ہر شخص کا یہ عذر عدالتوں میں لازماً قابل تسلیم نہ ہو سکتا تھا بالخصوص جبکہ لوگوں نے بکثرت تین طلاق دے کر ایک طلاق کی نیت کا عذر پیش کرنا اپنا ویرہ بنالیا ہو اس لیے اس مسئلے میں حضرت عمر کے فیصلے کی نوعیت یہ نہ تھی کہ آپ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کیے ہوئے کسی فیصلے یا آپ کے بنائے ہوئے کسی قانون میں کوئی تغیر و تبدل کر دیا تھا بلکہ اصل نوعیت یہ تھی کہ آپ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت شدہ ایک قانون کی اصل روح کو برقرار رکھنے کا انتظام فرمایا تھا :

اسی ضمن میں ایک اور مثال دیتے ہوئے منکرین حدیث مفتوحہ اراضی کی تقسیم | یہ بھی کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں مفتوحہ زمینیں مجاہدین میں تقسیم کر دی گئی تھیں لیکن حضرت عمر نے اپنے عہد میں مفتوحہ زمینوں کی یہ تقسیم بند کر دی اور اس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے طرز عمل سے ہٹ کر اپنی صوابدید کے مطابق ایک نیا طرز عمل اختیار کر کے یہ جملہ دیا کہ تغیر حالات کے تحت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلوں سے ہٹ کر بھی ایک نیا فیصلہ رد بہ عمل لایا جاسکتا ہے۔

یہاں بھی منکرین حدیث نے بے بنیاد مغالطہ دینے کی کوشش ہے حضرت عمر نے اپنے عہد میں صحابہ کے مشورے سے مفتوحہ اراضی کا جو بندوبست کیا اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلوں میں رد و بدل کی مثال نہیں قرار دیا جاسکتا اس لیے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فیصلہ کبھی نہیں فرمایا تھا کہ مفتوحہ اراضی ہمیشہ مجاہدین میں تقسیم کی جاتی رہیں اگر ایسا کوئی حکم آپ نے دیا ہوتا اور حضرت عمر نے اپنے عہد میں اس کے خلاف عمل کیا ہوتا تو کہا جاسکتا تھا کہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے میں



رد و بدل کر دیا یا پھر یہ بات اس وقت صادق آسکتی تھی جبکہ حضرت عمرؓ نے ان زمینوں کو جمنیں بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانے میں مجاہدین میں تقسیم کیا تھا ان سے واپس لے لیا ہوتا ان دونوں باتوں میں سے کوئی ایک بھی پیش نہیں آئی تو پھر کیسے کہا جاسکتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے سے ہٹ کر ایک نیا فیصلہ صادر کر دیا۔ اس معاملے میں اصل صورت حال یہ ہے کہ مفتوحہ زمینوں کو لازماً مجاہدین میں تقسیم کر دینا سرے سے کوئی اسلامی قانون تھا ہی نہیں بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مفتوحہ اراضی کے معاملے میں حسب موقع و ضرورت مختلف مواقع پر مختلف فیصلے فرمائے تھے۔ بنو نضیر، بنو قریظہ، خیبر، فدک، وادی القری، مکہ اور طائف کی مفتوحہ زمینوں میں سے ہر ایک کا بند و بست عہد رسالت میں الگ الگ طریقوں سے کیا گیا تھا۔ ایسا کوئی ضابطہ یا قانون نہیں بنایا گیا تھا کہ آئندہ مفتوحہ اراضی کا بند و بست لازماً فلاں فلاں طریقے پر کیا جائے ایسی صورت میں حضرت عمرؓ کا اپنے زمانے میں مفتوحہ اراضی کا کوئی بھی بند و بست عہد رسالت کے کسی ضابطے یا قانون کی خلاف ورزی قرار نہیں دیا جاسکتا ۛ

### مؤلفۃ القلوب اور حضرت عمرؓ کا استدلال | منکرین حدیث اپنے دعوے کے ثبوت میں بلا سوچے سمجھے مؤلفۃ

القلوب کے مسئلے کو بھی زیر بحث لاتے ہیں کہتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں مؤلفۃ القلوب کو صدقات کی مد سے امداد دی جاتی تھی حضرت عمرؓ نے اپنے عہد میں اسے ختم کر دیا معلوم ہوا حضرت عمرؓ بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلوں میں رد و بدل کو جائز سمجھتے تھے۔

یہاں اعتراض کرنے کے جوش میں منکرین حدیث یہ بھی بھول گئے کہ صدقات کی مد میں مؤلفۃ القلوب کا حصہ بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا نہیں بلکہ خود اللہ تعالیٰ کا مقرر کیا ہوا تھا۔ ذرا سورہ توبہ کی وہ آیت دوبارہ نکال کر دیکھ لیجئے جس میں صدقات کی آٹھ مذاات کا بیان ہوا ہے غور سے دیکھئے اس میں مؤلفۃ القلوب کی مد شامل

ہے یا نہیں کیا اب منکرین حدیث یہ کہیں گے کہ حضرت عمرؓ معاذ اللہ قرآن کے فیصلوں کو بھی حسب ضرورت تبدیل کر دینے کے قائل تھے اگر منکرین حدیث نے فقوراً غور و فکر سے کام لے لیا ہوتا تو مولفۃ القلوب کے مفہوم ہی پر غور کر لیا ہوتا۔ صدقات کی مد میں مولفۃ القلوب کا حصہ شامل ہونے کا مطلب یہ ہے کہ صدقات میں سے ان لوگوں کو بھی مال دیا جاسکتا ہے جن کی تالیف قلب مطلوب ہو حضرت عمرؓ کا استدلال یہ تھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اسلامی حکومت کو تالیف قلب کے لیے مال دینے کی ضرورت تھی اس لیے آپؐ اس مد سے لوگوں کو دیا کرتے تھے لیکن اب اسلامی حکومت اتنی طاقتور ہو گئی ہے کہ اس غرض کے لیے اب کسی کو مال دینے کی حاجت نہیں رہی اس لیے اب ہم اس مد میں کوئی پیسہ خرچ نہیں کریں گے۔ اب غور کر کے بتائیے کیا اس سے ہی نتیجہ نکلتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا ہوا کوئی فیصلہ بدل ڈالا کیا واقعی آپؐ کا فیصلہ یہی تھا کہ تالیف قلب کی حاجت ہو یا نہ ہو ہر حال کچھ لوگوں کو ضرور مولفۃ القلوب قرار دیا جائے اور صدقات میں سے ہمیشہ ہمیشہ ان کا حصہ نکالا جاتا رہے۔ کیا خود قرآن نے بھی یہ لازم قرار دیا ہے کہ تالیف قلب کی مد پر ہر حال میں صدقات میں سے کچھ کچھ ضرور خرچ کیا جائے۔

دراصل بات کچھ بھی نہیں منکرین حدیث کو اس سے کوئی غرض نہیں کہ جو کچھ وہ کہہ رہے ہیں اس کے پیچھے دلیل و برہان کی قوت موجود ہے یا نہیں وہ بلا سوچے سمجھے ایک دعویٰ کر بیٹھتے ہیں اور پھر اس کو نبھانے کے لیے کبھی قرآن و حدیث میں دو روز کا ر تاویلات سے کام لیتے نظر آتے ہیں اور کبھی حالات و واقعات کو توڑتے مروڑتے دکھائی دیتے ہیں۔ یہاں بھی وہ یہ دعویٰ تو کر بیٹھے کہ صحابہ کرام تغیر حالات کے مطابق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلوں میں رد و بدل کرنا جائز سمجھتے تھے مگر اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود اس کو ثابت نہ کر سکے۔ جتنی مثالیں وہ اس سلسلے میں دیتے ہیں وہ سب کی سب ان کے حق میں جانے کے بجائے الٹا انہی کے خلاف ثبوت فراہم کرتی نظر آتی

ہیں اور یہ حقیقت اور زیادہ کھل کر سامنے آتی ہے کہ صحابہ کرام بالاتفاق حدیث رسول کی تشریحی حیثیت کے قائل تھے۔

حدیث کی تشریحی حیثیت کے ثبوت میں اب تک جو کچھ کہا گیا ہے اس کو سامنے رکھ کر آدمی سوچے صحابہ کرام کی جماعت جو وحی الہی کی اولین مخاطب ہے وہ حدیث کی تشریحی حیثیت کی قائل ہے خود صاحب وحی یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات حدیث کی اتباع کو اپنے اقیقوں پر واجب قرار دیتی ہے اور اس پر مزید خود وحی الہی حدیث رسول کی اطاعت کو قرآن کی اطاعت کے مترادف ٹھہراتی ہے پھر اس کے بعد جو شخص حدیث کی تشریحی حیثیت کا انکار کرتا ہے وہ بلاشبہ صحابہ کی جماعت سے علیحدہ، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حلقہ اطاعت سے باہر اور قرآن کی پیروی سے منحرف ہے یا نہیں؟

# خبر واحد کی حجیت

حدیث کی تشریحی حیثیت کو مشکوک بنانے اور اس سے کمزور کرنے کی خاطر منکرین حدیث خبر متواتر اور خبر واحد کی بحث بھی چھیڑا کرتے ہیں اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ خبر واحد کی حجیت پر بھی تفصیل سے کلام کیا جائے۔

جو باتیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہم تک پہنچی ہیں ان کو دو حصوں پر تقسیم کیا جاسکتا ہے ایک وہ حصہ جو تواتر کے ساتھ آیا ہے اور اس سے حاصل شدہ علم قطعی اور یقینی ہوتا ہے اور دوسرے حصہ جو تواتر کے ساتھ نہیں آیا اور اس سے حاصل شدہ علم ظن غالب کے درجے میں ہے اصول حدیث کی اصطلاح میں ہم اسی بات کو یوں کہہ سکتے ہیں کہ حدیث کی دو قسمیں ہیں : ایک خبر متواتر اور دوسری خبر واحد۔ خبر متواتر اس خبر کو کہتے ہیں کہ جس کے بیان کرنے والے اس قدر مختلف اور بے شمار ہوں کہ عقل سلیم اتنے مختلف طبقوں کے آدمیوں کا مل کر ایک جھوٹ گھڑ لینے کو محال سمجھے اور خبر واحد وہ خبر ہے جس کے بیان کرنے والے اس قدر کثیر اور بے شمار نہ ہوں جس قدر متواتر میں ہوتے ہیں خواہ وہ ایک یا دو ہوں یا تین اور چار ہوں۔ اس طرح پر ہر وہ خبر جو متواتر نہ ہو اصطلاحی طور پر خبر واحد ہی کہلاتی ہے۔

تمام امت کا اس پر تو اتفاق ہے کہ خبر متواتر سے علم قطعی اور یقینی حاصل ہوتا ہے اور خبر واحد سے علم ظنی حاصل ہوتا ہے، خبر واحد کو مفید علم یقین کوئی بھی نہیں کہتا مگر اختلاف جو کچھ واقع ہوتا ہے وہ اس امر میں ہے کہ ظنیت کی بنا پر خبر واحد کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے؟ جمہور کے نزدیک خبر واحد اگر سچے اور ثقہ راوی سے مروی ہو تو معتبر قابل قبول اور واجب العمل ہے جبکہ منکرین حدیث کا کہنا یہ ہے کہ خبر واحد سے چونکہ علم ظنی حاصل ہوتا ہے اور ظنیت میں خطا و نسیان کا احتمال ہر وقت باقی رہتا ہے

خواہ وہ سچے اور ثقہ راوی ہی سے مروی کیوں نہ ہو اس لیے اس سے استدلال درست نہیں پھر اسی بنیاد پر منکرین حدیث یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ احادیث کا تمام مجموعہ ظنی ہے اس لیے بالنظر رد کر دینے کے لائق ہے کیونکہ جو چیز ظنی ہوتی ہے وہ ثابت شدہ نہیں ہوتی اور جو ثابت شدہ نہ ہو وہ لائق اتباع نہیں ۛ

**اصولی غلطی** | اس میں تو کوئی شک نہیں کہ جو چیز ظنی ہوتی ہے وہ ثابت شدہ نہیں ہوتی مگر منکرین حدیث کا یہ کہنا اصولی طور پر غلط ہے کہ جو چیز ثابت شدہ نہ ہو وہ قابل اتباع نہیں۔ انسان اکثر و بیشتر معاملات میں صرف اُس تحقیق پر اعتماد کرنے کے لیے مجبور ہے جس سے ظن غالب حاصل ہوتا ہے اگر وہ اس تحقیق میں شک کرے اور علم یقین کے بغیر سربا ت ماننے سے انکار کر دے تو وہ دنیا کے کام کا نہ رہے۔ ہماری زندگی کے بیشتر معاملات ایسے ہیں جن میں ہم اخبار آحاد یعنی ایک دو راویوں کی دی ہوئی خبروں کو تسلیم کرتے ہیں اور انہی پر اپنے فیصلوں اور اپنے علم و عمل کا مدار رکھتے ہیں۔ جہاں تک اخبار آحاد میں خطا و نیاں کے احتمال کا تعلق ہے تو بات دراصل یہ ہے کہ محض خبر ہونے کی حیثیت سے تو ہر خبر میں سچ اور جھوٹ ہونے کا امکان احتمال ہوتا ہے مگر ان دونوں پہلوؤں میں سے ایک کو ترجیح دینے کے لیے ہم محض خبر کے ہو۔ نے ہی پر نظر نہیں رکھتے بلکہ خارجی قرائن سے مدد لیکر صدق یا کذب کے کسی ایک پہلو کو ترجیح دیتے ہیں چنانچہ خبر متواتر میں راویوں کی تعداد کی زیادتی وہ خارجی قریبہ ہے جس کی بنا پر ہم اسے قطعی اور یقینی سمجھتے ہیں۔ اسی طرح ہم اخبار آحاد کی امکانی جا پخ پڑتا ل کرنے صدق و کذب کے دونوں پہلوؤں میں سے ایک کو ترجیح دیتے ہیں اور اگرچہ اسی ترجیح سے ہمیں صرف ظن غالب حاصل ہوتا ہے لیکن اکثر و بیشتر اس ظن پر ہم ای طرح عمل کرتے ہیں جس طرح علم یقین حاصل ہونے کی صورت میں کرتے ۛ

**یقینیات کی شرط اور دنیوی معاملات** | اتباع کے لیے یقینیات کو اگر لازمی شرط قرار دے دیا جائے

تو دنیا میں جینا محال ہو جاتے ہماری زندگی کے کتنے معاملات ایسے ہیں جن میں ہم صرف یقینیات کی پیروی کرتے ہیں اور منطونات کو بالکل رد کر دیتے ہیں؟ منطونات کو بالکل رد کر دینے کا قاعدہ زندگی میں نہ کبھی چلا ہے نہ چل سکتا ہے عقل سلیم کا تقاضا یہی ہے اور اسی کی پیروی ہم زندگی کے تمام معاملات میں کرتے ہیں کہ تمام منطونات کو بیک تلم رد کر دینے کے بجائے ان کے درمیان تمیز کرتے ہیں ان میں سے ہر ایک کو علیحدہ علیحدہ جانچ کر دیکھتے ہیں اور تحقیق کے مختلف ذرائع سے کام لیکر یہ دریافت کرتے ہیں کہ کونسی چیز یقین سے کس درجہ قریب یا کس درجہ بعید ہے جو چیز بعید ہو اسے رد کر دیتے ہیں جو چیز قرب و بعد کے درمیان ہو اس میں توقف کرتے ہیں تا آنکہ کسی ایک وجہ کو ترجیح ہو جائے اور جو چیز قریب یا اقرب ہوتی ہے اس کو بہ لحاظ اس کے درجہ قرب کے قبول کر لیتے ہیں۔ یہی اصول ہے جس پر دنیا کے سارے معاملات چل رہے ہیں۔

اگر ایک ثقہ اور سچے آدمی کی خبر کو محض اس وجہ سے رد کر دیا جائے کہ وہ درجہ تراثر کو نہیں پہنچی تو کارخانہ عالم درہم برہم ہو جائے۔ دنیا کے تقریباً تمام کاروبار اخبار آحاد پر چل رہے ہیں تجارت کا سارا نظام انہی کی بنیاد پر قائم ہے بہت سی خبریں ہم کو تار اور اخبارات کے ذریعے سے ملتی ہیں جن میں عقلاً صدق و کذب دونوں پہلوؤں کا احتمال ہے ہم نہیں کہہ سکتے کہ جس شخص نے ہمیں تار دیا ہے وہ فی الواقع آیا وہی شخص ہے جس کا نام تار پر لکھا ہوا ہے؟ اس کے علاوہ جو خبر وہ دے رہا ہے ہمیں نہیں معلوم وہ اسے کس ذریعے سے معلوم ہوئی؟ نیز اس کا ذریعہ معتبر ہے یا نہیں؟ اسی قسم کے بہت سے احتمالات کی گنجائش ہر تار کی خبر میں موجود ہوتی ہے لیکن جن لوگوں کا سارا کاروبار ہی ان خبروں کی بنیاد پر چل رہا ہے وہ ان احتمالات کے چکروں میں نہیں پڑتے محض ظاہری فرائض سے بچا چلے جاتے ہیں کہ تار انہی کے کارندے کا دیا ہوا ہے یا نہیں اور جب ایک ظن غالب اس خبر کے سچ ہونے پر انہیں ہو جاتا ہے تو اس پر اپنے لاکھوں روپے لگا دیتے ہیں۔ ذرا غور کیجئے اگر آج اس اصول کو مان لیا جائے کہ محض ظن غالب پر عمل درست نہیں تو کیا

کوئی بے چارہ تا جر تجارت کر سکتا ہے۔

اسی طرح سرکاری وغیرہ سرکاری دفاتر کے تمام معاملات، رسل و رسائیں، نامہ و پیام، تار اور ٹیلی فون کا تمام تر مدار و مدارِ خبر و حد پہنچا ہوا ہے۔ دفاتر کے تمام پیغامات کا راوی ایک بے چارہ بے علم چپڑا ہی تو ہوتا ہے ذرا تصور کیجئے دفتر کا کوئی افسر کسی کارکن کو بلانے کے لیے چپڑا ہی بھیجے اور وہ کارکن اپنے افسر کا حکم پا کر یہ کہنے لگے کہ چونکہ یہ خبر چپڑا ہی ایک فرد واحد لایا ہے اس میں جھوٹ کا احتمال موجود ہے اس لیے میں اس خبر پر اعتماد نہیں کرتا اور یہ کہہ کر چپڑا ہی کو واپس کر دے تو کیا ایسے کارکن کو دفتر میں رکھے جلنے کے قابل سمجھا جائے گا اور اگر دفتر کے سارے کارکن اسی اصول پر عمل کرنے لگیں تو کیا دفتر کا نظام ایک دن بھی چل سکتا ہے؟

ہماری زندگی کے معاملات میں سب سے زیادہ اہم اور نازک معاملہ عدالت کا ہے۔ عدالتوں میں خالص اور مٹھوس عقلی امتحان پر احکام کی بنا رکھی جاتی ہے متقاضی یا جج کے سامنے جتنے مقدّمات پیش ہوتے ہیں ان کے ثبوت کے لیے بہت کم کیا شاذ و نادر ہی شہادتیں تو اتر کی حد کو پہنچتی ہیں اکثر و بیشتر معاملات میں جج کے سامنے صرف اخبار آحاد ہی پیش ہوتی ہیں جنہیں وہ جرح و تعدیل، قرائن و آثار اور ثبوت عقلی کی کسوٹی پر پرکھ کر سچ اور جھوٹ کے امکاں پہلوئوں میں سے کسی ایک پہلو کو راجح قرار دیتا ہے اور جو پہلو راجح ہوتا ہے اسی پر اپنے فیصلے کی بنیاد رکھتا ہے اور اس طرح فیصلہ کرتا ہے جیسے اس کے نزدیک وہ مقدمہ یقین کی حد تک ثابت ہو گیا ہے۔ فرض کیجئے کوئی جج ہر شاہد کو جھوٹا اور ہر شہادت کو غلط ٹھہرا کر اپنا کام مشرور کرے اور ہر واقعہ کو تسلیم کرنے کے لیے اس بات پر اصرار کرے کہ یا تو واقعہ خود اس کی آنکھوں کے سامنے پیش آئے یا پھر تو اتر کی حد کو پہنچتی ہوئی شہادتیں اس کے سامنے پیش ہوں تو کیا ایسا جج کسی ایک مقدمے کا فیصلہ بھی کر سکے گا یا انجساد آحاد پر اسے اعتماد کرنا پڑے گا یا عدالت کی کرسی چھوڑنی پڑے گی۔

اور تو اور ہم میں سے ہر شخص کو یہ بات کہ وہ اپنے باپ کی جائزہ اولاد ہے صرف اپنی ماں کی روایت سے معلوم ہوتی ہے اس خبر و حد میں جس کے لیے کوئی دوسرا شاہد ہر

سے مل ہی نہیں سکتا خبریت کے لحاظ سے صدق و کذب دونوں پہلوؤں کا یکساں احتمال ہے لیکن کوئی شریعت آدمی اس میں کذب کے پہلو کو ترجیح دینا تو درکنہ کسی ادنیٰ درجے میں بھی یہ تسلیم کرنے کو تیار نہ ہو گا کہ اسے اپنے باپ کی جائز اولاد ہونے میں شک ہے۔ اس خبر و احادیث کی بنیاد پر اگر رد کر دیا جائے تو بتائیں ان قرابتوں اور رشتے داروں کا کیا بن جن کی بنیاد پر نکاح اور شادی بیاہ چل رہے ہیں اور وراثتیں تقسیم ہو رہی ہیں؟

**یقینیات کی شرط اور مذہبی معاملات** | دینی معاملات ہی میں نہیں مذہبی معاملات میں بھی یہی صورت ہے

یقینیات کی شرط لگا کر اور ظنیت کی بنا پر خبر و احادیث کو بالکل رد کر کے آپ ایک قدم آگے نہیں چل سکتے فرض کیجئے آپ نماز پڑھنے کے لیے مسجد میں جلتے ہیں وضو کے پانی کے بارے میں آپ پوچھتے ہیں کیا پاک ہے؟ غلام مسجد خبر دیتا ہے کہ ہاں پاک ہے آپ اس کی اطلاع کو خبر و احادیث دے کر مسترد کر دیتے ہیں آگے بڑھتے ہیں صفوں کے بارے میں استفسار کرتے ہیں کہ کیا پاک ہیں پھر وہی خبر و احادیث آپ کو ملتی ہے کہ جی ہاں پاک ہیں، امام نماز پڑھنے کے لیے کھڑا ہوتا ہے خبر دیتا ہے کہ میں باد وضو ہوں، میرے کپڑے پاک ہیں آپ اس کو خبر و احادیث بنا پر رد کر دیتے ہیں ذرا بتلائیے اس طرح ہر خبر کو خبر و احادیث کی بنا پر اگر آپ رد کرتے رہے تو کیا ایک وقت کی نماز بھی آپ پڑھ سکتے ہیں؟

مذہبی معاملات میں سب بڑی چیز جس پر ہمارے ایمان کا دار و مدار ہے قرآن حکیم ہے اس کتاب کا کلام الہی ہونا ہمیں خبر و احادیث کے ذریعے سے معلوم ہوا ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی و احادیث ہے جس نے ہمیں یہ فیروہی کہ قرآن حکیم کلام الہی ہے، نفس خبر ہونے کے لحاظ سے تو اس خبر میں بھی صدق و کذب دونوں پہلوؤں کا احتمال ہے۔ خبر و احادیث اگر بالکل رد کر دینے کے قابل ہے تو کیا قرآن حکیم کا کلام الہی ہونا بھی معاذ اللہ مشکوک و ناقابل قبول ٹھہریگا؟ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ علم کہ قرآن کلام الہی ہے خبر و احادیث کے ذریعے ہوا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر جو وحی آتی تھی وہ تن تنہا حضرت جبریل علیہ السلام ہی لے کر آتے تھے۔ قرآن خود کہتا ہے اِنَّا نَقُولُ رَسُوْلًا كَرِيْمًا (یہ قرآن) تو لے



ایک رسول کریم (جبریل) کا۔ الحاقہ - ۴۰) تو کیا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت جبریل کی لائی ہوئی دجی کو قبول کرنے سے معاذ اللہ انکار کر دینا چاہیئے تھا؟  
 کون نہیں جانتا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے بھی ہر امت کی طرف ایک ہی باری و نذیر آیا، ایک ہی پیغمبر نے لوگوں کو خدائے بزرگ و برتر کا پیغام پہنچایا۔ حضرت نوح، حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ، حضرت ہود، حضرت صالح اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام تنہا تنہا ہی اپنی اپنی امتوں کی طرف مبعوث ہوئے اور ہر ایک نے اکیلے اکیلے ہی خدائی دین کی نقل و روایت امت کے سامنے پیش کی یہ خبر واحد نہیں تو اور کیا تھی؟ کیا خدا سے معاذ اللہ بھول ہو گئی کہ اس نے دین کی روایت خبر واحد کے ذریعے کرادی جس سے صرف علم ظنی حاصل ہوتا ہے؟  
 اور ظن موجب عمل نہیں۔ اب جن لوگوں نے پیغمبر کا انکار کیا تو کیا معاذ اللہ بالکل درست کیا کہ خبر واحد ہوتی ہی رد کر دینے کیلئے ہے؟ خدا را کچھ تو عقل سے کام لیجئے۔ خبر واحد کو بالکل رد کر کے سوچئے تو سہی کہ بات کہاں سے کہاں جا پہنچتی ہے۔

اخبار آحاد کو بالکل رد کر دینے سے دین کے معاملے میں عملاً جو خرابی واقع ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ جزئیات میں انسان رسالت کی رہنمائی سے محروم ہو جاتا ہے اور دین پر عمل کرنے کی تفصیلی صورتوں میں قیاس رائے کا دخل اس قدر بڑھ جاتا ہے کہ اس سے خود اصولی احکام کی اصل روح کے بھی ضائع ہو جانے کا خوف ہے۔ علاوہ ازیں جب تفصیلات میں سرے سے کوئی سند ہی نہ ہوگی تو ہر شخص اپنی رائے اور اپنے رجحان کے مطابق جو صورت چاہے گا اختیار کرے گا نتیجتاً تفرقہ، انتشار اور اختلاف گوراہ ملے گی ہر شخص جزئیات کو اپنی رائے سے مقرر کرے گا اور کسی رائے کو بھی کوئی ایسی قوت حاصل نہ ہوگی جس کی بنا پر اسے دوسری رائے کے مقابلے میں ترجیح دی جاسکے اور مسلمانوں کی کسی برسی جماعت پر اس کی پیروی لازم ہو جائے۔ ہر کوئی بخوبی اندازہ کر سکتا ہے کہ اس سے جزئیات میں کس قدر فساد و فتنہ برپا ہوگی، نظام جماعت کو کتنا نقصان پہنچے گا اور کس طرح بعض صورتوں میں مقاصد شریعت تک فوت ہو جائیں گے۔ اسلام کے نظام شریعت میں غور کریں وہ چیز جو اس نظام کو ایک مستقل عملی ڈھانچہ مہیا کرتی ہے اور وہ چیز جو مسلمانوں کی تہذیب



ہونے کا زبردست ثبوت ہیں۔

ان آیات کے بارے میں ممکن ہے کوئی یہ کہے کہ رسول اور نبی کی شخصیت ایک غیر معرکی شخصیت ہے ان کی دی ہوئی خبر کا ماننا درحقیقت رسالت اور نبوت کے قدرتی دباؤ کا اثر ہے نہ کہ اصول فن کا تقاضہ۔ یعنی رسول کی دی ہوئی خبر واحد کوئی نفی یا اصولی خبر واحد نہیں کہ متذکرہ بالا آیات کی نظروں سے اسے قرآن سے ثابت شدہ مانا جائے۔ اگر کوئی یہ کہتا ہے تو ہم کہتے ہیں کہ یہ اس کی قرآن سے ناواقفیت کی دلیل ہے قرآن نے کہیں بھی کسی پیغمبر کی دی ہوئی خبر کو پیغمبر یا رسالت و نبوت کے دباؤ سے منوانے کی کوشش نہیں کی بلکہ صرف اصول روایت اور فنی قواعد کے لحاظ سے ہی اس کے ماننے اور واجب الاعتبار سمجھنے پر زور دیا ہے۔ چنانچہ قرآن ایک مقام پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دی ہوئی خبر واحد کی توثیق کرتا ہے تو وصف رسالت کو اس کی بنیاد نہیں بناتا بلکہ اصول روایت کو بالتصریح اس کا مدار معیار ٹھہراتا ہے۔ ارشاد ہے :

تم ہے تارے کی جب وہ ڈوبنے لگے کہ یہ  
تمہارے ساتھ کے رہنے والے نہ بھٹکے اور  
نہ غلط راستے پر ہولے اور نہ وہ اپنی خواہش  
نفسانی سے باتیں بناتے ہیں ان کا کلام تو تمام  
وحی ہی ہے جو ان پر بھیجی جاتی ہے۔

وَالنَّجْمِ إِذَا هَوَىٰ ۖ مَا ضَلَّ  
صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوَىٰ ۚ وَمَا يَنْطِقُ  
عَنِ الْهَوَىٰ ۚ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ  
يُرْسَلُ (النجم : ۱۰-۱۱)

اس آیت کے الفاظ میں غور کیجئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے پہنچی ہوئی اس خبر واحد کو قرآن واجب الاعتبار ٹھہرا رہا ہے تو یہ کہہ کر نہیں کہ آپ نبی اور رسول ہیں بلکہ بطور خاص صاف جبکہ تمہارا ساتھ کار رہنے والا کہہ رہا ہے گویا خبر واحد کے منوانے میں قرآن رسالت کا دیاؤدلوں پر نہیں ڈالنا چاہتا پھر اس کے ساتھ ہی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے قرآن جن صفات تبیین کی نفی کر رہا ہے وہ سب وہی ہیں جو اصول روایت میں مطاعن کی حیثیت رکھتے ہیں اور جن کی بنا پر روایت محذوشت ہو جاتی ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ قرآن کہنا یہ چاہتا ہے کہ اس خبر واحد کو اس لیے مان لو کہ اس کے راوی ہیں مطاعن

روایت میں سے کوئی مطعن موجود نہیں ہے۔ دیکھ لیجئے قرآن سب سے پہلے بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے ضلالت کی نفی کرتا ہے کیونکہ بے راہ روا اور ناواقف کی بات ہرگز قابل اعتبار نہیں ہوتی پھر آپ کی ذات سے غوایت کی نفی کرتا ہے ظاہر ہے راہ سے بھٹکا ہوا اور غلط راستے پر چلنے والا الٹی ہی سمجھ رکھتا ہے اور الٹی ہی بات کہتا ہے جس کی بنا پر اس کی روایت بھی قابل التفات نہیں ہوتی۔ پھر اس کے بعد قرآن کہتا ہے کہ آپ اپنی خواہش نفسانی سے باتیں بنانے والے بھی نہیں ہیں کیونکہ ایسا شخص خود غرض ہوتا ہے اور خود غرض کی بات بھی لائق اعتبار نہیں ہوتی۔ یہ بے راہ روی ناواقفیت کا

راہی اور خود غرضی سب مطاعن روایت ہی تو ہیں جن کی نفی کر کے قرآن یہ بتلانا چاہتا ہے کہ بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دی ہوئی خبر واحد کو اس لیے تسلیم کر لو کہ آپ میں کوئی

نہمت اور کوئی طعن موجود نہیں ہے۔ آخر میں بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں ان مطاعن روایت کے موجود نہ ہونے کی علت بیان کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے کہ ان مطاعن کی غیر موجودگی راوی کے صاحب دہی ہونے کی بنا پر ہے جو پیغمبر کے سوا کوئی دوسرا نہیں ہوتا اور نبوت و رسالت ایک ایسا اعلیٰ مقام ہے کہ اس کے ساتھ بے راہ روی ناواقفیت اور خود غرضی جیسے مطاعن کبھی جمع نہیں ہو سکتے گویا نبوت کے وصف کو اول تو قرآن نے صراحتاً ذکر ہی نہیں کیا پھر اشارۃً ذکر بھی کیا تو منصب کی حیثیت سے نہیں بلکہ مطاعن روایت کی غیر موجودگی ثابت کرنے کے لیے بطور علت کے ذکر کیا۔ یہ اسلوب کلام صاف بتلا رہا ہے کہ خبر واحد کی حجیت کو رسالت کے دباؤ سے نہیں منوایا جا رہا ہے بلکہ اس کو معیار روایت پر پورا پورا اترنے اور مطاعن روایت سے پاک ہونے کی وجہ سے واجب التسلیم قرار دیا جا رہا ہے۔

غرض وہ بیسیوں آیات قرآنی جن میں انبیاء کی طرف سے اپنی اپنی قوم کو فرداً فرداً دعوت دینے کا ذکر ہے وہ سب کی سب اس بات کا زبردست ثبوت ہیں کہ قرآن کے نزدیک خبر واحد حجت ہے۔ تاہم ان آیات قرآنی کے علاوہ ایسی آیات بھی متعدد پیش کی جاسکتی ہیں جن سے غیر رسول اشخاص کے حوالے سے دی گئی خبر واحد کی حجیت کا ثبوت ہم پہنچتا ہے۔ مثال

کے طور پر۔

(۲) قرآن انصحاب قریہ کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے :

وَجَاءَ مِنْ أَقْصَى الْمَدِينَةِ رَجُلٌ	اور ایک شخص اس شہر کے کسی دور مقام سے دوڑتا
يَسْعَى قَالَ يَاقَوْمِ اتَّبِعُوا الْمُرْسَلِينَ	ہوا آیا اور کہنے لگا کہ اے میری قوم والو رسولوں
(یس - ۲۰)	کی راہ پر چلو۔

اور پھر جب قوم کے لوگوں نے اس شخص کی بات نہ مانی تو ان پر عذاب الہی آنے کا ذکر قرآن نے اس طرح کیا ہے :

ان كانت الا صيحة واحدة	وہ (سزا) تو بس ایک چیخ تھی کہ سب
فاذا هم خمدون (یس - ۲۹)	اسی دم بچھ کر رہ گئے۔

دیکھنے کی بات یہ ہے کہ اگر اس شخص کی دی ہوئی خبر واحد اس کی قوم کے لوگوں پر حجت نہ ہوتی تو اس کی بات نہ ماننے پر اس کی قوم کے لوگ عذاب کے مستحق نہ ہوتے اور عذاب کی ایک ہی چنگھاٹیں وہ جل بجھ کر راکھ نہ ہو جاتے۔ یہ عذاب کا بالمتصریح ذکر اس بات کی دلیل ہے کہ اس شخص کی دی ہوئی خبر واحد قرآن کی نظر میں اس کی قوم کے لوگوں پر حجت تھی۔

(۳) اسی طرح جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ سے ایک قسطنی مارا جاتا ہے تو ایک شخص آپ کو اکرا طلاع دیتا ہے کہ فرعون آپ کے قتل کے درپے ہے اس لیے آپ اپنی جان بچا کر نکل جائیے۔ اس واقعے کو قرآن ان الفاظ میں بیان کرتا ہے :

وَجَاءَ رَجُلٌ مِنْ أَقْصَى الْمَدِينَةِ	اور ایک شخص شہر کے کنارے سے دوڑا ہوا آیا
يَسْعَى قَالَ يَوْمِئِذٍ إِنَّ الْمَلَأَ يَأْتَمِرُونَ	کہنے لگا اے موسیٰ اہل دربار آپ کے متعلق مشورہ
بَكَ لِيَقْتُلُوكَ فَاخْرُجْ إِنَّكَ مِنَ	کر رہے ہیں کہ آپ کو قتل کر دیں سو آپ چلے جائیں
التَّاصِينَ هَ فُجِرَ مِنْهَا خَائِفًا	میں آپ کا بڑا خیر خواہ ہوں سو موسیٰ وہاں سے
يَتَرَقَّبُ (القصص - ۲۰-۲۱)	خوف اندیشے کے ساتھ نکل کھڑے ہوئے۔

ظاہر ہے اس شخص کی لائی ہوئی خبر خبر واحدہ ہی تھی کیونکہ بلاشبہ وہ ایک فرد واحد کی خبر تھی کسی جماعت کی نہ تھی لیکن موسیٰ علیہ السلام نے اس کی خبر مان لی اور اس کا اتنا اثر لیا کہ آپ کے دل پر خوف طاری ہو گیا بلکہ صرف اثر ہی نہیں لیا اس خبر کی بنیاد پر آپ شہر سے نکل بھی کھڑے ہوئے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر خبر واحدہ حجت نہ تھی تو حضرت موسیٰ نے اس کو قبول کیوں کیا۔ اس آیت میں اِنِّیْ لَمِّنَ الصّٰحِیْنِ کے الفاظ قابل غور ہیں خبر دینے والا خود اپنی خبر کی توثیق یہ کہہ کر کر رہا ہے کہ میں یہ خبر اپنی ہوائے نفس یا کسی دوسرے کے بہکائے سکھائے سے غلط نہیں دے رہا ہوں محض آپ کی خبر خواہی کی خاطر آپ کو مطلع کرتے آیا ہوں گویا یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ میری روایت ہر قسم کے مطاعن سے پاک ہے کیونکہ ظاہر ہے کہ اوصاف راوی کے سلسلے میں سب سے بڑا وصف بے لوثی ہے جس سے خبر کی پوزیشن صاف ہوتی ہے۔ دیکھا جائے تو حضرت موسیٰ نے اس خبر کو قبول بھی اسی لیے کیا کہ روایت اصولی روایت کے عین مطابق تھی راوی متہم نہ تھا، محروح نہ تھا اور ہوائے نفسانی سے خبر نہیں دے رہا تھا۔

بہر حال دیکھنے کی بات یہ ہے کہ ایک ایسے فرد واحد نے جو پیغمبر نہیں ہے ایک عام آدمی ہے ایک خبر روایت کی اور ایک پیغمبر نے اس روایت کو قبول کر کے نہ صرف اثر لیا بلکہ اس کی بنیاد پر عمل بھی کیا اس سے بڑھ کر خبر واحد کی حجیت کے معتبر ہونے کا اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے۔

(۴) حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس موقع پر بھی خبر واحد کو قبول کیا جب آپ مصر سے نکل کر مدین میں پہنچے اور حضرت شعیب علیہ السلام کی صاحبزادی اپنے والد کی طرف سے آپ کو بلانے آئیں انہوں نے اپنے والد کا پیغام ان الفاظ میں دیا :

میرے والد تمہیں بلاتے ہیں تاکہ تم کو اس کا صلہ دیں کہ تم نے ہماری خاطر (چارے ہانوروں کو) پانی پلا دیا تھا۔

اِنَّ اٰلِیَیْدِیْکَ لِیَجْزِیْکَ اَجْرٌ  
مَا سَقِیْتَ لَنَا۔

(القصص - ۲۵)

حضرت موسیٰ یہ پیغام سنتے ہی حضرت شعیب علیہ السلام کی صاحبزادی کے ساتھ چل پڑے۔

ایک عورت کی دی ہوئی خبر اگر حضرت موسیٰ کے نزدیک قابل قبول نہ ہوتی تو آپ کبھی اس کے ساتھ نہ جاتے۔

(۵) پھر اسی واقعے میں آگے چل کر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت شعیب علیہ السلام کو جب فرعون کے منتقل سارا واقعہ سنایا تو حضرت شعیب نے اس پر یقین کر کے حضرت موسیٰ کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا:

لا تخف تدنوت من القوم  
الظالمین ۵ (قصص - ۲۵)

خیال رہے کہ حضرت موسیٰ ابھی نبی نہیں ہوئے تھے اگر خبر و احاطہ قابل قبول نہ ہوتی تو ایک غیر نبی کی دی ہوئی خبر کی ایک نبی کبھی تصدیق نہ کرتا۔

(۶) سورہ مؤمن میں قرآن ایک ایسے شخص کا ذکر کرتا ہے جو آل فرعون سے تھا حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزات دیکھ کر آپ پر ایمان لے آیا تھا مگر فرعون کے خوت سے اپنے ایمان کو چھپاتے ہوئے تھا ایک موقع پر وہ اپنی قوم کے لوگوں کو نصیحت کرتے ہوئے کہتا ہے:

وقال الذی آمن یقوم اتبعون  
اهدکم سبیل الرشاد۔ (الزمر - ۲۸)

اس ایک شخص کا اپنی قوم کے لوگوں کو اپنی اتباع کی دعوت دینا ظاہر ہے خبر و احاطہ ہے لیکن قرآن اس دعوت، اتباع کو ہدایت سے تعبیر کر رہا ہے اگر قرآن کے نزدیک خبر و احاطہ نہ ہوتی تو فرد و احد کی دعوت کو تئید سے رستے کی ہدایت سے ہرگز تعبیر نہ کیا جاتا۔

(۷) پھر اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے وہ شخص اپنی قوم سے کہتا ہے:

فستذکرون ما أقول لکم۔  
سو عنقریب تم میری بات کو یاد کر گے۔ (الزمر - ۲۴)

سوچنے کی بات یہ ہے کہ اگر اس شخص کا قول خبر و احاطہ ہونے کی بنا پر حجت نہ ہو تو قرآن کا یہ کہنا بے کار ہو جائے کہ تم اس قول کو یاد کرو گے اور ظاہر ہے قرآن کا ایک لفظ اور ایک

حرف تک بے کار نہیں لہذا معلوم ہوا کہ اس شخص کا قول خبر واحد ہونے کے باوجود قرآن کی نظر میں حجت تھا۔

(۸) پھر جب اس کی قوم کے لوگوں نے اس شخص کی بات نہ مانی تو اللہ کے عذاب نے انہیں آپکا قرآن اس کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے :

فَوَقَّهَ اللَّهُ سَيِّئَاتِ مَا هُمْ رَاوِحَاق بِأَن فَرَعُونَ سَتُورَ الْعَذَابِ (المومن - ۴۵)	پھر اللہ نے اسی (مومن) کو ان لوگوں کے مکر سے محفوظ رکھا اور اہل فرعون کو موزی عذاب نے آگھرا۔
---	---

اگر اس فرد واحد کا قول حجت نہ ہوتا تو اس کے قبول نہ کرنے پر قوم کے عذاب میں گرفتار ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس شخص کی نافرمانی پر عذاب الہی کا ترتیب دلیل ہے اس بات کی کہ قرآن کی رو سے خبر واحد قابل قبول اور حجت ہے۔

(۹) قرآن کی رو سے عادل شخص کی دی ہوئی خبر واحد تو قابل قبول ہے ہی جیسا کہ اوپر کی مثالوں سے ظاہر ہے قرآن کی ایک آیت ایسی بھی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی فاسق شخص کی دی ہوئی خبر بھی بالکل رد کر دینے کے قابل نہیں ہے بلکہ ضروری ہے کہ اس کی دی ہوئی خبر کی تحقیق کر لی جائے۔ قرآن کہتا ہے :

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن جَارَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَإٍ فَتَبَيَّنُوا أَن نَصِيبُوا قَوْمًا لِلْجَاهِلِيَّةِ فَنَصِيبُوا عَلَى مَا فَعَلْتُمْ نَذِيرًا (حجرات - ۶)	اے ایمان والو اگر تمہارے پاس کوئی فاسق خبر لائے تو تحقیق کر لیا کرو ایسا نہ ہو کہ نادانستگی میں کسی قوم پر تم مصیبت ڈھاؤ اور پھر اپنے لیے پتھر پھینکاؤ۔
---	---

معلوم ہوا کہ فرد واحد کی خبر اس کے فاسق ہونے کے باوجود بھی قرآن کے نزدیک معتبر اور حجت ہونے کی نشان دہی ہے بشرطیکہ تحقیق میں آجائے اور حجت بھی ایسے معاملات میں جن کے بگڑ جانے کی صورت میں ندامت اور شرمندگی کا سامنا کرنا پڑے۔ اگر فرد واحد کی خبر مطلقاً قابل رد ہوتی تو یوں کہا جاتا کہ فاسق اگر کوئی خبر لائے تو ہرگز اس کی بات کا اعتبار مت کرو لیکن ایسا نہیں کہا گیا بلکہ یہ کہا گیا کہ تحقیق کے بعد اسے مان لو اور معتبر سمجھو تحقیق کی شرط اس لیے لگائی گئی کہ راوی کے فسق و فجور سے اس کی خبر میں جو بے اعتباری کی گنجائش پیدا



ہو گئی تھی وہ ختم ہو جائے اور خبر قابل اعتبار بن جائے مگر ہر حال تحقیق کے بعد بھی وہ ربے کی خبر واحد ہی اس لیے ثابت ہوا کہ خبر واحد قرآن کے نزدیک بڑے بڑے معاملات تک میں معتبر اور قابل حجت ہے۔

(۱۰) ارشاد ربانی ہے :

<p>اور مومنوں کو نہ چاہیے کہ سب کے سب نکل کھڑے ہوں یہ کیوں نہ ہو کہ ہر گروہ میں سے ایک حصہ نکل کھڑا ہو اگر سے تاکہ یہ دین کی سمجھ بوجھ حاصل کریں اور جب اپنی قوم میں واپس آئیں تو انہیں ڈراتے رہیں عجب کیا کہ وہ محتاط رہیں۔</p>	<p>وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُونَ لِيَنفِرُوا كَافَّةً فَلَوْلَا نَفَرَ مِن كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَائِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ وَلِيُنذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُونَ (التوبة - ۱۲۲)۔</p>
--	---

اس آیت کا حاصل یہ ہے کہ مومنوں کے ہر گروہ میں سے ایک طائفہ کو چاہیے کہ تفقہ فی الدین کے لیے کوچ کرے پھر تفقہ حاصل کر کے جب اپنے وطن لوٹے تو اپنی قوم کو ڈراتے یعنی خبر دے اور خبردار کرے کہ اے قوم رسول کی نافرمانی اور مخالفت سے بچو اس طائفہ کے ڈرانے پر اس کی قوم پر واجب ہے کہ اس کا کہا مانے اور اس کے کہنے پر عمل کرے۔ اب اس آیت کے مفہوم میں غور کرنے والی بات یہ ہے کہ طائفہ کا لفظ لغت کے لحاظ سے ایک شخص یا دو اشخاص پر بھی پوری طرح صادق آتا ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ ایک یا دو آدمیوں کے ڈرانے کی خبر پر جو ظاہر ہے کہ خبر واحد ہے قرآن نے عمل کو واجب قرار دیا ہے۔ اگر خبر واحد قرآن کی رو سے حجت نہ ہوتی تو طائفہ کا ڈرانا قوم کے لیے حجت نہ قرار دیا جاتا۔

۔ ہاں اس بات کا بشرط کہ طائفہ کا لفظ ایک شخص یا دو اشخاص پر بھی پوری طرح صادق آتا ہے اس کے لیے کہیں دُور جانے کی ضرورت نہیں خود اسی آیت میں دلیل موجود ہے۔ اتنی بات تو ہر کوئی جانتا ہے کہ فرقۃ کے معنی ہیں گروہ یا جماعت اور اس بات کے لیے بھی کسی دلیل کی ضرورت نہیں کہ جماعت کے لفظ کا اطلاق کم سے کم تین آدمیوں پر ہوتا ہے اب اس آیت کے الفاظ میں غور کیجئے قرآن کہہ رہا ہے کہ ہر جماعت میں سے ایک طائفہ نکل آیا کرے ظاہر ہے تین میں سے جو لوگ نکلیں گے وہ زیادہ سے زیادہ دو اشخاص ہو سکتے ہیں

اور کم سے کم ایک شخص۔ معلوم ہوا کہ طائفے کا اطلاق ایک یا دو آدمیوں پر بالکل درست ہو گا۔

خبر واحد کی حجیت کے ثبوت میں اگرچہ قرآن سے اور بھی بہت سی آیات پیش کی جاسکتی ہیں مگر ہم سمجھتے ہیں کہ جو بانی حق کے لیے یہ دس نظائر بھی کافی ہیں۔ اس کے بعد بھی کوئی شخص اگر خبر واحد کی حجیت سے انکار کرتا ہے تو یہ کتنا قطعاً مبالغہ نہ ہو گا کہ وہ قرآن کا انکار ہی ہے۔

**خبر واحد کی حجیت اور عہد رسالت** | ان قرآنی نظائروں کی موجودگی میں خبر واحد کی حجیت کے ثبوت کے لیے اگرچہ کسی مزید

دلیل کی حاجت نہیں رہتی تاہم مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس امر کا بھی جائزہ لے لیا جائے کہ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں خبر واحد کے رد و قبول کے بارے میں صورت حال کیا تھی۔ اس سلسلے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ سے بے شمار ایسے واقعات پیش کیے جاسکتے ہیں جن سے خبر واحد کی حجیت ثابت ہوتی ہے لیکن یہاں صرف حوالے کے طور پر چند چیدہ چیدہ واقعات پیش کیے جاتے ہیں۔

(۱) ایک شخص نے روزے کی حالت میں اپنی بیوی کا بوسہ لیا مگر بعد میں اسے شدید ندامت کا احساس ہوا۔ اس نے اپنی بیوی کو مسئلہ دریافت کرنے کے لیے بھیجا وہ ام المؤمنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں حاضر ہوئی اور حقیقت حال بیان کی حضرت ام سلمہ نے جواب دیا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی روزے کی حالت میں الیا کر لیا کرتے ہیں۔ عورت نے واپس جا کر اپنے خاوند کو بتایا وہ ناراض ہو کر کہنے لگا ”ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح نہیں ہیں“ اللہ تعالیٰ اپنے رسول کے لیے جو چاہے حلال کر دے“ وہ عورت پھر حضرت ام سلمہ کی خدمت میں حاضر ہوئی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو وہاں موجود پایا آپ نے پوچھا ”یہ عورت کس لیے آئی ہے“ وجہ بتلانے پر آپ نے فرمایا ”کیا تم نے اسے بتایا نہیں کہ

”یہ تمام واقعات امام شافعی کی تصنیف ”الرسالۃ“ کے مقالہ بعنوان ”حجیت خبر واحد کے دلائل“ سے لیے گئے ہیں۔

روزے کی حالت میں بھی اس طرح کر لیا کرتا ہوں حضرت ام سلمہؓ نے تمام ماجرا کہ سنایا اور اس عورت کے خاوند کی ناراضگی کا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں اس کے قول کا بھی ذکر کیا۔ آپؐ نے یہ سن کر اپنی ناگواری کا اظہار فرمایا اور ارشاد فرمایا میں تم میں سب سے زیادہ متقی اور خدا کی حدود کا سب سے زیادہ علم رکھنے والا ہوں۔

اس واقعے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول کہ کیا تم نے اسے بتایا نہیں کہ میں بھی روزے میں اس طرح کر لیا کرتا ہوں اس امر کی دلیل ہے کہ آپؐ کی ذات سے متعلق ایک عمل کی خبر جو حضرت ام سلمہؓ نے اس عورت کو دی تھی وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر میں خبر واحد ہونے کے باوجود مستبر اور قابل قبول تھی اگر آپؐ کی نظر میں حضرت ام سلمہؓ کا بیان حجت نہ ہوتا تو آپؐ ان سے اس بیان کے بارے میں اس طرح استفسار نہ فرماتے۔ اسی طرح اس شخص کی بیوی کی خبر اپنے خاوند کے قول کے بارے میں اگر آپؐ کی نظر میں قائل تسلیم نہ ہوتی تو آپؐ اس پر اپنی ناراضگی کا اظہار نہ فرماتے۔

(۲) لوگ مسجد نما میں نماز فجر ادا کر رہے تھے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا قاصد تحویل قبلہ کی خبر لے کر ان کے پاس پہنچا۔ سب نے اس کا کلام سنتے ہی نماز ہی کے اندر اپنا رخ بیت المقدس کی طرف سے ہٹا کر بیت اللہ کی طرف کر لیا۔

اہل قبائیل میں سے سابق الاسلام تھے وہ نماز جیسے فریضہ کو صرف اسی صورت میں ترک کر سکتے تھے جب ان پر کوئی شرعی حجت قائم ہو جاتی۔ تحویل قبلہ کی خبر نہ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بذات خود سنی نہ کسی جماعت نے آکر انہیں یہ خبر سنائی بلکہ صرف ایک شخص سے یہ خبر سن کر وہ کعبۃ اللہ کی جانب پھر گئے معلوم ہوا ان کے نزدیک دینی مسائل میں خبر واحد حجت تھی۔ بالفرض ان کا یہ اقدام اگر غلط ہوتا تو یقیناً نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان کو تنبیہ فرماتے کہ جب تم ایک قطعی فیصلے پر قائم تھے تو تم نے صرف ایک شخص کے کہنے پر ایک فرض قطعی کو کیسے چھوڑ دیا اور براہ راست میری ہدایت یا خبر متواتر کا انتظار کیوں نہ کیا مگر یہاں تنبیہ یا اعتراض تو دیکھا اپنی جانب سے فرد واحد کا بھیجنا خود اس بات کی واضح دلیل ہے کہ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک بھی دین

کے بارے میں ایک ثقہ اور صادق شخص کی دی ہوئی خبر معتبر اور حجت تھی۔

یہ واقعہ تو بلکہ اس بات کا ثبوت ہے کہ خبر واحد کا قبول کرنا صرف جائز ہی نہیں فرض ہے، اگر خبر واحد کو قبول کرنا صرف جائز ہوتا تو سابق الاسلام صحابہ ایک یقینی اور قطعی فریضے یعنی اسیت المقدس کی طہر رُخ کرنے (کو حالت نماز میں ترک کر کے ایک غیر یقینی خبر کی بنا پر دوسرے قبیلے کی جانب متوجہ نہ ہوتے اس لیے کہ ایک یقینی امر کو دوسرے یقینی امر ہی کی بنا پر ترک کیا جاسکتا ہے۔

(۳) حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں ابو عبیدہؓ، ابو طلحہؓ اور ابی بن کعبؓ کو شراب پلا رہا تھا کہ دفعۃً ایک شخص آیا اور اس نے خبر دی کہ شراب حرام ہو گئی یہ سن کر فوراً ابو طلحہؓ نے کہا انس اٹھو اور شراب کے ٹکے تو ڈالو میں نے ایک بڑا سا بھڑا اٹھا کر ان پر دے مارا جس سے وہ ٹوٹ گئے۔

ان صحابہ کا جو علمی مقام تھا اور تقدم صحبت نبوی کے لحاظ سے یہ جس مرتبہ پر فائز تھے کوئی صاحب علم اس سے انکار نہیں کر سکتا۔ ظاہر ہے شراب پہلے شرعاً حلال ہی تھی اور عام لوگ ان دنوں شراب پیتے تھے لیکن اچانک ایک شخص اگر حرمت شراب کی خبر دیتا ہے اور شراب کے مشکوں کے مالک ابو طلحہؓ فوری طور پر ان کو توڑنے کا حکم دے دیتے ہیں ان میں سے کسی نے بھی یہ نہ کہا کہ ایسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کر لیں یا عام لوگوں سے پوچھ لیں۔ نہ کسی نے یہ اعتراض کیا کہ قبل از تحقیق یہ اضاعت مال اور اسراف بے جا ترین عقل نہیں۔ معلوم ہوا کہ وہ سب ایک شخص کی خبر پر پورا پورا اعتقاد کرتے تھے۔

(۴) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے زنا کے ایک مقدمے میں زانی کے اقرار پر اس کو کوڑے لگانے کا حکم دیا اور جس عورت کے متعلق اس شخص نے زنا کا اقرار کیا تھا اس کے پاس حضرت انس رضی اللہ عنہ کو بھیجا اور فرمایا کہ اس سے دریافت کرو اگر وہ بھی اقرار کر لے تو اس کو دھم کر دو ورنہ اس شخص کو حد فذف بھی لگاؤ کہ اس نے بلا شرعی ثبوت کے ایک عورت پر زنا کی تہمت کیسے رکھی۔ حضرت انس پہنچے اس عورت نے زنا کا اقرار کیا اور وہ بھی رجم کر دی گئی۔

اس واقعے سے بھی خبر واحد کا حجت ہونا واضح ہوتا ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک فرد واحد کو رجم کا حکم دے کر بھیجنا اور ایک فرد واحد کے ذریعے سے پوچھے ہوئے حکم نبوی کے سامنے اس عورت کا اپنے آپ کو سنگساری کے لیے پیش کر دینا دونوں اپنی اپنی جگہ پر خبر واحد کی حجیت کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔

(۵) عمرو بن سلمہ الزرقانی اپنی والدہ سے روایت کرتے ہیں کہ ہم مقام منیٰ میں مقیم تھے کیا دیکھتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اُرنٹ پر سوار چلا کر یہ کہتے چلے آ رہے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے یہ کھانے پینے کے دن ہیں کوئی شخص روزہ نہ رکھے۔

ظاہر ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اسی صورت میں ایک فرد واحد کو یہ پیغام پہنچانے کے لیے بھیج سکتے تھے جب اس کا قول واجب التسلیم حجت ہو ورنہ آپ اس پیغام رسانی کے لیے چند آدمیوں کو بھی مامور فرما سکتے تھے۔

(۶) یزید ابن شیبان کہتے ہیں کہ ہم عرفات میں ایک ایسی جگہ ٹھہرے ہوئے تھے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قیام گاہ سے کافی دور تھی اسی اثنا میں ہمارے پاس حضرت ربیعہ انصاری آئے اور کہا کہ میں آپ لوگوں کی طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قاصد بن کر آیا ہوں آپ نے حکم دیا ہے کہ اپنی جگہ پر ٹھہرے رہو وہاں سے منتقل ہونے کی ضرورت نہیں۔ مطلب یہ تھا کہ میدان عرفات میں جہاں بھی قیام ہو جائے فریضہ و قوف ادا ہو جاتا ہے۔

اس واقعے سے بھی ظاہر ہے اگر خبر واحد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک حجت نہ ہوتی تو ایک آدمی کے بجائے ایک جماعت کو اس پیغام رسانی کے لیے مامور فرماتے۔

(۷) سنہ ہجری میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر کو امیر حج بنا کر بھیجا، مختلف دیار و امصار کے حاجی جمع تھے آپ نے ان کو احکام حج بتلائے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات گرامی سے ان کو مطلع کیا۔

احکام حج سنانے اور مناسک حج ادا کرنے کے لیے تنہا حضرت ابوبکرؓ کا مامور

کیا جانا خبر واحد کی حجیت کی کھلی دلیل ہے۔

(۸) اسی طرح سہ ماہی ہجری میں ہی اسی حج کے موقع پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو روانہ کیا گیا تاکہ وہ کفار کو سورہ برات کی تازہ نازل شدہ آیات سنا کر ہتھیار کر دیں کہ انہوں نے خود بدعت کی ہے اب اللہ کا بھی ان سے کوئی معاہدہ باقی نہیں رہا۔  
نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے ایک فرد واحد کو احکام قرآنی پہنچانے کے لیے روانہ فرمانا صرف اسی صورت میں کارآمد اور مفید ہو سکتا تھا جب اس کا قول لوگوں پر حجت ہوتا۔

(۹) حجۃ الوداع کے موقع پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کے حق میں باوازا بلند تعویذی کلمات ارشاد فرمائے جو آپ کی بات یاد رکھ کر دوسروں تک پہنچائے۔  
آپ نے ارشاد فرمایا :

لَقَدْ رَأَى اللَّهَ عَبْدًا سَمِعَ مَقَالَتِ  
فَوَعَا هَذَا إِذَا هَا إِلَى مَنْ لَمْ  
يَسْمَعِهَا. (مباح)۔

اس حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی ایک شخص کے لیے اپنی بات کو محفوظ کر کے دوسرے شخص تک پہنچانے پر خوشی کا اظہار فرمایا ہے۔ حدیث میں واحد کا صیغہ عبد استعمال کیا گیا ہے جو فرد واحد پر دلالت کرتا ہے معلوم ہوا فرد واحد کی اطلاع دوسرے کے لیے قابل حجت ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک شخص کی اطلاع پر خوشی کا اظہار نہ فرماتے اور نہ خبر دینے والے کے حق میں آپ کی زبان مبارک سے دعائیہ کلمات صادر ہوتے :

(۱۰) یہی حجۃ الوداع کا موقع ہے اور یہی منی کا میدان ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے خطبے کا اختتام اس مشہور متواتر فقرے پر ختم فرماتے ہیں کہ اَلَا فَيْلَيْلُ الشَّاهِدِ الْغَائِبِ (چاہیے کہ جو حاضر ہے وہ غائب تک پہنچاتا جائے) یہاں بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادات نبوی روایت کرنے والے کے لیے واحد کا صیغہ شاہد استعمال کیا ہے جو ظاہر ہے فرد واحد پر دلالت

کہتا ہے اگر فردوا حد کی اطلاع دوسرے کے لیے قابلِ حجت نہ ہوتی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم واحد کے بجائے ہالا التزام جمع کا ایسا استعمال فرماتے۔

یہ چند واقعات ہم نے مشتبہ نمونہ از خروار سے کے طور پر پیش کر دیے ہیں ورنہ کون نہیں مانتا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ سے ایسی بے شمار نظیریں پیش کی جاسکتی ہیں جن سے خبر واحد کا حجت ہونا ثابت ہوتا ہے۔ اس قسم کے واقعات کے علاوہ ایسے نظائر بھی موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف اطرافِ اکناف میں اپنے اعمال روانہ فرمائے مگر کہیں بھی ان میں عدد کا کوئی لحاظ نہیں کیا اکثر و بیشتر آپ نے ایک ایک ہی عاملی روانہ فرمایا چنانچہ حضرت تیس بن عاصمؓ، حضرت زبیرؓ، حضرت بلدؓ اور حضرت ابن زبیرؓ کو فرداً فرداً ہی اپنے قبائل کی طرف بھیجا۔ اسی طرح وفدِ بحرین کے ساتھ حضرت سعید بن العاصؓ کو اور یمن کے بالمقابل حضرت معاذ بن جبلؓ کو روانہ کیا۔ آپ نے جتنے عمال بھی بھیجے ہیں تاریخ کے اوراق میں ان کے نام بھی محفوظ ہیں اور وہ مقامات بھی درج ہیں جہاں انہیں بھیجا گیا لیکن کیا کوئی بتا سکتا ہے کہ کبھی آپ نے بطور خاص ان میں عدد کا لحاظ کیا ہو۔ آپ نے اگر اہتمام کیا تو صرف اس بات کا کہ ایسے لوگ بھیجے جائیں جو معروف ہوں اور لوگ ان کی صداقت و امانت سے آشنا ہوں۔ تاریخ میں کہیں منقول نہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عاملوں کے ساتھ کسی نے یہ مناقشہ کیا ہو کہ چونکہ یہ ایک ہی فرد ہے اس لیے اس کو صدقات و عشر نہیں دئے جائیں گے۔

اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب مختلف دیار و امصار کی طرف فوجی دستے روانہ کرتے تو ایک ایک صحابی کو ہی دستے کا امیر مقرر فرماتے چنانچہ جب مقام موتہ کی طرف فوج روانہ کی تو حضرت زید بن حارثہؓ کو سالار لشکر مقرر فرمایا ان کے شہید ہونے پر حضرت جعفرؓ کو اور پھر ان کی شہادت کے بعد حضرت عبداللہ بن رواحہؓ کو امیرؓ مقرر کیا جانے کی تاکید فرمائی۔

اس کے علاوہ ایک زمانے میں آپ نے دعوتِ اسلام کے لیے مختلف بلاد میں بارہ قاصد روانہ فرمائے اور صرف اس بات کا خیال رکھا کہ ہر علاقے میں ایسا شخص بھیجا

جلے جوان اطراف میں متعارف ہوتا کہ اس کے جھوٹے ہونے کا شبہ نہ رہے اور لوگوں کو اس کا اطمینان ہو جائے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قاصد ہے چنانچہ حضرت وحیہ کلبی کو اس علاقے کی طرف اپنی بنا کر بھیجا گیا جہاں وہ لوگوں میں جلنے پہنچے اسی طرح اپنے عمال کی طرف خطوط بھیجنے کے لیے آپ نے انہی لوگوں کو سفارت پر مامور فرمایا جو مرسل الیہ کے لیے متعارف اور قابل اعتماد ہوتا تھا کبھی آپ نے یہ اہتمام نہیں فرمایا کہ ایک شخص کے بجائے ایک جماعت کو سفارت کے لیے روانہ کیا جائے نہ ہی کسی عامل یا قاضی نے ایک فرد واحد کے ذریعے موصول شدہ خطوط پر کبھی کسی شک و شبہ کا اظہار کیا جب بھی کسی عامل کے پاس آپ کا کوئی خط پہنچا ہمیشہ فوراً اس نے اس کو نافذ کیا۔

غرض عہد رسالت کے یہ تمام واقعات اور حیات نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے یہ تمام اظہار اس بات کا صریح ثبوت ہیں کہ خبر واحد کی حجیت کو خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مستند قبول حاصل ہے۔

**خبر واحد کی حجیت اور عہد صحابہ** [نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد محمد صحابہ میں بھی ایسی واضح شہادتیں موجود ہیں

جو اس بات کا ثبوت مہیا کرتی ہیں کہ صحابہ کے درمیان خبر واحد کی حجیت کو ایک مسلمہ حقیقت کی حیثیت حاصل تھی۔ اس ضمن میں بھی چند نظائر کا پیش کرنا مناسب رہے گا۔

(۱) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جب یہ مسئلہ درپیش ہوا کہ آپ کی تدفین کس جگہ عمل میں لائی جائے تو کون نہیں جانتا کہ اس کا فیصلہ ایک خبر واحد ہی کی بنیاد پر کیا گیا حضرت ابو بکر نے فرمایا کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ **الانبياء يدفنون حيث يموتون** (انبیاء جہاں فوت ہوتے ہیں وہیں دفن کیے جاتے ہیں) اس خبر کو سننے کے بعد کسی ایک زمانہ کو بھی یہ کہتے نہیں سنا گیا کہ اس خبر پر کوئی شاہد لاؤ کسی نے بھی اس پر عمل کرنے کے لیے تواتر کی شرط نہیں رکھی دنیا جانتی ہے کہ اسی خبر واحد کی تعمیل میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تدفین حضرت عائشہ کے حجرہ مبارکہ ہی میں عمل میں آئی جہاں آپ کی وفات ہوئی تھی اسی طرح سقیہ غزوہ ماعدہ کے واقعے میں ایسے موقع پر جبکہ خلافت کے مسئلے پر



صحابہ کے اختلاف نے نزاع کی شکل اختیار کر لی تھی اور عقل پر جذباتیت کے غالب آنے کا غم شدہ پیدا ہو چکا تھا ایک خبر واحد ہی تھی جس نے آنا فانا صحابہ کے باہمی اختلاف کا خاتمہ کر دیا اور سب کے سر تسلیم و رضا کے اظہار میں جھکے نظر آنے لگے اس وقت بھی صرف تن تنہا حضرت ابوبکر ہی تھے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد روایت کرتے ہوئے سنے گئے کہ **الائمة من القریش (خلفاء قریش میں سے ہوں گے)** حضرت ابوبکر کی زبان سے ان الفاظ کے نکلنے کی دیر تھی سارے اختلافات مٹ گئے اور قریش میں سے خلیفہ منتخب کر لیا گیا۔

(۲) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ مسند خلافت پر متمکن ہوئے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی میراث کا معاملہ پیش آیا حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی جانب سے باغ فدک کا مطالبہ ہوا اور آپ کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے سهم خیر پر اپنا حق بتایا تو اس کا فیصلہ بھی خبر واحد ہی کی بنیاد پر کیا گیا حضرت ابوبکرؓ نے ان دونوں سے فرمایا :

سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے سنا
يقول لا نورث ما ترکنا صدقة	جہ کہ ہم (گروہ انبیاء) کا کوئی وارث نہیں ہوتا
(بخاری)	ہم جو چھوڑ جاتے ہیں وہ سب صدقہ ہے۔

اور پھر اسی حدیث پر آپ نے عمل فرمایا حضرت فاطمہ اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما نے بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کے سامنے (فنی طویر پر خبر واحد ہونے کے باوجود) سر تسلیم خم کر دیا نیز تمام صحابہ کرام نے حضرت ابوبکرؓ کے اس فیصلے سے اتفاق کیا۔ اگر صحابہ کے درمیان خبر واحد حجت نہ ہوتی تو نہ حضرت ابوبکرؓ محض اپنی معلومات پر اکتفا کر کے کوئی فیصلہ دیتے اور نہ دیگر صحابہ ہی حضرت ابوبکرؓ کے اس فیصلے کو قبول کر معلوم ہوا خبر واحد کی حجت صحابہ کے درمیان مسلمہ تھی۔

بلکہ اوپر کے ان دو واقعات سے تو خبر واحد کی حجت پر صحابہ کرام کا اجماع ثابت ہوتا ہے کیونکہ ان محولہ بالا تمام اخبار آحاد کو تمام صحابہ نے بالاجماع قبول کیا ہے اور اس

حاجہ سے کہ صحابہ کرام کا یہ اجماع ہم تک بالآخر منقول ہے اگر ہم یہ کہیں تو قطعاً غلط نہ ہو گا کہ خبر واحد کی حجیت کو تو اتر کی سند حاصل ہے۔

(۳) ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے اعلان فرمایا کہ کیا کسی شخص نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بارے میں کچھ سنا ہے کہ اگر جھگڑنے میں کسی عورت کا حمل ساقط ہو جائے تو اس کی جزا کیا دینی چاہیے؟ یہ سن کر حضرت حمل بن مالک کھڑے ہوئے اور فرمایا کہ ایک مرتبہ میری دونوں بیویوں کے درمیان لڑائی ہو گئی ایک نے دوسری کے پیٹے کی چوب دے مادی جس کے صدمہ سے اس کا حمل ساقط ہو گیا مقدمہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے آیا آپؐ نے قائلہ پر پانچ سو درہم بطور دیت لازم فرمائے۔ حضرت حمل سے یہ سن کر حضرت عمرؓ نے فرمایا اگر ہم یہ حدیث نہ سنتے اور اپنی رائے سے فیصلہ کرتے تو شاید اس کے خلاف فیصلہ کرتے۔

حضرت حمل بن مالکؓ کی یہ روایت ظاہر ہے خبر واحد تھی اگر حضرت عمرؓ کے نزدیک خبر واحد حجیت نہ ہوتی تو یقیناً حضرت حمل سے شاہد طلب کرتے یا بصورت دیگر اس کو بد کر کے اپنے عقل کے مطابق فیصلہ دیتے مگر ایسا نہیں ہوا حضرت حمل کی روایت کردہ حدیث سن کر حضرت عمرؓ جو فیصلہ صادر کرنا چاہتے تھے اس سے باز رہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق فیصلہ دے دیا۔

(۴) جب حضرت عمرؓ ملک شام کے سفر پر تھے تو راستے میں آپ کو بیتہ چلا کہ وہاں طاعون پھیلا ہوا ہے اس موقع پر حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ ارشاد نقل کیا جس میں ذکر ہے کہ ایسے علاقے میں جانا ممنوع ہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس حدیث کے سنتے ہی جو ظاہر ہے خبر واحد تھی آگے سفر جاری رکھنے کا ارادہ ترک کر دیا اور مدینہ منورہ لوٹ آئے۔

(۵) حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو مجوس سے جزیہ لینے کے بارے میں تردد تھا مگر جب حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ ہی کی زبانی ان تک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد پہنچا کہ مجوس سے اہل کتاب کا سا برتاؤ کیا جائے نیز یہ کہ آپؐ نے مقام حج کے

مخوسوں سے جزیہ لیا تھا تو اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنا سابقہ خیال ترک کر دیا اور مخوس سے جزیہ لینا شروع کر دیا۔ اس ارشاد نبوی کی روایت میں بھی حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ اکیلے ہی تھے اور اس لیے فنی طور پر یہ روایت بھی خبر واحد ہی کا درجہ رکھتی تھی مگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس خبر واحد کو بغیر کسی پس و پیش کے قبول کر لیا اور اپنے خیال سے رجوع کر کے مخوس کے ساتھ اہل کتاب کا سا برتاؤ کرنے لگے۔

(۶) حضرت عمر رضی اللہ عنہ دیت کے مسئلے میں اس رائے کے حامل تھے کہ بیوی کو اپنے شوہر کی دیت سے وراثت نہ ملنی چاہیے حضرت صحاک بن سفیان کو معلوم ہوا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہو کر کہا کہ ایک بار نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے لکھا تھا کہ اشیم ضیابی کی بیوی کو اس کی دیت سے حصہ دیا جائے یہ سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے خیال سے رجوع فرمایا۔

(۷) حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو اپنے عہد خلافت میں ایک موقع پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی ایسے قول یا فعل کی تلاش تھی جس سے یہ معلوم ہو سکتا ہو کہ شوہر کی ذفات کے بعد بیوی کے لیے اپنی عدت کی مدت شوہر ہی کے گھر میں پوری کرنی ضروری ہے یا یہ مدت وہ اپنے والدین یا اور کسی عزیز رشتے دار کے گھر میں رہ کر بھی پوری کر سکتی ہے۔ حضرت زبیر بن عوف بن مالک بن سنان کو جن کے ساتھ یہ صورت حال پیش آچکی تھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اس بارے میں ایک ارشاد معلوم تھا۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے ان کے پاس اپنا آدمی بھیجا اور ان سے دریافت کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں کیا حکم دیا تھا انہوں نے بتلایا کہ آپ نے انہیں شوہر ہی کے گھر میں عدت گزارنے کا حکم دیا تھا۔ حضرت عثمان نے یہ سنا تو اسی کے مطابق مقدمات فیصل کرنے لگے۔

اس واقعے سے معلوم ہوا کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے ایسی خبر واحد یعنی قبول کر لی جو صرف ایک عورت کی روایت کردہ تھی۔

(۸) حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے سن رکھی تھی کہ رونی حاجی آخری طوان یعنی

طواف وداع کیے بغیر وطن واپس نہیں جاسکتا، ان کے نزدیک عائشہ عورت بھی اس  
 محالیت میں شامل تھی چنانچہ انہیں یہ بتایا گیا کہ حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما  
 اس کے خلاف فتویٰ دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر عائشہ عورت یوم النحر میں طواف کر چکی ہو  
 تو آخری طواف سے قبل واپس جاسکتی ہے تو انہیں بہت تعجب ہوا حضرت ابن عباس رضی  
 اللہ عنہ سے اس بارے میں استفسار کیا انہوں نے ایک انصاری عورت کا حوالہ دیا کہ ان سے  
 مجھے یہ حدیث پہنچی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اس امر کی اجازت دی تھی امی  
 کی بنیاد پر میں ایسا فتویٰ دیتا ہوں۔ حضرت زید رضی اللہ عنہ ان انصاری صحابہ کے پاس  
 پہنچے انہوں نے تصدیق کی حضرت زید مطمئن ہو گئے اور اپنے موقف سے رجوع فرمایا۔  
 یہ واقعہ بھی اس بات کا ثبوت ہے کہ حضرت عبداللہ ابن عباس اور حضرت زید بن  
 ثابت رضی اللہ عنہما جیسے فقیہ صحابہ نے بھی محض ایک عورت کی روایت کردہ خبر واحد کو بھی  
 بلا تردد قبول فرمایا۔

(۹) حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما ابتدا میں مغابہ کے قاتل تھے یعنی بٹانی پر زمین دیا  
 کرتے تھے اور اس میں کوئی حنف نہ سمجھتے تھے، حضرت رافع بن خدیجؓ نے انہیں بتایا کہ  
 رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع کیا ہے یہ سنا تو حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ  
 نے مغابہ ترک کر دیا۔

(۱۰) حضرت عبداللہ ابن عباس کے سامنے کسی شخص کا یہ قول بیان کیا گیا کہ قرآن کریم میں  
 حضرت خضر اور حضرت موسیٰ علیہما السلام کا جو واقعہ بیان ہوا ہے اس میں حضرت خضر  
 کے ساتھی جس موسیٰ کا ذکر ہے وہ وہ موسیٰ نہ تھے جن کو بنی اسرائیل کی جانب بنی بنا کر  
 مبعوث کیا گیا تھا بلکہ کوئی اور شخصیت تھے حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یہ  
 سن کر کہا ”دشمن خدا جھوٹ کہتا ہے۔“ مجھے ابی بن کعبؓ نے بتایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ  
 وسلم نے ایک بار خطبہ دیتے ہوئے ہمیں حضرت خضر و حضرت موسیٰ علیہما السلام کا واقعہ  
 سنایا جس سے ہمیں معلوم ہوا کہ حضرت خضر کے ساتھی حضرت موسیٰ ہی تھے جو بنی اسرائیل  
 کی جانب بنی ہو کر آئے تھے۔“

یہ واقعہ بھی اس حقیقت کا آئینہ دار ہے کہ حضرت عبداللہ ابن عباس جیسے فقیہ صحابی نے ایک فرد واحد کی روایت کردہ حدیث کو تائید کے ساتھ دلیل کے طور پر پیش فرمایا جو بلا شبہ اس بات کی دلیل ہے کہ آپ کے نزدیک خبر واحد حجت تھی۔ یہ دس شہادتیں ہم نے عہد صحابہ سے بھی پیش کر دی ہیں یہ تمام اس بات کے ثبوت کے لیے کافی ہیں کہ عہد رسالت کی طرح عہد صحابہ میں بھی خبر واحد کو معتبر قابل قبول اور حجت تسلیم کیا جاتا تھا۔

عہد صحابہ کے ان واقعات کی جو توجیہ منکرین حدیث کی جانب سے پیش کی جاتی ہے وہ اگرچہ اس قابل تو نہیں کہ اسے اہمیت دی جائے اور یہاں زیر بحث لایا جائے لیکن احتیاط حق اور اتمام حجت کی خاطر اس کی اصل حقیقت اگر واضح کر دی جائے تو نا مناسب نہ ہوگا۔

منکرین حدیث کا کہنا یہ ہے کہ خبر واحد کو قبول کرنے میں صحابہ کا طرد عمل تو حق بجانب تھا کیونکہ عہد صحابہ میں شائبہ کا ملنا ممکن تھا لیکن زمانہ مابعد میں راوی کی حیثیت شائبہ کی نہیں رہی بلکہ مدعی کی ہوتی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے امت کے جملہ افراد پر ایک عقیدے یا عمل کی پابندی عائد کرنا چاہتا ہے اور اس کا بیان بھی واسطہ در واسطہ ہے اس پر لازم ہے کہ وہ اپنے دعوے پر دو شاہد عدل پیش کرے جو گواہی دیں کہ اس نے فلاں سے ہمارے سامنے سنا ہے پھر اسی طرح سلسلہ کے آخر تک منکرین حدیث کے نزدیک ہر راوی کی سماعت کے دو گواہ ہونے ضروری ہیں۔

اس سلسلے میں اولاً تو قابل غور بات یہ ہے کہ منکرین حدیث جس طرح زمانہ مابعد کے راوی پر یہ لازم ٹھہراتے ہیں کہ وہ دو شاہد عدل پیش کرے اسی طرح بلکہ اس سے بڑھ کر تو اس ذمہ داری کا بار اس صحابی کی گردن پر ہونا چاہیے جس نے کوئی حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کی ہے اس لیے کہ سب سے پہلا مدعی تو وہ ہے امت کے جملہ افراد پر کسی

عقیدے یا حمل کی پابندی عائد کرنے کی بنیاد تو سب سے پہلے اسی نے رکھی ہے سب سے پہلے اس کے فقے ہے کہ وہ اپنے اس دعوے کے لیے دو گواہ لائے کہ اس نے یہ حدیث نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہے اگر وہ گواہ نہیں لاتا یا دوسرا شخص اس سے گواہوں کا مطالبہ نہیں کرتا بلکہ بغیر گواہوں کے اس کا دعویٰ قبول کر لیا جاتا ہے تو یہ اس امر کی دلیل ہے کہ راوی کے لیے دراصل عدد کی شرط ہی غلط ہے۔

دوسرے غور طلب امر یہ ہے کہ خلاف واقعہ یہ بات کیونکر فرض کر لی گئی کہ صحابہ نے تمام روایتیں براہ راست نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سن کر بیان کی ہیں اس لیے ان کی حیثیت مدعی کی نہیں رہی۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ صحابہ کی روایتوں میں ایسی روایتیں بھی شامل ہیں جو انہوں نے خود نہیں بلکہ کسی دوسرے صحابی سے سن کر بیان کی ہیں۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں :

جو حدیث ہم بیان کرتے ہیں وہ تمام ہم نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں سنی بلکہ ان میں وہ حدیثیں بھی ہیں جو ہم میں سے بعض بعض سے روایت کرتا تھا۔

ما كل ما نحدث به سمعنا من رسول الله صلى الله عليه وسلم ولكن كان يحدث بعضنا بعضا۔

(مسندک للحاکم)

ایسی روایتوں کے لحاظ سے جو صحابہ نے براہ راست صاحب نبوت سے نہیں سنی ایک صحابی راوی کی حیثیت بھی ٹھیک رہی حیثیت ہو جاتی ہے جو زمانہ مابعد کے راوی کی بنتی ہے اس کے علاوہ یہ بات بھی تو اصولی طور پر مسلم نہیں کہ جس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے براہ راست حدیث سنی ہے اسی کی حیثیت مدعی کی نہیں رہتی۔ جب یہ بات ہے تو آخر اس کو بار ثبوت سے سبکدوش کس بنا پر سمجھ لیا جائے۔ رہی یہ بات کہ عہد صحابہ میں شاہد کاملنا ممکن تھا تو اول تو یہ ایک عذر لنگ سے زیادہ کچھ نہیں دوسرے یہ کہ نسائی یا شریعی قاعدہ ہے کہ کسی مدعی کے حق میں دعوے کی دگرہ صریح اس بنا پر دے دی جائے کہ وہ گواہ پیش کر سکتا ہے۔ کیا یہ کوئی معقول بات ہوگی کہ شاہد مل جانے کے محض اسکاں کی بنیاد پر مدعی سے شہادت کا مطالبہ ہی نہ کیا جائے۔ غرض ایک صحابی راوی اور زمانہ مابعد کے راوی کی حیثیتوں کے

درمیان شاہد اور مدعی ہونے کی کوئی تفریق قائم کرنا اور اس کو خبر واحد کی حجیت و عدم حجیت کے لیے چار قرار دینا کسی طرح بھی معقول اور مناسب نہیں۔

ہر حال اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ ایک طرف قرآنی تاہیات ہیں، عہد رسالت کے نظریے ہیں اور عہد صحابہ کی شہادتیں ہیں جو خبر واحد کی حجیت کا ثبوت ہیں اور دوسری طرف منکرین حدیث کا بلا دلیل یہ دعویٰ ہے کہ خبر واحد حجیت نہیں۔ اب ہر صاحب عقل خود فیصلہ کر سکتا ہے کہ کونسی بات حق ہے اور قابل قبول ہے اور کونسی بات محض باطل ہے اور قابل رد ہے۔

بات صرف عہد صحابہ تک ہی محدود نہیں عہد صحابہ کے بعد تابعین و تبع تابعین کے دور میں بھی خبر واحد کی حجیت کو ایک مسلمہ حقیقت کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب

### خبر واحد کی حجیت عہد صحابہ کے بعد

”الرسالۃ“ میں اخبار آحاد کی حجیت کے اثبات میں جو ایک طویل مقالہ تحریر فرمایا ہے اس میں انہوں نے مدینہ و مکہ، کوفہ و بصرہ اور یمن و شام کے متعدد اصحاب کے نام گنوائے ہیں۔ جو اخبار آحاد کو باہم نقل و روایت کرتے ان کو قبول کرتے ان کی روشنی میں فتویٰ دیتے اور ان کو دین میں بلا نزاع و جدال حجت قرار دیتے تھے امام شافعیؒ نے اس ضمن میں سلف سے لیکر خلف تک بکثرت ائمہ محققین کے اسماء گرامی ذکر کیے ہیں ان میں سے چند کے نام اگر ہم یہاں شمار کر دیں تو فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔

### اہل مدینہ

- |                           |                     |                          |
|---------------------------|---------------------|--------------------------|
| (۱) محمد بن جبیر          | (۲) نافع ابن جبیر   | (۳) یزید بن طلحہ         |
| (۴) محمد بن طلحہ          | (۵) نافع ابن عجبیر  | (۶) ابوسلمہ بن عبدالرحمن |
| (۷) حمید بن عبدالرحمن     | (۸) خارجہ بن زید    | (۹) عبدالرحمن بن کعب     |
| (۱۰) عبداللہ بن ابی قتادہ | (۱۱) سلیمان بن یسار | (۱۲) عطاء بن یسار        |

## اہل مکہ

دا، عطار	(۲) طاؤس	سید مجاہد
(۴) بن ابی ملیکہ	(۵) عکرمہ بن خالد	(۶) عبید اللہ بن ابی یزید
(۷) عبداللہ بن باباہ	(۸) بن ابی عمار	(۹) محمد بن المنکدر

## اہل کوفہ

(۱) اسود	(۲) عظیمہ	(۳) شعبی
----------	-----------	----------

## اہل بصرہ

(۱) عبدالرحمن بن غنم (۲) حسن (۳) محمد بن سیرین

اسی طرح یمن میں وہب بن منبہ اور شام سے مکحول کے اسمائے گرامی تابی ذکر ہیں یہ تمام اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صرف ایک صحابی سے روایت کرتے تھے اور اس ایک صحابی کی حدیث کی بنیاد پر فتوے صادر کرتے تھے۔ امام شافعیؒ کا قول ہے کہ اگر بالفرض کسی خاص مسئلے کے متعلق کسی کے لیے یہ کہنا جائز ہوتا کہ اس پر مسلمانوں کا ہمیشہ اجماع رہا ہے تو خبر واحد کی حجیت کے متعلق بھی میں یہ بات کہہ دیتا مگر اسے احتیاط کے خلاف سمجھ کر اتنا پھر بھی کہتا ہوں کہ اہل اسلام کے فقہاء میں سے مجھے ایک نام ہی آیا معلوم نہیں جس کے بارے میں کہا جاسکے کہ وہ خبر واحد کو حجت تصور نہیں کرتا تھا ان کے مابین یہ مسئلہ مرے سے متنازعہ تھا ہی نہیں۔

غرض خبر واحد کی حجیت عقل سے ثابت ہے قرآن سے ثابت ہے حدیث سے ثابت ہے صحابہ کرام کے آثار سے ثابت ہے اور تمام محدثین و مجتہدین و ائمہ محققین سے ثابت ہے جبکہ اس کے بالعکس خبر واحد کی عدم حجیت ان میں سے کسی ایک ذریعے سے بھی ثابت نہیں جرت ہوتی ہے ان لوگوں کی کم عقلی پر جو اس بات سے تو انکاری ہیں جو ہر ذریعے سے ثابت متحقق ہے اور اس بات کو منوانے پر بصد ہیں جو ہر قسم کے ثبوت سے عاری ہے۔



بہر حال حقائق کے انکار سے حقائق کے وجود پر کوئی زد نہیں پڑا کرتی منکرین حدیث انکار کرتے ہیں تو کرتے رہیں خبر واحد ہمیشہ سے دین میں جنت تھی، جنت ہے اور ہمیشہ جنت رہے گی کسی کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ خبر واحد کو صرف اس لیے موجب عمل نہ سمجھے کہ وہ تواتر کی حد کو نہیں پہنچتی۔ خبر واحد پر عمل نہ کرنے کی صرف ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ وہ خبر حد صحت کو نہ پہنچتی ہو یا اس کے معارض اس سے زیادہ کوئی صحیح حدیث موجود ہو لیکن اگر خبر واحد کا بیان کرنے والا سچا اور ثقہ ہو مطاعین روایت میں سے کوئی طعن اس میں موجود نہ ہو نیز کوئی صحیح حدیث اس خبر واحد کے معارض نہ ہو تو کسی کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ خبر واحد کو موجب عمل نہ سمجھے اور اسے ترک کر دے۔

**منکرین حدیث کے دلائل** | خبر واحد کی حجیت پر عقلی و نقلی حیثیت سے اس تفصیلی گفتگو کے بعد ہم ان دلائل کا تجزیہ کرتا ضروری

سمجھتے ہیں جو حدیث کی تشریحی حیثیت کو مشکوک بنانے کے لیے خبر واحد کی عدم حجیت پر منکرین حدیث کی طرف سے پیش کیے جاتے ہیں۔ اس ضمن میں ان کی طرف سے جو کچھ کہا جاتا ہے اس کا لب لباب درج ذیل چار نکات میں مختصر ہے :

(۱) خبر واحد جس طریق سے مروی و منقول ہوتی ہے وہ قطعی ہے کیونکہ راوی سے خطا و نسیان سرزد ہونے کا احتمال باقی رہتا ہے اور جس میں خطا و نسیان کا احتمال ہو وہ قطعی و حتمی نہیں ہو سکتی لہذا اس سے استدلال کرنے کا کوئی ثابہ نہیں۔

(۲) اگر فروعات میں خبر واحد موجب عمل ہے تو اصول و عقائد میں بھی اسے موجب عمل ہونا چاہیے حالانکہ اس پر فریقین کا اجماع منعقد ہو چکا ہے کہ عقائد میں خبر واحد پر عمل نہیں کیا جاسکتا بنا بریں جب عقائد میں خبر واحد پر عمل درست نہیں تو فروعات میں بھی جائز نہیں۔

(۳) حدیث میں آتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھول کر نماز عصر کے چار فرضوں کے بجائے دو فرض ادا کیے ذوالیدین نامی صحابی نے جب آپ کو اس سے آگاہ کیا تو ان کی بات تسلیم کرنے میں آپ کو تامل ہوا جب حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما

اور دیگر شرکاء نماز نے اس کی تائید کی تو آپ نے باقی ماندہ دو رکعتیں ادا کیں اور دو سجدہ پڑھے سہو کیے اگر خبر واحد حجت ہوتی تو آپ صرف ذوالیہدین کے کہنے پر نماز مکمل کر لیتے اور اس میں توقف نہ فرماتے۔

(۴) متعدد صحابہ کے بارے میں منقول ہے کہ وہ خبر واحد پر عمل نہیں کرتے تھے مثلاً حضرت ابو بکرؓ نے فادی کی میراث سے متعلق مغیرہ بن شعبہؓ کی روایت کو اس وقت تک قبول نہ کیا جب تک محمد بن مسلمہؓ نے اس کی تائید نہ کر دی اسی طرح حضرت عمرؓ نے طلب اذن کے بارے میں حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کی روایت پر شہد مانگا اور جب ابو سعیدؓ نے ان کے حق میں شہادت دی تب ان کی روایت کو قبول کیا ان چاروں نکات پر ہم فرداً فرداً گفتگو کریں گے مگر ان چاروں میں سے منکرین حدیث سب سے زیادہ زور چونکہ اسی نکتہ پر دیتے ہیں جو خبر واحد کی قطعی حیثیت سے متعلق ہے اور جو سب سے پہلے بیان ہوا ہے اس لیے اس پر ذرا تفصیل سے گفتگو کی جائے گی۔ خبر واحد کی حجیت کے خلاف منکرین حدیث کی اس دلیل کی تمام تر بنیاد چونکہ اس پر ہے کہ وہ مفید ظن ہوتی ہے اور دین کی بناء ظنیات پر قائم نہیں کی جاسکتی اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ پہلے ظن کے صحیح مفہوم کی تحقیق کر لی جائے ۛ

**ظن کے صحیح مفہوم کی تحقیق** | لفظ ظن کلام عرب میں دو معنی میں مستعمل ہے ایک گمان غالب جو کسی دلیل عقلی یا نقلی کی بنا پر پیدا

ہو نہ قطع نہ ہو دو سکتے تخمین و اندازہ اور شکل جس کا مطلب ہے محض اپنے خیال اور نفسانی خواہش سے بے دلیل اور بے تحقیق بات کا پیدا ہونا۔ خبر واحد جس ظن کو مفید ہوتی ہے وہ پہلی قسم کا ہے جو تمام عقلاء کے نزدیک حجت ہے۔ قابل رد جو ظن ہے وہ وہ ہے جو دوسری قسم کو شامل ہے۔ منکرین حدیث کی بنیادی غلطی یہی ہے کہ انہوں نے خبر واحد سے پیدا ہونے والے ظن کو دوسری قسم پر محمول کیا اور اسے رد کر دیا۔ قرآن کریم میں جہاں جہاں ظن کی مذمت وارد ہوئی ہے یہ وہ ظن ہرگز نہیں ہے جو اولہ شرعیہ کے ماتحت پیدا ہوتا ہے بلکہ اس کا مصداق وہ ظن ہے جو محض اپنی

جانب سے پکائے ہوئے بے بنیاد خیالات پر مشتمل ہو۔ وہ ظن جو اولہ شریعہ کے ماتحت پیدا ہوتا ہے قرآن نے اس کی مذمت میں کہیں ایک حرف بھی نہیں کہا۔ منکرین حدیث ظن کی مذمت میں قرآنی آیات کے حوالے تو دیتے چلے جاتے ہیں مگر یہ غور کرنے کی تکلیف گوارہ نہیں کرتے کہ اس سے کونسا ظن مراد ہے۔ مثال کے طور پر اسی آیت کو لے لیجئے جو ظن کی رد میں بڑی شد و مار سے پیش کی جاتی ہے یعنی

إِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِي مِنَ الْحَقِّ | اور اٹکل حق کے مقابلے میں ذرا بھی کام

شَسَا (النجم - ۲۸) | نہیں دیتی۔

یہ سورہ نجم کی آیت ہے اس آیت کے سیاق و سباق کو دیکھ لیجئے کہا یہ جارہا ہے کہ جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے وہ فرشتوں کو مؤنث ناموں سے پکارتے ہیں حالانکہ اس کے لیے ان کے پاس کوئی دلیل نہیں یہ لوگ محض اٹکل پر چل رہے ہیں اور اٹکل حق کے مقابلے میں ذرا بھی کام نہیں دیتی۔ اب ظاہر ہے فرشتوں کو مؤنث قرار دینے کے لیے منکرین آخرت کے پاس نہ کوئی عقلی دلیل تھی نہ نقلی۔ بلا دلیل محض اپنے دماغ میں انہوں نے یہ پکالیا تھا کہ فرشتے مؤنث ہیں اور اللہ کی بیٹیاں ہیں۔ تو قرآن نے یہاں جس ظن کی مذمت کی ہے وہ وہی ہے جو خود تراشیدہ خام خیالی پر مبنی ہو۔ اسی طرح ظن کی مذمت میں قرآن کی ایک اور آیت ملاحظہ کیجئے اور دیکھئے کہ قرآن جس ظن کی مذمت کرتا ہے وہ کونسا ظن ہے۔ سورہ آل عمران کی آیت ہے۔

يُظَنُّونَ بِاللَّهِ غَيْرَ بِالْحَقِّ ظُنُّنَ | یہ لوگ اللہ کے بارے میں غلات حقیقت خیالات الجاہلیۃ۔ (آل عمران - ۱۵۳)

جاہلیت کے خیالات قائم کر رہے تھے۔

اس آیت میں ظن الجاہلیۃ اور غیر الحقی کے الفاظ سے واقعی ظن کی مذمت ثابت ہوتی ہے مگر کونسے ظن کی؟ اس ظن کی جو اس پوری آیت میں بیان ہوا ہے یعنی منافقین کی یہ بدگمانی کہ مسلمانوں کو اللہ کی نصرت نصیب نہ ہوگی۔ یہ پوری آیت ذرا پڑھ کر دیکھئے نذر انزل

علیکم من بعد الغیر امنہ نفا ساً یحشی طائغۃ منکم و طائغۃ قد اُفتمتہم  
 انفسہم لیظنون باللہ غیر الحق ظن الجاہلیۃ (پھر اس نے اس غم کے بعد تمہارے  
 اوپر راحت نازل کی (یعنی) غم و غمی کہ اس کا تم میں سے ایک جماعت پر غلبہ ہو رہا تھا اور ایک جماعت وہ  
 تھی کہ اسے اپنی جانوں کی پڑی ہوئی تھی۔ یہ لوگ اللہ کے بارے میں غلات حقیقت جہالت کے سے خیالات  
 قائم کر رہے تھے) یہ مضمون جنگِ اُحد سے متعلق ہے اس وقت جب میدانِ اُحد میں مسلمانوں  
 کو ایک عارضی شکست کا سامنا کرنا پڑا تو منافقین جو مسلمانوں ہی کی صفوں میں ملے  
 جلے تھے گھبرا اُٹھے انہیں اپنی جان کے لالچے پڑ گئے وہ مسلمانوں سے حجت و تکرار  
 کرنے لگے کہ تم سے جو وعدہ نصرت تھا وہ کیا ہوا۔ اب اللہ سے متعلق منافقین کی یہ  
 بدگمانیاں بلاشبہ غلات و اُتعیات و غلات حقیقت تھیں کسی دلیل کی بنیاد پر ہرگز نہ  
 تھیں اور قرآن ان کی انہی بدگمانیوں کو ظن الجاہلیۃ سے تعبیر کر رہا تھا۔

قرآن نے ایک اور موقع پر ظن کو توڑا ہشتاتِ نفسانی کے متوازی ذکر کر کے اس  
 کی مذمت کی ہے مگر وہاں بھی اگر غور سے کام لیا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ ظنِ قرآن  
 کی نظر میں وہ مذموم ہے جو محض بے بنیاد خیالات پر مبنی ہو۔ سورہٴ نجم ہی کی ایک

آیت ہے :

<p>یہ لوگ نرمی اُنکلی اور اپنے نفس کی خواہش پر چل رہے          ہیں حالانکہ ان کے پاس ان کے پروردگار کی طرف          سے ہدایت آچکی ہے۔</p>	<p>إِنْ يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَهُوَ          الْاَنفُسُ وَلَقَدْ جَاءَهُمْ          رِیْضُ الْهَدٰی : نجم - ۲۳ -</p>
---	--

غور کیجئے اس آیت میں ظن کے متوازی نفسانی خواہشات کے ذکر سے جہاں ظن کی مذمت  
 ہوتی ہے وہاں ظن کے متقابل ہدایت کے ذکر سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ ظن وہی  
 مذموم ہے جو ہدایت پر مبنی نہ ہو محض بے بنیاد تخمینات کی پسند اور ہو۔ اس آیت کا سیاق  
 بھی یہی بتلا رہا ہے کہ وہ ظن جس کو و ما تھوی الا نفس کے ساتھ ملا کر ذکر کیا گیا وہ  
 کسی عقلی یا فطری دلیل پر مبنی نہ تھا بلکہ اپنے دماغ سے گھڑ کر ایک غلط خیال قائم کر لیا  
 گیا تھا اس آیت سے پہلی آیتوں کے مضمون میں غور کیجئے ذکر یہ ہو رہا ہے کہ مشرکین

مکہ نے بعض بتوں کو جن کو وہ دیوتا یا تصور کرتے تھے اللہ کی بیٹیاں جو بچہ رکھا ہے تو یہ سرے نام ہی نام ہیں جو انہوں نے اور ان کے باپ دادوں نے اپنی طرف سے بٹھرا لیے ہیں اللہ نے قرآن کے اس عمل پر کوئی دلیل نہیں اتاری مآ انزل اللہ بھا من سلطان (اللہ نے تو اس پر کوئی دلیل اتاری نہیں ہے۔ نجم - ۲۲) پھر اس کے بعد یہ متذکرہ بالا آیت ہے کہ یہ لوگ صرف اٹکل اور اپنے نفس کی خواہش پر چل رہے ہیں حالانکہ ان کے پاس ان کے رب کی طرف سے ہدایت آچکی ہے معلوم ہوا کہ اس آیت میں جس ظن کی مذمت ہے وہ یہی ہے جو بلا دلیل ہو۔

قرآن نے بعض آیات میں تو یہ بات بالکل ہی واضح کر دی ہے کہ قرآن کی نظر میں ظن مذموم وہ ظن ہے جو شک اور وہم کے ہم معنی ہے جس کی بنیاد محض غلط تباہات اور باطل انداز سے ہوا کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر قرآن کہتا ہے :

<p>وَالَّذِينَ اخْتَلَفُوا فِيهِ فَمَا شَلَّيْنَاهُمْ مِنْهُ مَا لَهُمْ بِهِ مِنْ عِلْمٍ الْاِتِّبَاعِ الظَّنِّ -</p>	<p>اور یہ لوگ (حضرت عیسیٰ علیہ السلام) کے بارے میں اختلاف کر رہے ہیں یہ ان کے بارے میں شک میں پر رہے ہوئے ہیں ان کے پاس کوئی علم تو ہے نہیں ہاں بس گمان کی پیروی ہے۔</p>
---	--

(نساء - ۱۵۷)

جن لوگوں کے متعلق اس آیت میں شک کی حالت میں ہونا بیان کیا گیا ہے انہی کے متعلق فرمایا جا رہا ہے کہ یہ لوگ ظن کی اتباع کرتے ہیں اس کا صاف مطلب یہ ہوا کہ قرآن کنایہ پر جانتا ہے کہ ان کے ظن کی بنیاد شک ہے اگر یہاں اصطلاحی ظن مراد ہوتا تو شک کے ساتھ اس کا ذکر بے معنی ہوتا کیونکہ اصطلاحی لحاظ سے تو شک اور ظن دو متقابل چیزیں ہیں مترادف نہیں ہیں اسی طرح ایک اور مقام پر قرآن نے ظن اور خرس (یعنی باطل تخمینے) کو باہم مترادف اور ہم معنی الفاظ کے طور پر استعمال کیا ہے۔ سورہ یونس کی ایک آیت ہے :

<p>وَمَا يَتَّبِعُ الَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ شُرَكَاءَ اَنْ يَتَّبِعُونَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُونَ (سورہ برنس - ۲۱)</p>	<p>اور وہ لوگ جو اللہ کے علاوہ شرکاء کو پکارتے ہیں یہ صرف خیال کے پیچھے پر رہے ہوئے ہیں اور محض (باطل) تخمینے لگاتے ہیں۔</p>
---	--

اس آیت کا اندازہ بیان بھی صاف بتلا رہا ہے کہ ظن کا خرص کے مترادف ہونا ہی ظن کے مذموم ہونے کا سبب ہے۔

غرض قرآن میں جہاں کہیں ظن کی مذمت بیان ہوئی ہے وہاں وہی ظن مراد ہے جو خود اپنے دماغ سے تراش لیا جائے۔ محولہ بالا آیات میں تائین نے دیکھ ہی لیا ان جملہ مواقع پر جتنے ظنون ہیں وہ سب نسی سنائی باتوں اور غلط قیاسات کا نتیجہ ہیں یہ سب وہ ظنون ہیں جو شریعت کے خلاف یعنی اللہ اور اس کے رسول کے بیان کردہ عقائد کے خلاف قائم کر لیے گئے ہیں۔ ان کا تو مذموم ہونا ظاہر ہے جب اللہ کی جانب سے حقیقات پہنچا دی جائے تو پھر تو اس کے خلاف نہ ظن معتبر ہوتا ہے نہ یقین۔ منکرین حدیث نے یہ سمجھ لیا ہے کہ ظن کی مذمت اس لیے کی گئی ہے کہ وہ ظن ہے حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔ انہوں نے اتنا نہ سوچا کہ وہ ظن جس کی مذمت قرآن میں کی گئی ہے وہ اگر یقین کے مرتبہ میں داخل ہو جائے تو اور زیادہ قابل مذمت ہو جاتا ہے جبکہ خبر واحد سے پیدا ہونے والا ظن اگر یقین کے مرتبہ پر پہنچ جائے تو منکرین حدیث کے نزدیک بھی مستحسن اور قابل اعتماد بن جاتا ہے۔ غور کا مقام ہے فرض کیجئے کسی خبر واحد کے بارے میں تحقیق کے بعد پتہ لگے کہ وہ خبر متواتر کی تمام صفات سے متصف ہے تو ظاہر ہے ہی کہا جائے گا کہ اس خبر میں جو طبیعت تھی وہ قطعیت میں تبدیل ہو گئی یعنی ظن ترقی کر کے یقین میں پہنچ گیا پھر خود منکرین حدیث کے نزدیک بھی اسی خبر پر عمل واجب ہو گا امن کا مطلب یہ ہوا کہ خبر واحد سے پیدا ہونے والا ظن یقین میں بدل جائے تو اور زیادہ وقیع ہو جاتا ہے اسی کے مقابلے میں وہ ظن جو محض اپنی دماغی ایجاد اور خواہش نفس کی بنا پر ہو اس کی حقیقت میں ذرا غور کیجئے وہ یقین کی حد میں داخل ہو گا تو اور زیادہ مذموم سمجھا جائے گا۔ بھلا وہ ظن جو محولہ بالا پہلی آیت میں کفار مکہ کو فرشتوں کے متعلق تھا یا وہ ظن جو دوسری آیت میں منافقوں کو اللہ کی نصرت کے بارے میں تھا یا اسی طرح وہ ظن جو مشرکین مکہ نے اپنی دیویوں کے بارے میں قائم کر لیا تھا یہ تمام ظنون جو قرآن نے بیان کیے ہیں بھلا یہ اگر یقین کے مرتبہ پر پہنچ جائیں تو کیا وقیع اور قابل اعتماد ہو جائیں گے؟ یقیناً نہیں! یہ تمام ظنون یقین میں

تبدیل ہو کر تو اور زیادہ مذموم بن جائیں گے۔ معلوم ہوا قرآن جس ظن کا ذکر کرتا ہے وہ مذموم ہے تو اس لیے نہیں کہ وہ محض ظن ہے یقین کی حد کو نہیں پہنچا بلکہ اس لیے ہے کہ اس کی حقیقت بے تحقیق بات اور باطل قیاس سے زیادہ کچھ نہیں۔ وہ ظنی احکام جو ظنی احادیث سے ثابت ہوں قرآن نے ان کے خلاف کہیں بھی کوئی اشارہ تک نہیں کیا۔

در اصل قرآن کی اصطلاح میں ظن، یقین اور شک کے بالمقابل کسی حالت کا نام نہیں ہے بلکہ انسان کے اپنے ہی ایک تخمینے کا نام ہے جو واقعات کی نوعیت کے لحاظ سے یقین اور وہم دونوں حالتوں کے ساتھ جمع ہو سکتا ہے۔ مثال کے طور پر قرآن ایک مقام پر نماز کا ذکر کرتے ہوئے غاشعین کے متعلق کہتا ہے :

<p>وَاللّٰهُ الْكَبِيْرُ ۝ اَلَا عَلَى الْغَاشِعِيْنَ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنْهُمْ مَلَا قُوْلًا ۖ تَمَّ (البقرة : ۲۵-۲۶)</p>	<p>وہ بہت گراں ہے مگر غاشعین پر نہیں جنہیں یہ خیال رہتا ہے کہ انہیں اپنے پروردگار سے ملنا بھی ہے۔</p>
--	---

اس آیت میں ظن یقین کے ساتھ جمع ہے اس لیے کہ نماز پڑھنے والے غاشعین کو قیامت کا ظن نہیں بلکہ کامل یقین حاصل تھا جیسا کہ قرآن خود اس بات کی گواہی دیتا ہے :

<p>وَبِالْآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُوْنَ (البقرة - ۴)</p>	<p>اور آخرت پر وہ پورا یقین رکھتے ہیں۔</p>
---	--

جب کہ دوسری مثال میں دیکھئے ظن وہم کے ساتھ بھی جمع ہے قرآن کفار کے متعلق کہتا ہے :

<p>اَلَا يَظُنُّ اُولٰٓئِكَ اَنْهُمْ مَبْعُوْثُوْنَ لِيَوْمٍ عَظِيْمٍ ۚ يَوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِوَجْهِ الْعَلَمِيْنَ (المنافقین : ۳-۶)</p>	<p>کیا انہیں ان کا خیال نہیں کہ انہیں ایک بڑے سخت دن میں زندہ اٹھایا جانا ہے یہ وہ دن ہے جس میں سب لوگ پروردگار کے روبرو کھڑے ہوں گے۔</p>
---	---

ظاہر ہے کفار کو قیامت کا یقین کب تک صرف وہم گئے دہے میں ایک مہموم سا خیال ضرور تھا جیسا کہ قرآن نے ان کا قول نقل کرتے ہوئے کہا ہے :

<p>مَا نَدْرِيْ مَا السَّاعَةُ اِنَّ لَّظَنًا وَمَا نَحْنُ بِمَسْتَیْقِنِيْنَ (جاثیہ : ۲۲)</p>	<p>ہم نہیں جانتے قیامت کیا چیز ہے ہمیں قیامت کا یقین خیال سا ہے ہم ہرگز اس پر یقین لانے والے نہیں۔</p>
--	--

چونکہ ظن یقین کے ساتھ بھی جمع ہو سکتا تھا اس لیے وما نحن بمستيقنین کے الفاظ اس بات کی تصریح کر رہے ہیں کہ کفار کا یہ ظن وہ ظن نہیں جس کے بعد یقین پیدا ہو سکے بلکہ یہ ان ادہام کے قبیلے کی چیز ہے جو جانب مخالف کے بارے میں یقین رکھتے ہوئے بھی دماغ میں اپنا گذر رکھ سکتی ہے۔

یہ دونوں مثالیں اس بات کی دلیل ہیں کہ قرآن کی نظر میں ظن یقین کے بالمقابل کسی چیز کا نام نہیں بلکہ اس خیال آرائی کا نام ہے جو انسانی فطرت کی سلامتی اور کجی کے اعتبار سے یقین اور وہم دونوں حالتوں کو اپنی ذات میں سموئے ہوئے ہے سلیم الفطرت انسان اکثر واقع کے مطابق ہی ظن کیا کرتا ہے جیسا کہ ناشعین کا لقاء رب کے بارے میں ظن کرنا اور کج فطرت انسان ہمیشہ اٹکل کے تیر چلاتا ہے اور وہم کی بھول بھلیوں میں ٹانگ ٹٹیاں مارتا ہے جیسا کہ کفار کا قیامت کے بارے میں موہوم سا خیال رکھنا۔

غرض اب تک کی بحث سے معلوم ہوا کہ وہ ظن جو قابلِ مذمت ہے وہ علم کی کسی کیفیت کا نام نہیں ہے بلکہ وہ محض خیال آفرینی اور قیاس آرائی ہے جبکہ اس کے بالعکس خبر واحد سے پیدا ہونے والا ظن علم ہی کی ایک قسم ہے۔ ہر وہ بات جو قرآن و حدیث نے بتائی یا صحابہ سے منقول ہوئی وہ علم ہے خواہ وہ قطعیت کے درجے میں ہو یا ظنیت کے درجے میں۔

صحابہ کے آثار میں غور کرنے سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ ہر وہ بات جو ان تک بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پہنچی ان کے لیے علم کی حیثیت کی حامل تھی ظن کے لفظ کا استعمال ان کے درمیان صرف اس رائے کے لیے کیا جاتا تھا جو محض اپنی عقل سے کسی شرعی ہیناد کے بغیر قائم کی جائے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک دن اپنے خطبے میں فرمایا:

اے لوگوں! جہاں تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے کا تعلق ہے سو وہ درست تھی کیونکہ اللہ آپ کی رہنمائی کرتا تھا ہماری رائے تو صرف ظن اور تکلف ہے۔

ایہا الناس ان الرای انہا کان من رسول اللہ حبیباً لان اللہ کان یرید و انہا ہو منّا الظن والتکامد (جامع بیان العلم)۔



حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ جو رائے اللہ کی ارادۃ اور اصابت کے ساتھ ہو حقیقی معنی میں صرف اسی کا نام رائے ہے اور صرف وہی درست اور ٹھیک ہے یعنی علم کی حیثیت صرف اسی کو حاصل ہے اس کے علاوہ جو رائے محض اپنی جانب سے ہو اللہ کی ارادۃ اسی میں شامل نہ ہو یعنی جس کی بنیاد قرآن اور حدیث پر نہ ہو وہ رائے کلمائے جانے کی مستحق ہی نہیں اس کو صرف ظن اور تکلف ہی کہا جاسکتا ہے۔

حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کا یہ دستور تھا کہ جب کسی معاملے کے متعلق انہیں کتاب و سنت میں کوئی فیصلہ نہ ملتا تو توقف فرماتے اور فیصلہ نہ دیتے پھر فرماتے اگر تم چاہو تو میں تمہیں اپنے ظن اور انکل سے بتلا دوں گویا یہ جملہ دیتے کہ ہر وہ بات جو کتاب و سنت کے علاوہ ہے وہ ظن اور انکل سے زیادہ کچھ نہیں۔

اپنی جانب سے تخمینہ اور خیال آرائی کے لیے صحابہ کبھی ظن اور تکلف کے الفاظ ساتھ ساتھ استعمال کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کے قول سے ظاہر ہے اور کبھی صرف ظن کا لفظ استعمال میں لاتے جیسا کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے کلام سے واضح ہے جبکہ کبھی اپنے تخمینوں کو صرف تکلف کے لفظ سے تعبیر فرماتے چنانچہ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کے ان الفاظ پر غور کیجئے :

اگر کسی کے پاس کوئی علم ہو تو وہ لوگوں کو سکھلا دے اور اگر علم نہیں رکھتا تو وہ بات منہ سے نہ نکالے جس کا اس کو علم نہیں تاکہ متکلفین میں اس کا شائبہ نہ ہو جائے۔

مَنْ كَانَ عِنْدَهُ عِلْمٌ فَلْيُعَلِّمِ النَّاسَ  
وَإِنْ لَمْ يَعْلَمْ فَلْيَقُولْ مَا لَيْسَ  
لَهُ بِهِ عِلْمٌ فَيَكُونَ مِنَ الْمُسْتَظْفِينَ  
(اعلام الموقعین ج ۱ ص ۵)

حضرت ابو موسیٰؓ کے ان الفاظ سے معلوم یہ ہوا کہ جب کبھی بات کا علم نہ ہو تو اپنی بے علمی چھپانے کے لیے اپنی جانب سے جو بات گھر لی جائے وہ تکلف ہے۔ آپ غور کریں تو

ظن کی حقیقت یہی یہی ہے کہ وہ محض اس خیال کا نام ہے جو خود اپنے دماغ سے تراش لیا جائے۔

ظن اور تکلف کے علاوہ اپنی طرف سے تھینز اور خیال آرائی کے لیے کبھی کبھی صحابہ مطلقاً رائے کا لفظ بھی استعمال کرتے تھے جیسا کہ حضرت ابو بکرؓ کا ایک قول ہے آپ فرمایا کرتے تھے کہ میں کس زمین کے اوپر اور کس آسمان کے نیچے رہ سکتا ہوں اگر قرآن کی کسی آیت میں صرف اپنی رائے سے کوئی بات کہوں یا ایسی بات کہوں جس کا مجھے علم نہیں ہے۔ مگر ایسی صورت میں وہ رائے جو کتاب اللہ یا سنت رسول اللہ کے تحت ہوتی تھی اس کو مطلقاً رائے نہیں کہا جاتا تھا بلکہ کتاب و سنت کی قید لگا کر اس کو عمیز کر دیا جاتا تھا چنانچہ حضرت عبداللہ بن عباس کے ایک قول میں اس تقسیم کی طرف اشارہ موجود ہے آپ فرمایا کرتے

جس نے کوئی ایسی رائے ایجاد کی جو قرآن میں نہیں اور نہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے موافق ہے وہ نہیں جانتا کہ اسی قیامت میں اس کا کیا عسر ہو گا۔

من أحدث رأياً ليس في كتاب  
الله ولم ينفذ به سنة من  
رسول الله لم يدر على ما هو منه  
إذا نقى الله عن وجهه

(اعلام الموقعين ج ۱ ص ۴۵)

غرض صحابہ کے یہ تمام اقوال اس بات پر شاہد ہیں کہ ظن جسے صحابہ تکلف اور رائے سے بھی تعبیر کرتے تھے وہ علم کی کسی قسم کا نام نہیں تھا بلکہ صرف تھینز یا توں کو ظن کہا جاتا تھا اس کے مقابلے میں ہر وہ بات جو کلام اللہ یا سنت رسول اللہ کے ذریعے ان تک پہنچتی صحابہ کے نزدیک اسے علم کا درجہ حاصل تھا متذکرہ بالا اقوال صحابہ میں ظن اور تکلف کے بالمقابل علم کا بطور خاص ذکر بھی اسی حقیقت کی طرف رہنمائی کرتا ہے کہ ظن اور علم ان کے یہاں دو متقابل چیزوں کا نام تھا۔

جس طرح اپنی رائے اور اپنے تخمینوں کے لیے ظن کے لفظ کا استعمال صحابہ کے  
یہاں رائج تھا اسی طرح ہر وہ بات جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہو خواہ وہ  
خبر واحد ہی کے درجے میں کیوں نہ ہو اس کے لیے صحابہ کے یہاں علم کی اصطلاح کا  
رواج تھا۔ اس کے لیے بہترین شہادت وہ واقعہ ہے جو ملک شام کی طرف حضرت  
عمرؓ کے تاریخی سفر میں پیش آیا اور جس کا ذکر ہم اوپر بھی کہیں کر چکے ہیں طاعون زدہ  
علاقوں میں رہتے نہ رہتے کے متعلق بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث جب حضرت  
عبدالرحمن بن عوفؓ نے حضرت عمرؓ کے سامنے پیش کی تو نقل کرنے سے پہلے فرمایا میرے  
پاس اس مسئلے کے متعلق ایک علم ہے۔ ظاہر ہے یہ حدیث خبر واحد تھی کہ اس کے  
راوی اکیلے حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ ہی تھے اس خبر واحد کو حضرت عبدالرحمن بن  
عوفؓ نے علم سے موسوم کیا اور اسی علم کی بنیاد پر حضرت عمرؓ آگے سفر جاری رکھنے  
کے بجائے واپس مدینہ لوٹ آئے۔

صحابہ کے بعد تابعین اور ائمہ مجتہدین و محدثین کے درمیان بھی ظن اور علم یارائے  
اور علم دو متقابل چیزوں کے طور پر مسلم رہے ابن سعد نے طبقات میں حضرت عطاء  
بن ابی رباح کے حال میں لکھا ہے کہ ابن جریج کہا کرتے تھے :

عطاء جب کوئی روایت بیان کرتے تو میں پوچھتا  
کہ علم ہے یا رائے اگر حدیث ہوتی تو کہتے علم ہے  
اور اگر رائے ہوتی تو کہتے کہ رائے ہے۔

كَانَ عَطَاءٌ إِذَا حَدَّثَ بِشَيْءٍ  
قَالَ: "عِلْمٌ أَوْ رَأْيٌ فَإِنْ كَانَ  
أَمْرًا قَالَ عِلْمٌ وَإِنْ كَانَ رَأْيًا قَالَ  
رَأْيٌ" (طبقات ابن سعد ۱ ص ۲۴۵)

امام اوزاعی فرمایا کرتے تھے کہ علم صرف وہ ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم  
کے صحابہ سے منقول ہو اور جو ان سے منقول نہیں وہ علم ہی نہیں ہے۔

**ظن کی حجیت** | ظن کے صحیح مفہوم کی اس تحقیق کے بعد کیا اس امر میں کسی شبہ کی کوئی گنجائش باقی رہ جاتی ہے کہ ظن صرف وہ مذموم اور قابل رد

ہے جو محض تکلف اور خود ساختہ رائے پر مبنی ہو۔ بلکہ وہ ظن جو ضرور احسن سے حاصل ہوتا ہے اس کے قابلِ مذمت ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اس لیے کہ وہ علم ہی کی ایک قسم ہے اسے قبول کیے بغیر چارہ ہی نہیں۔ دیکھا جائے تو انسان کے تمام دلائل کی پروا صرف ظن ہی کی حد تک محدود ہوتی ہے اس کے بعد یقین کا حاصل ہونا صرف اللہ تعالیٰ کی بخشش پر منحصر ہے۔ انسان تو جس حد تک مکلف ہے وہ صرف تحصیلِ ظن ہے یقین کی وہ منزل جس میں جانبِ مخالفت کا گذر تک نہ ہو بہت نادر ہے۔ اگر تمام شریعت کی بنیاد ایسے ہی یقین پر قائم مانی جائے تو فردعات تو درکنار اصول کے بہت سے مسائل بھی دلائل کی روشنی میں اس قسم کے یقین کی حد تک ثابت ہونا مشکل ہیں۔ اسی لیے تحصیلِ یقین کا ذریعہ صرف ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ انبیاء علیہم السلام کے اعتماد پر ان کی تمام باتوں کو بے دلیل مان لیا جائے۔ احکام الہیہ میں غور کیجئے جہاں ہمیں بلا تردد یقین رکھنے کا مکلف بنایا گیا ہے وہاں دلائل کی تحصیل کا حکم نہیں دیا گیا اور جہاں اجتہاد و استدلال کا حکم دیا گیا ہے وہاں یقین کے آخری مراتب کا مکلف نہیں بنایا گیا بلکہ ظن ہی کو یقین کا حکم دے دیا گیا ہے اس لیے کہ انسان کے دلائل کی پروا محدود ہی صرف تحصیلِ ظن تک ہے۔

اگر ہر ہر قدم پر یقین کا حاصل کرنا فرض کر دیا جاتا تو دین و دنیا دونوں کے نظام معطل ہو کر رہ جاتے جیسا کہ اس مضمون کی ابتدا میں ہم نے اس پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ دراصل شہادت اور خارجی دلائل کی روشنی میں جو نتیجہ حاصل ہوتا ہے اس کا نام ظن ہے ہی نہیں وہ یقین ہی ہے خواہ عقلی طور پر اس میں کتنے ہی شبہات باقی رہیں مثلاً اگر ایک کنویں میں نجاست کا گرنا ثابت نہیں ہو سکا تو اس کو پاک منہ بیتی ہو گا حالانکہ یہ احتمال ہر وقت ممکن ہے کہ اس میں نجاست گر گئی ہو اور اس کا ہمیں علم نہ ہو لیکن جب اس احتمال کے لیے کوئی شہادت موجود نہیں تو اس کا اعتبار

بھی نہیں۔ ہر حال اس میں ایک لمحہ کے لیے بھی کسی شبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ مسائل فروجیہ میں ہرگز اس یقین کا اعتبار نہیں ہے جو تواتر سے حاصل ہوتا ہے بلکہ ہر وہ یقین جو دلائل کی رہبری و رہنمائی میں حاصل ہو جائے وہ بھی بلا تردد معتبر ہے اب خواہ آپ اس کا نام یقین نہ لکھیں خواہ اسے ظن سے تعبیر کریں۔

در اصل منکرین حدیث کو غلط نفی محدثین کے اس بیان سے لگ گئی کہ خبر متواتر علم یقین کو مفید ہوتی ہے اور خبر واحد علم یقین کو مفید نہیں ہوتی وہ محدثین کے اس بیان کو پوری طرح سمجھ نہیں سکے انہوں نے سوچا کہ جب خبر واحد مفید علم یقین نہ ہوتی تو یقیناً مفید علم ظن ہوتی نہ تھا خبر متواتر کے علاوہ جتنی حدیثیں ہیں وہ سب ظنیات کا مجموعہ ہیں اور ظن ہی کو مفید ہیں حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ محدثین نے جن علم کو خبر متواتر کے ساتھ مخصوص کیا ہے وہ صرف علم بدیہی ہے یعنی وہ علم جو کسی دلیل و برہان کے بغیر حاصل ہوتا ہے جیسا کہ آفتاب کے وجود کا علم کہ ہر مسلم و کافر، ہر جوان اور بوڑھا اور ہر احمق و عاقل شخص اس کے وجود کا علم رکھتا ہے اور اس کے لیے کسی دلیل کا محتاج نہیں لیکن ظاہر ہے ایسا علم صرف اپنے مشاہدات پر ہی حاصل ہو سکتا ہے اس کے سوا اگر ہزاروں افراد بھی کسی بات کو نقل کریں تو اس قسم کا علم حاصل نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر دیکھئے لاکھوں کروڑوں انسان حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق ابن اللہ کا عقیدہ رکھتے ہیں یا لاکھوں کروڑوں انسان ایسے ہیں جو آدا گران کے قائل ہیں مگر ان کروڑوں انسانوں کی خبر کے بعد بھی یقین تو مدکنا اس کا ظن بھی پیدا نہیں ہوتا اس لیے کہ یہاں خبر متواتر کی اور شرطوں کے علاوہ سب سے بڑی یہ شرط مفقود ہے کہ اس کا مبنی امر محسوس نہیں بلکہ امر معقول ہے اور اتنی بات تو منکرین حدیث بھی مانتے ہیں کہ خبر متواتر کے لیے شرط یہ ہے کہ اس کا مبنی امر محسوس ہو۔ نیز اس خبر کو سننے ہی سامع کو یقین حاصل ہو جائے اور وہ کسی دلیل کا محتاج نہ رہے۔

معلوم ہوا محدثین نے خبر واحد سے جس علم کی نفی کی تھی وہ علم بدیہی تھا منکرین حدیث اپنی نا سمجھی کی بنا پر خبر واحد سے مطلق علم ہی کی نفی کر بیٹھے۔ محدثین کے تذکرہ بالا

قول کا مطلب یہ تھا کہ خبر واحد سے جو علم حاصل ہوتا ہے وہ خبر متواتر کی طرح علم بدیہی نہیں ہوتا بلکہ کبھی ظنی ہوتا ہے اور کبھی نظری۔ یہی وجہ ہے کہ خبر متواتر سے علم حاصل ہونے میں سب لوگ یکساں ہوتے ہیں خواہ ان میں غور و فکر کی صلاحیت ہو یا نہ ہو لیکن خبر واحد سے علم حاصل کرنا صرف ان لوگوں کا کام ہے جن میں نظر و فکر کی اہلیت موجود ہو خبر واحد سے ہر شخص کو یکساں علم حاصل نہیں ہو سکتا یہی وجہ ہے کہ خبر متواتر میں سند سے بحث کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی جبکہ خبر واحد میں یہ ضرورت باقی رہتی ہے۔

اب خبر متواتر کے ساتھ علم بدیہی کی شرط رکھ کر غور کیجئے اگر تمام دین کی بنیاد علم بدیہی ہی پر قائم کی جائے تو اس کا نتیجہ اس کے سوا اور کیا نکلے گا کہ تمام دین کو قطعی طور پر حاصل کرنے کے بجائے پورے دین سے ہی ہاتھ دھونا پڑے گا۔ عقائد اصول شرائط، منہیات اور دین کے تمام نظری مسائل سب ظنی ہو جائیں گے اور منکرین حدیث کی دلیل کے مطابق قابل اعتبار نہ دیں گے۔

منکرین حدیث ذرا یہ تو بتلائیں کہ اگر ظن ان کی نظر میں ایسا ہی قابل رد ہے تو ان احکام کے متعلق ان کی کیا رائے ہے جو قرآن کریم سے ظنی طور پر ثابت ہیں کیا وہ بھی خبر واحد کی طرح ان کے نزدیک مساؤ اللہ قابل رد ٹھہریں گے؟ قرآن کا ایک ایک حرف اگرچہ متواتر ہے لیکن اس کے باوجود اس کے جو مسائل فروعیہ اس سے مستنبط ہوتے ہیں ان کے متواتر ہونے کا دعویٰ کوئی نہیں کر سکتا کیونکہ ضروری نہیں کہ جبکا ثبوت قطعی ہو اس کی دلالت بھی قطعی ہو آیات قرآنیہ یقیناً تمام کی تمام قطعی الثبوت ہیں ان کے ثبوت میں ذرہ برابر کسی قسم کا شبہ نہیں لیکن کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ ہر آیت قطعی الدلالت بھی ہے۔ ظاہر ہے نہیں، آیات قرآنی دلالت علی المعنی میں باہم مختلف ہیں بعض آیات کی دلالت کسی معنی اور مفہوم پر قطعی ہے جبکہ بعض آیات کی دلالت کسی خاص مفہوم اور خاص معنی پر ظنی ہے مثال کے طور پر قرآن کا کوئی لفظ ہے کہ اس کے معنی میں ائمہ لغت کا اختلاف

ہے یا کوئی اعرابی مسئلہ ہے کہ ائمہ نحو اس میں مختلف رائے رکھتے ہیں یا اسی طرح کوئی کوئی بلاغی مسئلہ ہے کہ ائمہ بلاغت کے اس میں مختلف اقوال ہیں تو ایسی صورت میں وہ انظر قرآنی متعدد معانی کو محتمل ہو گا چنانچہ اس کی دلالت اپنے معنی پر قطعی نہ ہوگی بلکہ کئی ہوگی اور جو احکام اس قسم کے الفاظ پر مشتمل آیات سے ثابت ہوں گے ظاہر ہے وہ بھی قطعی ہوں گے قطعی نہ ہوں گے، لہذا اگر اہل آحاد ظنی ہونے کی وجہ سے متقابل رد ہیں تو منکرین حدیث ذرا بتلائیں کہ وہ احکام جو قرآن کریم سے قطعی طور پر ثابت ہیں یک وہ بھی آپ کے نزدیک معاذ اللہ قابل رد ہیں۔

اسی طرح منکرین حدیث کی ان احکام قرآنی کے متعلق کیا رائے ہے جن کا معنی کوئی امر غیر محسوس ہے کیا وہ سب متواتر کی تعریف پر پورے اترتے ہیں؟ معنی غیر محسوس ہونے کی بنا پر متواتر کی فرست سے تو وہ نکل گئے کیا ان احکام کو بھی قبول کرنے سے انکار کر دیا جائے گا؟ سوچنے کی بات ہے قرآن کو متواتر کہنے کا کیا مطلب ہے؟ لہذا کہ یہ وہی قرآن ہے جو بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا تھا اس کے علاوہ جتنے اس کے غیر محسوس احکام ہیں جتنے عالم غیب کے اسرار و حقائق ہیں کیا وہ سب بھی متواتر ہیں؟ کیا تواتر کی ساری شرائط ان میں موجود ہیں؟ کیا سامع کو سننے کے ساتھ ہی فوراً ان تمام غیر محسوس احکام پر عالم غیب کے ان تمام اسرار و حقائق پر بلا دلیل یقین حاصل ہو جاتا ہے؟ ظاہر ہے ایسا نہیں ہے قرآن اگر متواتر ہے تو اس کے معنی صرف یہ ہیں کہ اس کے الفاظ تواتر کے ساتھ سنے گئے ہیں جب احکام کا مرحلہ آئے گا تو اکثر آیات کا مفہوم غیر محسوس ہونے کی بنا پر متواتر نہ رہے گا اور جو متواتر نہ ہو وہ مفید یقین نہیں ہوتا تو کیا منکرین حدیث ان تمام احکام کا انکار کر دیں گے؟

غرض دین کے تمام احکام کو اگر تواتر کی شرط کے ساتھ مشروط کر دیں گے تو فردعی مسائل تو درکنار بہت سے اصولی احکام کو بھی ثابت کرنا مشکل ہو جائے گا لہذا یہ ماننے بغیر چارہ نہیں کہ خبر واحد سے حاصل ہونے والا علم ظنی ہونے کے باوجود متقابل قبول اور موجب عمل ہے بشرطیکہ وہ خبر کسی سچے اہل ثقہ راوی سے مروی ہو نیز کوئی دلیل قطعی اس

کے مصادیق نہ ہو۔

شریعت نے کسی خبر کی تصدیق کا معیار تو اتر رکھا ہی نہیں بھال بھی زور دیا ہے راوی کی عدالت پر اور اس کے صدق پر زور دیا ہے۔ شریعت نے جان تک کے معاملے میں دو شخصوں کے بیان کا اعتبار کر لیا ہے اور ایک جگہ بھی خبر کی تصدیق کے لیے تو اتر کی شرط نہیں لگائی اگر دو شخصوں کے بیان پر ایک مسلمان کو قصاصاً قتل کیا جاسکتا ہے یا ایک چور کا ہاتھ کاٹا جاسکتا ہے یا ایک شخص پر حد قذف لگائی جاسکتی ہے یا لاکھوں کروڑوں کی مالیت تقسیم کی جاسکتی ہے تو کیا یہ اس بات کا بدیہی ثبوت نہیں ہے کہ شریعت نے یقین کا معیار تو اتر نہیں رکھا کیا یہ سمجھنا کسی طرح بھی درست ہوگا کہ شریعت نے ایک مسلمان کا قتل، ایک معصوم ہاتھ کا قطع ایک بے گناہ پر حد قذف اور لاکھوں کروڑوں کی مالیت کی تقسیم جیسے معاملات کو یقین حاصل ہوئے بغیر محض ظن کی بنا پر ہائز قرار دے دیا ہے۔ دینی ثبوت کے لیے یقین کا مطالبہ تو معقول ہو سکتا ہے مگر تو اتر کی شرط لگانا بالکل بے معنی بات ہے۔ منکرین حدیث یا تو یہ ثابت کر کے دکھائیں کہ شریعت نے تو اتر کے علاوہ یقین کو یقین ہی نہیں کہا یا پھر یہ ثابت کریں کہ خبر واحد کسی صورت بھی مفید یقین ہوتی ہی نہیں اگر خارجی قرائن ملا کر کبھی خبر واحد بھی یقین کا نائدہ دے سکتی ہے اور شریعت کے نزدیک یہ یقین معتبر بھی ہے تو پھر یہ تفریق کہ اس قسم کا یقین دین میں معتبر ہے اور اس قسم کا نہیں بالکل غیر معقول اور لایعنی بحث ہے۔ جی ہاں کہ یقین کا افادہ صرف تو اتر میں منحصر نہیں بلکہ جب متفرق دلائل اور خارجی و داخلی قرائن کی ایک امر کی شہادت دیتے چلے جائیں تو اس میں لفظی تو اتر نہ سہی مگر ایک قسم کا معنی تو اتر ضرور پیدا ہو جاتا ہے اور اس مجموعے سے یقین حاصل ہو جاتا ہے۔

خبر واحد کی فہمیت پر اب تک جو گفتگو ہوئی ہے اس سے یہ بات اگرچہ ثابت ہو چکی ہے کہ خبر واحد مفید علم لینی ہونے کے باوجود قابل استناد اور موجب عمل ہے تاہم اس ضمن میں ایک آخری بات کہہ کر ہم اس بحث کو ختم کرتے ہیں اور منکرین حدیث کی دوسری دلیل کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔



علامہ ابن حزم نے الاحکام میں خبر واحد کی حجیت پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اخبار آحاد کی حجیت کا جہاں تک تعلق ہے تو وہ ظنی نہیں بلکہ قطعی ہے اس لیے کہ عمر صحابہ رضی اللہ عنہم نے کہ آج تک اس بات پر علماء کا اجماع مستند ہوتا چلا آ رہا ہے کہ خبر واحد حجیت ہے اب اس پر کسی کا اختلاف بھی ہو تو وہ ظاہر ہے اجماع پر افرانہ لازم نہیں ہو سکتا اس لیے ثابت ہوا کہ خبر واحد کی حجیت کی تعمیل ایک ظنی دلیل کی پیروی نہیں بلکہ ایک قطعی دلیل یعنی اجماع کا اتباع ہے ۔

**أصول وفروع کا فرق** | آپ آئیے منکرین حدیث کی دوسری دلیل کی طرف، خبر واحد کی عدم حجیت کے بارے میں ان کی دوسری دلیل یہ ہے کہ جب اصول و عقائد میں خبر واحد پر عمل درست نہیں تو فرد علت میں بھی درست نہیں ان کے خیال کے مطابق خبر واحد اگر موجب عمل و قابل استناد ہے تو نہ اصول و فروع دونوں میں ہونا چاہیئے اور اگر اصولیات میں وہ قابل استناد نہیں تو پھر فروعیات میں بھی اس کا قابل استناد ہونا جائز نہیں ۔

منکرین حدیث کی اس دلیل کا یہ حاسرہ مطلب یہ ہے کہ وہ چاہتے ہیں کہ یا تو قطعی دلائل کے وجوب کے سلسلے میں فروع کو بھی اصول و عقائد پر قیاس کیا جائے یا پھر ظنی دلائل کے موجب عمل ہونے کے لیے اصول و عقائد کو بھی فروع پر محمول کیا جائے اور یہ دونوں باتیں محالات کی فہرست میں آتی ہیں نہ فروع کو اصول پر قیاس کیا جاسکتا ہے اور نہ اصول کو فروع پر ۔ یہ اس قدر بدیہی بات ہے کہ اس سے اختلاف و نزاع صرف وہی شخص کر سکتا ہے جس کا مقصود مناظرہ بازی سے زیادہ کچھ نہ ہو ۔ کیا یہ بات بھی کسی دلیل کی محتاج ہے کہ اجماع دین دین کی بنیاد ہوتے ہیں اگر وہ ظنی ہوں گے تو دین کی بنیاد ہی کا ظنی امور پر قائم ہونا لازم آئے گا جبکہ فروع پر دین کی بنیاد قائم نہیں ہوتی وہ اصول دین کے ماتحت ہوتے ہیں اگر فروعیات میں ظنیت ہو تو کوئی نقصان لازم نہیں آتا اس لیے

کہ اصول جن کی دراصل وہ مخالفت میں ہیں وہ خود اپنی جگہ قطعیت لیے ہوئے ہیں اس کی مثال بالکل قانونی دفعات کی سمجھنے قانون کے الفاظ اپنے اجمال کے ساتھ قطعی ہوتے ہیں اور اس کی ضمنی دفعات و تشریحات بسا اوقات ظنی ہوتی ہیں۔ فروع کے لیے قطعیت کا مطالبہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی یہ مطالبہ کرتے لگے کہ کسی ملک کے آئین اساسی کو تمام جزئی قوانین کا احاطہ کیے ہوئے ہونا چاہیے جس طرح اس مطالبے کو ہر کوئی غیر معقول اور ناقابل عمل کہے گا اسی طرح یہ مطالبہ بھی غیر معقول اور ناقابل عمل ہی کہلائے گا کہ فروع کے لیے بھی دلیل قطعی کا ہونا لازمی ہے۔

فروعات میں جن ظنیات کا اعتبار ہے وہ سب وہ ظنیات ہیں جو کسی نہ کسی قطعی اصل کے ماتحت درج ہیں۔ ایسی ظنیات کا دین میں کوئی اعتبار نہیں بن کے لیے کسی قطعی اصل کی شہادت موجود نہ ہو بلکہ امام شاطبی کی تحقیق کے مطابق تو ایسی ظنیات کا دین میں وجود ہی کوئی نہیں امام شاطبی نے المواقعات میں دلائل شرعیہ کی چار قسمیں بیان کی ہیں اول دلیل قطعی دوم وہ دلیل ظنی جو کسی قطعی اصل کے ماتحت ہے سوم وہ دلیل ظنی جو کسی قطعی کے معارض ہے اور دوسری کوئی قطعی دلیل اس کے لیے شاید بھی نہیں ایسی ظنی دلیل یقیناً قابل قبول نہیں اور چہارم وہ دلیل ظنی کہ نہ اس کی موافقت میں کوئی دلیل قطعی ہاتھ آئے نہ مخالفت میں۔ اس چوتھی قسم کے متعلق امام شاطبی فرماتے ہیں :

والاستقرار يدل على انه غير موجود (المواقعات جلد ۳ ص ۱۱)

بہر حال جب یہ ثابت ہے کہ تمام فروعات کسی نہ کسی قطعی اصل کے ماتحت مندرج و مندرج ہیں تو ان کے ظنیات پر قائم ہونے سے کوئی نقصان لازم نہیں آتا بخلاف اصولیات کے کہ ان کا قیام بھی اگر ظنیت پر ہو تو دین کی بنیاد ہی محل نظر بن کر رہ جائے گا۔ اصول و فروع کو اپنے اپنے ثبوت میں ایک دوسرے پر قیاس نہیں کیا جاسکتا۔

ذوالیہدین کی بات تسلیم کرنے میں  
نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا تامل

خبر واحد کی عدم حجت کے سلسلے میں  
منکرین حدیث کی تفسیری دلیل ذوالیہدین نامی  
صحابی کی بات پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم

کے تامل سے متعلق ہے۔ ذوالیہدین ایک صحابی کا لقب تھا ان کے ہاتھ بہت لمبے تھے  
اسی لیے ان کا یہ لقب پڑ گیا تھا یہ واقعہ اس طرح پر ہے کہ ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ  
علیہ وسلم نے نماز عصر پڑھائی اور بھول کر بجائے چار فرضوں کے دو رکعت پڑھی سلام  
پھر دیا مقتدیوں میں حضرت ابوبکر و عمرؓ بھی تھے اور کسی کو تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم  
سے اس بارے میں پوچھنے کی ہمت نہ ہوئی ذوالیہدین نامی صحابی نے سوال کیا یا رسول  
اللہ کیا نماز کم ہو گئی یا آپ بھول گئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”نہیں  
بھولا اور نہ نماز کم ہوئی“ پھر آپ نے دوسرے صحابہ سے استفسار کیا کہ کیا ذوالیہدین  
کی بات صحیح ہے حضرت ابوبکر و عمرؓ اور دوسرے شہکار نماز نے اس کی تائید کی تو آپ  
نے نماز کو درست کر لیا۔ یہ واقعہ امام بخاری نے حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت  
کیا ہے۔

اس واقعے سے منکرین حدیث کا استدلال یہ ہے کہ اگر خبر واحد حجت ہوتی تو  
آپ صرف ذوالیہدین کے کہنے پر نماز درست فرما لیتے ذوالیہدین کی بات سن کر دوسروں  
سے آپ کا اس بارے میں استفسار کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم  
کے نزدیک خبر واحد موجب عمل نہ تھی۔

اس سلسلے میں ہمیں منکرین حدیث سے سب سے پہلے تو یہ پوچھنا ہے کہ جس مجموعہ  
احادیث سے آپ یہ محولہ بالا حدیث اپنے موقف کی تائید میں لائے ہیں اسی مجموعے  
میں وہ احادیث بھی تو ہیں جن سے آپ کے موقف کی کھلی تردید ہوتی ہے۔ اپنی تائید  
میں تو آپ کو صرف ایک حدیث ہی مل سکی ہے جبکہ آپ کی تردید کرنے والی احادیث  
بے شمار ہیں۔ صرف اس ایک حدیث کو قبول کرنے اور دوسری تمام احادیث کو  
رد کر دینے کے لیے آپ کے پاس کیا دلیل ہے۔ نو دس احادیث تو ہم نے ہی اس

زیر نظر تحریر میں آپ کے موقف کے رد میں پیش کی ہیں اس قسم کی احادیث آخر آپ کی توجہ کا مرکز کیوں نہ بنیں ؟

علاوہ انہیں اس محولہ بالا حدیث سے بھی منکرین حدیث کا استدلال اس وقت درست ہوتا جبکہ یہ کہا جا رہا ہو تاکہ خبر واحدہ حالت میں قابل قبول اور معتبر ہے یہ دعویٰ تو کسی کا بھی نہیں کہ خبر واحدہ کو بغیر کسی چھان بین کے قبول کر لو راوی کی عدالت و ثقاہت کی کوئی پرواہ نہ کرو روایت میں وہم و غلطی کی کوئی علامت ہو تو اس پر بھی کوئی دھیان نہ دو بس خبر واحدہ سنتے ہی اس کو موجب عمل جان لو۔ خبر واحدہ کے بارے میں ایسی بات تو کوئی بھی نہیں کہتا۔ قابل قبول معتبر اور موجب عمل تو وہی خبر واحدہ ہے جو کسی سچے اور ثقہ راوی سے مروی ہو راوی میں مطاعن و روایت میں سے کوئی طعن نہ ہو اور کوئی دلیل قطعی اس کے معارض نہ ہو۔

اب ذوالیہدین والی روایت میں غور کیجئے۔ ذوالیہدین کی بات تسلیم کرنے میں بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس لیے تامل ہوا کہ مبادا انہیں وہم ہو گیا ہو یا فی شرکاء نماز کے بارے میں بہ صراحت یہ بات آئی ہے کہ وہ بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بارے میں کچھ پوچھتے ہوئے در رہے تھے جب ہاتھی نمازیوں نے یہ بات نہیں کہی تھی تو آپ کو کیلئے ذوالیہدین کی بات پر وہم کا گمان ہوا اور اس میں کسی کو بھی کلام نہیں کہ خبر واحدہ میں اگر وہم کی کوئی علامت پائی جاتی ہو تو اس میں توقف واجب ہے۔ بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اسی لیے توقف فرمایا کہ وہم کی علامت موجود تھی جب دیگر حاضرین نے تائید کر دی تو ذوالیہدین کی خبر واحدہ سے وہم کا احتمال جاتا رہا چنانچہ آپ نے اسے قبول کر لیا ۛ

بعض صحابہ کے طرز عمل سے غلط استدلال

خبر واحدہ کی عدم حجیت پر منکرین حدیث کی چوتھی دلیل کا تعلق بعض صحابہ کے ایسے طرز عمل سے ہے جو بظاہر خبر واحدہ کی حجیت کے خلاف نظر آتا ہے۔

وہ لوگ مختلف صحابہ کا حوالہ دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ ان کے طرز عمل سے ظاہر ہوتا ہے

کہ وہ خبر واحد پر عمل نہیں کرتے تھے مثلاً حضرت ابو بکرؓ نے دادی کی میراث سے متعلق حضرت میسرہ بن شعبہؓ کی روایت کو اس وقت تک قبول نہ کیا جب تک حضرت محمد بن مسلمہؓ نے اس کی تائید نہ کر دی اسی طرح حضرت عمرؓ نے طلب اذن کے بارے میں حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کی روایت پر شہادت طلب کی اور جب حضرت ابوسعید خدریؓ نے شہادت دی تب آپؐ نے اسے قبول کیا۔ علیؓ ہذا القیاس حضرت علیؓ کا حوالہ دیتے ہوئے منکرین حدیث کہتے ہیں کہ آپؐ کے بارے میں یہ ثابت ہے کہ آپ صحت لیے بغیر کسی کی روایت قبول نہیں کیا کرتے تھے۔ نیز حضرت عائشہؓ کے بارے میں منقول ہے کہ انہوں نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی اس روایت کو قبول نہیں کیا تھا کہ گمراہوں کے روئے سے میت کو سزا دی جاتی ہے۔

منکرین حدیث کی یہ دلیل بھی باقی دوسری دلیلوں کی طرح بالکل بے بنیاد ہے یہ ایک حقیقت ثابتہ ہے جس میں کسی شبہ کی کوئی گنجائش نہیں کہ صحابہ اخبار اہل بیتؑ کرتے تھے۔ ابھی ہم خبر واحد کی حیثیت اور عہد صحابہؓ کے ذیلی عنوان کے تحت متعدد حوالوں سے یہ بات ثابت کر آئے ہیں منکرین حدیث کی بجانب سے پیش کردہ ان متذکرہ بالا خاص خاص حوالوں کے بارے میں بھی اس کتاب کے پہلے حصے میں ہم نے حفاظت حدیث اور خلفائے راشدینؑ کے عنوان کے تحت بڑی سیر حاصل بحث کی ہے ناظرین براہ کرم ذرا پھر اس پوری بحث پر نظر ڈال لیں۔

منکرین حدیث نے حضرت ابو بکر صدیقؓ رضی اللہ عنہ کا میراث جہدہ کے متعلق جو واقعہ بیان کیا ہے اس سے خبر واحد کی عدم حیثیت کسی طرح ثابت نہیں ہوتی حضرت ابو بکرؓ نے حضرت میسرہ بن شعبہؓ کی روایت قبول کرنے سے یہ تو کہا ہی نہیں جاسکتا کہ انکار کیا تھا زیادہ سے زیادہ یہی کہا جاسکتا ہے کہ توقف کیا تھا تو وقت بھی اس لیے نہیں کیا تھا کہ آپ خبر واحد کو قبول نہ کرتے تھے بلکہ صرف اس لیے کیا تھا کہ آپ اصولی طور پر یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ کوئی بات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف محض منسوب کر دینے سے ہی قابل قبول نہیں ہو جاتی بلکہ تہاں بین اور تحقیق و تفتیش کے بعد یہ یقین حاصل

کرنا ضروری ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اس بات کو منسوب کرنے میں کسی غلط بیانی یا مہو کا دخل تو نہیں۔ اسلام میں دادی کے لیے ترکہ کا چھٹا حصہ مقرر ہے چونکہ یہ ایک ایسا مسئلہ تھا جس پر قسطنطنیہ صراحتہ روشنی نہیں ڈالی اس لیے اس کی تعمیل کرنے میں زیادہ حزم و احتیاط کی ضرورت تھی حضرت میخزومہؓ کی روایت پر حضرت ابوبکرؓ کا گواہی مانگنا اعتماد کی شرط کے طور پر نہ تھا بلکہ محض مزید اطمینان کی ایک تدبیر تھی۔ آپ اپنے طرز عمل سے یہ سبق سکھانا چاہتے تھے کہ دین کا وہی حصہ کیوں نہ ہو جس کی بنیاد اخبار آحاد پر ہے اس کے رد کرنے یا قبول کر لینے میں لاپرواہی سے کام نہیں لینا چاہیے۔

بالکل یہی بات حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے حضرت ابوموسیٰؓ کی روایت پر شہادت طلب کرنے کے بارے میں بھی کہی جاسکتی ہے۔ یہ مطالبہ اس لیے ہرگز نہ تھا کہ تنہا حضرت ابوموسیٰؓ کی روایت پر حضرت عمرؓ کو اعتماد نہ تھا کیونکہ اسی نوعیت کی تہنارادیوں کی روایت کردہ نہ جانے کتنی حدیثوں پر حضرت عمرؓ سے بار بار اعتماد کرنا ثابت ہے بلکہ تائید کا یہ مطالبہ صرف اس لیے تھا کہ تحقیق حدیث کے لیے جس اصول کی بنیاد حضرت ابوبکرؓ رکھ گئے تھے حضرت عمرؓ اس کو زیادہ سے زیادہ مستحکم کرتا چاہتے تھے حضرت عمرؓ چاہتے یہ تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف یونہی لاپرواہی سے کوئی بات منسوب نہ کی جائے بلکہ اعتماد میں قوت پیدا کرنے کے لیے جو تائید بھی مل سکتی ہو اس کو حاصل کیا جائے چنانچہ اس سلسلے میں حضرت ابی بن کعبؓ کے ایک استفسار پر حضرت عمرؓ نے اس حقیقت کا صراحتاً اظہار بھی فرمایا کہ حضرت ابوموسیٰؓ کی روایت پر تائید کا یہ مطالبہ محض تحقیق حدیث کے لیے تھا۔ آپؓ فرمایا :

سبحان اللہ سبحان اللہ سبحان اللہ میں نے ایک بات سنی	سبحان اللہ سبحان اللہ سبحان اللہ
میں نے چاہا کہ اسے پایہ ثبوت تک پہنچایا جائے۔	شئاً فاجبت أن أثبت - (جمع الغوائد)

اسی پر حضرت علیؓ کے طرز عمل کو قیاس کرتے ہوئے۔ حلف لیے بغیر کسی کی روایت کو قبول

نہ کرنے کا جو طریقہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اختیار کر لیا تھا اس کا سارا پس منظر ہم اس کتاب کے پہلے حصے میں "حفاظت حدیث اور خلفائے راشدین" کے عنوان کے تحت تفصیل سے بیان کر آئے ہیں اس پس منظر میں حضرت علی کے طرز عمل کا جو شخص بھی انصاف سے جائزہ لے گا وہ اسی نتیجہ پر پہنچے گا کہ آپ کا یہ طریقہ احادیث نبویہ پر اعتماد میں قوت پیدا کرنے کے لیے تھا۔ فرقہ سبائیہ نے جس انداز سے جھوٹ گھڑا گھر کر بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرنے کا دیدہ و دانستہ سلسلہ شرمٹ کر رکھا تھا اس کی موجودگی میں حضرت علیؑ کے پاس اسکے سوا کوئی چارہ کار نہ رہا تھا کہ آپ بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کوئی بات حلفت لیے بغیر قبول نہ کریں خصوصاً ایسی صورت میں جبکہ کوفہ میں اکثریت ایسے لوگوں کی تھی جو بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کی دولت سے تو سرفراز ہوئے تھے لیکن شرف صحابیت سے محروم تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال کو اپنے کانوں سے سننے اور اپنی آنکھوں سے دیکھنے کی سعادت انہیں حاصل نہ تھی۔

دہری بات حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی اس روایت کو قبول نہ کرنے کی جس کو حضرت عبداللہ ابن عمر نے نقل کیا تھا کہ گھر والوں کے رونے سے میت کو سزا دی جاتی ہے تو اس بارے میں منکرین حدیث کی ذرا علمی دیانت ملاحظہ ہو جنہوں نے اپنے مطلب کے لیے یہ تو نقل کر دیا کہ حضرت عائشہؓ نے اس روایت کو قبول نہ کیا تھا مگر اس روایت کو قبول نہ کرنے کی جو وجہ حضرت عائشہؓ نے بیان کی تھی اس کا ذکر تک نہیں کیا۔ حضرت عائشہؓ نے اس روایت کو رد کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ قرآن تو کہتا ہے کہ لا تزدر ذرۃ و ذرۃ آخری (اور کوئی کسی دوسرے کا بوجہ نہ اٹھائے گا۔ فاطمہ ۱۸) اس کا مطلب یہ ہوا کہ حضرت عائشہؓ نے خبر واحد کے مقابلے میں ایک دلیل قطعی پیش کی تھی جو حضرت عائشہؓ کی نظر میں اس کے معارض تھی اور ایسی خبر واحد جس کے معارض کوئی دلیل قطعی ہو کسی کے نزدیک بھی قابل قبول نہیں۔ لہذا حضرت عائشہؓ کا قبول روایت سے انکار اس بنا پر نہ تھا کہ وہ خبر واحد تھی بلکہ صرف اس بنا پر تھا کہ حضرت عائشہؓ کی

نظر میں ایک دلیل قطعی اس خبر واحد کے معارض ہوتی۔ چنانچہ حضرت عائشہؓ کے علاوہ دوسرے صحابہ نے جن کی نظر میں یہاں قطعی اور قطعی کا معارضہ ہے ہی نہیں اس خبر واحد کو قبول کیا ہے ان صحابہ کا کہنا ہے کہ قرآن کریم کی محولہ بالا آیت اور حضرت ابن عمرؓ کی مذکورہ روایت کے درمیان معارضہ اس بنا پر نہیں ہے کہ حدیث نبوی کے مطابق زندوں کے نوحہ کرنے سے میت کو عذاب اس وقت ہوتا ہے جبکہ نوحہ ان کے گھر کا دستور ہو اور میت نے اپنی حیات میں اس سے روکا بھی نہ ہو ظاہر ہے کہ اب یہ فعل میت ہی کا بن جائے گا اور اس لیے جو عذاب اس کو ہو گا وہ اپنے ہی فعل کا نتیجہ کہلائے گا نہ کہ دوسرے کے افعال کا۔

غرض اس تخیل کی جتنی احادیث ہیں جن کے بارے میں بظاہر صحابہ کی طرف عدم قبول کی نسبت کی گئی ہے ان کے متعلق جب بھی تحقیق و تفتیش سے کام لیا جائے گا یہی نتیجہ سامنے آئے گا کہ صحابہ نے جن احادیث کو بھی مسترد کیا یا جن روایات کو بھی قبول کرنے میں توقف سے کام لیا ان میں کوئی نہ کوئی شرط شرائط قبریت میں سے مفقود تھی جو اس کے عدم قبول کی وجہ بنی یا راوی میں مطاعن روایت میں سے کوئی طعن موجود ہو گا یا کوئی قطعی دلیل ان کے معارض ہوگی اور دوسری کسی قطعی دلیل سے شہادت بھی میسر نہ ہوگی اور یا پھر وہ ہم و سہو کے احتمال سے بچنے کے لیے تحقیق و تفتیش کے مقصود کے پیش نظر توقف سے کام لیا گیا ہو گا جیسا کہ اوپر حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے بارے میں ابھی منقول ہوا ہے کہ تائید و شہادت کے بغیر انہوں نے بعض اخبار آحاد کو قبول کرنے میں توقف سے کام لیا اس قسم کی مثالوں میں تو یوں بھی کسی طرح یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ اخبار آحاد سے عدم احتجاج کے بارے میں وارد ہوئی ہیں اس لیے کہ ایک صحابی کے ساتھ دوسرے صحابی کے منظم ہو جانے سے وہ روایت خبر واحد کے درجے سے ذیل کر خبر متواتر تو نہیں بن جاتی کوئی روایت ایک یا دو یا تین صحابیوں سے مروی ہونے کے باوجود بھی اصطلاحی طور پر رہتی تو خبر واحد ہی ہے۔

ہر کیف حدیث کی تشریحی حیثیت کو مشکوک بنانے کی خاطر خبر واحد کی عدم حجیت



پر مکرین حدیث کی جانب سے جو دلائل دئے گئے تھے تاریکین نے دیکھ لیا کہ ان میں کوئی وزن نہیں۔ کوئی مستقریت نہیں تھی کہ بعض بعض جگہ وہ علمی دیانت تک سے تھی دامن ہیں اس کے مقابلے میں خبر واحد کی حجیت کے ثبوت میں عقلی و نقلی حیثیت سے جو کچھ ہم نے کہا ہے وہ بھی تاریکین کے سامنے ہے ایک طرف بلا کسی معقول و متوازن دلیل کے یہ دعویٰ ہے کہ خبر واحد حجیت نہیں اور دوسری طرف اس کی حجیت کے ثبوت میں محسوس عقلی دلائل کے ساتھ قرآنی تائیدات ہیں، عہد رسالت کے نظائر ہیں، عہد صحابہ کے شواہد ہیں اور ائمہ محققین و مجتہدین کی محققانہ آراء ہیں۔ اب یہ فیصلہ کرنا کچھ مشکل نہیں کہ حق کس کے ساتھ ہے اور باطل پر کون بلا جواز پسند ہے۔

---

# ”منصب رسالت“ اور ”مرکزیت“ کا تصور

در اصل حدیث کی تشریحی حیثیت سے انکار کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ منکرین حدیث منصب رسالت کے سمجھنے میں ٹھوکر کھا گئے ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ رسول کا کام صرف اتنا ہے کہ وہ اللہ کی کتاب اللہ کے بندوں تک پہنچا دے۔ تبلیغ کتاب کے بعد ان کے نزدیک رسول کی حیثیت رسالت ختم ہو جاتی ہے پھر وہ بھی الیہا ہی ایک انسان ہے جیسے اور دوسرے انسان۔ منکرین حدیث کا کہنا ہے کہ رسالت کا حق صرف یہ ہے کہ جو کتاب رسولوں نے بڑھ کر سنائی ہے اس کو ان کے اعتماد پر اللہ کا کلام سمجھ لیا جائے اس کے بعد رسول اور ہم برابر ہیں جس طرح ان کے پاس عقل ہے ہمارے پاس بھی ہے جس طرح وہ اللہ کی کتاب کو سمجھتے ہیں اسی طرح ہم بھی سمجھ سکتے ہیں چنانچہ ان کے نزدیک بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن پہنچا دینے کے علاوہ جو کچھ شخصیت سے کیا۔ قرآن کے مطابق امت کا نظم و نسق، اس کی شیرازہ بندی ان کی تعلیم و تربیت ان کا تزکیہ نفس، ان کے باہمی قضایا کے فیصلے، تدبیر مہمات اور جنگ و صلح جیسے اجتماعی امور میں ان کی قیادت غرض تبلیغ قرآن کے علاوہ بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ بھی کیا وہ منکرین حدیث کے نزدیک اگرچہ آپ نے قرآن ہی کی روشنی میں کیا مگر رسول اور پیغمبر کی حیثیت سے نہیں بلکہ اپنی ذاتی اور شخصی حیثیت میں مسلمانوں کے ایک امیر ہونے کے لحاظ سے کیا اور اس بنا پر ان تمام امور میں بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت اس بنا پر نہیں کہ آپ اللہ کے رسول تھے بلکہ اس لیے ہے کہ آپ اپنے زمانے کے صاحب امر تھے اور اسی بنا پر آپ کی اطاعت اس وقت تک ہے جب تک آپ حیات ہیں اور اولوالامر کے عہد سے پرفائز ہیں آپ کے بعد جو بھی اولوالامر بنے گا یہ اطاعت کا حق اس کی طرف منتقل ہوتا جائے گا۔ اس طرح پر منکرین حدیث کا دعویٰ ہے کہ قرآن میں اطاعت رسول کے جو احکام ہیں وہ آپ کی ذات تک محدود نہیں ہیں

بلکہ اس میں آپ کے بعد آنے والے تمام خلفاء داخل ہیں کیونکہ اطاعت کے یہ احکام منصب امامت کے لیے ہیں اس لیے آپ کے بعد جو بھی اس منصب پر فائز ہوگا وہ اس اطاعت کا مستحق ہوگا اور چونکہ امامت کا یہ منصب جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے نبی نوع انسان کی صلاح و فلاح کے لیے قائم ہوا ہے قیامت تک ستر ہے اور آپ کے زندہ جانشینوں کے ذریعہ سے ہمیشہ باقی رہنے والا ہے اس لیے قرآن میں جہاں کہیں بھی اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے اس سے مراد امام وقت کی اطاعت ہے۔ اس امام وقت کو منکرین حدیث نے مرکز ملت کا نام دیا ہے۔ یہ مرکز ملت ان کے نزدیک چونکہ خود اللہ و رسول ہے اس لیے قرآن کو اپنے زمانے کے حالات کے مطابق جو معنی وہ پہنائے ان کو درست ماننا اور ان پر عمل کرنا اسی طرح ضروری ہوگا جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امامت کے زمانے میں اپنے حالات کے مطابق قرآن کی جو تشریح و تفسیر کی اس کا ماننا اور اس پر عمل کرنا ضروری تھا مرکز ملت کے تمام فیصلے منکرین حدیث کی نظر میں واجب الاتباع ہیں مرکز ملت کو اختیار ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کیے ہوئے فیصلوں میں سے جس کو چاہے باقی رکھے اور جسے چاہے رد کر دے وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت شدہ احکام و مسائل کا پابند نہیں ہے اس کے لیے ان کی حیثیت صرف نظائر کی ہے اور نظائر بھی ایسے کہ ان سے وہ اپنی صوابدید کے مطابق استفادہ کرنے اور نہ کرنے میں پوری طرح آزاد ہے۔

غرض منصب رسالت کے مفہوم اور مرکز ملت کے تصور سے متعلق منکرین حدیث کی ساری بحث درج ذیل تین مرکزی نقطوں کے گرد گھومتی ہے۔

- (۱) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذمہ داری صرف اتنی تھی کہ وہ اللہ کی کتاب اللہ کے بندوں تک پہنچا دیں اس کے بعد آپ کی حیثیت رسالت ختم ہو جاتی ہے۔
- (۲) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم رسالت اور امامت دو حیثیتوں کے حامل تھے رسالت کی حیثیت سے آپ برصورت ایمان لانا ضروری تھا جہاں تک آپ کی اطاعت کا تعلق

ہے آپ کے امتیوں پر اس کا وجوب آپ کی امامت کی حیثیت سے تھا رسالت کی حیثیت سے نہیں۔

(۳) رسالت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر فہم ہو گئی مگر امامت کا منصب آپ کے زندہ جانشینوں کے ذریعے ہمیشہ باقی رہنے والا ہے چنانچہ قرآن میں جہاں کہیں اطاعت رسول کا حکم دیا گیا ہے اس سے مراد امام وقت یعنی مرکز ہدایت کی اطاعت ہے جب تک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تھے یہ اطاعت امام وقت ہونے کی وجہ سے آپ کا حق تھی آپ کے بعد جو بھی اس منصب پر فائز ہوتا رہے گا یہ اطاعت اس کا حق بھڑے گی۔

آئیے منکرین حدیث کے ان تینوں دعوؤں کا بہ نظر غور جائزہ لیں اور دیکھیں کہ اس سلسلے میں منکرین حدیث نے کہاں کہاں ٹھوکر کھائی ہے۔

جہاں تک منکرین حدیث کے پہلے دعویٰ کا تعلق ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا کام صرف اللہ کی کتاب پہنچانے کا ہے

کیا منصب رسالت صرف قرآن پہنچانے تک محدود ہے

دینا تھا اور بس تو یہ دعویٰ منکرین حدیث کے اپنے دماغ کی اختراع ہو تو ہو قرآن کی کسی آیت سے اس دعوے کی تائید نہیں ہوتی۔ قرآن کے نزدیک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت محض پیغام پہنچا دینے والے کی نہیں ہے قرآن تو کہتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مبلغ کتاب ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے امتیوں کے لیے معلم و مربی بھی ہیں اور پیشوا و نمونہ تقلید بھی حاکم و فرمانروا بھی ہیں اور قاضی فوج بھی۔ ان کا کام صرف اتنا ہی نہ تھا کہ وہ اللہ کی کتاب پر لکھ کر سنا دیں بلکہ یہ بھی ان کی ذمہ داری تھی کہ قرآنی آیات کی صحیح صحیح مرادات نہ صرف زبانی کھول کھول کر بیان کر دیں بلکہ ان کا عملی نمونہ بھی بنایا کر دیں۔ قرآن ہمیں بتلاتا ہے کہ جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کام ہے کہ وہ مبلغ کتاب ہونے کی حیثیت سے آیات قرآنی کو لکھ کر سنا دیں وہاں آپ کا کام یہ بھی ہے کہ معلم کی حیثیت سے احکام قرآنی کی تعلیم اور اس کے قوانین کی تشریح و

تو بیچ بھی کریں نیز مربی ہونے کی حیثیت سے قرآنی تعلیمات و قوانین کے مطابق اپنے امتیوں کی تربیت بھی کریں۔ اسی طرح پیشوا و نمونہ تقلید ہونے کی حیثیت سے آپ کا کام یہ بھی ہے کہ خود قرآنی تعلیم کا عملی مجسمہ بن کر دکھلائیں۔ اس کے ساتھ ہی قرآن کما ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں کے حاکم و فرمانروا بھی ہیں لیکن ایسے حاکم و فرمانروا نہیں جن سے نزاع کی جاسکے بلکہ ایسے حاکم اور ایسے فرمانروا جن کے حکم کو بے چون و چرا ماننا ویسا ہی فرض ہے جیسا قرآن کی آیات کو ماننا فرض ہے یہ حاکم و فرمانروا جس بارے میں جو فیصلہ کر دے وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے قول ناظر بن جائے گویا ایسا قاضی اور ایسا جج جس سے اوپر کوئی اپیل نہیں۔ اس قاضی اور اس جج کے دئے ہوئے فیصلے پر جو شخص اپنے دل میں ذرا سی بھی تنگی محسوس کرے اس کا ایمان سلب ہو جائے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ تمام ذمہ داریاں یہ تمام حیثیتیں قرآنی تصریحات ہیں۔ منکرین حدیث جو چاہے دعویٰ کرتے رہیں منصب رسالت کا اپنی طرف سے جو چاہے مفہوم متعین کرتے پھریں۔ قرآن ان کے ہر دعوئے سے بری ہے۔ قرآن اٹھا کر دیکھ لیجئے منصب رسالت کی جو تفصیل قرآن نے دی ہے وہ وہی ہے جو اوپر مختصراً بیان ہوئی۔ اس سلسلے میں قرآن کی شہادتیں ملاحظہ کیجئے :

**تبلیغ کتاب و تعلیم و تربیت افراد** | قرآن نے متعدد جگہ اس بات کو بار بار بتا کر دہرایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی

اللہ علیہ وسلم کو تین بنیادی ذمہ داریوں کے ساتھ مبعوث فرمایا ہے اول یہ کہ آپ آیات قرآنی پڑھ کر سنا لیں دوسرے یہ کہ لوگوں کو کتاب و حکمت کی تعلیم دیں اور تیسرے یہ کہ آپ اپنی تربیت سے ان کی انفرادی و اجتماعی خرابیوں کو دودھ کریں۔ ارشاد ربانی ہے :

وہی تو ہے جس نے اسی لوگوں میں خود انہی میں

سے ایک رسول مبعوث کیا جو ان کو اللہ کی

آیتیں پڑھ کر سنا تا ہے اور اودان کا تذکرہ

کرتا ہے اودان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا

مِّنْهُمْ يَتْلُو آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ

وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ

(المجدة-۲)

سورہ آل عمران میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ان ذمہ داریوں کا ذکر احسان کے انداز میں کیا گیا ہے شاید یہ بتلانا مقصود ہے کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ذمہ داریاں سونپی جاتیں تو انسانی صلاح و فلاح کا کام نامکمل رہتا۔ ارشاد ہے :

لَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِنْ أَنْفُسِهِمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ۔ (آل عمران - ۱۶۴)

اللہ نے ایمان لانے والوں پر احسان فرمایا جبکہ ان کے اندر خود انہی میں سے ایک رسول مبعوث کیا جو انہیں اس کی آیتیں پڑھ کر شانتا ہے اور ان کا تزکیہ کرتا ہے اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

یہ ذمہ داریاں اللہ کے نزدیک اتنی اہم تھیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تعمیر کعبہ کے وقت جب نبی اسماعیل میں سے ایک عظیم نبی کے مبعوث کیے جانے کی دعا کی تو اس دعا کے لیے جو الفاظ اللہ کی طرف سے القا کیے گئے ان میں بھی ان ذمہ داریوں کا ذکر بطور خاص شامل رکھا گیا چنانچہ حضرت ابراہیم کی دعا کے الفاظ ہیں :

رَبَّنَا وَبَعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ۔ (بقرہ - ۱۲۹)

اے ہمارے پروردگار ان لوگوں میں خود انہی کے اندر سے ایک رسول مبعوث فرما جو انہیں تیری آیات پڑھ کر شانتا ہے اور ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دے اور ان کا تزکیہ کرے۔

سورہ بقرہ، ہی میں ایک اور مقام پر ان ذمہ داریوں کا ذکر اس انداز میں کیا گیا :

كَمَا أَرْسَلْنَا فِيكُمْ رَسُولًا مِنْكُمْ يَتْلُو عَلَيْكُمْ آيَاتِنَا وَيُزَكِّيكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيكُمْ مَا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ۔ (البقرہ - ۱۲۹)

جس طرح ہم نے تمہارے اندر خود تمہی میں سے ایک رسول بھیجا جو تمہیں ہماری آیات پڑھ کر شانتا ہے اور تمہارا تزکیہ کرتا ہے اور تم کو کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور تمہیں وہ کچھ سکھاتا ہے جو تم نہیں جانتے تھے۔

اسے بتلایا ہے قرآن تو بار بار یہ کہتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کام صرف قرآن سنا دینا ہی ختم نہیں ہو جاتا بلکہ لوگوں کا تزکیہ نفس کرنا اور ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دینا بھی آپ کے فرائض میں داخل ہے مگر منکر بن حدیث کا دعویٰ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کام قرآن

بہو نچا دینا تھا اور بس۔ سوچئے کس کی بات مانی جائے اور کس کی رد کی جائے

ان آیات کے بارے میں یہ کہے چلے جانا کہ ان تمام ذمہ داریوں سے مراد قرآن ہی کا بہو نچا دینا ہے بالکل ہی بلا دلیل ہے جس کو اللہ نے ذرا سی بھی عقل دی ہے وہ خود گمراہ ہو سکتا ہے کہ کتاب اور حکمت کی تعلیم قرآن کے الفاظ سنا دینے سے نائد ہی کوئی چیز ہو سکتی ہے ورنہ اس کا تلاوت آیات قرآنی کے بعد علیحدہ ذکر کرنا بے معنی تھا اسی طرح افراد اور معاشرے کی تربیت کے لیے آپ جو تدابیر بھی اختیار فرماتے تھے وہ بھی لازمی طور پر قرآن کے الفاظ پڑھ کر سنا دینے سے نائد ہی کوئی چیز تھی تو اس کا ذکر ایک علیحدہ ذمہ داری کے طور

پر کیا گیا۔ یوں بھی کسی ہدایت نامے میں مندرج احکام و مسائل کی تعلیم اور ان پر عمل پیرا ہونے کی تربیت محض ان احکام و مسائل کے الفاظ بار بار دہراتے رہنے کا نام نہیں ہے الفاظ دہراتے رہنے سے تعلیم تربیت کا تصور وہی کر سکتا ہے جو عقل کی نعمت سے محروم ہو۔

**توضیح و تشریح کتاب** | تعلیم کتاب کی جس ذمہ داری کا ان محمولہ بالا آیات میں ذکر آیا ہے اس کو اور زیادہ واضح انداز میں توضیح و

تشریح کتاب سے تعبیر کیا گیا ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے بتایا گیا ہے کہ یہ کتاب ہم نے تم پر اس لیے نازل کی ہے کہ تم لوگوں کے سامنے اسے کھول کھول کر بیان کر دو۔ سورۃ نحل میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

<p>وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ - (نحل - ۴۴)</p>	<p>(اے نبی) یہ ذکر ہم نے تمہاری طرف اسی لیے نازل کیا ہے کہ تم لوگوں کے سامنے کھول کھول کر بیان کر دو اس تعلیم کو جو ان کی طرف آئی گئی ہے۔</p>
---	---

ایک موٹی سی عقل کا آدمی بھی کم از کم اتنی بات تو سمجھ ہی سکتا ہے کہ کسی کتاب کو کھول کھول کر بیان کرنا محض اس کتاب کے الفاظ پڑھ کر سنا دینے سے پورا نہیں ہو جاتا بلکہ بیان کرنے والا اس کے الفاظ سے نائد ہی کچھ کہتا ہے تاکہ سننے والا کتاب کا مطلب پوری طرح سمجھ جائے۔ اب بتلائیے یہ توضیح و تشریح اور یہ بیان کتاب کی ذمہ داری تبلیغ کتاب کی ذمہ داری کے علاوہ ہے یا نہیں۔

**عملی نمونہ** | اس کے علاوہ یہ بات بھی سوچنے کی ہے کہ قرآن صرف ایک علمی کتاب نہیں جس کا مقصد صرف علمی طور پر حل کر لینا ہو۔ اگر بات صرف اتنی ہی ہوتی تو

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کام شاید قرآن پہنچا کر ہی ختم ہو جاتا لیکن یہاں تو معاملہ یہ ہے کہ قرآن افراد و اقوام کا وہ دستور العمل ہے جسے زندگی کے ایک ایک شعبے میں نافذ ہونا ہے اس لیے تبلیغ کتاب کے بعد بلکہ اس کی تعلیم اور اس کی توضیح و تشریح کے بعد بھی ایک اہم ضرورت اور باقی رہتی ہے اور وہ ہے اس کا نقشہ عمل۔

دینی علوم میں بھی بہت سے علوم ایسے ہیں جو عملی مظاہر سے کسے بغیر اولاً تو سمجھ ہی میں نہیں آتے اور اگر سمجھ میں آ بھی جائیں تو اس وقت تک صحیح طور پر رویہ عمل نہیں لائے جاسکتے جب تک ان کا کوئی نقشہ عمل سامنے نہ ہو جو صحیح دینی علوم کا یہ حال ہے تو ربانی علوم کی دقیق اور معاملات و عبادات کی نزاکتیں اپنے انواع و اقسام کے اختلاف کے ساتھ کسی ربانی معلم کی رہنمائی سے مہیا شدہ کسی نقشہ عمل کے بغیر کیسے سمجھ میں آ سکتی ہیں چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ذمہ داری بھی سونپی گئی کہ قرآنی احکام و ہدایات کا عملی مظاہرہ کر کے دکھائیں۔ قرآن نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ پر ایمان لانے والوں کے لیے ایک نمونہ تقلید کی حیثیت سے پیش کرتے ہوئے کہا:

<p>لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَن كَانَ يَرْجُو اللَّهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ (احزاب - ۲۱)</p>	<p>تمہارے لیے اللہ کے رسول میں ایک نمونہ تقلید ہے ہر اسی شخص کے لیے جو اللہ اور یوم آخر کا امیدوار ہو۔</p>
---	--

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے صاف فرما دیا ہے کہ اگر اس نمونے کی پیروی نہ کرو گے تو مجھ سے کوئی امید نہ رکھو۔ اب بتلائیے اگر آپ کا کام صرف قرآن کا پہنچا دینا تھا تو آپ کو نمونہ تقلید قرار دینے کے کیا معنی۔ نمونہ تقلید قرار دینے کا تو مقصد ہی یہی ہے کہ مگر قرآن کی جو باتیں علمی مسائل سے متعلق ہیں ان کا عملی مظاہرہ کر کے بتایا جائے کہ منشائے خداوندی پر اس طرح عمل کرنا ہے قرآن کے علمی احکام و مسائل کے متعلق مسائل کرنے والوں کو پھر کتاب کے الفاظ ہی سنا دینا کسی طفل مکتب کے نزدیک بھی سوال کرنے والوں کی تشفی کا موجب نہیں سمجھا جاسکتا اس



کے لیے تو ایک ایسے ہی نقشہ عمل کی ضرورت ہے جس کو دیکھ کر انسانی زندگی کے تمام انفرادی و اجتماعی امور کو درست طریقے پر استوار رکھا جاسکے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عجم نقشہ عمل بنا دیا اور حکم دے دیا کہ اس نقشہ عمل کے مطابق اپنی زندگیوں کو ڈھالتے چلے جاؤ ساتھ ہی صاف صاف فرما دیا کہ جس کسی کو اخروی نجات کی فکر ہے اور جو کوئی مجھ سے کوئی امید لگائے ہوئے ہے اس سے چاہیے کہ وہ اس نقشہ عمل اور اس نمونہ تقلید کی پیروی کرے گویا جو شخص پیروی نہیں کرتا وہ اللہ سے کوئی امید نہ رکھے۔ ایک اور مقام پر تو یہاں تک فرما دیا گیا کہ اس نمونہ تقلید کی پیروی سے منہ موڑنا کفر ہے۔ سورہ آل عمران میں ہے :

اے نبی! آپ کہہ دیجئے کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی کرو اللہ تم سے محبت کرے تم لگے گا اور تمہارے گناہ بخش دے گا اللہ بڑا بخشنے والا ہے پھر یہاں ہے آپ کہہ دیجئے کہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو پھر اگر وہ منہ موڑیں تو اللہ کافروں سے ذرا محبت نہیں رکھتا۔

قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ  
فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ  
وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ وَاللَّهُ  
غَفُورٌ رَحِيمٌ قُلْ أَطِيعُوا اللَّهَ  
وَالرَّسُولَ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّ اللَّهَ  
لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ  
(آل عمران - ۳۱: ۳۲)

اس آیت کے بارے میں یہ کہنا کہ اس سے مراد قرآن کی پیروی ہے سراسر لغو ہے  
فَاتَّبِعُونِي (تو میری پیروی کرو) کے لفظ سے کسی طرح قرآن کی پیروی مراد نہیں لی جاسکتی اگر  
یہ مراد ہوتی تو سیدھا سادا فَاتَّبِعُوا الْقُرْآنَ فرمایا جاتا۔

**حاکم و فرمانروا** | قرآن جگہ جگہ بڑی صراحت کے ساتھ یہ بھی کہتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کا حاکم و فرمانروا مقرر کیا ہے۔ ہر وہ شخص جو آپ کو اللہ کا رسول جانتا اور مانتا ہے اس پر واجب ہے کہ وہ آپ کی اطاعت کرے اس لیے کہ رسول بھیجا ہی اسی لیے جاتا ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے :

وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُولٍ إِلَّا يَطَاعُ | ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اس لیے کہ اس کی  
بِإِذْنِ اللَّهِ (النسار - ۶۴) | اطاعت کی ہلئے اللہ کے اذن سے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حاکمیت و فرمانروائی چونکہ آپ کے منصب رسالت ہی  
کا ایک حصہ تھی اس لیے پوری وضاحت کے ساتھ یہ بھی بتلا دیا گیا کہ آپ کی اطاعت  
یعین اللہ کی اطاعت ہے :

مَنْ يَطِيعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ | جو رسول کی اطاعت کرے اس نے اللہ کی  
اللَّهُ (نسار - ۸۰) | اطاعت کی۔

اسی طرح آپ کے ہاتھ پر بیعت کرنا دراصل اللہ سے بیعت کرنا ہے :

إِنَّ الَّذِينَ يَبَايِعُونَكَ إِنَّمَا | جو لوگ تم سے بیعت کرتے ہیں وہ درحقیقت  
يَبَايِعُونَ اللَّهَ - (فتح - ۱۰) | اللہ سے بیعت کرتے ہیں۔

نیز آپ کی اطاعت نہ کرنا ایسا ہے جیسے اللہ کی اطاعت نہ کی جائے اور اس کا نتیجہ یہ  
ہوتا ہے کہ آدمی کے تمام اعمال غارت جاتے ہیں کوئی عمل بھی اللہ کے یہاں مقبول نہیں ہوتا۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ | اے لوگو جو ایمان لائے ہو اطاعت کرو اللہ کی  
وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَلَا تَبْطُلُوا | اور اطاعت کرو رسول کی اور اپنے اعمال  
أَعْمَالَكُمْ - (محمد - ۳۳) | کو باطل نہ کر لو۔

رسول کی یہ اطاعت و فرمانبرداری کسی عام دنیوی حاکم کی اطاعت و فرمانبرداری کی طرح  
نہیں ہے کہ اس سے نزاع بھی کی جاسکتی ہو بلکہ رسول کی اطاعت بالکل غیر مشروط اطاعت  
ہے رسول جس بات کا حکم کر دے یا جس بات سے روک دے وہ اٹل ہے اس کے بعد  
مومن کو کوئی اختیار باقی نہیں رہتا۔

وَمَا كَانَ لِلْمُؤْمِنِ وَلَا الْمُؤْمِنَةِ | اور کسی مومن مرد اور مومن عورت کو یہ حق نہیں  
إِذَا قَضَى اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا | ہے کہ جب کسی معاملے کا فیصلہ اللہ اور اسی کا رسول  
أَنْ يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ | کر دے تو پھر انکے لیے اپنے اس معاملے میں خود کوئی  
أَمْرِهِمْ (الاحزاب - ۳۶) | فیصلہ کر لینے کا کوئی اختیار باقی رہ جائے۔

ان تمام آیات میں اللہ کی اطاعت کے ساتھ ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی غیر مشروط اطاعت کا ذکر صاف یہ بتلا رہا ہے کہ آپ کا کام صرف قرآن کا پوچھا دینا نہیں تھا اگر ایسا ہوتا تو آپ کی اطاعت کو علیحدہ حیثیت دینے کی ضرورت ہی نہیں تھی صرف قرآن کی اطاعت کا حکم دے دینا کافی ہوتا لیکن یہاں تو صریحاً حال یہ ہے کہ ایک طرف اطمینان اللہ کہہ کر قرآن کی اطاعت کا حکم دیا جا رہا ہے تو دوسری طرف اطمینان رسول کہہ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کی مستقل حیثیت واضح کی جا رہی ہے اگر آپ کا منصب رسالت صرف قرآن پوچھا دینے تک محدود تھا تو پھر آپ کی اطاعت آخر کس حیثیت سے؟

**حکم اور فیصل** | اسی طرح قرآن میں ایک جگہ نہیں بکثرت مقامات پر اللہ تعالیٰ نے اس امر کی تصریح فرمائی ہے کہ اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام اور فیصل مقرر کیا ہے۔ ارشاد ربانی ہے :

إِنَّا أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا أَرَاكَ	(یعنی) ہم نے تمہارا کتاب حق کے ساتھ کتاب نازل کی ہے تاکہ تم لوگوں کے درمیان اللہ کی دکھائی ہوئی روشنی میں فیصلہ کرو۔
---	--

اللہ (النار - ۱۰۵)

یہ اللہ کی دکھائی ہوئی روشنی میں حکیم بین الناس کا کام تبلیغ کتاب کے علاوہ اور اس سے نازدہ ہے یا نہیں؟ سوچنے کی بات ہے۔ اگر اللہ کی کتاب پوچھا کر آپ کا کام ختم ہوتا تھا تو تنزیل کتاب کا ذکر کرنے کے بعد بطور خاص حکیم بین الناس کے ذکر کی کیا ضرورت تھی۔ معلوم ہوا تبلیغ کتاب کے ساتھ ساتھ حکیم بین الناس بھی آپ کی ذمہ داری تھی اور ذمہ دار کا بھی ایسی کہ آپ کے منصب رسالت کا ایک حصہ تھی حکیم کے کام کو اللہ کی دکھائی ہوئی روشنی کے ساتھ خاص کرنا اس کی مزید دلیل ہے۔ نیز سورۃ نور میں لکھا گیا ہے کہ اللہ کا رسل جب کوئی فیصلہ کر دے تو مومنین کی شان یہ ہے کہ وہ فوراً اسے تسلیم کر دیں اور کہیں کہ ہم نے سنا اور مان لیا۔ مومنین سے اس انداز کی تسلیم و رضا کا مطالبہ بھی اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ حکیم بین الناس کا کام منصب رسالت کا ایک حصہ تھا۔ سورۃ نور کی آیت ہے :

إِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِينَ إِذَا  
دُعُوا إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ لِيَحْكُمَ  
بَيْنَهُمْ أَنْ يُقِئُوا سَمْعًا وَ  
أَطَعُوا (النور - ۵۱)

ایمان لانے والوں کا کام تو یہ ہے کہ وہ جب اللہ  
اور اس کے رسول کی طرف بلائے جائیں تاکہ رسول  
ان کے درمیان فیصلہ کر دے تو وہ کہیں ہم نے سنا  
اور مان لیا۔

بلکہ صرف زبان سے ہی سمعنا و اطعنا کہنا کافی نہیں بل میں بھی مومن کوئی تنگی محسوس  
نہ کرے رسول کی تحکیم کو برضا و رغبت قبول کرے۔ قرآن نے ایک مقام پر بالکل بے  
لاگ انداز میں کہہ دیا ہے کہ رسول کی تحکیم کو جو شخص اس طرح برضا و رغبت تسلیم نہیں کرتا  
وہ مومن ہی نہیں ہے ارشاد ہے :

فَلَا وَرَيْكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّى  
يُحَاكِمُوا فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ  
لَا يَجِدُوا فِي أَنْفُسِهِمْ حَزْبًا  
مِمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا  
(النساء - ۶۵)

پس (اے نبی) تیرے رب کی قسم وہ ہرگز مومن  
نہ ہوں گے جب تک وہ اپنے جھگڑاؤں میں کچھ  
فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں پھر جو فیصلہ تو کرے  
اس کی طرف سے اپنے دل میں کوئی تنگی محسوس  
نہ کریں بلکہ اسے سر و چشم قبول کر لیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دیئے ہوئے فیصلے پر دل میں تنگی محسوس ہو تو ایمان کا  
سبب ہو جانا اس بات کی کھلی دلیل ہے کہ آپ کی یہ تحکیم بین الناس کی ذمہ داری بھی  
منصب رسالت ہی کا ایک حصہ تھی۔

غرض منکرین حدیث کا یہ دعویٰ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا منصب رسالت  
صرف قرآن پڑھنا دینے تک محدود تھا قرآنی تصریحات کے بالکل خلاف ہے۔  
محولہ بالا آیات قرآنی اس بات کا ثبوت ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تبلیغ قرآن کے  
ساتھ ساتھ تعلیم احکام قرآنی، توضیح و تشریح مراعات قرآنی اور تربیت افراد  
اجتماعات کے کام پر بھی مامور تھے نیز آپ مبلغ قرآن ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے  
ماننے والوں کے لیے قرآن کا عملی نمونہ غیر مشروط اطاعت کے حامل حاکم و فرمانروا اور  
ہر قسم کی تنقید سے بالاتر حکم اور فیصلہ بھی تھے۔

## شخصی اور پیغمبرانہ حیثیت کا فرق | اس موقع پر اپنی طرف سے یہ مندر کیے چلے جانا کہ آپؐ نے یہ کام اپنی ذاتی اور شخصی حیثیت

میں کیے اور اس پر کوئی دلیل قائم نہ کرنا کوئی معقول بات نہیں ہے۔ اگر آپؐ نے یہ تمام کام اپنی ذاتی اور شخصی حیثیت سے انجام دئے تھے تو آپؐ کو ان کاموں کو انجام دینے کا اختیار کس نے دیا تھا آپؐ معلم تھے تو کس کے حکم سے آپؐ نے افراد و معاشرہ کی تربیت کا کام انجام دیا تو کس کے کہنے پر آپؐ مسلمانوں کے حاکم و فرمانروا تھے تو کس اختیار کے تحت آپؐ تحکیم بین الناس کا کام انجام دیتے تھے تو کس قانون کی رو سے ؟

اگر آپؐ نے یہ تمام کام اللہ تعالیٰ کے حکم سے کیے، اگر آپؐ نے یہ تمام خدمات قرآن کے تحت انجام دیں اور اگر آپؐ کو یہ تمام ذمہ داریاں بذریعہ وحی سونپی گئی تھیں جیسا کہ محولہ بالا آیات اس پر شاہد ہیں تو پھر ہی تو اس بات کا ثبوت ہیں کہ آپؐ کے یہ تمام کام آپؐ کی یہ تمام خدمات اور آپؐ کی یہ تمام ذمہ داریاں آپؐ کے منصب رسالت ہی کا حصہ تھیں آپؐ نے یہ سب کچھ شخصی حیثیت سے نہیں بلکہ پیغمبرانہ حیثیت سے کیا تھا۔

اس کے برعکس اگر کوئی کہتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم معلم و مفسر قرآن تو تھے مگر خدا کے مقرر کردہ نہیں بلکہ جیسے دُنیا میں اور علوم کے استاد ہوتے ہیں ویسے ہی ایک آپؐ بھی تھے اسی طرح آپؐ مربی و مزیٰ اور علمی نمونہ تو تھے مگر مامورِ اللہ ہونے کی حیثیت سے نہیں، نیز اسی طرح آپؐ حاکم و فرمانروا اور قاضی و فیصل تو تھے مگر اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو اپنی طرف سے قاضی یا فیصل و حکم مقرر نہیں کیا تھا بلکہ دُنیا کے عام قاضیوں اور عام فیصل و حکم کی طرح آپؐ بھی ایک قاضی یا فیصل تھے اگر کوئی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں اس قسم کی صورت حال کا دعویٰ کرے تو یہ بارِ ثبوت اس پر ہے کہ وہ بتلائے کہ پھر یہ تمام مناصب آپؐ کو کیسے حاصل ہوئے؟ کیا مکے میں اسلام قبول کرنے والوں نے اپنے اختیار سے آپؐ کو اپنا معلم و مربی اپنا حاکم و فرمانروا اور اپنا قاضی و فیصل منتخب کیا تھا۔ یا کیا مدینہ پہنچ کر انصار و مہاجرین نے باہمی مشورے سے یہ طے کیا تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم آج سے ہمارے رہنما اور ہمارے قائد ہوں گے اور یہ یہ

مناصب آپ کے سپرد ہوں گے؟ کیا کبھی کسی مرحلے پر ایسا کوئی انتخاب عمل میں آیا؟ اگر ایسا نہیں ہوا اور یقیناً نہیں ہوا تو پھر بتلایا جائے آخر یہ تمام مناصب آپ کو کیسے حاصل ہوئے؟ اگر ان تمام مناصب پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مامور من اللہ بھی نہیں تھے اور منتخب شدہ بھی نہیں تھے تو کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ان تمام مناصب پر معاذ اللہ آپ خود ہی فائز ہو بیٹھے تھے؟ کیا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم از خود ہی مسلمانوں کے رہنما فرمانروا کاظمی اور معلم و مربی بن بیٹھے تھے۔

ہر حال یہ ماننے بغیر چارہ نہیں کہ آپ کو یہ مناصب شخصی حیثیت سے نہیں بلکہ پیغمبرانہ حیثیت سے حاصل تھے آپ کو یہ تمام ذمہ داریاں بذریعہ وحی سونپی گئی تھیں۔ آپ نے یہ تمام کام اللہ کے حکم سے کیے تھے اور آپ نے یہ تمام خدمات قرآن کے تحت انجام دی تھیں۔ اور بنا بریں اسی حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا کام صرف قرآن پہنچا کر ختم نہیں ہو جاتا تھا بلکہ اس کے بعد وہ تمام کام بھی آپ کی ذمہ داریوں میں شامل تھے جن کا بھی تفصیل سے قرآنی آیات کے حوالے سے ذکر ہوا ہے۔

**منکرین حدیث کے موقف کا جائزہ** | اس ضمن میں منکرین حدیث اپنے موقف

کرتے ہیں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کا بھی مختصر جائزہ لے لیا جائے۔ ان کے موقف کا مدار یہ آیات ہیں :

رسول کے ذمے بجز اسکے کچھ نہیں کہ وہ پیغام پہنچا دے۔  
ہمارے ذمے سولے واضح تبلیغ کے اور کچھ نہیں  
آپ کے ذمے صرف تبلیغ ہے۔  
اگر تم نے مزہ پھر لیا تو ہمارے رسول پر صرف  
واضح تبلیغ ہے اور بس  
تیرے ذمے پہنچانا ہے اور ہم پر حساب لینا ہے۔

مَا عَلَى النَّبِيِّ إِلَّا الْبَلَاغُ (المائدہ - ۶۶)  
وَمَا عَلَيْنَا إِلَّا الْبَلَاغُ الْمُبِينُ (البقرہ - ۱۰۵)  
إِنْ عَلَيْكَ إِلَّا الْبَلَاغُ (الشورى - ۱۲۸)  
فَإِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَإِنَّمَا عَلَى رَسُولِنَا  
الْبَلَاغُ الْمُبِينُ (التغابن - ۱۲)  
فَإِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلَاغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ

یہ آیات پیش کر کے منکرینِ حدیث دعویٰ کیا کرتے ہیں کہ قرآن کی نظر میں رسول  
کافرِ یزیدِ یحییٰ منصفِ رسالت صرف پیغامِ الہی کی تبلیغ ہے اور ان آیات کو پیش کرتے  
وقت اپنی عادت کے مطابق چالاکी یہ کرتے ہیں کہ ان آیات کے سیاق و سباق اور فحوائے  
کلام کو قطعاً نظر انداز کر جاتے ہیں حالانکہ جو کوئی بھی ان آیات کو ان کے سیاق و سباق  
کے ساتھ ملا کر پڑھیں گا وہ فوراً اس حقیقت کو پا لے گا کہ دراصل ان آیات میں جو کچھ کہا گیا  
ہے وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے والوں سے نہیں بلکہ آپ کا انکار کرنے والوں  
سے متعلق ہے جو لوگ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی ہدایت کو قبول کرنے پر تیار  
نہ ہوتے تھے اور بار بار آپ کو جھٹلاتے تھے ان کے بارے میں کہا گیا ہے کہ رسول کا  
کام صرف ان تک ہمارا یہ پیغام پہنچا دینا تھا سو اس نے پہنچا دیا اب وہ لوگ یہ نہیں  
کہہ سکتے کہ ہمارے پاس کوئی رہنما نہیں بھیجا گیا جیسا کہ اللہ نے قرآن میں ان کا یہ قول  
نقل بھی کیا ہے :

کہیں تم یہ نہ کہنے لگو کہ ہمارے پاس کوئی بھی نہ  
بشارت دینے والا آیا نہ تنبیہ کرنے والا (لواب تو)  
آگیا تھا ہمارے پاس بشارت دینے والا اور تنبیہ کرنے والا۔

أَنْ تَقُولُوا مَا جَاءَنَا مِنْ بَشِيرٍ  
وَلَا نَذِيرٍ ۚ فَقَدْ جَاءَكُمْ بَشِيرٌ  
وَنَذِيرٌ (مائدہ - ۱۹)

دراصل ان محولہ بالا تمام آیات میں اسی مضمون و مفہوم کی اور دیگر آیات میں انکار کرنے والوں کے  
انکار کے پیش نظر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ تم ان کافروں کی روگردانی  
سے دل گرفتہ کیوں ہوتے ہو تم ان پر داروغہ نہیں بنائے گئے تمہارے پیرو جو خدمت  
کی گئی ہے وہ صرف اس قدر ہے کہ ان کے سامنے سیدھا راستہ پیش کر دو سو وہ تم نے کر  
دیا اب اگر وہ تمہاری تعلیم و تبلیغ سے منہ موڑ کر ٹھیکے راستوں پر چلتے ہیں تو ان کے اس  
فعل کی کوئی باز پرس تم سے نہ ہوگی ذرا غور کیجئے سورہ شوریٰ میں اِنْ عَلَيْكَ إِلَّا ابْلَآءُ  
الْعَاوِلِ مَا اُولَئِكَ يَفْعَلُونَ (یہ لوگ اگرچہ بھی  
مہینہ موڑے رہیں تو ہم نے آپ کو ان پر کوئی نگران بنا کر نہیں بھیجا ہے آپ کے ذمے صرف پہنچا

دینا ہے)۔ اسی طرح اگر ایک طرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی تو دوسری طرف انکار کرنے والوں سے بھی کہا گیا ہے کہ تمہارے مژدہ موزن سے اللہ کا یا اس کے رسول کا کوئی نقصان نہیں نقصان تو تمہارا ہے ہم نے رسول کے ذمے صرف اتنا ہی کام لگایا ہے کہ وہ تم تک ہماری بات پہنچادے تمہیں کھینچ پھینچ کر ہمارے راستے کی طرف لانا یہ اس کا کام ہی نہیں۔ سورۃ تغابن کی محولہ بالا آیت اسی مضمون کی حامل ہے۔

غرض ان تمام آیات کا رخ کفار کی طرف ہے۔ ان آیات کے وہ لوگ مخاطب ہی نہیں جو ایمان لے آئیں اور اسلام قبول کر لیں۔ ان لوگوں کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت محض پیغام پہنچا دینے والے کی نہیں ہے بلکہ آپ ان کے لیے معلم بھی ہیں۔ مرتی بھی ہیں، مفسر و شارح قرآن بھی ہیں، قرآنی احکام کا عملی نمونہ بھی ہیں، حاکم و فرمانروا بھی ہیں اور حکم و فیصل اور قاضی بھی ہیں جیسا کہ ہم ابھی آیات قرآنی سے آپ کی یہ تمام حیثیات بطور رسول ثابت کر آئے ہیں۔

منکرین حدیث نے بنیادی ٹھوکریں ہی یہی کھائی ہے کہ بعض آیات قرآنی کا مفہوم غلط سمجھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منصب رسالت کو صرف تبلیغ قرآن تک محدود کر دیا حالانکہ ان آیات کی رو سے آپ کی مبلغانہ حیثیت صرف اس وقت تک ہے جب تک کہ لوگ دائرہ اسلام میں داخل نہ ہوئے ہوں اور صرف ان لوگوں کے لیے ہے جنہوں نے آپ کی تعلیم کو ابھی قبول نہ کیا ہو رہے وہ لوگ جو اسلام قبول کر لیں اور امت مسلمہ میں داخل ہو جائیں تو ان کے لیے آپ کی حیثیت صرف مبلغ کی نہیں رہ جاتی۔ ان کے لیے آپ وہ سب کچھ ہیں جس کی تفصیل ابھی گزر چکی ہے :

**رسالت و امامت کی تفریق** | پھر اسی پہلی ٹھوکری کے نتیجے میں منکرین حدیث کو دوسری ٹھوکری بھی پہلی غلطی ان کی

دوسری غلطی کا موجب بنی جب انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مسلم و غیر مسلم سب کے لیے محض مبلغ قرار دے لیا تو ان کو مشکل یہ پیش آئی کہ قرآن میں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مسلمانوں کے لیے معلم و مرتی اور عملی نمونہ وغیرہ قرار دیا گیا ہے اس کا کیا مفہوم



متعین کیا جائے۔ اس مشکل کا حل انہوں نے یہ نکالا کہ آپ کی شخصیت کو دو حیثیتوں میں تقسیم کر دیا ایک حیثیت رسالت کی اور دوسری حیثیت امامت کی۔ آپ کی حیثیت رسالت کو صرف تبلیغ قرآن تک محدود کر دیا اور اس نتیجہ پر پہنچ گئے کہ مبلغانہ حیثیت کے ماسوا آپ کی جو حیثیت بھی ہے اس کا آپ کے منصب رسالت سے کوئی تعلق نہیں تبلیغ قرآن کے سوا آپ نے جو کچھ کیا وہ اپنی ذاتی و شخصی حیثیت سے کیا اور مسلمانوں کے امام ہونے کی حیثیت سے کیا پھر ہمیں سے وہ اس غلط نتیجے پر پہنچ گئے کہ رسالت کی حیثیت سے صرف آپ پر ایمان لانا ضروری تھا لیکن جہاں تک اطاعت کا تعلق ہے آپ کے امتیوں پر اس کا وجوب آپ کے ایام و وقت اور مرکز ملت ہونے کی حیثیت سے تھا رسالت کی حیثیت سے نہیں۔

رسالت و امامت کی اس تقسیم سے نیز اطاعت کو امامت کے ساتھ خاص کرنے سے منکرین حدیث کا مدعا دراصل یہ ہے کہ آپ کی ذات بحیثیت رسول اور آپ کی ذات بحیثیت انسان کے درمیان فرق کر دیں رسول ہونے کی حیثیت سے آپ نے قرآن ہم تک پہنچایا اس کو سمع و طاعت کا مستحق سمجھیں مگر یہ حیثیت انسان چونکہ آپ کے اقوال و افعال ایسے ہی ہیں جیسے کسی دوسرے انسان کے ہوتے ہیں اس لیے ان کا خدا کی طرف سے ہونا اور ضلالت و گمراہی سے پاک ہونا مسلم نہ سمجھا جائے ان کی اطاعت اسی طور پر کی جائے جس طور پر ایک ایک عام انسان کی امام وقت اور مرکز ملت ہونے کے طور پر کی جاتی ہے۔

یوں تو بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پاک میں ذہنی اعتبار سے دو حیثیتیں کیا بہت سی حیثیتیں قائم کی جاسکتی ہیں مگر سوال یہ ہے کہ کیا آپ کی ان دو حیثیتوں کو جن کو منکرین حدیث نے اپنے ذہن سے اختراع کر لیا ہے قرآن نے کہیں بھی جدا جدا اعتبار کیا ہے یعنی قرآن نے کہیں بھی کبھی یہ حیثیت رسول اور کبھی یہ حیثیت امام آپ کے دو قسم کے حقوق بتلائے ہیں۔ پھر کیا صحابہ کرام نے ان دو حیثیتوں کے لحاظ سے کبھی آپ کے ساتھ دو قسم کے معاملات کیے ہیں پھر امت مسلمہ نے آپ کی ذات کو کبھی ان دو حیثیتوں کا حامل سمجھا ہے اگر ان سب سوالوں کا جواب نفی میں ہے اور یقیناً نفی میں ہے تو

بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں رسالت و امامت کی دو حیثیتیں قائم کرنا محض منکرین حدیث کے ذہن کی ایسی اچھ ہے خارج میں جس کا کوئی وجود نہیں۔

رسالت و امامت کی یہ تفریق قرآن کریم سے ہرگز ثابت نہیں ہے قرآن کریم نے ہمیشہ آپ کی صرف ایک ہی حیثیت بیان کی ہے اور وہ رسول ہونے کی حیثیت ہے جس وقت اللہ تعالیٰ نے آپ کو منصب رسالت پر سرفراز فرمایا اس وقت سے لے کر حیات جسمانی کے آخری سانس تک آپ ہر آن اور ہر حال میں خدا کے رسول تھے آپ کا ہر فعل اور ہر قول رسول خدا کی حیثیت سے تھا اسی حیثیت میں آپ مبلغ قرآن بھی تھے اور معلم قرآن بھی مربی افراد بھی تھے اور مزی معاشرہ بھی حاکم و فرمانروا بھی تھے اور قاضی و امام بھی۔ حیرت کی بات ہے منکرین حدیث کس طرح یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ تبلیغ قرآن کے علاوہ باقی تمام کام آپ نے اپنی ذاتی و شخصی حیثیت میں کیے تھے جبکہ امر واقعہ یہ ہے کہ قرآن آپ کے ان تمام کاموں کا ذکر کرتے وقت آپ کو رسول کہہ کر پکارتا ہے۔ ابھی فائدہ لین کی نظر سے وہ تمام آیتیں گزر چکی ہیں جن میں بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ان تمام کاموں کا ذکر ہوا ہے ان آیتوں پر دوبارہ نظر ڈال لی جائے قرآن آپ کو معلم کہہ کر پکارتا ہے تو رسول کہہ کر ہی آپ کی تعلیم کتاب و حکمت کا ذکر کرتا ہے قرآن آپ کو مربی و مزی افراد و معاشرہ کہتا ہے تو رسول ہی کی حیثیت سے کہتا ہے۔ توضیح و تشریح کی ذمہ داری کا ذکر آتا ہے تو آپ کو مہبط رحی ہی کی حیثیت سے خطاب کیا جاتا ہے قرآن آپ کو امت مسلمہ کے لیے عملی نمونہ قرار دیتا ہے تو یہ نہیں کہتا کہ محمد بن عبد اللہ کی ذات میں تمہارے لیے عملی نمونہ ہے بلکہ واضح طور سے اعلان کرتا ہے کہ اللہ کے رسول میں تمہارے لیے اسوۂ حسنہ ہے۔ حاکم و فرمانروا کی حیثیت سے آپ کی غیر مشروط اطاعت کے مطالبے کی بات آتی ہے تو محمد بن عبد اللہ کی حیثیت سے نہیں محمد رسول اللہ کی حیثیت سے اطاعت کو خاص کرنے پر زور دیا جاتا ہے۔ نیکم بین الناس کا موقع ہے تو قرآن مومنین کو رسول ہی کے لیے سمع و طاعت کا حکم دیتا ہے۔ بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ان تمام کاموں اور آپ کی ان تمام ذمہ داریوں کا ذکر کرتے وقت قرآن بالکل اسی طرح رسول کا لفظ استعمال کرتا ہے جس طرح تبلیغ کی ذمہ داری کا

ذکر کرتے وقت آپ کو رسول کہہ کر پکارتا ہے :

يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ (اسے رسول جو کچھ آپ پر آپ کے  
پروردگار کی طرف سے اتارا جاتا ہے اس کو دوسروں تک پہنچا دیجئے۔ المائدہ : ۶۷)

معلوم ہوا جس حیثیت میں آپ مبلغ ہیں بالکل اسی حیثیت میں آپ معلم بھی ہیں مرنے والے کی  
بھی ہیں مفسر قرآن بھی ہیں قرآنی احکام کا عملی نمونہ بھی ہیں اور مسلمانوں  
کے حاکم و فرمانروا اور قاضی و نزع بھی ہیں مگر حیرت ہے قرآن کی  
ان تمام تصریحات کے علی الرغم منکرین حدیث آپ کی ذات کو دو حیثیتوں میں تقسیم کرتے  
ہیں ایک حیثیت میں آپ کو رسول مانتے ہیں اور دوسری حیثیت میں آپ کو ایک عام انسان۔  
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت رسالت اور حیثیت انسانی اگرچہ اعتباری  
نحوہ سے دو جداگانہ حیثیتیں شمار کی جاسکتی ہیں مگر وجود میں فی الحقیقت دونوں ایک ہی  
ہیں اور ان کے درمیان عملاً کوئی فرق کرنا ممکن نہیں۔ منکرین حدیث نے منصب  
رسالت کو بھی دنیوی عہدوں کی طرح سمجھ لیا ہے کہ عہد سے دار جب تک اپنے عہدے  
کی گمرسی پر بیٹھا ہے عہدہ دار ہے اور جب اس سے اترتا تو ایک عام انسان ہے۔ اللہ  
کا رسول ہر وقت اللہ کا رسول ہے وہ جس وقت منصب رسالت پر مقرر نہ ہوتا ہے اس  
وقت سے مرتے دم تک وہ ہر وقت اور ہر آن مامور من اللہ ہوتا ہے وہ زندگی کے  
کسی لمحے بھی منصب رسالت کی ذمہ داری سے سبکدوش نہیں سمجھا جاتا۔ اس کی زندگی کے  
تمام معاملات خواہ وہ ایک امام کی حیثیت سے ہوں یا امیر کی حیثیت سے قاضی کی  
حیثیت سے ہوں یا معلم اخلاق کی حیثیت سے اور خواہ اس کی ذات کے ساتھ ان معاملات  
کا تعلق ایک شہری اور معاشرے کے ایک فرد کی حیثیت سے ہو یا ایک شوہر، باپ  
بھائی، رشتہ دار اور دوست کی حیثیت سے سب پر اس کی حیثیت رسالت اس  
طرح حاوی ہوتی ہے کہ اس کی ذمہ داریاں کسی حال میں ایک لمحے کے لیے بھی اس سے  
منفک نہیں ہوتیں۔ زندگی کے مختلف شعبوں میں وہ جو کچھ کرتا ہے اللہ کی ہدایت کے  
تحت کرتا ہے اس پر ہر آن اللہ کی طرف سے سخت نگرانی قائم رہتی ہے جس کے

ماتحت وہ اپنی حدود کے اندر چلنے پر مجبور ہوتا ہے جو اللہ نے مقرر کر دی ہیں۔ اللہ کا رسول اپنے ہر قول اور ہر فعل سے بلکہ زندگی کے ہر پہلو کے طریقہ عمل سے دُنیا کے سامنے ان اصولوں کا تعین کرتا ہے جن پر انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے نظام کا قیام فطری طور پر متقاضی ہے وہ اپنی زندگی کے ہر پہلو سے دُنیا کے سامنے ان اصولوں کی نشاندہی کرتا ہے جن کے دائرے میں ہی انسان کی انفرادی عمل کو محدود دیکھنا چاہیے ہے۔ ان امور کی تعیین اور ان حدود کی نشاندہی کا یہ کام اللہ کا رسول اپنی شخصی ذاتی زندگی میں بھی اسی طرح انجام دیتا رہتا ہے جس طرح اپنی سرکاری حیثیت میں اور کسی معاملہ میں بھی اگر اس کے قدم کو ذرا سی لغزش ہو جاتی ہے تو اس کو فوراً اللہ کی طرف سے تنبیہ کی جاتی ہے کیونکہ وہ ایک ایسے منصب پر متمکن ہے کہ اس کی

وجہ سے اس کی خطا صرف اسی کی خطا نہیں رہ جاتی بلکہ ایک پوری امت کی خطا بن جاتی ہے اس کو بھیجنے کا مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ وہ لوگوں کے درمیان زندگی بسر کر کے ان کے سامنے ایک ایسی زندگی کا مکمل نمونہ پیش کر دے جو اللہ کی منشا و رضا کے عین مطابق ہو اور صرف یہی نہیں کہ انفرادی معاملات میں ان کی رہنمائی کر کے ان کو فرداً فرداً مسلمان بنائے بلکہ اس کے ساتھ ہی ان کا تمدنی، سیاسی، معاشی اور اخلاقی نظام بھی ان خطوط پر استوار کر دے جو خالق کائنات نے بنی نوع انسان کی نلاح کے لیے متعین کیے ہیں ظاہر ہے اس کام کے لیے اللہ کے رسول کا ہر قسم کی خطا اور ہر نوع کی غلطی سے محفوظ ہونا لازم ہے تاکہ کامل اعتماد کے ساتھ اس کی پیروی کی جاسکے اور اس کے قول و فعل کو منشا الیہ معلوم کرنے کے لیے بلا خوف و خطر ایک معیار قرار دیا جاسکے۔

ہر حال قرآن کریم میں کہیں کوئی خفیف سے خفیف بھی ایسا اشارہ نہیں ملتا جس کی بنا پر یہ خیال کیا جائے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت رسالت اور حیثیت انسانی یا حیثیت امامت میں کوئی فرق کیا گیا ہے اور فرق کیا بھی کیسے جاسکتا ہے جب آپ اللہ کے رسول تھے تو لازم تھا کہ آپ کی پوری زندگی اللہ کی شریعت کے ماتحت ہو اور اس شریعت کی نمائندہ ہو اور آپ سے کوئی ایسا فعل اور کوئی ایسی حرکت صادر نہ ہو جو اللہ کی رضا کے خلاف ہو چنانچہ بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جس وقت جس حالت میں جو

کچھ بھی کرتے تھے رسول اللہ کی حیثیت سے کرتے تھے اور یہ سب کچھ ضلالت و غرابت اور ہوائے نفس سے پاک ہوتا تھا کیونکہ یہ سب کچھ وحی الہی کی روشنی میں ہوتا تھا۔ یہی بات ہے جس کی طرف سورہ نجم کی ابتدائی آیات میں اشارہ کیا گیا ہے ارشاد ربانی ہے :

<p>تہارے صاحب (یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم) نہ بھٹکے اور نہ گمراہ ہووے جو کچھ کہتے ہیں ہوا نفس کی بنا پر نہیں کہتے ان کی بات کچھ نہیں ہے مگر وحی جو ان پر نازل کی جاتی ہے ان کو ایسے (فرشتے) نے تعلیم دی ہے جس کی توفیق بڑی زبردست ہیں۔</p>	<p>مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوَىٰ ۚ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ ۚ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوسَىٰ ۚ عَلَّمَ مَثَدٍ الْقَدَىٰ ۚ</p> <p>(النجم - ۵:۲)</p>
--	---

مذہب حدیث ان آیات کو بھی اپنے مطلب کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان آیات میں محض سران کے وحی ہونے کا دعویٰ کیا گیا ہے جس کا کفار انکار کرتے تھے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان آیات میں کوئی مخفی سا اشارہ بھی قرآن کی طرف نظر نہیں آتا اِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوسَىٰ میں ہُوَ کی ضمیر نطق رسول کی طرف پھرتی ہے جس کا ذکر وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ میں کیا گیا ہے۔ ان آیات میں کوئی چیز آخر ایسی ہے جس کی بنا پر نطق رسول کو صرف سران کی تلاوت کے ساتھ مخصوص کیا جاسکتا ہو۔ جو شخص بھی ذرا انصاف کی نظر سے دیکھے گا بر ملا کہ اُٹھے گا کہ ہر وہ بات جس پر نطق رسول کا اطلاق کیا جاسکتا ہے آیات محمولہ بالا کی بنا پر وحی ہے اور ہوائے نفس سے پاک ہے کفار و راصل اسی چیز کے منکر تھے ان کا کہنا تھا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو نعوذ باللہ جنون ہے وہ اپنے دل سے باتیں بنا بنا کر کہتا ہے یا کوئی آدمی اس کو پڑھاتا ہے ان آیات میں کفار کے اسی غلط خیال کی تردید کی گئی ہے اور صاف الفاظ میں فرمادیا گیا ہے کہ تمہارا صاحب نہ بدراہ ہے نہ گمراہ اور نہ وہ اپنی خواہش نفس کی بنا پر کچھ کہتا ہے اس کی زبان سے جو کچھ نکلتا ہے حق نکلتا ہے جو خاص ہماری جانب سے ہے اور اس کو کوئی انسان یا جن یا شیطان نہیں پڑھاتا بلکہ وہ معلم فرشتہ بحق دیتا ہے جو شدید القویٰ ہے۔ یہی بات خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنی زبان مبارک کی طرف اشارہ کر کے فرمائی ہے کہ

فَوَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ مَا يَخْرُجُ | اس ذات پاک کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے  
مِنْهُ إِلَّا حَقًّا۔ (سنن دلمی) | اس (زبان) سے جو کچھ نکلتا ہے حتیٰ ہی نکلتا ہے۔

سوچنے کی بات ہے اگر اللہ کے رسول کی کسی ایک بات میں بھی یہ شبہ ہو جائے کہ وہ خواہش نفس پر مبنی ہے اور خدا کی طرف سے نہیں ہے تو اس کی رسالت پر سے اعتماد اٹھ جائے۔ قرآن میں یہ تصریح کہ رسول جو کچھ کہتا ہے وحی الہی کی بنا پر کہتا ہے کی ہی اسی لیے گئی ہے کہ جن لوگوں کے پاس رسول کو بھیجا گیا ہے ان کو رسول کے بارے میں بدراہی و گمراہی اور ہولائے نفس سے محفوظ ہوتے کا کامل اطمینان ہو جائے۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن بار بار اس امر کی صراحت کرتا ہے کہ رسول ہونے کی حیثیت سے جو فرائض نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر عائد کیے گئے ہیں اور جو خدمات آپ کے سپرد کی گئی ہیں ان کی انجام دہی میں آپ اپنے ذاتی خیالات و خواہشات کے مطابق کام کرتے کے لیے آزاد نہیں چھوڑ دئے گئے بلکہ آپ وحی کی رہنمائی کے پابند ہیں۔ قرآن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے بار بار کھلتا ہے :

إِنِّ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰ رَاحَتِ | میں تو بس اس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو میرے پاس آتی ہے۔ (الانعام - ۵۰)

قُلْ إِنَّمَا أَتَّبِعُ مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ مِنْ رَبِّي۔ (الاعراف - ۲۰۳) | آپ کہہ دیجئے میں تو بس اسی کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر میرے رب کی طرف سے وحی ہوا ہے۔

یوں بھی یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک شخص کو اللہ تعالیٰ اپنا رسول مقرر کرے دنیا بھر کو اس پر ایمان لانے کی دعوت دے اس کی بے چون و چرا اطاعت اور اس کے اتباع کا بار بار تاکید حکم دے اسے اپنی طرف سے نمونے کا آدمی ٹھہرائے اور یہ سب کچھ کرنے کے بعد اسے آزاد چھوڑ دے کہ اپنے ذاتی خیالات و رجحانات کے مطابق جس طرح چاہے رسالت کی خدمت انجام دے۔

غرض قرآنی آیات اس باب میں بالکل صریح ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا جو قدم اٹھاتا تھا وحی کی رہنمائی میں اٹھاتا تھا جو قول اور جو فعل آپ کی ذات سے صادر ہوتا تھا وحی

کی رہنمائی میں صادر ہوتا تھا جس کا مطلب یہ ہوا کہ آپؐ نے اپنی تیسیس سالہ پیغمبرانہ زندگی میں جتنے کام سرانجام دئے اللہ کا رسول ہونے کی حیثیت سے انجام دئے ۔

## اجتہادِ غرضوں سے غلط استدلال | اس سلسلے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ان اجتہادِ غرضوں کو

استدلال کے طور پر پیش کرنا جس کا قرآن نے ذکر کیا ہے اور ان کی بنیاد پر یہ کہنا کہ آپؐ کی ذات سے غرضوں کا صدور اس بات کی دلیل ہے کہ تبلیغ قرآن کے بعد آپؐ کے جتنے کام تھے ایک عام انسان کی حیثیت سے تھے بالکل ہی بے اصل ہے ۔ اس لیے کہ اگر یہ مان لیا جائے تو اس کا تو مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف سے پہلے ایک رسول بھیجا اور پھر خود ہی اس کا اعتبار کھونے کے لیے وہ آیات بھی نازل کر دی جو اس کو محاذِ اللہ غلط کار ثابت کرتی ہیں تاکہ لوگ کہیں اطمینان کے ساتھ اس کی پیروی نہ کرتے لگیں کتنی مضحکہ خیز بات ہے یہ ! قرآن کریم میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی غرضوں اور ان پر اللہ کی تہنیدوں کا جو ذکر آیا ہے اس کا ہرگز یہ منشا نہیں ہے کہ لوگوں کے دلوں سے آپؐ کا اعتماد اٹھ جائے اور لوگ یہ سمجھنے لگیں کہ جب اللہ کا رسول بھی نعوذ باللہ ہماری ہی طرح غلطیوں کا ارتکاب کر سکتا ہے تو اس کے احکام کی اطاعت اور اس کی روش کی پیروی کامل اطمینان کے ساتھ کیسے کی جاسکتی ہے بلکہ ان غرضوں اور تہنیدوں کے ذکر سے بتانا یہ مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسول کو چونکہ اپنے بندوں کی رہنمائی کے لیے مامور کرتا ہے اس لیے ہمیشہ اس پر خاص نظر رکھتا ہے غلطیوں سے اس کی حفاظت کرتا ہے مگر اہمیتوں سے اس کو بچاتا ہے حتیٰ کہ اگر بمقتضائے بشریت کبھی وہ اپنے اجتہاد میں بھی غلطی کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ فوراً اس کی اصلاح کر دیتا ہے ۔ قرآن کریم میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جن پانچ یا چھ غرضوں کا ذکر ہے اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ آپؐ نے اپنے فیصلوں میں محاذِ اللہ بہت سی غلطیاں کی ہیں جن میں سے اللہ نے بطور نمونہ یہ چند غلطیاں پکڑ کر بتا دیں تاکہ لوگ ہوشیار ہو جائیں منکرینِ حدیث کا موقف تسلیم کر لیا جائے تو پھر بھی مطلب نکلتا ہے حالانکہ دراصل ان غرضوں کا ذکر اسکے

بالکل ہی برعکس مفہوم کا حامل ہے اس کا مطلب تو یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی پوری پیغمبرانہ زندگی میں بس یہی چند لہزہ شیش صادر ہوئیں جن کی اللہ تعالیٰ نے غوراً اصلاح فرمادی اور اب ہم پورے اطمینان کے ساتھ اس پوری سنت کی پیروی کر سکتے ہیں جو آپ سے ثابت ہے کیونکہ اس میں اگر کوئی اور لہزہ شیش ہوتی تو اللہ تعالیٰ اس کو بھی برقرار نہ رہنے دیتا جس طرح ان لہزہ شیشوں کو اس نے برقرار نہیں رہنے دیا۔

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے صرف پانچ مواقع پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ کی کسی غلطی پر تنبیہ کی گئی ہے۔

ایک سورۃ انفال میں بدر کے قیدیوں کو فدیہ کے عوض رہا کر دینے کے موقع پر اس بات پر تنبیہ کی گئی کہ آپ نے اس وقت تک قتل و قتال کیوں جاری نہ رکھا جب تک فساد کی بالکلینہ سبب مکنی نہ ہو گئی فرمایا گیا :

<p>نبی کی شان کے لائق نہیں ہے کہ اس کے قیدی (باقی) رہیں جب تک وہ زمین میں اچھی طرح خون دہری نہ کر لے۔</p>	<p>مَا كَانَ لِنبِيِّ أَنْ يَكُونَ لَهُ أُسْرَى حَتَّى يَشْتَرِيَ فِي الْأَرْضِ مِنْ (انفال : ۶۷)</p>
---	---

دوسرے جنگ تبوک کے موقع پر جب بعض منافقین نے بہانے بنا کر جنگ میں شریک نہ ہونے اور وطن میں رہ جاتے کی اجازت مانگی اور آپ نے کمال عفو اور مہربانی سے کام لیتے ہوئے ان کو اجازت دے دی تو اس بات پر تنبیہ کی گئی کہ اگر آپ اجازت نہ دیتے تو شریک تو یہ منافقین پھر بھی نہ ہوتے مگر اس وقت بغیر اجازت رہ جانے پر ان کی قلعی کھل جاتی۔ ارشاد فرمایا گیا :

<p>اللہ نے آپ کو معاف کر دیا لیکن آپ نے ان کو اجازت کیوں دے دی تھی جب تک کہ آپ پر سچے لوگ ٹھہر نہ ہو جلتے اور آپ جھوٹوں کو جان نہ لیتے۔</p>	<p>عَفَا اللَّهُ عَنْكَ لِمَ أَذِنَتْ لَكَ حَتَّى تَبَيَّنَ لَكَ الَّذِينَ صَدَقُوا وَلَعَلَّمَ الْكَاذِبِينَ (التوبہ - ۴۲)</p>
---	---

تیسرے اس موقع پر آپ کے لیے اللہ کی جانب سے تنبیہ نازل ہوئی جب آپ حضرت زید کی



مطلقہ بیوی حضرت زینب سے نکاح کرنے کے بارے میں صرف اس لیے متروک تھے کہ قوم عرب جو منہ بولے بیٹے کی بہو سے نکاح کو انتہائی محبوب سمجھتی ہے طریح طرح سے بدنام کرے گی۔ آپ کے اپنی فکر و تردد پر تبیین کرتے ہوئے فرمایا گیا:

اور آپ اپنے دل میں وہ چھپاتے رہے جسے اللہ ظاہر کرنے والا تھا اور آپ لوگوں کی طرف سے اندیشہ کر رہے تھے حالانکہ اللہ ہی اسی کا زیادہ حقدار ہے کہ اس سے ڈرا جائے۔

وَرَخِیْ فِي نَفْسِكَ مَا اللَّهُ مُبْدِيهِ  
وَتَخْشَى النَّاسَ وَاللَّهُ أَسَنُّ  
أَنْ تَخْشَاهُ۔

(الاحزاب : ۲۷)

جو تھا موقع وہ ہے جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی کسی زوجہ مطہرہ کی ذل جونی کے لیے عہد کر لیا تھا کہ آئندہ آپ کبھی شہد نہ پیش گئے یہ عمل اگرچہ بجائے خود بالکل جائز تھا لیکن ایک پیغمبر کے شایان شان نہ تھا کہ ایک داعی ضعیف کی بنا پر ایک حلال چیز کو چھوڑ دیں اس لیے اس پر اللہ کی جانب سے آپ کو عتاب کے رنگ میں خطاب فرمایا گیا۔ آپ اگرچہ کسی حلال چیز کو حرام نہیں فرما رہے تھے لیکن آپ کے عہد کے بعد چونکہ صرف وجوب امتناع میں وہ چیز مثل حرام کے ٹھہر رہی تھی اس لیے اللہ تعالیٰ نے اسے تبلیہاً تحریم سے تعبیر کرتے ہوئے فرمایا:

اے نبی جس چیز کو اللہ نے آپ کے لیے حلال کیا ہے اسے آپ اپنی بیویوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے کیوں حرام کر رہے ہیں۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَا آتَاكَ  
اللَّهُ لَكَ تَبْتَغِي مَرْضَاتَ  
أَرْوَاجِكَ (التحریم : ۱)

اور پانچواں موقع وہ ہے جس کا ذکر سورہ عبس کی ابتدائی آیات میں ہوا ہے جب آپ کے پاس سرداران قریش بیٹھے ہوئے تھے اور تبلیغ و اشاعت دین کی دھن میں آپ ان کی طرف اس قدر متوجہ تھے کہ ایک نابینا صحابی عبداللہ بن مکتوم کے آنے پر اور کوئی مسئلہ پر چھنے پر ان کی طرف توجہ نہ فرما سکے جس سے کچھ بے اعتنائی کا سا مظاہرہ ہو گیا تو اللہ کی طرف سے تبیین ہوئی کہ سائل پہلے سے مشرف باسلام ہونے کی بنا پر آپ کی توجہ کا زیادہ مستحق تھا۔ اس تبیین کی ابتداء ان الفاظ سے ہوئی ہے:

عَبَسَ وَتَوَلَّى ۚ اَنْ جَاءَهُ الْاُنْحَىٰ | (پیمبر) چپیں بچیں ہرنے اور منہ پھیر لیا اس  
..... ۱۰۰۰ (عبس: ۱-۱۰) | بات پر کہ ان کے پاس نابینا آیا۔

بس ان پانچ مواقع پر قرآن میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اللہ کی جانب سے  
تنبیہ نازل ہوئی ہے۔ البتہ ایک اور مقام جہاں گمان کیا جاسکتا ہے کہ شاید یہاں کسی  
غلطی پر تنبیہ کی گئی ہے وہ سورہ توبہ کی اس آیت میں ہے جس میں منافقین کی نماز  
جنازہ پڑھانے سے منع کیا گیا ہے اور فرمایا گیا ہے:

وَلَا تُصَلِّ عَلَىٰ اَحَدٍ مِنْهُمْ مَاتَ  
اَبَدًا ۚ لَا تَقُمْ عَلَىٰ قَبْرِہٖ۔  
(التوبہ: ۸۴)۔  
اور ان میں سے جو کوئی مُر جلتے اس پر کبھی  
بھی نماز نہ پڑھئے اور نہ اس کی قبر پر  
کھڑے ہو جیسے۔

اگر اس کو بھی شامل کر لیا جائے تو کل چھ مواقع بن جاتے ہیں۔ پورے تینیس سال کے  
زمانہ نبوت میں ان پانچ یا چھ مواقع کے سوا قرآن کریم میں نہ رسول اللہ صلی اللہ  
علیہ وسلم کی کسی غلطی کا ذکر آیا ہے نہ کسی قسم کی اس پر تنبیہ یا اس کی اصلاح کا۔  
اس سے جو بات فی الحقیقت ثابت ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ اس پورے زمانے میں  
نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم براہ راست اللہ تعالیٰ کی نگرانی میں فرائض نبوت انجام  
دیتے رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ بطور خاص اس بات کی حفاظت فرماتا رہا ہے کہ اس  
کا نمائندہ مجاہد کہیں اس کی نمائندگی اور لوگوں کی رہنمائی کے کام میں کوئی غلطی نہ  
کرے۔ بیٹھے چنانچہ ان پانچ یا چھ مواقع پر جو ذرا سی جھک آپ سے ہوئی جس کو صحیح  
معنوں میں غلطی بھی نہیں کہا جاسکتا بلکہ زیادہ سے زیادہ اجتہادی لغزش سے تعبیر  
کیا جاسکتا ہے اس کی بھی فوراً اصلاح کر دی اور لغزش اور اصلاح دونوں کا  
ذکر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے قرآن کریم میں ثبت کر دیا تاکہ یہ ثابت ہو جائے کہ کار نبوت  
سارا کا سارا ہر قسم کی غلطی کی آمیزش سے پاک ہے اور یہ معلوم ہو جائے کہ ان مواقع  
کے سوا اگر کوئی اور غلطی آپ سے ہوئی ہوتی تو اس کی بھی اسی طرح فوراً اصلاح کر دی  
جاتی اور قرآن میں اس کا بھی ذکر اسی طرح موجود ہوتا۔ یہ چیز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم

کی رہنمائی پر سے ہمارا اطمینان رخصت کر دینے کے بجائے اس کو اور زیادہ بچتے اور مضبوط بناتے والی ہے۔ ہم اب پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ آپؐ کی تیئیس لہ پیغمبرانہ زندگی کا پورا کارنامہ ہر قسم کی خطا اور ہر طرح کی لغزش سے بالکل پاک ہے اور اس کو اللہ تعالیٰ کی سند حاصل ہے۔

کاش منکرین حدیث نے کبھی اس بات پر غور کیا ہوتا کہ ان معمولی معمولی لغزشوں کو اللہ کے یہاں اتنی اہمیت کہوں دی گئی کہ فوراً وحی جلی کے ذریعے سے ان کی اصلاح کرنا ضروری سمجھا گیا اگر تبلیغِ قرآن کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت ایک عام انسان کی سی ہوتی اور ایک عام امیر کی طرح آپؐ مسلمانوں کے امیر ہوتے تو کیا اس وقت بھی ان معمولی معمولی باتوں کی اسی قدر اہمیت ہوتی کیا اس وقت بھی باقاعدہ ایک فرشتہ وحی الہی لے کر ان باتوں کی اصلاح کے لیے آسمان سے اترتا۔ سوچنے کی بات ہے کسی انسان کا شہد کھانا نہ کھانا یا کسی اندھے کی طرف توجہ نہ کرنا یا کسی کے مرنے پر اس کے لیے دعائے مغفرت کر دینا کیا ایک عام انسان کی زندگی کے ایسے ہی اہم واقعات ہیں کہ ان کے لیے آسمان سے وحی اترے اسی طرح جنگ کی شرکت سے کسی کو مستثنیٰ کر دینا یا بعض قیدیوں کو فدیہ لینے کہ چھوڑ دینا کیا ایک عام امیر یا حاکم کی زندگی کے ایسے ہی اہم معاملات ہیں کہ ان پر تہنیت کے لیے آسمان سے فرشتے نازل ہوں۔ کونسا امیر یا حاکم دنیا کا الیاس ہے جس کی زندگی میں بارہا اس طرح کے بلکہ اس سے کہیں زیادہ بڑے اور اہم معاملات پیش نہ آتے ہوں کیا کبھی کسی امیر کے لیے کسی بھی موقع پر آسمان سے فرشتہ اترتا سنا یا دیکھا ہے آخر کیا وجہ ہے کہ اتنی معمولی لغزشیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے صادر ہوئیں اور فوراً ان کی اصلاح کے لیے آسمان سے وحی اتر آئی۔ منکرین حدیث نے کبھی اس حقیقت پر غور کیا ہوتا تو ان کی سمجھ میں آگیا ہوتا کہ انہوں نے اللہ کے رسول کو ایک عام انسان کا درجہ دے کر کس قدر زبردست ٹھوکر کھائی ہے۔ بات یہ ہے کہ دنیا کا کوئی امیر کوئی حاکم کوئی فرمانروا یا کوئی رہنما یا منکرین حدیث کی اصطلاح میں کوئی مرکز ملت اللہ تعالیٰ کا نمائندہ نہیں ہوتا اس کا مقرر کیا ہوا شارع اور اسی

کی طرف سے مامور نمونہ تقلید نہیں ہوتا اس لیے اس کی کسی بڑی سے بڑی غلطی کے بارے میں بھی یہ خدشہ نہیں ہوتا کہ وہ قانون کی حیثیت اختیار کر لیگی یا اس سے خدا کی شریعت کا کوئی اصول اثر انداز ہوگا اس لیے اس پر کسی قسم کی تنبیہ کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی اس کی اصلاح کا بطور خاص کوئی اہتمام نہیں کیا جاتا لیکن بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے اپنے اعلانات کی رو سے دنیا کے سامنے مہضات الہی کی نمائندگی کرتے تھے آپ کی اطاعت اور آپ کی اتباع کو جزو ایمان بنایا گیا تھا آپ کے بارے میں صاف طور سے یہ کہہ دیا گیا تھا کہ جو کچھ آپ حلال کیں اسے حلال جانو اور جسے آپ حرام قرار دے دیں اسے حرام مان لو آپ کی زندگی کے ایک لمحے کو اسوۂ حسنہ قرار دے دیا گیا تھا اس لیے آپ کی یہ معمولی لغزشیں بھی بہت بڑی تھیں کیونکہ وہ کسی عام انسان کی لغزشیں نہ تھیں بلکہ اللہ کے اس رسول کی لغزشیں تھیں جس کی ایک ایک حرکت اور سکون سے قانون الہی تشکیل پاتا تھا اس لیے آپ کے ایک ایک قول اور ایک ایک عمل کی بطور خاص حفاظت کی گئی جہاں کہیں ذرا سی چوک ہوئی فوراً وحی جلی کے ذریعے اس کی اصلاح کر دی گئی۔ اگر قرآن پہونچا دینے کے بعد آپ کی حیثیت ایک عام انسان کی سی ہوتی تو آپ کے قول و عمل کی اس طرح کی حفاظت کا ہرگز اتنا اہتمام نہ کیا جاتا۔

اس ضمن میں منکرین حدیث کی جانب سے درج ذیل آیت بھی پیش کی جاتی ہے :

**فرائض نبوت کی انجام دہی اور غلطیوں کا صدور**

آپ کہہ دیجئے کہ اگر میں گمراہ ہو گیا تو میری گمراہی کا وبال مجھ ہی پر رہے گا۔ اور اگر میں ہدایت پر رہوں تو یہ اس وحی کی بدولت ہے جو میرا پروردگار مجھے کرنا رہتا ہے۔

قُلْ إِنْ ضَلَلْتُ فَإِنَّمَا أَضِلُّ عَلَى  
نَفْسِي وَإِنْ اهْتَدَيْتُ فَبِمَا يُوحَىٰ  
إِلَيَّ نَبِيًّا (۵۰ : ۱)

اور کہا جاتا ہے کہ یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ آپ سے فرائض نبوت کی انجام دہی میں کبھی کبھی غلطیاں ہی سرزد ہو جاتی تھیں نیز قرآن کے علاوہ جس کو اس آیت میں فہماؤ جی

اَلْحَىِّ مَرِئِي سے تعبیر کیا گیا ہے آپ کے اقوال و افعال کے بارے میں یہ آیت بتاتی ہے کہ وہ خطا و قصور سے محفوظ نہ تھے اور یہی بات منکرین حدیث کے نزدیک اس بات کا ثبوت ہے کہ قرآن پونچانے کے علاوہ آپ کے جتنے کام تھے ایک عام انسان کی حیثیت سے تھے۔

کتنی عجیب بات ہے منکرین حدیث دعویٰ کرتے وقت شاید عقل کو بالکل ہی کام میں نہیں لاتے اگر اس آیت سے یہی مفہوم مستفاد ہوتا ہے جو ان لوگوں نے سمجھا ہے تو اس کا تو مطلب یہ ہوا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس معاذ اللہ ضلالت و ہدایت کا مجموعہ تھی کتنی مضحکہ خیز ہے یہ بات! کیا یہ تصور کر لیا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف سے ایک رسول بھی بھیجا اور پھر خود ہی اس کا اعتبار کھونے اور اسے لغو و بالذات غلط کار و گمراہ ثابت کرنے کے لیے یہ آیت بھی نازل کر دی اور خود اسی کے منہ سے کہلوا دیا کہ میں کبھی کبھی گمراہ بھی ہو جاتا ہوں؟ کیا اس لیے کہ کہیں لوگ اطمینان کے ساتھ اس کی پیروی نہ کرنے لگیں؟

منکرین حدیث نے استدلال کرتے وقت اتنا بھی نہ دیکھا کہ یہ آیت کس سیاق و سباق میں آئی ہے دیکھا تو ضرور ہو گا مگر کیا کیا جائے ان کا توفیق ہی یہ ہے کہ آیت قرآنی کو ان کے سیاق و سباق سے علیحدہ کر کے اپنے من مانے معانی ان کو پہنائیں۔ یہ آیت سورہ سبأ کی ہے اللہ تعالیٰ نے اس سورت کے پہلے ہی رکوع میں کفار مکہ کا یہ الزام نقل فرمایا ہے کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بہتان گھڑنے والا یا مجنوں قرار دیتے تھے۔

اَفْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا اَمْ بِهِ  
جَنَّةٌ (سبأ: ۸)

اس نے یا تو خدا پر جھوٹ بہتان باندھا ہے یا اسے جنون ہے۔

پھر کفار مکہ کے اس الزام کا جواب دیتے ہوئے اول اللہ تعالیٰ نے نصیحت کے انداز میں فرمایا کہ دیکھو تم انفرادی طور پر اور سب مل کر بھی خدا اور ہٹ دھرمی چھوڑ کر خلوص دل کے ساتھ ذرا غور تو کرو تمہارا دل خود گواہی دے گا کہ یہ شخص جو تمہیں عذاب الہی سے ڈرا

ہرگز مجنون نہیں ہے :

قُلْ إِنَّمَا أَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ  
أَنْ تَقُومُوا لِلَّهِ مِثْلِيَ خَزَائِدٍ  
ثُمَّ تَتَفَكَّرُوا مَا بِصَاحِبِكُمْ  
مِنْ جِنَّةٍ إِنَّهُ هُوَ إِلَّا نَذِيرٌ  
لَّكُمْ بَيْنَ يَدَيْ عَذَابٍ شَدِيدٍ

(سبا - ۴۲)

آپ یہ کیے کہ میں تمہیں ایک بات بھاتا ہوں  
وہ یہ کہ تم اللہ کے واسطے دو دو اور ایک  
ایک کر کے کھڑے ہو جاؤ پھر سوچو۔ تمہارے ان  
ساتھی کو جنوں نہیں ہے یہ تو ایسے عذاب شدید کی  
آمد سے پہلے تم کو ڈرانے والے ہیں۔

یہ تو جواب تھا اس بات کا کہ معاذ اللہ آپ کو جنون ہو گیا ہے اس کے بعد اس الزام کے  
جواب میں کہ یہ شخص اللہ پر جان بوجھ کر بہتان گھڑتا ہے اللہ تعالیٰ اپنے نبی سے فرماتا  
ہے کہ اے نبی ان سے کہہ دیجئے کہ درحقیقت یہ سچا کلام میرا رب اقرار فرماتا ہے :  
قُلْ إِنْ سَأَلْتُمْ لِيَقْذِفُوا بِحَقِّ (آپ کہہ دیجئے کہ میرا رب سچا دین ڈالتا ہے۔ سبا : ۴۸) اگر  
میں گمراہ ہو گیا ہوں جیسا کہ تم الزام لگا رہے ہو تو میری اس گواہی کا وبال مجھ پر ہے  
إِنْ ضَلَلْتُ فَإِنَّمَا أَضِلُّ عَلَىٰ نَفْسِي وَإِذَا كُنْتُمْ عَلَىٰ رِجْلٍ مِّنَ الْأَرْضِ فَأَنصِتْ إِلَىٰ صَوْتِي وَهُوَ كَافِرٌ  
ہوں جو میرا رب مجھ پر نازل کرتا ہے وَ إِنْ هَدَيْتُمْ فِيمَا أُوتِيتُ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ  
سننے والا اور قریب ہے إِنَّهُ سَمِيعٌ قَرِيبٌ یعنی اس سے پوشیدہ نہیں ہے کہ میں  
گمراہ ہوں یا ہدایت یافتہ۔

یہ ہے منکرین حدیث کی طرف سے ہٹس زدہ آیت کا سیاق و سباق۔ تاہم خود  
اندازہ لگائیں کہ کس سیاق و سباق میں کہی ہوئی بات کو کہاں لے جا کر چسپاں کیا گیا۔ جو بات  
کفار مکہ کے الزامات کا منہ توڑ جواب تھی اس کو ان خوفِ خدا سے عاری لوگوں نے  
کفار مکہ کے الزامات کا ثبوت بنا کر رکھ دیا گویا اللہ تعالیٰ نے کفار مکہ کے سامنے  
اپنے رسول سے یہ اعتراف کروا دیا کہ جو کچھ تم کہتے ہو وہ درست ہے میں واقعی کبھی کبھی  
گمراہ بھی ہو جاتا ہوں اعاذنا اللہ منہ۔

حضور کی بشریت سے غلط استدلال | اپنے اسی فن کا کرشمہ ان لوگوں نے اس آیت میں بھی دکھایا ہے جو اپنے اسی

دعوے کے ثبوت میں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت تبلیغ قرآن تک محدود تھی اور اس کے بعد آپ ایک عام انسان کی حیثیت میں مسلمانوں کے امام تھے ان کی طرف سے بار بار پیش کی جاتی ہے۔ وہ آیت ہے،

قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ | آپ کہہ دیجئے کہ میں تو بس تمہارا ہی جیسا ایک  
(الکہف : ۱۱۰) | بشر ہوں۔

قرآنی آیت کا یہ ٹکڑا پیش کر کے منکرینِ حدیث اپنے زعم میں دلائل کی ایک بہت بلند عمارت تعمیر کرتے ہیں اور ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ فرائض رسالت کی انجام دہی میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ کر کے دکھایا ایک عام بشر کی حیثیت سے کر کے دکھایا۔ ان کے نزدیک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے یہ اعلان کرنا کہ أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ اس بات کی دلیل ہے کہ خود قرآن کی نظر میں بھی آپ کی حیثیت ایک عام انسان کی تھی۔

جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا اس آیت کو بھی سیاق و سباق سے علیحدہ کر کے اپنے معمولہ معنی پہنائے گئے ہیں بلکہ اس آیت کو پیش کرتے وقت تو کمال یہ کیا گیا ہے کہ پوری آیت بھی پیش نہیں کی گئی قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ کے فوراً بعد جو الفاظ ہیں جان بوجھ کر حوالہ دیتے وقت ان کو حذف کر دیا گیا اس لیے کہ ان الفاظ کی موجودگی میں اس آیت کو وہ معنی نہیں پہنائے جاسکتے جو منکرینِ حدیث کا مطلب نظر ہیں۔ پوری آیت اس طرح ہے :

قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ | آپ کہہ دیجئے میں تو تمہارا ہی جیسا ایک بشر ہوں  
يُوسُفُ رَاحٍ - (الکہف : ۱۱۰) | البتہ مجھ پر وحی آتی ہے۔

گویا پوری بات جو قرآن نے کہی ہے وہ یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک ایسے بشر ہیں جن پر خدا کی طرف سے وحی آتی ہے ایک اور مقام پر قرآن نے اس سے بھی زیادہ واضح انداز میں یہ کہا ہے کہ آپ ایک ایسے بشر ہیں جنہیں رسول بنایا گیا ہے سورۃ بنی اسرائیل میں آپ ہی کی زبان سے اعلان کر دیا گیا ہے :

قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيَ هَلْ كُنْتُ  
إِلَّا بَشَرًا مَّرْسُولًا (نبی اسرائیل - ۱۲) | آپ کہہ دیجئے پاک ہے میرا پروردگار۔ میں بجز ایک  
آدمی کے جو رسول ہے امد کیا ہوں۔

ظاہر ہے ایک عام بشر میں اور اس بشر میں جس پر وحی آتی ہو اور جس کو منصب رسالت پر  
مقرر فرمایا گیا ہو نہ بین آسمان کا فرق ہے وہ بشر جو خدا کا رسول ہے وہ لامحالہ خدا کا نمائندہ  
ہے اور وہ بشر جس کے پاس وحی آتی ہے وہ بلاشبہ خدا کی براہ راست ہدایت کے تحت کام  
کرتا ہے اس کی حیثیت اور ایک عام بشر کی حیثیت یکساں کیے ہو سکتی ہے۔

اس قسم کی آیات میں دراصل بتلایا یہ گیا ہے کہ اللہ کا رسول باوجود اس حقیقت کے  
کہ انبی زندگی کا ایک ایک لمحہ اللہ کی براہ راست رہنمائی میں گزرتا ہے یہاں تک کہ اسکے  
منہ سے وہی کچھ نکلتا ہے جو اس پر وحی کی جاتی ہے لیکن اس کے باوجود وہ انسان ہی ہوتا ہے  
خدا نہیں ہوتا۔ اس قسم کی آیات سے فی الحقیقت نصاریٰ کا مقصود ہے جنہوں نے حضرت  
عیسیٰ کو خدا کا بیٹا بلکہ خود خدا کا ایک اقنوم قرار دے لیا تھا۔ دیکھا جائے تو نبی کریم صلی اللہ  
علیہ وسلم کی ذات سے لغزشوں کا صہیدہ اور اس پر اللہ کی طرف سے تنبیہات کا ذکر بھی  
قرآن میں اسی لیے کیا گیا ہے کہ آپ کی طرف الوہیت کے تصور کا امکان ہی باقی نہ رہے۔  
جبریت ہوتی ہے منکرین حدیث کی کج فہمی جو آیات اس بات کا ثبوت تھیں کہ نبی کریم صلی اللہ  
علیہ وسلم کی ذات میں انسانی حیثیت اور پیغمبرانہ حیثیت دونوں اس طور پر جمع ہیں کہ ایک  
حیثیت کو دوسرے حیثیت سے علیحدہ نہیں کیا جاسکتا انہی آیات کو توڑ کر ان لوگوں نے  
آپ کی دونوں حیثیتوں میں تفریق من کل الوجوہ کے لیے دلیل بنا لیا۔ اس قسم کی تمام آیات سے  
فی الحقیقت جھٹلانا یہ مقصود ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جس طرح انسان ہو کر رسول ہیں  
اسی طرح رسول ہو کر بھی انسان ہی ہیں خدا نہیں۔

فرق دراصل یہی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن جب بشر کہتا ہے تو رسول  
ہونے اور مہبط وحی ہونے کی فید گاہ کریمہ واضح کر دیتا ہے کہ آپ ہیں تو بشر مگر ایسے بشر جن کی  
زندگی کا ایک ایک لمحہ اللہ تعالیٰ کی براہ راست حفاظت ہدایت کے تحت گزرتا ہے اس  
سے برعکس جب منکرین حدیث آپ کی بدتریت کو زیر بحث لاتے ہیں تو اس حیثیت سے



کہ آپ ایک عام غیر معصوم انسان ہیں۔ جس طرح دوسرے عام انسانوں کے اقوال و افعال خطا و قصور سے متبرک نہیں اسی طرح آپ سے بھی غلطیاں سرزد ہو سکتی ہیں اور ہوتی رہی ہیں۔

**قیام دین سے متعلق اشکالات**  
اور ان کا بخسریہ

بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بشریت کی قرآنی تعبیر کو اگر ذہن میں رکھا جائے تو منکرین حدیث کی جاہل سے پیش کردہ وہ اشکالات بھی خود بخود ہوا میں تحلیل ہو جاتے ہیں جو وہ بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہر آن اور ہر حال میں رسول مافے کی صورت پر بیٹے شد و مد سے وارہ دیکھا کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اگر یہ مان لیا جائے کہ قرآن پہونچانے کے علاوہ بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جتنے کام بھی کیے رسول کی حیثیت سے کیے تو اس سے لازماً دو نیچے پیدا ہوں گے اولاً یہ کہ آپ کے علاوہ دین پر عمل کرنا عام انسانوں کے لیے ناممکن تصور کیا جائے اور یہ سمجھ لیا جائے کہ جو نظام زندگی اللہ کے رسول تھے قائم کر کے چلا دیا اسے آپ کے بعد قائم کرنا اور چلانا عام انسانوں کے بس کی بات نہیں دوسرے یہ کہ اس نظام کو قائم رکھنے اور چلانے کے لیے بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی نبوت کا دروازہ کھلا رکھا جائے تاکہ ہر زمانے میں اللہ کا رسول ہی آکر وہ کام انجام دیتا رہے جو عام انسان نہیں کر سکتے۔ ان دونوں اشکالات کا قرآن نے یہ کہہ کر وجود ہی ختم کر دیا کہ آپ رسول ہو کر بھی انسان ہی ہیں فرشتے یا خدا نہیں ہیں کہ ان کی ذات سے صادر ہونے والے کاموں کی انجام دہی کو عام انسانوں کی قدرت سے باہر سمجھا جائے۔

بلکہ اگر صحیح معنوں میں دیکھا جائے تو یہ دونوں اشکالات تو اس وقت پیدا ہوتے ہیں جب منصب رسالت کے بارے میں منکرین حدیث کا یہ نقطہ نظر درست تسلیم کر لیا جائے کہ قرآن پہونچانے کے علاوہ بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے جتنے کام تھے انہیں وحی الہی کی سند حاصل نہ تھی کیونکہ اس صورت میں ہمارے پاس قرآن تو موجود ہو گا مگر قرآنی احکام پر عمل کرنے کا کوئی ایسا نمونہ ہمارے سامنے نہ ہو گا جس کی پیروی ہم اس اطمینان کے ساتھ کر سکیں کہ وہ قرآن کا ایک ایسا نقشہ عملی ہے جو قرآن اتارنے والے کی مشا و مراد

کے عین مطابق ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال فرما جانے کے بعد کوئی کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ جس دین کو قائم کرنے کے لیے جد و جہد کے پہلے قدم سے لے کر کامیابی کی آخری منزل تک ہر ضرورت اور ہر نازک موقع پر اللہ کی آیات اترتی رہی ہوں اسے اب کیسے قائم کیا جاسکتا ہے۔ قرآن ظاہر ہے پورا کا پورا ایک ہی وقت میں بطور ایک مرتب کتاب کے تو نازل نہیں ہو گیا تھا قرآن آخرانی وحیوں کا تو مجموعہ ہے جنہیں سال کے عرصہ پر محیط زمانہ نبوت کے دوران مختلف اوقات میں اور دین قائم کرنے کے مختلف مرحلوں میں آسانی ہدایات لے لے کر نازل ہوتی رہی ہیں قرآن پڑھتے ہوئے صاف محسوس ہوتا ہے کہ اللہ کی طرف سے مقرر کردہ ایک برگزیدہ انسان اس کائنات میں اللہ کا بھیجا ہوا دین قائم کرنے کی کوشش میں لگا ہوا ہے اور قدم قدم پر اللہ کی وحی قرآنی آیات کی صورت میں اس کی رہنمائی کے لیے آسمان سے اتر رہی ہے۔ مخالفین اس پر اعتراضات کی بوچھاڑ کرتے ہیں اور ان اعتراضات کا جواب آسمان سے آتا ہے۔ قیام دین کی جد و جہد میں طرح طرح کی مزاحمتیں مائل ہیں قسم قسم کی مخالفتوں کا سامنا ہے دین پر چلنے والوں کو گونا گوں مشکلات سے واسطہ ہے اور ان سب کے لیے تدا بیر قرآنی آیات کی صورت میں جبرئیل علیہ السلام لے کر آ رہے ہیں کہ فلاں مزاحمت اس طرح دوسرے فلاں مخالفت کے مقابلے کے لیے یہ رخ اختیار کرو اور فلاں فلاں مشکلات کا یہ حل ہے۔ جدید معاشرے کی تشکیل کا مسئلہ درپیش ہے اسلامی ریاست کی تعمیر کے مسائل سلجھانے ہیں منافقین یہود اور کفار عرب کے ساتھ کش مکش سے پیدا ہونے والے پیچ در پیچ معاملات نبھانے ہیں ان سب میں قدم قدم پر وحی آسمانی چھوٹی بڑی آیتوں اور سورتوں کی شکل میں اللہ کے اس برگزیدہ بندے کی رہنمائی کر رہی ہے۔ صرف یہی نہیں کہ جدید معاشرے کی تشکیل اور اسلامی ریاست کی تعمیر جیسے اہم مسائل کو سلجھانے کے لیے ہی آسمان سے ہدایات آتی ہیں بلکہ وہاں تو حال یہ ہے کہ کوئی جنگ پیش آگئی ہے تو اس معاشرے کے سمار اور اس ریاست کے فرمانروا کو جو جنگ کے وقت فوجوں کا سپہ سالار بھی ہے جنگ پر لوگوں کو ابھارنے کے لیے خطبہ آسمان سے ملتا ہے۔ تشکیل و تعمیر کے

کام پر مامور کوئی کارکن کہیں کوئی ذرا سی کمزوری دکھاتا ہے تو اس کی فہمائش کے لیے تقریباً آسمان سے اترتی ہے۔ کچھ لوگ ایک موقع پر جنگ پر جانے سے بھی چڑتے ہیں تو ان کے معاملے کا فیصلہ براہ راست اللہ میاں کر کے بھیجتے ہیں کوئی شخص دشمن کو جانوسی کا خط لکھ بھیجتا ہے تو اس کا فضیہ نمٹانے کے لیے آسمان سے وحی اترتی ہے۔ منافقین مسجد حرام بناتے ہیں تو اس کو توڑنے کا حکم بذریعہ وحی دیا جاتا ہے۔ بنی کی بیوی پر دشمن اہم طرزی کرتے ہیں تو اس کی صفائی آسمان سے آتی ہے۔

یہ سب قرآنی حقائق ہیں جن سے انکار ممکن نہیں۔ اگر منکرین حدیث کے نزدیک واقعی یہ بات مایوس کن ہے کہ دین کو قائم کرنے کے لیے بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ کیا اس کے بارے میں یہ یقین کر لیا جائے کہ وہ سب کچھ آپ نے وحی الہی کی رہنمائی میں کیا تو یہ مایوسی کا سبب تو خود قرآنی حقائق بھی موجود ہے۔ اگر وحی غیر قرآنی کا وجود تسلیم کر لینے میں یہ اشکال ہے کہ آپ کے بعد دین کا قائم کرنا اور چلانا عام آدمی کے بس کی بات متصور نہ ہو سکے تو بالکل یہی اشکال وحی قرآنی کا وجود تسلیم کر لینے میں بھی موجود ہے۔ قرآنی وحی بھی تو انہی ہدایات پر مشتمل ہے جو قیام دین کی جدوجہد میں از ابتدا آخر ہر ضرورت ہر مرحلے اور ہر نازک موقع پر بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رہنمائی کے لیے آسمان سے اترتی رہی ہیں۔ کوئی کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ جس دین کے قیام میں قدم قدم پر قرآنی آیات کی رہنمائی میسر رہی ہو اس دین کو وحی کا سلسلہ منقطع ہو جانے کے بعد کیونکر قائم کیا جاسکتا ہے۔ اگر وحی غیر قرآنی کا وجود تسلیم کر لینے پر منکرین حدیث کو نبوت کا دروازہ کھلا رکھنے کی ضرورت محسوس ہوتے لگتی ہے تو وحی قرآنی کے معاملے میں بھی تو یہی مشکل درپیش ہے۔ جب دین کے قیام کی ساری جدوجہد قرآنی آیات کی رہنمائی ہی کی مرہون منت ہے تو اب بھی دین کا قیام اس وقت تک کیسے ممکن ہوگا جب تک اس کے لیے جدوجہد کرنے والے پر بھی یعنی منکرین حدیث کے ”مرکز ملت“ پر بھی آیات الہی نازل ہونے کا سلسلہ شروع نہ ہو۔

معلوم ہوا منکرین حدیث کا استدلال ہی غلط ہے اگر دین کے قیام میں وحی الہی کی

رہنمائی آئندہ دین کی ترقی کی راہیں مسدود کر دینے کے مترادف ہے تو ہمیں ماننا پڑے گا کہ یہ راہیں اللہ نے معاذ اللہ خود مسدود کر دی ہیں۔ وحی قرآنی ہو یا غیر قرآنی اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ رہنمائی تو بہر حال وحی کی ہی رہی اس نقطہ نظر کی صورت میں تو ہمیں تسلیم کرنا پڑے گا کہ آیات قرآنی کے ذریعے سے قدم قدم پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رہنمائی کر کے اللہ تعالیٰ نے معاذ اللہ خود ایسا نامناسب طریقہ اختیار کیا جو مستقبل میں قیام دین کے احکامات سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مایوس کر دینے والا تھا۔ اس نقطہ نظر سے تو دراصل ہونا یہ چاہیے تھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت کے پید ہونے کا دن ایک مکمل کتاب دے دی جاتی جس میں انسانی زندگی کے مسائل سے متعلق تمام ہدایات مندرج ہوتیں پھر ختم نبوت کا اعلان کر کے خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی نبوت بھی ختم کر دی جاتی اس کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک نبی کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک عام انسان کی حیثیت سے اس کتاب کو لے کر جدوجہد کرتے اور اس کی ہدایات کے مطابق ایک اسلامی معاشرہ اور ایک اسلامی ریاست قائم کرتے۔ صرف اسی صورت میں منکرین حدیث کا اشکال دور ہو سکتا تھا اور دین کے قیام و ترقی کی راہیں ان کو کھلی نظر آ سکتی تھیں بلکہ دیکھا جاتے تو اس صورت میں تو ایک نبی کے مبعوث کرنے کی بھی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ اس کے لیے تو یہ طریقہ بھی باطل درست ہوتا کہ ایک کتاب لکھی لکھائی اللہ تعالیٰ براہ راست انسانوں کے ہاتھوں میں تھا دیتے اور دیباچے میں یہ لکھ دیتے کہ اس کتاب میں لکھی ہوئی ہدایات کے مطابق اپنی انفرادی و اجتماعی زندگیوں کو درست کر لو۔

مگر اللہ نے یہ طریقہ پسند نہیں کیا اس کے بجائے اللہ تعالیٰ نے جو طریقہ اختیار کیا وہ یہ تھا کہ ایک انسان کو رسول بنا کر مبعوث کیا اس پر مختلف اوقات میں ضرورت و حالات کے موافق مقررہ مقررہ کر کے ایک کتاب نازل کی اور پھر اس رسول کو اس کتاب کا اعلیٰ نمونہ بنا کر پیش کیا اور اس کے ذریعے سے بالحدیث نظام حق قائم فرمادیا۔ نظام حق کے اس نفاذ میں اصل عامل کتاب نہیں تھی بلکہ وہ زندہ انسان تھا جسے اس عظیم کام

کی انجام دہی پر مامور کیا گیا تھا اس انسان کے ہاتھوں سے اللہ تعالیٰ نے اپنی حفاظت نگرانی میں ایک مکمل نظام حیات بنوا کر اور چلوا کر دکھلادیا اور ہمیشہ کے لیے دنیا کے سامنے ایک نمونہ قائم کر دیا تاکہ آئندہ آنے والے اس نمونے کو دیکھ کر اس کے مطابق اپنا نظام حیات درست کرتے چلے جائیں۔ اللہ تعالیٰ نے نمونہ کی اس عمارت کو براہ راست اپنی ہدایات کے تحت بنوایا کیونکہ اس نمونے کا ناقص رہ جانا لازماً ہدایت الہیہ کے نقص کو مستلزم ہوتا۔ اس عمارت کے معمار کو نقشہ تعمیر بھی خود دیا اور خود ہی اس کا مطلب بھی سمجھایا صرف یہی نہیں بلکہ معمار کو اس عمارت کی تعمیر کی حکمت بھی سکھائی اور عمارت کا ایک ایک گوشہ بناتے وقت اس کی نگرانی بھی کی، تمہیں کوئی اینٹ نہ رکھنے میں اس سے ذرا سی بھی اگر چوک ہو گئی تو فوراً ٹوک کر اس کی اصلاح کر دی تاکہ جس عمارت کو قیامت تک کے لیے نمونہ بننا ہے اس میں کوئی ادنیٰ سی خامی بھی نہ رہ جائے تعمیر کے دوران مسلسل کبھی وحی جلی کے ذریعے سے اور کبھی وحی خفی کے ذریعے سے اس معمار کی رہنمائی ہوتی رہی اور پھر جب اس نے اپنے آقا کی ٹھیک ٹھیک مرضی کے مطابق اس عمارت کی تعمیر مکمل کر لی تو دنیا میں اعلان کر دیا **يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ أَوْفِرْ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَالْمَثَلُ عَلَيْكُمْ نَعْمَتِي وَرَضِيَّتُ لَكُمْ الْإِسْلَامَ هَدِيَّتِي** (آج کے دن میں نے تمہارا دین تمہارے لیے مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت اتمام کو پہنچا دی اور تمہارے لیے اسلام کو دین کے طور پر پسند کر لیا)۔

تاریخ گواہ ہے کہ اس طریق کار سے امت میلہ حقیقتاً کسی مایوسی کا شکار نہیں ہوئی۔ وحی کا سلسلہ منقطع ہو جانے کے بعد دین کے قیام میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں ہوئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال فرما جانے کے بعد جب وحی الہی کا دروازہ بند ہو گیا تو خلفائے راشدین نے یکے بعد دیگرے وحی کے بغیر اس نمونے کی عمارت کو نہ صرف قائم رکھا بلکہ آئندہ اسی نمونے پر دین حق کی عمارت کو اور وسعت دی۔ خلفائے راشدین کے بعد بھی حضرت عمر بن عبد العزیز اور ان کے بعد وقتاً فوقتاً مختلف صالح فرمان روا اور دیگر مصلحین امت وحی کے بغیر ہی اسی نمونے کی پیروی کرتے ہوئے دین حق کی

عمارت کو مضبوط سے مضبوط تر بناتے رہے۔ ان میں سے کسی کی زبان پر یہ نہیں آیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم توحی کی رہنمائی میں یہ کام کر گئے اب یہ ہمارے جیسے عام انسانوں کے بس کا روگ نہیں ہے۔

حق یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا بڑا احسان ہے کہ اس نے ہم ہی میں سے ایک انسان کو اپنا رسول بنا کر ہمارے پاس بھیجا اس پر ایک کتاب اتاری اور پھر اس رسول کے ہاتھوں خاص اپنی نگرانی و ہدایت میں ہمارے لیے ایک مکمل نظام فکر و اخلاق، ایک مکمل نظام تہذیب و تمدن، ایک مکمل نظام عدل و قانون اور ایک مکمل نظام معیشت و سیاست مضبوط بنیادوں پر استوار کر کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہمارے سامنے ایک روشن نمونہ قائم کر دیا۔ اب قیامت تک جو انسان بھی اپنی فلاح کے خواہش مند ہوں گے وہ اس نمونے کو دیکھ کر باسانی اپنا نظام حیات صحیح بنیادوں پر استوار کر سکیں گے۔

لیکن یہ احسان صرف اسی وقت تک احسان رہتا ہے جب تک ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت شخصی اور حیثیت بنوی میں کوئی تفریق نہیں کرتے اور یہ مانتے ہیں کہ آپ انسان ہوئے ہوئے بھی ہمہ وقت رسول تھے اس کے برعکس اگر منکرین حدیث کا نقطہ نظر تسلیم کر لیا جائے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت بنوی کو حیثیت شخصی سے جدا کر کے یہ کہا جائے کہ آپ کی حیثیت بنوی صرف قرآن پہنچانے تک محدود تھی اس کے بعد آپ کی حیثیت ایک عام انسان کی تھی جس کا مطلب یہ ہوا کہ قرآن پہنچانے کے علاوہ آپ کے جتنے کام تھے انہیں وحی الہی کی سند حاصل نہ تھی اگر یہ نقطہ نظر درست تسلیم کر لیا جائے تو پھر یہ احسان مبدل بہ نقصان ہوتا نظر آتا ہے کیونکہ اس صورت میں ہمارے پاس قرآن تو موجود ہو گا مگر اس کے احکام کو رو بہ عمل لانے کا کوئی ایسا نمونہ ہمارے سامنے نہ ہو گا جس کی پیروی ہم اس اطمینان کے ساتھ کر سکیں کہ وہ قرآن کا ایک ایسا نقشہ عمل ہے جو قرآن انار نے والے کی منشا و مراد کے عین مطابق ہے۔

غرض یہ مانے بغیر چارہ نہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں حیثیت شخصی اور حیثیت بنوی

رسالت و نبوت کی حقیقت

دونوں اس طور پر جمع ہیں کہ ایک حیثیت کو دوسری حیثیت سے علیحدہ نہیں کیا جاسکتا۔  
 دراصل منکرینِ حدیث نے منصبِ رسالت و نبوت کو صحیح طور پر سمجھا ہی نہیں ہے۔ رسالت  
 و نبوت کی حقیقت یہ نہیں ہے کہ ایک انسان جو ہر حیثیت سے دوسکڑا انسانوں جیسا ایک انسان  
 ہو ایک عمر کو پہنچنے کے بعد یکایک اللہ کی طرف سے منصبِ رسالت و نبوت کے لیے چُن لیا  
 جاتا ہو اور اس پر وحیِ اترنا شروع ہو جاتی ہو ایسا کبھی نہیں ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے یکایک کسی  
 راہ چلتے کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنی کتاب پہنچانے کے لیے مامور کر دیا ہو یا کسی شخص کو اس طور  
 پر اپنی پیغام بری کے لیے مقرر کیا ہو کہ وہ منجملہ اپنی زندگی کی دوسری مصروفیات کے ایک  
 بیخبری کا کام بھی انجام دے دیا کرے گویا وہ ایک جزوقتی کارکن ہے کہ مقررہ اوقات میں ایک  
 مقررہ کام کیا اور اس کام کو ختم کرنے کے بعد وہ آزاد ہے جو چاہے کرے۔ حاملِ منصبِ رسالت  
 کے بارے میں یہ خیال بھی قطعاً غلط ہے کہ بجز اس کتاب کے جو اس پر نازل کی گئی ہے اور کسی  
 بات میں بھی اس کی رائے اُس کے خیالات اس کے کام اُس کے احکام اور اس کے  
 فیصلے عام انسانوں سے متاثر نہ ہوں یا زیادہ سے زیادہ یہ کہ اس میں اور عام انسانوں میں صرف  
 اتنا ہی فرق ہو کہ تنزیلِ کتاب کے ساتھ ساتھ اس کو احکام کتاب کی عملی تفصیلات بھی بتادی  
 گئی ہوں اور اس خاص امتیازی طبیعت سے قطع نظر کر کے وہ محض عام اماموں جیسا ایک امام،  
 عام امیروں جیسا ایک امیر، عام فرمانرواؤں جیسا ایک فرمانروا اور عام قاضیوں جیسا ایک قاضی  
 ہو۔ اسی طرح حاملِ منصبِ رسالت کے بارے میں یہ تصور بھی درست نہیں کہ رسول کی ذات  
 بشریہ پر رسالت عارض ہوتی ہو اور اس کے عروض کے بعد بھی رسول کی بشریت اور اس  
 کی رسالت دونوں علیحدہ علیحدہ رہتی ہوں حتیٰ کہ ہم اس کی زندگی کو دو مختلف شعبوں میں تقسیم  
 کر سکتے ہوں۔

قرآن کریم سے رسالت و نبوت کی حقیقت پر جو روشنی پڑتی ہے وہ ان تمام تصورات  
 و خیالات کے بالکل برعکس ہے۔ آئیے ہم قرآن کریم کی روشنی میں رسالت و نبوت کی  
 حقیقت معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

نبی کی پیدائش سے پہلے ہی قرآن کریم ہمیں بتلاتا ہے کہ نبی اپنی پیدائش اور پرورش کے مراحل سے گزرنے کے بعد نبوت کے لیے منتخب نہیں کیا جاتا بلکہ وہ کار نبوت ہی کے لیے پیدا کیا جاتا ہے

اللہ تعالیٰ جب کسی قوم میں نبی بھیجنا چاہتا ہے تو خاص طور پر ایک شخص کو اسی لیے پیدا کرتا ہے کہ وہ نبوت کی خدمت انجام دے۔ قرآن کریم میں انبیاء علیہم السلام کے جو حالات بیان ہوئے ہیں ان میں غور کیجئے۔ انبیاء علیہم السلام پیدائش سے پہلے ہی نبوت کے لیے نامزد کر دیے جاتے تھے اور ان کو خاص طور پر اسی منصب کے لیے پیدا کیا جاتا تھا۔ مثلاً حضرت اسحق کی پیدائش سے پہلے ہی ان کے والد حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ان کی پیدائش اور نبوت کی خوشخبری دے دی جاتی ہے قرآن کہتا ہے :

وَبَشِّرْنَا هَٰذَا بِاسْحَاقَ نَبِيًّا مِّنَ الصَّالِحِينَ ۝ وَبَنَّا عَلَیْكَ رَٰعِیَ اسْحَاقَ ۙ (التین : ۱۱۲ : ۱۱۳)

اور ہم نے اسے اسحق کی بشارت دی جو نبی اور نیک بندوں میں ہوں گے اور ہم نے ابراہیم پر اور اسحق پر برکتیں نازل کیں۔

حضرت زکریا بیٹے کے لیے دعا کرتے ہیں تو ان کو حضرت یحییٰ کی خوشخبری ان الفاظ میں دی جاتی ہے :

اِنَّ اللّٰهَ یُبَشِّرُکَ بِیَحٰی مَصَدِّقًا لِّکَلِمَۃٍ مِّنَ اللّٰهِ وَسَیَدَّ اَنَّ حَٰضِرًا وَنَبِیًّا مِّنَ الصّٰلِحِیْنَ (آل عمران : ۳۹)

اللہ آپ کو یحییٰ کی خوشخبری دیتا ہے جو کلمہ اللہ کی تصدیق کرنے والے ہوں گے اور حاضر ہوں گے اور بڑے ضبط نفس کرنے والے ہوں گے اور نبی ہوں گے صالحین میں سے۔

حضرت مریم کے پاس خاص طور پر فرشتہ بھیجا جاتا ہے کہ ان کو ایک پاک لہنت لڑکے کی خوشخبری دے فرشتہ آکر کہتا ہے :

قَالَ اِنَّمَا اَنَا رَسُوْلُ رَبِّکَ قَلِیْلًا ۙ وَلَیْسَ عَلَیْکَ ذِکْرًا (مریم : ۱۹)

فرشتے نے کہا میں تو بس تمہارے پروردگار کا ایک ایچی ہوں تاکہ تمہیں ایک پاکیزہ لڑکا دوں۔



پھر پیدا ہوتے ہی اس پاکیزہ لڑکے کے منہ سے اعلان کرایا جاتا ہے کہ  
 اَسْتَشْنِي الْكِتٰبَ وَجَعَلْنِي ذٰبِيًا۔ | اس نے مجھے کتاب دی اور اس نے مجھے بنی  
 بنایا۔ (مریم - ۳۰)

اسی طرح حضرت موسیٰ کی پیدائش جس ماحول میں ہوئی اور ان کی پرورش جس انداز سے ہوئی اس  
 میں غور کیجئے صاف معلوم ہوتا ہے کہ انہیں خاص طور پر مصری فرعونیت کو تباہ کرنے اور بنی اسرائیل  
 کو غلامی سے نجات دلانے کے لیے پیدا کیا گیا تھا۔ فرعون کے ہاتھوں قتل سے بچانے کے لیے ایک  
 تابوت میں رکھ کر دریا میں ڈلوانا خاص اسی فرعون کے گھر میں پہنچانا جس کو ان کے ہاتھوں تباہ  
 کر دانا مقصود تھا ان کو ایسی پیاری صورت دینا کہ فرعون کے گھر والوں کے دل میں دیکھتے ہی  
 محبت کے جذبات بیدار ہو جائیں ان کے منہ کو تمام عورتوں کے دودھ سے روک دینا تاکہ وہ  
 پھر اپنی مال کے آغوش میں پونچ جائیں، حضرت موسیٰ کی پیدائش اور پرورش میں یہ تمام اہتمام  
 اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ نے حضرت موسیٰ کو ان کی پیدائش سے بھی پہلے منصب رسالت  
 و نبوت کے لیے منتخب کر لیا تھا۔

غرض عاقلین منصب رسالت و نبوت کے بارے میں پہلی بات جو قرآن سے ہمیں معلوم  
 ہوئی وہ یہ ہے کہ ان حضرات کو ان کی پیدائش سے پہلے ہی اس منصب کے لیے منتخب کر لیا  
 جاتا ہے۔

جنتی اور وہی علوم | دوسری بات جو اس سلسلے میں قرآن ہی سے ہمیں معلوم ہوتی ہے  
 یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام عام انسانوں کی طرح نہیں ہوتے  
 بلکہ اللہ تعالیٰ ابتدائی سے ان کے اندر بلا کسی واسطے کے اعلیٰ درجے کی ذہنی و روحانی قوتیں  
 ودیعت کرتا ہے ان کے علوم کسی نہیں ہوتے بلکہ جنتی اور وہی ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر  
 دیکھئے حضرت نوح علیہ السلام اسی ودیعت خداوندی کا ذکر کرتے ہوئے اپنی قوم سے کہتے ہیں  
 وَاعْلَمُوا مِنْ اَللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ | میں اللہ کی طرف سے وہ کچھ جانتا ہوں جو تم  
 نہیں جانتے۔ (اعراف : ۶۲)

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ملکوت السموات والارض کا مشاہدہ کرایا جاتا ہے

وَكَذَلِكَ نُرِي إِبْرَاهِيمَ مَلَكُوتَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ ۖ وَهُوَ يُبْرَاهِيمَ الْكَافِرُ  
اور زمین کی حکومت دکھا دی۔ (الانعام : ۷۵) اور جب وہ اس مشاہدے سے علم یقین لے کر پلٹے  
ہیں تو اپنے باپ سے کہتے ہیں :

اے ابا جان میرے پاس وہ علم آیا ہے جو ترے پاس نہیں ہے لہذا میری پیروی کریں تجھے سیدھا راستہ بتاؤں گا۔	يَا أَبَتِ إِنِّي قَدْ جَاءَنِي مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ يَأْتِكَ فَاتَّبِعْنِي أَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِيًّا (مریم : ۴۲)
--	---

حضرت یعقوب کے متعلق اللہ تعالیٰ خود گواہی دیتے ہوئے فرماتا ہے :

اور وہ یقیناً علم رکھتا تھا جو ہم نے اس کو تعلیم کیا تھا مگر اکثر لوگ (یہ بات) نہیں جانتے۔	وَأَنَّهُ لَدُوٌّ عَلِيمٌ لِّمَا عَلَّمْنَاهُ وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ (یوسف : ۶۸)۔
--	--

اسی طرح حضرت یوسف کے حق میں ارشاد فرمایا :

اور جب وہ اپنی جوانی کو پہنچا تو ہم نے اس کو حکمت اور علم عطا کیا۔	وَلَمَّا بَلَغَ أَشُدَّهُ آتَيْنَاهُ حُكْمًا وَعِلْمًا۔ (یوسف : ۲۲)
---	--

بالکل یہی بات حضرت موسیٰ کے حق میں بھی فرمائی :

اور جب وہ اپنی جوانی کو پہنچا اور درست ہو گیا تو ہم نے اسے حکمت اور علم عطا کیا۔	وَلَمَّا بَلَغَ أَشُدَّهُ وَاسْتَوَىٰ آتَيْنَاهُ حُكْمًا وَعِلْمًا۔ (القصص : ۱۴)
---	--

یہی حکمت اور یہی علم حضرت نوح کو بھی عطا کیا گیا چنانچہ ارشاد فرمایا :

اور نوح کو ہم نے حکمت اور علم عطا کیا۔	وَلُوطًا آتَيْنَاهُ حُكْمًا وَعِلْمًا (الانبیاء : ۷۴)
--	--

اور حکمت و علم کی اسی نعمت سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی سرفراز فرمایا ایک چنانچہ  
ارشاد رہائی ہے :

وَأَنْزَلَ اللَّهُ عَلَيْكَ الْكِتَابَ

وَالْحِكْمَةَ وَفَعَّلَكَ مَا لَمْ تَكُنْ

لَعَلَّكَ (النسار : ۱۱۳)

اور اللہ نے تجھ پر کتاب اور حکمت تادی اور  
تجھ وہ علم دیا جو پہلے تو نہ جانتا تھا۔

یہ علم و حکمت ایک روشنی ہے جو انبیاء علیہم السلام کو وہی طور پر ودیعت کی جاتی ہے وہ  
اس روشنی سے تھا کہ عینی مشاہدہ کرتے ہیں۔ اسی روشنی کی بدولت انہیں غلط اور  
صحیح میں امتیاز کا ملکہ حاصل ہو جاتا ہے۔ یہی روشنی معاملات کا فیصلہ کرنے اور ان کے  
سامنے پیش ہونے والے امور مختلف میں نظر کرنے میں انبیاء کی رہنمائی کرتی ہے۔ یہ روشنی انبیاء کو ہر وقت حاصل رہتی ہے

اور وہ اس سے ہر موقع پر کام لیتے ہیں دوسرے لوگ غور و فکر کے بعد بھی جن باتوں کو  
نہیں سمجھ سکتے اور حق و صواب معلوم نہیں کر سکتے انبیاء علیہم السلام اللہ کی دی ہوئی اس  
روشنی کی مدد سے آن و احد میں ان باتوں کی تہہ تک پہنچ جاتے ہیں اس روشنی کی  
بنا پر نبی اور عام المغانوں کے درمیان اتنا عظیم تفاوت واقع ہو جاتا ہے جتنا ایک آنکھوں  
والے اور ایک نابینا کے درمیان ہوتا ہے اس تفاوت کی نشاندہی کرتے ہوئے قرآن مجید  
کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے اُلوٹا ہے :

میں تو بس اس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو میرے  
پاس آتی ہے (اے محمد) آپ کہہ دیجئے کیا اندھا  
اور آنکھوں والا برابر ہو سکتے ہیں۔

إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ  
قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الْأَعْمَىٰ  
وَالْبَصِيرُ (انعام)

تیسری چیز جو صالحین منصب رسالت و نبوت کے بارے  
میں قرآن ہمیں بتاتا ہے یہ ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ ان  
حضرات کو اعلیٰ درجے کے علم اور حکمت سے نوازا ہے اسی طرح ان کو انسانیت کی بلند ترین  
اخلاقی صفات سے بھی مزین کرتا ہے۔ مثلاً حضرت یحییٰ کے بارے میں قرآن ہمیں بتلاتا ہے  
کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں حکمت کے ساتھ ساتھ رحم دلی اور پاک طینتی بھی عطا فرمائی تھی ارشاد  
ربانی ہے :

وَأَنبَتْنَاهُ الْحُكْمَ حَبِيبًا وَحَسَنًا  
مِّنْ لَّدُنَّا وَزَكَاةً (مریم : ۱۲، ۱۳)

ہم نے بچپن ہی میں اس کو نبوت فیصلہ اور رحم دلی اور  
پاک طینتی عطا فرمائی تھی۔

اسی طرح قرآن حضرت عیسیٰ کی زبان سے اُکھوتا ہے کہ

وَجَعَلَنِي مَبَارَكًا اَيْنَ مَا كُنْتُ رَوَّ  
اَوْ صَانِيًا بِالصَّلَاةِ وَالزَّكَاةِ مَا  
دُمْتُ حَيًّا وَيَا اَيُّهَا الَّذِي  
وَلَمْ يَجْعَلْنِي جَبَّارًا شَقِيًّا

(مریم : ۳۱-۳۲)

اور اللہ نے مجھے برکت والا بنایا جہاں بھی میں  
رہوں اور اس نے مجھ کو وصیت کی کہ جب تک  
جیوں نماز پڑھوں اور زکوٰۃ دوں اور اس نے  
مجھ کو اپنی ماں کا خد متلگنا نہ بنایا اور مجھ کو جبار اور  
شقی نہیں بنایا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بلند ترین اخلاقی صفات کا حامل قرار دیتے ہوئے فرمایا :  
وَ اِنَّكَ تَعْلٰی خَافِ عَظِيْمٍ  
(التعلیم : ۴)

معلوم ہوا کہ انبیاء کی فطرت نہایت پاکیزہ ہوتی ہے وہ فطرتاً صحیح سوچتے ہیں صحیح بولتے ہیں اور  
صحیح عمل کرتے ہیں غلط اندیشی اور کج بینی کی استعداد ہی ان میں نہیں ہوتی اور اس طرح ان کی  
نفسی و روحانی قوتیں انتہائی غیر معمولی ہوتی ہیں۔

غلیظیوں اور لغزشوں سے حفاظت | اس کے علاوہ قرآن کریم ہمیں بتاتا ہے کہ  
اللہ تعالیٰ انبیاء علیہم السلام کو نہ صرف یہ

کہ علم و حکمت عطا کرتا ہے اور بلند ترین اخلاقی صفات سے نوازتا ہے بلکہ اس کے ساتھ ہی وہ  
ہمیشہ ان پر خاص نظر رکھتا ہے۔ غلیظیوں اور لغزشوں سے ان کی حفاظت کرتا ہے ہر قسم کی  
گمراہیوں سے ان کو بچاتا ہے حتیٰ کہ اگر یہ مقتضائے بشریت کبھی وہ اپنے اجتہاد میں بھی  
غلطی کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ فوراً ان کی اصلاح کر دیتا ہے۔ چنانچہ انبیاء کی زندگیوں میں  
اس کی واضح مثالیں موجود ہیں۔

مثال کے طور پر حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ میں غور فرمائیے عین اس وقت  
جبکہ عزیز مصر کی بیوی نے آپ کو اپنے جال میں پھنسا لینے میں کوئی کسر باقی نہ چھوڑی تھی اللہ تعالیٰ  
نے اپنی برہان دکھلا کر حضرت یوسف علیہ السلام کو بدکاری سے محفوظ کر دیا۔ قرآن اس  
واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے :

اور اس (عورت) کے دل میں تو اس کا خیال جم  
ہی رہا تھا اور اسے بھی اس (عورت) کا خیال ہو  
چلا تھا اگر اس نے اپنے پروردگار کی دلیل کو نہ  
دیکھ لیا ہوتا فی طرح (ہم نے اسے بچا دیا تاکہ ہم  
اس سے بلی اور بے حیائی کو دور رکھیں وہ بیشک  
ہمارے ان بندوں میں سے تھا جن کو ہم نے اپنے  
لیے حاصل کر لیا ہے۔

وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا  
لَوْ لَا اَنْ رَّاٰ بِرَبِّهٖ  
كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهٗ السُّوْءَ  
وَالْفَحْشَآءَ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا  
الْمُخْلِصِيْنَ (یوسف : ۲۳)

اسی طرح حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کے واقعات پر نظر ڈالئے کسی کس  
طرح فرعون سے ان کی مخالفت کی گئی۔ جب فرعون کے پاس جانے کا حکم پا کر دونوں خوف زدہ  
ہو جاتے ہیں کہ کہیں فرعون ہمارے ساتھ ظلم کا سلوک نہ کرے تو اللہ تعالیٰ ان الفاظ میں ان  
کو اپنی مخالفت کا یقین یاد دلاتا ہے :

تم نہ ڈرو تم دونوں کے ساتھ میں ہوں میں (سب)  
سنتا اور دیکھتا ہوں۔

لَا تَخَافَاۤ اِسْتَنْیٰ مَعَكُمْ اَسْمَعُ  
وَ اَدْعُ (طہ - ۴۶)

پھر جب جاؤ گے سرداروں کے بنائے ہوئے سانپوں کو دیکھ کر حضرت موسیٰ بہ تقاضائے  
بشری ڈر جاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ اس بشری کمزوری کو اپنی رحمت کے ذریعے سے دور  
فرماتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے :

ڈرو نہیں۔ غالب تو یقیناً تم ہی  
رہو گے۔

لَا تَخَفْ اِنَّكَ اَنْتَ الْاَعْلٰی  
(طہ - ۶۸)

حضرت نوحؑ اپنے بیٹے کو ڈوبتے دیکھ کر چیخ اُٹھتے ہیں یا اللہ یہ تو میرا بیٹا ہے :  
اے میرے رب میرا بیٹا تو میرے گھر والوں  
ہی میں سے ہے۔

رَبِّ اِنَّ اَبْنٰی مِنْ اَهْلِیْ  
(ہود - ۴۵)

اور آپ نے میرے گھر والوں کو کشتی میں سوار کرنے کا حکم دیا تھا قُلْنَا اِجْلٰی فِیْهَا مِنْ  
کُلِّ نَسَاۤءٍ وَجَبْنِ اٰمِیْنٌ وَاَفْلَحَ (ہم نے کہا اس کشتی میں ہر قسم کے جوڑوں میں سے دو دو کو

پڑھا اور اپنے گھر والوں کو بھی۔ (صود: ۴۰) محبت پدری کے جوش میں حضرت نوح کو یہ خیال ہی نہ رہا کہ إِلَّا مَن سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ (بجز ان کے جن پر حکم نافذ ہو چکا ہے) کی شرط بھی ساتھ ہی لگائی گئی تھی۔ محبت پدری کی بشری کمزوری نے ذرا سی دیر کے لیے بنی کی نظر سے اس حقیقت کو چھپا دیا کہ حق کے معاملے میں باپ، بیٹا اور بھائی کوئی چیز نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعے سے اسی وقت اپنے بنی کی آنکھوں پر سے پردہ اٹھا دیا اور ان پر یہ حقیقت واضح کر دی کہ آپ کا بیٹا آپ کے لطف سے ضرور ہے مگر چونکہ اس کا عمل غیر صالح ہے اس لیے وہ آپ کے گھر والوں میں سے نہیں ہے۔

یا نوحُ اِنَّكَ كُنْتَ هَٰذَا	اے نوح یہ تمہارے گھر والوں ہی میں سے نہیں ہے
عَمَلٍ رَّجِيٍّ (ہود: ۴۶)	اس کے عمل خراب ہیں۔

اس طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے بنی کی اس غلط فہمی سے بھی حفاظت فرمائی۔ بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بھی متعدد مرتبہ ایسے واقعات پیش آئے کہ جب کبھی بھی اقتضائے بشریت کی بنا پر آپ سے کوئی اجتماعی لغزش ہوئی اللہ تعالیٰ نے وحی جلی سے فوراً اس کی اصلاح فرمادی قرآن کریم نے اس قسم کی تمام لغزشوں کا اور اللہ کی جانب سے ان کی جو اصلاح کی گئی ان کا بہ تمام و کمال ذکر کر دیا ہے ان آیات کی نشاندہی ہم اوپر کر آئے ہیں۔ یہ تمام آیات اس بات کا ثبوت ہیں کہ بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو غلطیوں سے بچانے اور آپ کی زندگی کے ایک ایک لمحے کو معیار حق پر قائم رکھنے کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے براہ راست اپنے ذمے لے رکھی تھی۔ نیز ان آیات سے صریح طور پر یہ بھی ثابت ہو جاتا ہے کہ ان لغزشوں کے علاوہ جن کا قصہ آج کریم نے ذکر کر دیا ہے بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تیسیس سالہ پیغمبرانہ زندگی کا پورا کا نام ہر قسم کی خطا اور ہر طرح کی لغزش سے بالکل پاک ہے اور اس کو اللہ تعالیٰ کی سند حاصل ہے کیونکہ ان متذکرہ لغزشوں کے علاوہ دیگر کسی بھی قول و فعل پر اللہ تعالیٰ کا گرفت نہ کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس سے صابر ہونے

و اے تمام اقوال و افعال اللہ کے معیار مطلوب پر اترتے ہیں گویا ان پر اللہ کی طرف سے مہر تصدیق و توثیق ثبت ہے۔

**منصب رسالت اور حیات طیبہ** | غرض عاقلین منصب رسالت و نبوت کے بارے میں قرآنی استشہاد کے ساتھ اب

تک جو کچھ کہا گیا ہے اسے پیش نظر رکھیے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں غور کیجئے صورت حال یہ نہیں ہوئی کہ آپ اپنی پیدائش اور پرورش کے مراحل سے گزرنے کے بعد نبوت کے لیے منتخب ہوئے ہوں بلکہ صاف نظر آتا ہے کہ آپ کو ابتداء ہی سے پیدائش سے بھی پہلے کار نبوت کے لیے چن لیا گیا تھا۔ پھر پیدائش کے بعد اللہ تعالیٰ نے خاص اپنی نگرانی میں آپ کی پرورش اور تربیت کرائی نبوت عطا کرنے سے پہلے ہی آپ کو ہر طرح کے اخلاقی عیوب اور ہر قسم کی گمراہیوں اور غلط کاریوں سے محفوظ رکھا اور ایسے حالات میں آپ کی پرورش کی جن میں آپ کی استعداد نبوت جو پیدائش سے پہلے ہی آپ میں درجیت کر دی گئی تھی رفتہ رفتہ فعالیت کی طرف بڑھتی رہی تا آنکہ جب یہ استعداد اپنے کمال کو پہنچ گئی تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو خاص اپنے پاس سے علم قوت فیصلہ اور نور ہدایت عطا کر کے آپ کو منصب نبوت پر مامور کر دیا اور پھر آپ سے اس طرح کا ایسا کہ اس منصب پر آنے کے بعد سے اس حیات ظاہری کے آخری سانس تک آپ کی پوری زندگی اسی کار نبوت کے لیے وقف رہی۔ تلاوت آیات، تعلیم کتاب و حکمت اور تزکیہ نفس کے سوا آپ کا اور کوئی مشغلہ نہ رہا۔ رات دن اٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے آپ کو یہی دھن رہی کہ گمراہوں کو راہ راست پر لائیں اور راہ راست پر آ جانے والوں کو ترقی کی اعلیٰ منزلوں پر پہنچنے کے قابل بنائیں اس تمام کام میں اللہ کی طرف سے ہمہ وقت نگرانی آپ کے شامل حال رہی۔ ہوائے نفس کے اتباع اور شیطانی وسوسے سے آپ کی پوری طرح حفاظت کی گئی معاملات کو بالکل آپ کی بشری عقل اور آپ کے بشری اجتہاد پر نہیں چھوڑ دیا گیا بلکہ جہاں کہیں بھی آپ کی خواہش یا آپ کے اجتہاد نے اللہ کے مقرر کیے ہوئے خط مستقیم سے بال برابر بھی جنبش کی وہیں آپ کو اس پر تنبیہ کر کے آپ کا رخ

سیدھا کر دیا گیا۔

نبوت کے منصب پر فائز ہو جانے کے بعد بھی بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اگرچہ بشر ہی رہے اور ان تمام حدود سے محدود رہے جو اللہ تعالیٰ نے فطرت بشریہ کے لیے مقرر فرمائی ہیں لیکن ان حدود کے اندر آپ کی بشریت آخری اور انتہا درجے کی کامل و اکمل بشریت تھی جس میں وہ تمام قوتیں بدرجہ اتم موجود تھیں جو زیادہ سے زیادہ ایک انسان کو حاصل ہونی ممکن ہیں دراصل آپ کے جسمانی، نفسانی اور عقلی و روحانی قوتی کو ابتداء ہی سے عدل و تسویہ کے انتہائی مقام پر رکھا گیا۔ آپ کو قلب کی سلامت اور فطرت کی صحت اس درجے کی عطا کی گئی کہ آپ بچپن ہی سے خود بخود کسی خارجی انسانی تعلیم و تربیت کے بغیر ان راستوں سے دور رہیں جو رضائے الہی کے خلاف ہیں اور ان راستوں کو اختیار کریں جو مرضات الہی کے عین مطابق ہیں آپ کی یہی کامل و اکمل بشریت تھی جو اپنی پختگی اور اپنے کمال کو پہنچ جانے کے بعد ہدایت عامہ کے منصب پر سرفراز ہوئی، اللہ تعالیٰ کی جانب سے علم کی مزید روشنی پا کر سراج منیر بنی اور مصلح عامہ بشریہ کے لیے تعلیمات و احکام کا مبطل قرار پا کر نبوت و رسالت سے موسوم ہوئی گویا امر واقعہ یہ نہیں ہے کہ نبوت ایک عرض کی حیثیت رکھتی تھی جو ایک خاص وقت میں بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے جوہر انسانیت پر عارض ہوا ہو بلکہ حقیقت نفس الامریہ ہے کہ اس کی حیثیت انسانیت کاملہ کے ایک ایسے جوہر کی تھی جو نبوت کی استعداد کے ساتھ پیدا ہوا اور فعلیت کی طرف ترقی کرتے کرتے آخر کار نبوت بنا دیا گیا۔ اس لحاظ سے بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اطر میں نبوت ایک پیدائشی چیز تھی اور آپ کی حیثیت ذاتی ہی دراصل آپ کی حیثیت نبوی کو متضمن تھی فرق اگر تھا تو صرف اتنا کہ بعثت سے قبل آپ کی حیثیت نبوی بالقوہ تھی اور بعثت کے بعد بالفعل۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ کی ذات میں حیثیت ذاتی اور حیثیت نبوی دونوں اس طور پر جمع تھیں کہ ایک حیثیت کو دوسری حیثیت سے علیحدہ نہیں کیا جاسکتا تھا۔

اس وضاحت کے بعد کوئی عقل سے عاری ہی ہوگا جو بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اطر کو رسالت اور امامت دو حیثیتوں میں تقسیم کرے یہ کہے گا کہ رسالت کی



حیثیت سے صرف آپؐ پر ایمان لانا ہی کافی ہے اطاعت ضروری نہیں، اطاعت کا تعلق صرف آپؐ کی حیثیتِ امامت سے ہے۔

## اطاعتِ رسول اور حیثیتِ امامت | اطاعتِ رسول کے وجوب کی مستقل حیثیت

روشنی میں گزشتہ مضمون میں ”حدیث کی تشریحی حیثیت“ کے عنوان کے تحت بڑی تفصیل کے ساتھ کر آئے ہیں تاہم اس پر دوبارہ نظر ڈال لیں۔ اس کے بعد مزید کسی گفتگو کی گنجائش نہیں رہتی مگر اس ضمن میں ہم رسالت و امامت کی تقسیم کرنے والوں اور اطاعت کو امامت کے ساتھ خاص کرنے والوں سے تاریخی حیثیت سے یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ سیرتِ نبوی میں سے کیا کسی ایک بھی ایسے واقعہ کی نشان دہی کی جاسکتی ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہو کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صحابہ کا سلوک کبھی بہ حیثیتِ رسول ہوتا تھا اور کبھی بہ حیثیتِ امام۔ اگر منبر، مصلیٰ، جلوت و خلوت، سفر و حضر، گھر کے اندر اور گھر کے باہر، میدانِ جنگ اور دورانِ امن، محفلِ عزا اور لینے و خواب پر آپؐ کی صرف ایک ہی حیثیت یعنی حیثیتِ رسالت ہی سمجھی گئی ہے تو امامت کی ایک اور نئی حیثیت انہ خود کہاں سے پیدا ہو گئی۔ پھر رسالت و امامت کے حقوق بھی متضاد حقوق ہیں۔ تقسیمِ حیثیات کا دعویٰ کرنے والوں کے نزدیک رسول پر صرف ایمان لانا واجب ہے اور امام پر ایمان نہ لانا ضروری ہے، غور کا مقام ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بیک وقت لوگوں کو ایمان کی دعوت بھی دیتے تھے اور اپنی اطاعت کا امر بھی فرماتے تھے مگر کبھی یہ نہیں بتایا جاسکتا کہ آپؐ نے ان متضاد حقوق کو اپنے دو مختلف منصوبوں سے خود متعلق سمجھا ہو یا دوسروں کو اس پر کبھی تنبیہ کی ہو۔ مزید برآں اس دور میں اُن امیٰ مخاطبین کے لیے جو منطق کی بجائے بھی واقف نہ تھے یہ تقسیم کرنا کتنا مشکل ہوتا ہوگا کہ وہ ان متضاد حقوق کو ہمیشہ دو مختلف حیثیتوں کے ساتھ علیحدہ علیحدہ ملحوظ رکھیں جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بہ حیثیتِ رسول ظاہر ہوں تو ان پر فوراً ایمان لے آئیں اور جب بہ حیثیتِ امام سامنے آئیں تو ان کا انکار کر دیں اور کہہ دیں کہ یہ انکار بہ حیثیتِ امامت ہے نہ کہ بہ حیثیتِ رسالت یا اسی طرح اطاعت کے بارے میں وضاحت کریں کہ یہ اطاعت بہ حیثیت

امامت ہے نہ کہ بد حیثیت رسالت ۔

اس تمام گورکھ دھندے سے نجات کی ایک ہی صورت ہے کہ حق کو تسلیم کر لیا جائے اور حق یہی ہے کہ آپؐ کی ذات میں ذہنی لحاظ سے خواہ کتنی بھی خبیثات پیدا کر دی جائیں مگر اصل یہ ہے کہ آپؐ نبوت سے سرفرازی کے بعد سے یوم وصال تک کسی ایک لمحے بھی خبیثیت رسالت سے علیحدہ نہیں ہوئے ۔ ہمیشہ آپؐ پر ایمان آپؐ کی اطاعت اور آپؐ کی عظمت اسی منصب کے ماتحت ہوئی اور آج بھی آپؐ پر ایمان آپؐ کی اطاعت اور آپؐ کی عظمت اسی منصب رسالت کے اعتبار سے ہے اور تا قیامت اسی منصب کی حیثیت سے یہ سب کچھ کیا جاتا رہے گا اس کے خلاف جو کچھ ہے وہ سب حق کے خلاف ہے ۔

**ایمان کی حقیقت سمجھنے میں غلطی** | دراصل رسالت و امامت کی متذکرہ بالا تقسیم اور ایمان و اطاعت کے

درمیان یہ تفریق نتیجہ ہے اس شدید غلطی کا جو ایمان کے معنی سمجھنے میں ان منکرینِ حدیث کو پیش آگئی ہے ۔ اگر یہ لوگ ایمان کی حقیقت کا صحیح علم حاصل کر لیتے تو اطاعت کو ایمان سے علیحدہ کر ہی نہیں سکتے تھے ۔ یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ ایمان صرف زبان سے تصدیق کر لینے کا نام ہے اس لیے ان کے نزدیک رسول کا حق صرف تصدیق کر کے ادا ہو جاتا ہے اور اس کے بعد اطاعت کی کوئی ضرورت نہیں رہتی حالانکہ ایمان کی حقیقت اس سے بالکل مختلف ہے اولاً تو اطاعت کے بغیر ایمان ہی حاصل نہیں ہو سکتا دوم قلبی تصدیق حاصل ہو جانے کے بعد یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ اطاعت کا عہد دل میں پیدا نہ ہو جس دل میں رسول کی اطاعت کا عہد نہیں وہ دل یقیناً تصدیق رسول سے بھی خالی ہے ۔ ایمان اور اطاعت باہم لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ہر قتل شاہِ روم کو مسلمان نہیں کہا گیا حالانکہ اس نے برسرِ دربارِ عام محفل میں آپؐ کی تصدیق کر لی تھی اگرچہ اپنے درباریوں کی برہمی دیکھ کر بعد میں اس نے بات بنادی اگر ایمان کے لیے صرف تصدیق ہی کافی ہوتی تو ہر قتل

کو مسلمان کہا جانا چاہیے تھا اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ابوطالب نے بارہا آپ کی تصدیق کی لیکن اس کے باوجود کیونکہ ان کے دل نے معمولی انسانوں کی عار کی خاطر آپ کی اطاعت کرنا قبول نہیں کیا اس لیے جمہور امت نے ان کا ایمان تسلیم نہیں کیا۔

دفعہ نجران کے قصہ میں ایک کاہن بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کرتا ہے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے حافظ ابن قیم زاد المعاد میں تحریر فرماتے ہیں :

اس واقعے سے یہ مسئلہ بھی معلوم ہو گیا کہ اگر کوئی کتابی کاہن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں یہ تصدیق کرے کہ آپ بنی ہیں تو صرف اس اقرار سے وہ اسلام میں داخل نہیں مانا جاسکتا جب تک وہ آپ کی اطاعت اور اتباع کا بھی پورا پورا عہد نہ کرے۔

وَفِيهَا اِنْ اَقْرَارَ الْكَاهِنِ الْكَتَابِيِّ  
لِرَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ  
بِأَنَّهُ نَبِيٌّ لَا يَدْخُلُهُ فِي  
الْإِسْلَامِ حَالِدٌ يَلْتَزِمُ طَاعَتَهُ  
وَهُنَا بَعْدَهُ

(زاد المعاد جلد ۳)

اسی طرح کا ایک واقعہ ان دو یہودی علماء کا ہے جنہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے امتحاناً تین سوالات کیے تھے اور ان کے بالکل ٹھیک ٹھیک اور درست جواب دے کر بے اختیار گواہی دے آٹھے تھے کہ آپ بلاشبہ اللہ تعالیٰ کے نبی ہیں مگر جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا کہ پھر اب تمہیں میری اتباع سے کوئی چیز مانع ہے تو وہ مانع کرنے لگے کہ ہمیں یہ طور ہے کہ کہیں ہماری قوم ہمیں مار نہ ڈالے۔ یہ واقعہ بھی اس بات کا ثبوت ہے کہ جب تک آپ کی اطاعت کا عہد نہ کیا جائے محض آپ کی نبوت کا اقرار کر لینے سے اسلام کا حکم نہیں لگایا جاسکتا۔ اسی قسم کے واقعات کا حوالہ دینے کے بعد حافظ ابن قیم تحریر فرماتے ہیں :

يَوْ شَخْصٌ كَتَبَ بَعْدَ سِرِّهِ كَامَطْلُوعٍ كَرِهَ كَأَوَّلِ  
أَنِّ فِيهِ بَهْتٌ سَهْلٌ كِتَابٌ أَوْ مُشْرِكِينَ  
كِيَصْدِيقٍ كَالْوَقَاتِ بِطَرَفٍ كَأَوَّلِ

وَمَنْ تَأَمَّلَ فِي السِّيَرِ وَ  
الْأَخْبَارِ الثَّابِتَةِ مِنْ شَهَادَةِ  
كَثِيرٍ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ وَالْمُشْرِكِينَ

یہ بخوبی روشن ہو جائے گا کہ اسلام صرف آپ کی رسالت کی تصدیق کا نام نہیں بلکہ اسلام اس سے ماوراء کوئی چیز ہے نہ وہ صرف معرفت ہے اور نہ صرف معرفت و اقرار کا نام ہے بلکہ جب تک آپ کی معرفت اور اقرار کے علاوہ ظاہری و باطنی طور پر آپ کی فرماں برداری اور آپ کی پوری پوری اطاعت کا عہد نہ کرے اس وقت تک کوئی شخص مسلمان نہیں ہو سکتا۔

لَهُ، صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِالرَّسَالَةِ  
وَإِنَّهُ، حَادِقٌ فَلَمْ تَدْخُلْهُمْ هُنَا  
الشَّهَادَةُ فِي الْإِسْلَامِ عِلْمُ أَنَّ  
الْإِسْلَامَ أَمْرٌ وَرَأَى ذَلِكَ وَإِنَّهُ  
لَيْسَ هُوَ الْمَعْرِفَةُ فَقَطْ وَلَا الْمَعْرِفَةُ  
وَالْأَقْرَارُ فَقَطْ بَلِ الْمَعْرِفَةُ وَالْأَقْرَارُ  
وَالْإِقْبَادُ وَالتَّزَامُ طَاعَتِهِ  
وَدِينِهِ ظَاهِرًا وَبَاطِنًا۔

(زاد المعاد جلد ۳ ص ۵۵)

غرض نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا آپ کی اطاعت کے بغیر ایمان ہی نہیں ہے کوئی شخص صرف آپ کی نبوت کا اقرار کر کے اسلام کے دمر سے میں داخل نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ آپ کی اطاعت کا عہد بھی نہ کرے۔

منکرین حدیث لاکھ کہتے رہیں کہ منصب رسالت کو اطاعت سے کوئی تعلق نہیں حقیقت نفس الامراس کے بالکل خلاف ہے۔ اس موقع پر تارین کو ہم سورہ نسا کی وہ آیت پھر یاد دلاتے ہیں جس کا حوالہ ہم ”حدیث کی تشریحی حیثیت“ کے عنوان کے تحت اطاعت رسول کے وجوب پر گفتگو کرتے ہوئے دے آئے ہیں اور جو اس باب میں فیصلہ ناطق ہے کہ رسول پر ایمان لانا اس کی اطاعت کے بغیر ایمان ہی نہیں ہے ارشاد ربانی ہے :

آپ کے پروردگار کی قسم یہ ایمان دار نہ ہوں گے جب تک کہ آپ کے اختلافات میں آپ ہی کو حکم نہ ملے۔ پھر میں اس کے بعد آپ کے فیصلے سے اپنے دل میں کوئی تنگی بھی محسوس نہ کرے اور پوری طرح جب تک اس کے سامنے سر نہ جھکائیں۔

فَلَا وَرَيْكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّى  
يُحْكَمَوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا  
يَجِدُوا فِي أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِمَّا  
قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا۔

(النساء : ۶۵)

غور کا مقام ہے منکرینِ حدیث کے نزدیک تو منصب رسالت کو اطاعت سے کوئی تعلق ہی نہیں اور قرآن کہتا ہے کہ اطاعت کے بغیر رسول پر ایمان ہی کامل نہیں ہوتا بلکہ صرف ادھور اور ناتمام ایمان ہوتا ہے یہ آیت کس قدر صراحت سے اس بات کا اعلان کر رہی ہے کہ کوئی انسان اس وقت تک مومن کہلانے کا حق دار نہیں جب تک کہ ہر معاملے میں وہ رسول کو اپنا حکم نہ بنائے باہمی جو اختلاف بھی ہو اس میں اسی کا فیصلہ نا طاق نہ سمجھے یہی نہیں بلکہ تکمیلِ ایمان کے لیے یہ بھی بشرط ہے کہ اگر رسول کا فیصلہ اپنے مخالف ہو تو بھی اپنے دل میں اس کے بارے میں کوئی تنگی تک محسوس نہ کرے پھر اس پر بھی پس نہیں آگے ارشاد ہے ولعلکم واتسلما یعنی صرف تنگی محسوس نہ کرنا ہی کافی نہیں اس منہی پہلو کے ساتھ ساتھ اثباتی پہلو میں انقیاد و تسلیم کا ہونا بھی ضروری ہے اس کے بغیر بھی ایمان کامل نہیں۔

یہ تو رسول کی اطاعت کا پہلو تھا اس کے خلاف کا پہلو بھی سنئے۔ جو لوگ رسول کی اطاعت کو ضروری نہیں سمجھتے وہ ذرا سا ان کھول کر نہیں ان کے لیے دردناک عذاب کی وعید ہے :

<p>تو جو لوگ اس کے حکم کا خلاف کرتے ہیں انہیں ذرا ڈرتے رہتا چاہیے کہیں کوئی فتنہ یا دردناک عذاب نہ آپکڑے۔</p>	<p>فليحذر الذين يخالفون عن أمره أن تصيبهم فتنة أو يصيبهم عذاب اليم۔ (البقران - ۶۳)</p>
---	--

بہر حال رسول کے مطاع ہونے کا قانون اللہ تعالیٰ کا مستمر قانون ہے قرآن کے الفاظ میں رسول بتایا ہی اس لیے جاتا ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے۔

<p>ہم نے جو رسول بھی بھیجا ہے اسی لیے بھیجا ہے کہ اللہ کے حکم کے ماتحت اس کی اطاعت اور فرمانبرداری کی جائے۔</p>	<p>وما أرسلنا من رسول إلا ليطاع بأذن الله (النار - ۶۴)۔</p>
---	---

رسول کا مطاع ہونا گویا قرآن کے نزدیک حق رسالت ہے اور ایک ایسا عام قانون ہے جس سے کبھی کوئی رسول مستثنیٰ نہیں رہا۔

## قرآنی صداقتوں کا انکار | مختصر یہ ہے کہ بات رسالت و امامت کی تقسیم کی ہو یا ایمان و اطاعت کے درمیان تفریق کی منکرین

حدیث اپنی طرف سے جو چاہیں کہتے رہیں قرآن ان کے ہر دعوے سے بری الذمہ ہے اصل بات یہ ہے کہ قرآن صداقتوں کا ایک مجموعہ ہے اس کی ایک صداقت کا انکار کیا جائے تو دوسری صداقت کا انکار خود بخود سر پڑ جاتا ہے۔ منکرین حدیث نے اولاً جب قرآن کے خلاف یہ دعویٰ کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا منصب رسالت صرف تبلیغ قرآن تک محدود ہے تو اس کے لازمی نتیجے کے طور پر انہیں یہ بھی ماننا پڑا کہ مبلغانہ حیثیت کے علاوہ آپؐ کی جو حیثیت بھی قرآن نے ذکر کی ہے اس کا منصب رسالت سے کوئی تعلق نہیں۔ یہاں پوچھ کر انہیں یہ مشکل پیش آئی کہ پھر آخر ان حیثیات کا تعلق ہے کس سے؟ اس کے لیے انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت کو دو حیثیتوں میں تقسیم کرنا پڑا ایک حیثیت رسالت کی اور ایک حیثیت امامت کی اور یہ دعویٰ کرنا پڑا کہ تبلیغ قرآن کے سوا آپؐ کی جو حیثیت بھی قرآن نے بیان کی اس کا تعلق امامت سے ہے رسالت سے نہیں۔ پھر اس رسالت و امامت کی تفریق کو نبھانے کے لیے انہیں ایک اور خلاف قرآن دعویٰ کرنا پڑا کہ منصب رسالت کے لیے اطاعت ضروری نہیں قرآن میں جہاں کہیں اطاعت رسول کا حکم دیا گیا ہے۔ اس کا تعلق منصب امامت سے ہے منصب رسالت سے نہیں اسی طرح قرآن کی ایک صداقت کا انکار منکرین حدیث کو دوسری صداقت کے انکار پر مجبور کرتا رہا اور وہ ایک غلطی کے بعد دوسری غلطی کے مرتکب ہوتے چلے گئے۔

## اطاعت رسول کا قرآنی حکم اور امام وقت یا مرکز ملت | منکرین حدیث نے جب یہ دعویٰ کیا کہ اطاعت کا منصب رسالت سے کوئی تعلق نہیں ہے تو انہیں پھر ایک مشکل پیش آئی وہ یہ کہ قرآن

نے تو جگہ جگہ اطاعت رسول کا حکم دیا ہے بلکہ قرآن کے نزدیک تو رسول بنایا ہی اس لیے جاتا ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے تو اب ایسی کونسی توجیہ اختیار کی جائے کہ منصب رسالت کے لیے اطاعت بھی ضروری نہ رہے اور منکرین حدیث پر خلاف قرآن کوئی دعویٰ کرنے کا

الزام بھی سر نہ آئے۔ اس کے لیے انہیں پھر مزید ایک غلطی کا مرتکب ہونا پڑا انہوں نے کہا کہ قرآن میں جہاں کہیں اطاعت رسول کا حکم دیا گیا ہے اس سے مراد امام وقت کی اطاعت ہے جب تک بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حیات تھے یہ اطاعت امام وقت ہونے کی وجہ سے آپ کا حق تھا آپ کے بعد جو بھی اس منصب پر فائز ہو گا۔ یہ اطاعت اس کا حق ٹھہرے گی۔ امام وقت کے یہ منکرین حدیث نے ایک نئی اصطلاح ایجاد کی اور اسے مرکز ملت کا نام دیا۔ یہ مرکز ملت کا منصب جیسا کہ ہم اس سے پہلے بھی زیر نظر تحریر میں کہیں واضح کر آئے ہیں منکرین حدیث کے نزدیک بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس سے شروع ہو کر آپ کے زندہ جانشینوں کے ذریعے چونکہ ہمیشہ باقی رہنے والا ہے اس لیے حامل وحی ہونیکے علاوہ باقی جتنی حیثیات بھی بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل تھیں وہ سب کی سب آپ کے بعد آنے والے خلیفہ یعنی مرکز ملت کو منتقل ہو گئیں حتیٰ کہ قرآنی آیات کو اپنے زمانے کے حالات کے مطابق جو معنی بھی آپ کے بعد آنے والا امام وقت یعنی مرکز ملت پہنا سکے گا درست ماننا اور ان پر عمل کرنا منکرین حدیث کے نزدیک اسی طرح ضروری ہو گا جس طرح بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امامت کے زمانے میں اپنے حالات کے مطابق قرآنی آیات کی جو تشریح و تفسیر کی اس کا ماننا اور اس پر عمل کرنا ضروری تھا۔

حیرت کی بات ہے ایک طرف منکرین حدیث رسالت کے لیے اطاعت کو غیر ضروری قرار دیتے ہیں وہ رسالت جس کا حامل صاحب وحی ہوتا ہے اس پر ایمان نہ لانے والا کافر کہلاتا ہے اس کی ذات ہر قسم کی خطا و غرض سے معصوم ہوتی ہے دوسری طرف امامت کے لیے اطاعت کو لازمی قرار دیتے ہیں وہ امامت جس کا حامل نہ صاحب وحی ہوتا ہے نہ اس پر ایمان لانا ضروری ہے اور نہ وہ خطا و قصور سے مبرا ہے۔ آئیے منکرین حدیث کے اس دعوے کا بھی پوری حقیقت پسندی سے جائزہ لیں :

**اطاعت کے لیے حیات جسمانی کی قید** | جہاں تک اطاعت کو بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات جسمانی تک محدود

کرنے کا تعلق ہے تو منکرین حدیث کا یہ دعویٰ خلاف عقل بھی ہے اور خلاف نقل بھی۔

خلافتِ عقل اس طرح پر کہ ہم او پر ثابت کر آئے ہیں کہ جس وقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے منصبِ رسالت پر مقرر فرمایا اس وقت سے لے کر اپنی حیاتِ جسمانی کے آخری سانس تک آپ ہر آن اور ہر حال میں خدا کے رسول تھے اسی حیثیت میں آپ مبلغِ قرآن بھی تھے اور معلمِ قرآن بھی مربي افراد بھی تھے اور مترکی معاشرہ بھی حاکم و فرماں روا بھی تھے اور قاضی و امامِ وقت بھی۔ آپ کی ذاتِ اطر کو رسالت و امامت کی حیثیتوں میں تقسیم کرنا سراسر لغو ہے آپ کی ذات میں حیثیتِ رسالت اور حیثیتِ شخصی و انسانی دونوں اس طور پر جمع ہیں کہ ایک حیثیت کو دوسری حیثیت سے علیحدہ نہیں کیا جاسکتا۔ یہ بات پوری طرح ثابت ہو جانے کے بعد ذرا غور کیجئے کہ منکرینِ حدیث کا یہ دعویٰ کس قدر خلافتِ عقل ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کی اطاعت اور آپ کے ارشادات کی پیروی صرف آپ کی حیاتِ جسمانی تک محدود تھی۔ اس کے تو معنی یہ ہوئے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کے بارے میں یہ تسلیم کر لیا جائے کہ وہ صرف اسی عہد کے لیے تھی جس میں آپ اپنے جسمِ اطر کے ساتھ زندہ تھے۔ آپ کے وصال فرماتے ہی گویا آپ کی رسالت کا تعلق عملاً دینا سے منقطع ہو گیا اس لیے کہ آپ کی اطاعت کا مطلب ہے آپ کے اسی اسوۂ حسنہ کی اطاعت اور آپ کے ان اقوال و افعال کی اطاعت جو اپنی ذات میں قرآن کا مجسم عملی نمونہ ہیں لہذا قرآن کا جو عملی نمونہ آپ نے پیش کیا تھا وہ تو منکرینِ حدیث کے نزدیک آپ کی حیات کے ساتھ ہی ختم ہو گیا اب تو آئندہ قرآن کا وہ عملی نمونہ نافذ العمل اور قابلِ تسلیم سمجھا جائے گا جو آپ کے بعد آنے والا امامِ وقت اپنا احکام سے ادا اپنے اعمال سے قائم کرے گا اس صورت میں تو رسالت کا منصب ہی بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے سوچنے کی بات ہے جب قرآن کا عملی نمونہ قائم کرنے کا ہر شخص اہل ہو خواہ وہ نبی ہو یا نہ ہو خواہ اس پر روحی اترتی ہو یا نہ اترتی ہو تو پھر سرے سے کسی رسول کے مبعوث کرنے ہی کی کیا ضرورت باقی رہ جاتی ہے۔ قرآن بخیر کسی رسول کے آثار و پہچان اور ملنے والوں سے کہا جاتا کہ اپنے جس سے کسی شخص کو امامِ وقت منتخب کر لو جو تمہارے لیے اس قرآن کا ایک عملی نمونہ قائم کر دے پھر یہ نمونہ جو روحی الہی کی رہنمائی سے محروم ہوتا کیسا کچھ مختلف فیہ اور متنازع ہوتا ہر صاحبِ عقل خود تصور کر سکتا ہے۔ ایسی صورت میں



بنی نوع انسان کی ہدایت کا مقصد ہی فوت ہو جاتا۔ اگر اللہ نے یہ طریقہ پسند نہیں کیا اور قرآن کے ساتھ ایک رسول مبعوث کر کے قسراں کا ایک عملی نمونہ دجی ہی کی رہنمائی میں تیار کرانا ضروری سمجھا تو کیسے بان لیا جائے کہ یہ سب کچھ صرف تینیس چوبیس سال کے لیے کیا گیا۔ وہ چیز جس کے لیے اللہ تعالیٰ بطور خاص ایک رسول مبعوث کرتا ہے اور رسالت کا اتنا بڑا منصب قائم کرتا ہے وہ چیز جس کو قرآن انتہائی شد و مد کے ساتھ ذریعہ ہدایت قرار دیتا ہے اس کے بارے میں کیونکر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ وہ رسول اللہ کے جسم و جان کا تعلق منقطع ہوتے ہی دنیا کے لیے غیر ضروری قرار دی جاسکتی ہے۔ عقل کسی طرح اس صورت حال کو تسلیم نہیں کرتی۔ اسی لیے ہم یہ کہتے ہیں حق بجانب ہیں کہ اطاعت رسول کو محض حیات نبوی تک محدود کرتے کا دعویٰ سراسر لغو اور خلافت عقل ہے۔

رہا اس دعوے کا خلافت نقل ہوتا تو اس میں تو کسی شک و شبہ کی کوئی گنجائش ہی نہیں اگر قسراں آپ کو خاتم النبیین کہتا ہے اگر قرآن کے نزدیک آپ کی رسالت قیامت تک قائم رہنے والی ہے اگر قسراں کے الفاظ میں آپ تمام عالمین کے لیے رحمت ہیں اور اگر قسراں آپ کی بعثت کو پوری کائنات انسانی کی طرف بعثت عامہ قرار دیتا ہے تو پھر آپ کی اطاعت بھی قرآن کے نزدیک قیامت تک تمام عالم انسانی کے لیے باقی رہنے والی ہے کیونکہ یہ بات ہم بدلائل قطعیہ ثابت کر چکے ہیں کہ رسالت کے لیے اطاعت ایک جزو لاینفک کی حیثیت رکھتی ہے۔

اس بات سے تو منکرین حدیث کو بھی اتفاق ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اطرہ نبوت کا سلسلہ ختم کر دیا گیا قرآن نے بڑی صراحت کے ساتھ اعلان کیا۔

<p>ماکان محمد اباً احد من رجالکم و لکن رسول اللہ و خاتم النبیین (احزاب : ۴۰)</p>	<p>محمد تمہارے فردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں البتہ اللہ کے رسول ہیں اور سب نبیوں کے ختم پر ہیں۔</p>
--	--

جب آپ کے بعد کوئی نبی آنے والا ہی نہیں تو لازم ہے کہ آپ کی نبوت و رسالت قیامت قائم رہے اور جب تک نبوت و رسالت قائم و دائم ہے اس کا لازمی جزو اطاعت بھی قائم و دائم ہے۔

قرآن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام عالمین کے لیے رحمت کہہ کر پکارتا ہے :

اور ہم نے آپ کو تمام عالمین پر رحمت ہی کے لیے بھیجا ہے۔	وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ (الانبیاء - ۱۰۷)
---	--

آپ کا رحمتہ للعالمین ہونا مستلزم ہے اس بات کو کہ آپ کا فیضان رسالت صرف آپ کے اپنے زمانے تک محدود نہ ہو قیامت تک جاری و ساری رہنے والا ہو۔ اگر کہا جائے کہ آپ قرآن لائے جو ہمیشہ رہتے والا ہے اور اسی نسبت سے آپ رحمتہ للعالمین ہیں تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ آپ رحمت نہ تھے بلکہ رحمت تو قرآن تھا آپ کو رحمت خواہ مخواہ کہہ دیا گیا۔ معاذ اللہ حالانکہ قرآن کو اللہ تعالیٰ نے الگ رحمت فرمایا ہے اور اس کے لانے والے کو الگ۔

اسی طرح قرآن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کو پوری نوع انسانی کے لیے بعثت عامہ قرار دیتے ہوئے کہتا ہے :

ہم نے تو آپ کو صلہ ہی انسانوں کے لیے (پیغمبر بنا کر) بھیجا ہے بطور خوش خبری سنانے والے اور ڈرا ہنوالے کے۔	وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا كَافَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيرًا وَنَذِيرًا - (النبأ : ۲۸)
---	---

قرآن کا ارشاد اپنے مفہوم میں کس قدر واضح ہے۔ الناس کا لفظ اپنے معنی میں عام ہے یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے لیکر قیامت تک جس قدر بھی انسان ہیں سب کے لیے آپ اللہ کے رسول ہیں گویا آپ کی رسالت کسی خاص زمانے تک محدود نہیں بلکہ جہت تک بھی زمین پر انسان جیسے ہیں اس وقت تک آپ کی رسالت قائم ہے۔ اور جہت تک آپ کی رسالت قائم ہے آپ کی اطاعت بھی باقی ہے۔

اپنے اس دعوے کے ثبوت میں مکررین حدیث کی جانب سے کبھی کبھی سورہ انفال کی ایک آیت پیش کی جایا کرتی ہے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت سے ان کے استدلال کی اصل حقیقت بھی واضح کر دی جائے۔ سورہ انفال کی آیت ہے :

اے ایمان والو اطاعت کرتے رہو اللہ اور  
اس کے رسول کی اور اس سے روگردانی نہ کرو  
وہ آں سالیکہ تم سن رہے ہو۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَ  
رَسُولَهُ وَلَا تَوَلَّوْا عُنْدَهُ وَمَنْتُمْ  
تَسْمَعُونَ (انفال : ۲۰)

منکرین حدیث اس آیت کے الفاظ وَاَنْتُمْ تَسْمَعُونَ سے یہ استدلال کرتے ہیں کہ اطاعت  
رسول کا حکم صرف ان لوگوں کو دیا گیا تھا جو اس وقت اس حکم کو سن رہے تھے بعد کے آنے  
والے لوگوں کے لیے نہ تھا یہ استدلال سراسر بدینتی اور فریب پر مبنی ہے کیونکہ اس  
آیت کو اس کے سیاق و سباق سے کاٹ کر اپنی خواہش کے مطابق اس کا مفہوم نکالنے  
کی کوشش کی جا رہی ہے۔ سورہ انفال کو ابتدا سے پڑھا جائے تو صاف معلوم ہو  
جاتا ہے کہ اس آیت میں وَاَنْتُمْ تَسْمَعُونَ کہنے سے مقصود ہی کچھ اور ہے۔ اس  
سورت کی ابتدا میں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے وَاَطِيعُوا اللَّهَ  
وَرَسُولَهُ اِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ (اگر تم ایمان رکھتے ہو تو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت  
کرو۔ انفال - ۱) پھر ان لوگوں کو تبنیہ کی گئی ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے  
دی گئی دعوت بجا دینے پر دل تنگ ہوتے تھے وَاِنْ فَرَّقَا مِنْ الْمُؤْمِنِينَ لِنُكَرِهُونَ (اور  
مومنوں کا ایک گروہ (اس کو) گراں سمجھ رہا تھا۔ انفال - ۵) پھر آگے چل کر فرمایا گیا ہے  
وَمَنْ يَشَاقِقِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَاِنْ عَلَّاهُ شَدِيدُ الْعِقَابِ (اور جو کوئی اللہ اور اس  
کے رسول کی مخالفت کرتا ہے سو اللہ سزا دینے میں سخت ہے۔ انفال - ۱۳) اس کے بعد اس  
محولہ بالا آیت کا مضمون وارد ہوا ہے۔ اب ذرا غور کیجئے اس محولہ بالا آیت میں اور اس  
سے پچھلی تمام آیات میں رسول کے ساتھ اللہ کی اطاعت کا ذکر بار بار کیا گیا ہے جس سے  
یہ جھلانا مقصود ہے کہ رسول کی اطاعت عین اللہ کی اطاعت ہے پھر ہر جگہ لفظ رسول آیا  
ہے امیر کا لفظ کسی جگہ بھی استعمال نہیں کیا گیا کہ یہ کہا جاسکے کہ اس اطاعت کا تعلق آپ  
کے منصب امامت سے ہے۔ ایسا کوئی اشارہ بھی موجود نہیں جو یہ ظاہر کرتا ہو کہ ان آیات  
میں رسول سے مراد رسول کی ایسی امیرانہ حیثیت ہے جو منصب رسالت سے مختلف ہو

پھر اطاعت کے اثباتی پہلو کے بعد اس کا منفی پہلو بیان کرتے ہوئے رسول کے حکم سے منہ موڑنے سے منع کیا گیا ہے اور اس پر سخت عذاب کی دھمکی دی گئی ہے۔ اس سب کے بعد وَاَنْتُمْ تَسْمَعُونَ کہا گیا ہے جس کا منشاء صاف یہ ہے کہ تم ہمارے ان تاکیدی احکام کو سنتے ہوئے ہمارے رسول کی اطاعت سے کبھی منہ نہ موڑو۔ اس وَاَنْتُمْ تَسْمَعُونَ کے مخاطب صرف وہی لوگ نہیں ہیں جو اس وقت موجود تھے جس وقت یہ آیت نازل ہو رہی تھی یا جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات تک زندہ تھے بلکہ ان الفاظ کے مخاطب وہ سب لوگ ہیں جو قیامت تک ایمان کے ساتھ قرآن کو سننے والے ہیں۔ یہ آیت ان سب پر لازم قرار دے رہی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا جو حکم بھی ان تک پہنچے اس کے آگے وہ بلا چون و چرا سر تسلیم خم کر دیں۔

غرض اطاعت رسول کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات جہانی تک محدود کرتے کا دعویٰ نہ عقل ہی کی میزان پر پورا اترتا ہے اور نہ قرآن ہی سے اس کی تائید ہوتی ہے اس لیے منکرین حدیث کا یہ دعویٰ قطعاً بلا دلیل ہے۔

مرکز ملت کی طرف حق | اسی طرح اس ضمن میں منکرین حدیث کا یہ دعویٰ بھی دلیل کی حمایت سے قطعاً محروم ہے کہ حامل وحی ہونے کے علاوہ باقی جتنی حیثیات بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل تھیں وہ سب آپ کے بعد آپ کے جانشین یا مرکز ملت کو منتقل ہو گئیں اور اس طرح اطاعت کا وہ حق جو امام وقت ہونے کی بنا پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل تھا وہ آپ کے بعد آئندہ آنے والے امام وقت یا مرکز ملت کو منتقل ہو گیا اپنی طرف سے کوئی دعویٰ کر لینا بہت آسان ہے ثابت ہو جائے تو بات ہے اپنے دعویٰ کے ثبوت میں منکرین حدیث کے پاس کوئی کمزور سے کمزور دلیل بھی موجود نہیں ہے۔ وہ قرآن کی کوئی آیت ایسی پیش نہیں کر سکتے جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ان حیثیات کی منتقلی اور حق اطاعت کے انتقال کا ذکر ہو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی ایسا ارشاد اپنے اسی دعوے کے ثبوت میں وہ نہیں دکھا سکتے جس میں اس انتقال حیثیات و حق اطاعت

کے بارے میں کوئی بالواسطہ یا بلاواسطہ اشارہ تک کیا گیا ہو آثار صحابہ میں سے کوئی ایسی روایت انہیں اپنی نائید میں نہیں مل سکتی جس میں خلفائے راشدین میں سے کسی نے یہ دعویٰ کیا ہو کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی فلاں فلاں بیٹیاں ہماری طرف منتقل ہو گئی ہیں اور مطاع ہونے کے لحاظ سے ہم اب اسی مقام پر فائز ہیں جس پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی حیات تک فائز تھے۔ خلافت راشدہ کے بعد بھی آج تک کے ادوار میں سے کسی دور میں بھی ایسی نظیر موجود نہیں ہے جس سے ثابت ہوتا ہو کہ علمائے امت میں سے کسی قابل ذکر آدمی کا بھی یہ مسلک رہا ہو۔

اس سلسلے میں منکرین حدیث کی جانب سے  
**کیا اللہ و رسول کی اطاعت سے**  
**امام وقت کی اطاعت مراد ہے**  
 اسے دے کر بار بار بس ایک ہی بات  
 کہی جاتی ہے کہ قرآن میں جہاں کہیں اللہ

و رسول کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے اس سے مراد امام وقت کی اطاعت ہے مگر اول تو یہی بات ہماری سمجھ سے باہر ہے کہ یہ مراد آخر متعین ہوئی کس طرح؟ اس مراد کا تعین ہی اول تو محتاج دلیل ہے۔ دوسرے یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ منکرین حدیث ان متحد آیاتِ قرآنی کا کیا کریں گے جن میں اللہ و رسول کی اطاعت کا ذکر کسی طرح بھی امام وقت کی اطاعت مراد نہیں لیا جاسکتا۔ مثال کے طور پر وہی آیت لے لیجئے جو اس باب میں بنیادی آیت تصور کی جاتی ہے یعنی

اے ایمان والو! اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور ان لوگوں کی جو تم میں سے اولوالا ہوں پھر اگر تمہارے درمیان کسی بات میں نزاع ہو جائے تو اس کو پھر دو اللہ کی طرف اور رسول کی طرف۔	يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَاطِيعُوا الرَّسُولَ وَأَطِيعُوا الْأَمْرَ مِنْكُمْ فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ (النساء - ۵۹)
---	---

اس آیت میں اگر اللہ و رسول کی اطاعت سے امام وقت کی اطاعت مراد لی جائے تو اولوالامر یعنی امام کی اطاعت کا دوبارہ حکم دینا بے معنی

نکرار بن کر رہ جاتا ہے۔ علاوہ ازیں زبانِ تناسخِ عتہ میں مزاجِ نزاع اللہ و رسول کو ٹھہرایا گیا ہے جو بقول منکرینِ حدیثِ نورد امام وقت ہے اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ جس سے کسی معاملے میں اختلاف ہو اسی کو رفعِ اختلاف کے لیے ثالث تسلیم کر لیا جائے۔ کس قدر غیر معقول ہے یہ بات۔ اگر یہ کہا جائے کہ زبانِ تناسخِ عتہ میں آپس کا اختلاف مراد ہے اور مزاجِ نزاع امام وقت ہے تو پھر ”فردوہ الی اللہ والرسول“ کے الفاظ بالکل بے محل نظر آتے ہیں کیونکہ اوپر اولی الامر منکم کا ذکر آ جانے کے بعد فصاحت و بلاغت کا تقاضا یہ ہے کہ ”فردوہ الی اللہ والرسول“ کے بجائے ”فردوہ الیہما“ یا صاف ”فردوہ الی اولی الامر“ کہا جائے۔ غرض اس آیت میں کسی طرح بھی ”اللہ و رسول“ کو امام وقت کے معنی میں نہیں لیا جاسکتا اسی طرح اور بھی متعدد نظیریں قرآن سے پیش کی جاسکتی ہیں۔

اللہ و رسول اور امام یہ تینوں عربی زبان کے الفاظ ہیں کیا منکرینِ حدیث بتا سکتے ہیں کہ ”اللہ و رسول“ کے الفاظ سے امام وقت یا مرکزِ ملت کے معانی مراد لینا کونسا محاورہ اور کونسی لغت ہے۔ یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ اس سے مقصود امام رقت کی اطاعت کو اللہ و رسول کی اطاعت کے مترادف قرار دینا ہے کیونکہ اس خیال کی ہی اگر کوئی حقیقت ہوتی تو قرآن میں کہیں تو اس مضمون کی بھی کوئی ایک آیت ضرور آتی کہ من یطیع الامام فقد اطاع اللہ و الرسول (جس نے امام کی اطاعت کی اس نے اللہ و رسول کی اطاعت کی) جیسا کہ یہ واضح کرنے کے لیے کہ رسول کی اطاعت بعینہ اللہ کی اطاعت کے مراد ہے قرآن نے بڑے ہی صریح الفاظ میں اعلان کیا من یطیع الرسول فقد اطاع اللہ (جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی) - (۸۰) -

رسول کی اطاعت اور امام کی اطاعت میں بنیادی فرق

رسول کی اطاعت کو تو بعینہ اللہ کی اطاعت کہا جاسکتا ہے مگر امام کی اطاعت کو بعینہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت نہیں کہا جاسکتا کیونکہ

رسول کی اطاعت اور امام کی اطاعت میں بنیادی فرق یہ ہے کہ رسول کی اطاعت اللہ کے بیان اس کی ارادۃ اور اس کی وحی کے ماتحت ہونے کی بنا پر فی الحقیقت اللہ ہی کی اطاعت

ہوتی ہے مگر امام پر نہ وحی آتی ہے نہ اللہ کی طرف سے اس کی صواب رسی کی کوئی ضمانت دی گئی ہے نہ جو حکم دے گا اپنی صواب دیدہ اپنی فہم اور اپنے علم کے مطابق دے گا ظاہر ہے اس صودت میں اس کی اطاعت کو کسی طرح بھی اللہ و رسول کی اطاعت نہیں کہا جاسکے گا۔ اس حقیقت کو ایک بار حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے برسرِ منبر بڑے واضح الفاظ میں واضح کرتے ہوئے فرمایا :

لوگو! جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے (دین کے بارے میں) اس لیے صواب ہوتی تھی کہ وہ اللہ کی طرف سے ہوا کرتی تھی۔ یہی ہماری رائے تو وہ تو بعض ایک شکل ہوتی ہے۔

إِنَّمَا النَّاسُ رَأَوْا الْوَيْلَ إِذَا كَانَ مِنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَصِيبًا إِنَّ اللَّهَ كَانَ يُرِيدُ وَأَنَّهُمَا هُوَ مَنَّا الْفُطْنُ وَالتَّكَلُّفُ (اعلام الموقعین ج ۱ ص ۴۵)

اسی طرح ایک موقع پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے کاتب نے حضرت عمرؓ کے فیصلے پر یہ الفاظ لکھ دئے تھے: هَذَا مَا أَمَرَ بِهِ اللَّهُ أَمِيرَ الْمُؤْمِنِينَ عُمَرَ (یہ وہ فیصلہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے امیر المؤمنین عمرؓ کے خیال میں ڈالا ہے) حضرت عمرؓ نے دیکھا تو سختی سے منع فرمایا اور کہا کہ یو، مت لکھو بلکہ یوں لکھو کہ هَذَا مَا أَمَرَ بِهِ الْمُؤْمِنِينَ عُمَرَ (یہ وہ فیصلہ ہے جو امیر المؤمنین عمرؓ نے خود اپنے خیال کے مطابق صادر فرمایا) جملہ نامہ یہ مقصود تھا کہ ہم پر نہ وحی آتی ہے نہ ہم معصوم عن الخطا ہیں اور نہ ہماری رائے کو حفاظت ربانی کی ضمانت حاصل ہے اس لیے ہماری رائے کو صواب رسی میں رسول کی رائے کا مقام نصیب نہیں ہو سکتا اور ظاہر ہے جس کی رائے کا صواب اور درست ہونا یقینی نہ ہو اس کی اطاعت کو اس بستی کی اطاعت کے ہم پلہ کیونکر قرار دیا جاسکتا ہے جس کی اصابت رائے پر وحی الہی ضامن ہو۔

اس سلسلے میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ امام وقت یا مرکزِ ملت کی اطاعت کو اطاعتِ رسول کے قائم مقام قرار دینے کا لازمی طور پر یہ مطالب ہو گا کہ وہ خصوصیات جو اطاعتِ رسول کے لیے قرآن سے ثابت ہیں وہ سب کی سب امام وقت یا مرکزِ ملت کے لیے بھی مختص تصور کی جائیں حالانکہ ان میں سے کوئی ایک خصوصیت بھی امام وقت یا مرکزِ ملت پر صادق نہیں آتی۔

اطاعتِ رسول کے خصائص مرکزِ ملت سے ثابت ہیں وہ ہم ایک ایک کر کے  
کی اطاعت پر صادق نہیں آتے | گنا تے ہیں منکرینِ حدیث ان میں  
غور کر کے بتائیں ان میں سے کسی ایک کو بھی امامِ وقت یا مرکزِ ملت کے حق میں مختص قرار  
دینا کسی طرح بھی معقول نظر آتا ہے؟ قرآن کا ارشاد ہے :

فلا وربك لا يؤمنون حتى  
يحكموك فيما شجر بينهم ثم  
لا يجدوا في انفسهم حرجا مما  
قضيت وليسلموا تسليما  
(النساء : ۶۵)

سو آپ کے پروردگار کی قسم کہ یہ لوگ ایماندار  
نہ ہوں گے جب تک یہ لوگ آپ کے حکم سے  
میں آپ کو حکم نہ بنالیں اور پھر جو فیصلہ آپ کریں  
اس سے اپنے دلوں میں تنگی نہ پائیں اور اسی کو  
پورا پورا تسلیم کر لیں۔

اس آیت سے اطاعتِ رسول کی دو خصوصیتیں معلوم ہوتی ہیں :

(۱) اول یہ کہ رسول کے فیصلے پر رضا مندی شرط ایمان ہے جو شخص کسی معاملے  
میں رسول کے کیے ہوئے فیصلے سے اتفاق نہیں کرتا وہ مومن نہیں رہتا۔  
(۲) دوسری یہ کہ رسول کی اطاعت کا حق تب ادا ہوتا ہے جب اپنے ہر معاملے کو رسول  
کے سپرد کر دیا جائے پھر جو فیصلہ وہ کر دے اس کو ہر طرح حق اور درست مانا جائے نیز اس  
فیصلے پر اس طرح بخوشی راضی رہا جائے کہ اپنے خلاف ہونے کی صورت میں دل کے اندر بھی  
کوئی تنگی تک محسوس نہ ہو۔

اب امامِ وقت یا مرکزِ ملت کی اطاعت کو بعینہ رسول کی اطاعت قرار دینے والے  
ذرا سوچیں کیا مرکزِ ملت کی اطاعت بھی اسی درجے کی ہوگی کہ اس سے اتفاق نہ رکھنے والا  
ایمان کے دائرے سے خارج سمجھا جائے گا؟ کیا مرکزِ ملت کی ایسی اطاعت ممکن بھی ہے  
کہ اس کے ہر فیصلے کو حق اور درست مانا جائے اور اپنے خلاف دئے گئے کسی فیصلے پر دل  
میں ناگواری تک کا احساس نہ ہو؟

(۳) اطاعتِ رسول کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ رسول کا کیا ہوا ہر فیصلہ ناطق



ہوتا ہے اس کے فیصلے کے سامنے کسی مومن کو کوئی اختیار باقی نہیں رہتا اس کے فیصلے سے انکار کرنے والا کھلی گمراہی کا مردِ قرار پاتا ہے اطاعتِ رسول کی اس خصوصیت کے لیے سورہ احزاب کی چھتیسویں آیت ملاحظہ کیجئے :

<p>اور کسی مومن یا مومنہ کے لیے یہ درست نہیں کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی امر کا فیصلہ کر دیں تو پھر ان کو اپنے (اس) امر میں کوئی اختیار باقی رہ جائے اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا وہ صریح گمراہی میں جا پڑا۔</p>	<p>وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ إِنَّا قَضَى اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَنْ يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ وَمَن يَعْصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا مُّبِينًا (الاحزاب : ۳۶)</p>
--	---

ظاہر ہے مرکزِ ملت کے فیصلے کو یہ حیثیت حاصل نہیں ہو سکتی کہ اس کے بعد کسی کو کوئی اختیار ہو باقی نہ رہے۔ نہ مرکزِ ملت کے فیصلے سے انکار کرنے والے کو گمراہ کہا جاسکتا ہے اس لیے کہ گمراہی یا ہدایت کا دار و مدار وحی الہی کے رد و قبول پر ہے اور مرکزِ ملت وحی الہی کی رہنمائی سے محروم ہے۔

(۲) اطاعتِ رسول کی ایک خصوصیت قرآن کریم ہمیں یہ بتلاتا ہے کہ رسول کے کیے ہوئے فیصلے کی کہیں کوئی اپیل نہیں رسول جو حکم بھی دے دے اس کو سنتے ہی سر تسلیم خم کر دینا ضروری ہے۔ ارشادِ ربانی ہے :

<p>ایمان والوں کا قول تو یہ ہے جب وہ بلائے جاتے ہیں اللہ اور اس کے رسول کی طرف کہ (رسول) ان کے درمیان فیصلہ کر دیں تو وہ کہہ اٹھتے ہیں کہ ہم نے سنا اور مان لیا تو ایسے ہی لوگ تو فلاح یاب ہیں۔</p>	<p>إِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِينَ إِذَا دُعُوا إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ أَنْ يَقُولُوا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ - (النور : ۵)</p>
---	--

اس آیت میں تو سمیع و طاعت کا اثباتی پہلو بیان کیا گیا ہے کہ حکمِ رسول کے معاملے میں جو لوگ سمیع و طاعت کا راستہ اختیار کرتے ہیں وہ فلاح یاب ہیں اس کے منہجِ پہلو کی وضاحت کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے کہ جو لوگ اطاعتِ رسول کا اقرار کر کے اس سے ستر تابی کر جاتے ہیں

اور مومن ہی نہیں ہیں - سورہ نور ہی کی آیت ہے :

وَيَقُولُونَ آمَنَّا بِاللَّهِ وَبِالرَّسُولِ  
وَإِطَعْنَا لَمْ يَتَوَلَّ فَرِيقٌ مِّنْهُمْ  
مِّنْ بَعْدِ ذَلِكَ وَمَا أُولَٰئِكَ  
بِالْمُؤْمِنِينَ (النور : ۷۴)

اور کہتے ہیں کہ ہم اللہ اور رسول پر  
ایمان لے آئے اور ان کا حکم مانا ہے  
ان میں کا ایک گروہ اس کے بعد سرتابی کر  
جاتا ہے اور یہ لوگ ہرگز ایمان دار نہیں  
جمع و طاعت کے اثباتی اور منفی دونوں پہلوؤں کو یکجا کر کے دیکھئے معلوم ہوتا ہے حکم  
رسول پر اطلاع پانے کے بعد مومن کے لیے اور کوئی راستہ نہیں سوائے اس کے کہ  
سرا طاعت جھکا دے رسول سے اوپر کوئی ہستی ہی نہیں کہ اس کے سامنے دلیل کا سوال  
پیدا ہو خود رسول کے سامنے بھی چون و چرا کی گنجائش نہیں بس حکم رسو سنے و فوراً  
بجالائے ایمان کا تقاضا ہی ہے -

اطاعت رسول کی یہ خصوصیت بھی کسی طرح مرکز ملت پر صادق نہیں آتی تاہم  
اسلام گواہ ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ کے کسی جانشین یعنی منکرین حدیث  
کی اصطلاح میں کسی مرکز ملت کی اطاعت کو اس کا مستحق نہیں سمجھا گیا کہ اس کے حکم کو  
ہر قسم کی تنقید سے بالاتر تصور کیا جائے حضرت عمر فاروقؓ بھی رعب و دبہ کے حامل  
خلیفہ کے احکام کو ایک عام آدمی تنقید کا نشانہ بنا لیتا تھا اور جب تک قرآن و حدیث کی سند  
کے ساتھ اس کو مطمئن نہ کر دیا جاتا وہ تعمیل حکم سے صاف انکار کر دیتا تھا کوئی ایک نظیر  
بھی ایسی نہیں دی جاسکتی جس سے یہ معلوم ہوتا ہو کہ کسی بھی جانشین رسول نے یا دوسرے  
لفظوں میں کسی بھی مرکز ملت نے یہ کہا ہو کہ ہمارے احکام کے سامنے سمج و طاعت کلاسا  
ہی مظاہرہ کرو جیسا رسول اللہ کے سامنے لازم تھا کیونکہ مرکز ملت کی اطاعت اطاعت  
رسول کے قائم مقام ہے -

۵، اطاعت رسول کی پانچویں خصوصیت یہ ہے کہ قرآن کے نزدیک رسول کی  
اطاعت بعینہ اللہ کی اطاعت ہے :

من يطع الرسول فقد اطاع الله (النساء - ۸۰) | جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی۔

گویا اللہ کی اطاعت اور اس کے رسول کی اطاعت دو جدا جدا حیثیتوں کی حامل نہیں ہیں بلکہ فی الحقیقت ایک ہی ہیں رسول کی اطاعت کی صورت میں بھی اطاعت دراصل اللہ ہی کی ہوتی ہے اس لیے کہ رسول اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتا بلکہ وہی کچھ کہتا ہے جو اس پر وحی کی جاتی ہے۔

اس کے بالعکس مرکز ملت صاحب وحی نہیں ہوتا اس پر اللہ کی وحی نازل نہیں ہوتی وہ جو کچھ کہتا ہے اور جو فیصلہ دیتا ہے اپنی سمجھ بوجھ کے پھرو سے پر دیتا ہے یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس سے منکرین حدیث کو بھی انکار نہیں تو پھر ذرا بتلائیے اس خصوصیت کی موجودگی میں مرکز ملت کی اطاعت کو کس طرح اطاعت رسول کے قائم مقام قرار دیا جاسکتا ہے۔

(۶) اطاعت رسول کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس کے نتیجے میں یقینی طور پر اللہ کی محبت حاصل ہوتی ہے نیز وہ گناہوں کی مغفرت کا ذریعہ بنتی ہے۔ قرآن کا ارشاد ہے:

قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي | آپ کہہ دیجئے کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی کرو اللہ تم سے محبت کرنے لگے گا اور تمہارے گناہ بخش دے گا۔

(آل عمران ۳۱)

کیا مرکز ملت کی اطاعت کے بارے میں بھی یہ ضمانت دی جاسکتی ہے کہ وہ اللہ کی محبت حاصل کرنے کا ایک سبب اور گناہوں کی مغفرت کا ایک ذریعہ ہے ظاہر ہے ایسی کوئی ضمانت قطعاً نہیں دی جاسکتی تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ مرکز ملت کی اطاعت کو اللہ کے رسول کی اطاعت کے مرادف قرار نہیں دیا جاسکتا۔

(۷) اطاعت رسول کی خصوصیات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اس میں ہدایت منحصر ہے جو شخص اللہ کے رسول کی اطاعت کرتا ہے وہ ہدایت پالیتا ہے چنانچہ قرآن کہتا ہے:

وَرَأَىٰ طَٰغِيُوۡنَ مُنَٰفِقُوۡنَ ۖ قَالُوۡا هٰذَا الَّذِيۡ فَعَلۡنَا ۚ وَهٰذَا الَّذِيۡ كُنَّا نَعۡتَدُ ۚ  
 (النور : ۵۴) | اگر تم اس (رسول) کی اطاعت کرو گے تو ہدایت پاؤ گے۔

کیا منکرین حدیث کے مرکز ملت کو بھی یہ مقام دیا جاسکتا ہے کہ جو اس کی اطاعت کرے بس وہی ہدایت یافتہ سمجھا جائے اور اس کی اطاعت سے انکار کرنے والا گمراہ ٹھہرے۔ یہی نہیں بلکہ جو عمل اس نے اس انکار سے پہلے کیے ہوں وہ بھی ضائع ہو جائیں کیونکہ

(۸) قرآن ہی میں اطاعت رسول کی ایک یہ خصوصیت بھی بتائی گئی ہے کہ اس سے انکار کرنے کا نتیجہ ضبط اعمال کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے چنانچہ ارشاد رہانی ہے :  
 يَاۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا اَطِيعُوا اللّٰهَ | اے ایمان والو اطاعت کرو اللہ کی اور  
 وَاَطِيعُوا الرَّسُوۡلَ وَلَا تَبۡطُلُوۡا | اطاعت کرو رسول کی اور اپنے اعمال کو  
 اَعۡمَالِكُمۡ۔ (محمد : ۳۳) | رائیگاں مت کرو۔

(۹) تعین حکم سے انکار کی صفت بھی میں ضبط اعمال نہیں ہوتا اطاعت رسول کو تو قرآن نے وہ مقام دیا ہے کہ رسول کے سامنے اونچی آواز سے بولنے والا تک اپنے اعمال گنوا بیٹھا ہے۔ سورہ حجرات کی یہ آیت اس پر شاہد ہے :

يَاۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَرۡفَعُوۡا | اے ایمان والو اپنی آوازوں کو پیغمبر کی آواز  
 اَصۡوَاتِكُمۡ فَوْقَ صَوۡتِ النَّبِيِّ وَلَا | سے بلند نہ کیا کرو اور نہ ان سے ایسے کھل کر  
 تَجۡهَرُوۡا لَهٗ بِالۡقَوۡلِ كَجَهۡرٍ بَعْضُكُمۡ | بولا کرو جیسے آپس میں کھل کر بولا کرتے ہو کہ  
 لِبَعْضٍ اَنۡ تَحۡبِطَ اَعۡمَالُكُمۡ وَاَنْتُمْ | کہیں تمہارے اعمال برباد نہ ہو جائیں اور  
 لَا تَشْعُرُوۡنَ (حجرات : ۲) | تمہیں خبر تک نہ ہو۔

غور کرنے کی بات ہے کسی مرکز ملت کے بارے میں یہ تصور بھی نہیں کیا جاسکتا کہ اس کے سامنے محض اونچی آواز سے بولنا یا کھل کر حفظ مراتب کا خیال کیے بغیر لاپرواہی سے کلام کرنا ضبط اعمال کا موجب بن سکتا ہے۔

(۱۰) اسی طرح اطاعت رسول کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ اپنے اندر

معمولی معمولی اطاعت کو بھی سمجھو ہوئے ہے حتیٰ کہ کسی خاص مجلس سے باہر نکلنا ہو تو اس کے لیے بھی رسول کی اجازت لینی ضروری ہے اس اجازت کو قرآن کمال ایمان کا میعار قرار دیتا ہے۔ سورہ نور میں ہے :

<p>ان الذین یستأذنونک أوملک الذین یؤمنون باللہ ورسولہ (النور : ۶۲)</p>	<p>جو لوگ آپ سے اجازت لے کر جلتے ہیں یہی لوگ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھتے ہیں۔</p>
--	---

یہ دس خصوصیات ہم نے گنائی ہیں جو قرآن کریم سے صرف اطاعت رسول کے لیے ثابت ہوئی ہیں ان میں سے کوئی ایک خصوصیت بھی ایسی نہیں جو امام وقت یا مرکز ملت پر صادق آسکے ایسی صورت میں ہر صاحب عقل خود فیصلہ کر سکتا ہے کہ قرآن کریم میں ہر جگہ اللہ و رسول کی اطاعت سے امام کی اطاعت مراد لینا کسان تک درست ہے۔

اطاعت رسول سے امام وقت یا مرکز ملت کی اطاعت مراد لینے کے لازمی نتائج

ان خصوصیات میں ایک ایک کر کے غور کرتے چلے جائیے۔  
ان میں سے کسی ایک خصوصیت کو بھی اگر امام کے لیے درست تسلیم کر لیا جائے تو اس کے نتیجے میں ہمیں لازمی طور پر یہ ماننا پڑے گا کہ امام اپنی اطاعت کے لحاظ سے نبی کے مقام پر فائز ہے العباد باللہ امام کی اطاعت کو رسول کی اطاعت قرار دے کر منکرین حدیث کیا نبوت کا دروازہ کھلا رکھنا چاہتے ہیں؟

اس کے علاوہ اس سلسلے میں ایک اور بات بھی بہت اہم ہے۔ منکرین حدیث نے اللہ و رسول سے امام وقت یا مرکز ملت تو مراد لے لیا مگر یہ نہیں بتلایا کہ اس سے

امام صالح مراد ہے یا امام فاسق اگر اس سے مطلق امام مراد ہے خواہ وہ صالح ہو یا فاسق تو براہ کرم یہ بھی بتلایا جائے کہ کیا امام فاسق کی اطاعت کو بھی ٹھیک ٹھیک اللہ و رسول کی اطاعت سمجھا جائے گا اور اگر اس سے مراد خاص امام صالح ہے تو پھر تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ

خلافت راشدہ کے بعد تیرہ سو سال تک اللہ و رسول کی اطاعت کی کوئی صورت ہی باقی نہیں رہی اور اتنے طویل عرصے تک اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول کا نظام بالکلیہ معطل ہو گیا۔ لیکن نہ خلفائے راشدین کے بعد تو کوئی شاذ و نادر ہی امام صالح ہوا ہے۔ ”اللہ و رسول“ سے مرکز ملت مراد لے لینے کے بعد اس مشکل کا پیش آنا لازمی ہے اس کا منکرین حدیث کے پاس کیا حل ہے۔ سوچنے کی بات ہے قرآن نے بے شمار مقامات پر بصراحت اس بات کا اعلان کیا ہے کہ ہدایت اور نجات کا راستہ صرف اور صرف اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت میں منحصر ہے۔ اب اگر ہر جگہ اللہ و رسول کی اطاعت سے مراد امام وقت یا مرکز ملت کی اطاعت ہو تو یقیناً گزشتہ تیرہ سو سالوں میں اماموں کی اکثریت ایسی ہی ہے جن کی اطاعت کو اللہ و رسول کی اطاعت نہیں کیا جاسکتا تو کیا یہ تسلیم کر لیا جائے کہ اس پورے عرصے میں مسلمانوں کے لیے راہ نجات و ہدایت مسدود رہی کیا یہ مان لیا جائے کہ اسی تمام دور میں مسلمانوں کے پاس اپنے باہمی نزاعات رفع کرنے کی کوئی صورت ہی موجود نہیں رہی کیا یہ تصور کر لیا جائے کہ دین اسلام ایک ایسا آئین ہے جس پر عمل کرنا دنیا کی طاقت سے باہر ہے اگر آپ اللہ و رسولؐ کی اطاعت سے مرکز ملت کی اطاعت مراد لیتے ہیں تو آپ کو یہ سب کچھ جو قطعاً خلاف عقل و نقل اور سراسر خلاف واقعہ ہے ماننا پڑے گا۔

کبھی منکرین حدیث نے اس پر بھی غور کیا کہ وہ تمام خصائص جو قرآن سے اطاعت رسول کے لیے ثابت ہوتے ہیں اگر وہ امام وقت یا مرکز ملت کی ذات میں مجتمع ہو گئے تو عقلی طور پر اس کا نتیجہ کیا نکلے گا وہ تمام آیات جو اس ضمن میں ہم نے ابھی پیش کی ہیں ذرا ان میں غور کیجئے مرکز ملت کی ذات میں یہ تمام خصائص مجتمع ہو جانے کی صورت میں ایسی بدترین آمریت قائم ہوگی کہ فرعون کی فرعونیت اور ہٹلر و موسولینی کی بدنام زمانہ ڈکٹیٹر شپ بھی اس کے سامنے ماند پڑ جائے گی ذرا خیال تو کیجئے جب حال یہ ہو کہ مرکز ملت مسلمانوں کا دین و ایمان قرار پائے اس کے ہر حکم پر سر تسلیم کرنے والا تو مسلمان رہے مگر جو بھی کسی معاملے میں اس سے اتفاق نہ کرے وہ ایمان کے دائرے سے خارج سمجھا جائے اس کو راضی کرنا ہر مسلمان کے لیے شرط ایمان قرار پائے اور جو شخص بھی اس کی اطاعت سے ذرا منہ موڑے اس کی نماز اس کا روزہ اس کی زکوٰۃ غرض اس کی ساری نیکیاں برباد ہو جائیں اس کے سامنے آواز بلند

کرنے والا حتیٰ کہ اس کی مرضی کے بغیر اپنی جگہ سے ادھر ادھر ہو جانے والا تک اللہ کا مجرم گردانا جائے تو ایسا مرکزِ ملت کس قدر زبردست آمر اور ڈکٹیٹر ثابت ہوگا اس کی آمریت کو تاریخ انسانی کی کسی آمریت سے بھلا کیا نسبت ہو سکتی ہے۔

پھر کبھی منکر بنِ حدیث نے اس پہلو پر بھی غور کیا کہ نبواً میہ کے بعد سے آج تک سارا عالم اسلام کبھی ایک دن کے لیے بھی ایک مرکزِ ملت کے تحت جمع نہیں ہوا اس زمانے میں بھی مسلمانوں کی حکومتیں متعدد ہیں جو مختلف سربراہوں کے تحت اپنا نظام حکومت چلا رہی ہیں تو اب کیا انڈونیشیا، ملایا، ایران، ترکی، پاکستان، عرب، مصر، لیبیا، اردن، شام، عراق، تونس اور مراکش وغیرہ میں سے ہر ایک کے ”اللہ و رسول“ الگ الگ ہوں گے؟ یا کسی ایک ”ملک کے“ ”اللہ و رسول“ کیا زبردستی اپنی آمریت دوسرے ملکوں کے ”اللہ و رسول“ پر مسلط کریں گے؟ یا کیا اسلام کا سارا نظام اس وقت تک پورا کا پورا معطل رہے گا جب تک کہ پورا عالم اسلام متفق ہو کر ایک ”اللہ و رسول“ کا انتخاب نہ کر لے؟ کاش منکر بنِ حدیث نے ان عواقب پر غور کیا ہوتا جو ”اللہ و رسول“ سے امامِ وقت یا مرکزِ ملت خیزا دینے کی صورت میں لازمی طور پر پیش آتے ہیں۔ سچی بات یہ ہے کہ اگر انہوں نے صرف ان عواقب ہی پر غور کر لیا ہوتا تو منصبِ رسالت اور مرکزِ ملت کے تصور کو بوں گڈ بڈ کر کے دینِ اسلام کا اسی طرح حلیہ نہ بگاڑتے :

# پہلے بنیاد اعتراضات اور ان کا تجزیہ

اب تک ہماری گفتگو کا محور زیادہ تر وہ اعتراضات رہے ہیں جن کو منکرین حدیث اپنی دانست میں علمی مسائل کا رنگ دے کر پیش کرتے ہیں اور جن سے ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ احادیث نبوی کی عدم حجیت اگر ثابت نہ ہو سکے تو کم از کم ان کی حجیت مشکوک ضرور ہو جائے۔ لیکن جب علمی بساط پر ان کی یہ کوششیں کامیاب ہوتی نظر نہیں آتی تو پھر وہ اوجھے ہتھیاروں پر اتر آتے ہیں پھر وہ سارا زور داس پر صرف کرنا شروع کر دیتے ہیں کہ کسی طرح عام سادہ لوح مسلمانوں کی نظر میں احادیث کے موجودہ ذخیرے کو بے وقعت اور ناقابل اعتماد ثابت کر دیا جائے۔ اسی ضمن میں جتنے اعتراضات ان کی طرف سے کیے جاتے ہیں وہ اگرچہ اس قابل تو نہیں کہ انہیں کوئی وزن دیا جائے لیکن چونکہ زیر نظر تحریر سے ہمارا مقصد ہی منکرین حدیث کی ان شاطرانہ چالوں کو آشکار کرنا ہے جو وہ ناواقف حال عام مسلمانوں کے اذہان کو معلوم کرنے کے لیے چلتے ہیں اس لیے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان اعتراضات کی بھی اصل حقیقت واضح کر دی جائے تاکہ وہ لوگ جو بے چارے دین سے بوری طرح واقف نہ ہونے کی بنا پر منکرین حدیث کی چالوں کو سمجھ نہیں پاتے ان کے قریب کا شکار ہونے سے بچ جائیں۔

اس سلسلے میں ہم اپنی گفتگو صرف ان اعتراضات کے تجزیہ کے لیے بنیاد اعتراضات تک محدود رکھیں گے جن کو منکرین حدیث کے یہاں نمایاں

حجیت حاصل ہے۔ ایسے اعتراضات مختصراً حسب ذیل ہیں :

(۱) احادیث نبوی کا موجودہ ذخیرہ ناقابل اعتبار ہے اسی لیے کہ اس ذخیرے میں موضوع احادیث بہت کثرت سے شامل ہیں اور صحیح و غیر صحیح اس طرح مخلوط ہیں کہ ان میں امتیاز دشوار ہے۔

جھوٹی احادیث کا سلسلہ عمدہ رسالت ہی میں شروع ہو گیا تھا پھر جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا جعلی اور جھوٹی حدیثوں کا انبار لگتا چلا گیا۔ موضوع احادیث کی کثرت کا اندازہ اس



ہات سے لگایا جاسکتا ہے کہ امام بخاری کے زمانے میں جو چھ لاکھ حدیثیں رائج تھیں جن میں سے امام صاحب نے صرف نو ہزار کو صحیح احادیث کی حیثیت سے منتخب کیا۔  
(۲) بعض احادیث خلافت عقل و درایت میں لیکن اس کے باوجود محدثین کے یہاں انہیں صحت کا درجہ حاصل ہے۔

(۳) بعض صحیح احادیث عربیوں میں پر مشتمل ہیں۔  
(۴) بعض صحیح احادیث علم اور تجربے کے معیار پر پوری نہیں اترتیں۔  
دعا اکثر احادیث باہم متعارض ہیں اور متعارض اشیا ساقط الاعتبار ہوتی ہیں لہذا احادیث بھی تعارض کی وجہ سے ساقط الاعتبار ہوتیں۔

(۵) اکثر احادیث کی روایت بالمعنی ہے یعنی راوی نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مفہوم کو اپنے الفاظ میں ادا کیا ہے جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ ہی محفوظ نہیں تو مفہوم کے بارے میں کیسے یہ یقین کیا جاسکتا ہے کہ وہ محفوظ ہے۔

(۶) سب سے زیادہ احادیث حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہیں اور ابو ہریرہ کا حال یہ ہے کہ خود صحابہ کے درمیان ان کو ناقابل اعتماد تصور کیا جاتا تھا۔

(۷) امام ابو حنیفہ نے مسائل فقہی کے استنباط کے لیے صرف ۷۱ یا ۸۱ حدیثوں پر اعتماد کیا ہے ورنہ جتنے احکام و مسائل کا بھی انہوں نے استنباط کیا ہے ان سب کی بنیاد قرآن کی مکتوب ہدایات پر رکھی ہے اگر امام ابو حنیفہ یہ حق رکھتے تھے کہ حدیث کی مدد کے بغیر قرآن کی تعبیر اس وقت کے حالات کی روشنی میں کریں تو بعد میں آنے والوں کو یہ حق کیوں نہیں کہ وہ قرآن کی تعبیر اپنے وقت کے حالات کو مدنظر رکھ کر حدیث کی مدد کے بغیر کر سکیں۔

یہ ہے خلاصہ ان اعتراضات کا جو حدیث کی وقعت کو کم کرنے اور حدیث پر عام مسلمانوں کا اعتماد مجروح کرنے کی خاطر منکرین حدیث کی جانب سے بار بار مختلف انداز بدل بدل کر بڑے شد و مد سے اُبھالے جاتے ہیں۔ اب ہم ایک ایک کر کے ان تمام اعتراضات کا بے بنیاد ہونا واضح کرتے ہیں۔

# ۱۔ موضوع احادیث کی موجودگی سے غلط استدلال

منکرین حدیث کا پہلا اعتراض وضع حدیث سے متعلق ہے ان کا کہنا ہے کہ چونکہ موضوع احادیث بہت کثرت سے ہیں اس لیے

احادیث کا سارا ذخیرہ ناقابل اعتماد ہو گیا ہے۔ اس سے تو کسی کو انکار نہیں کہ موضوع احادیث کثیر تعداد میں موجود ہیں مگر منکرین حدیث کی یہ منطق کسی طرح سمجھ میں آنے والی نہیں کہ ان کی موجودگی احادیث کے تمام ذخیرے کو ساقط ال اعتبار بنادیتی ہے یہ تو ایسا ہی ہے جیسے کوئی یہ کہے کہ دنیا میں جھوٹ کی موجودگی پسح کو ناقابل اعتبار بنا دینے کی موجب ہے۔ کیا کسی معاشرے میں جھوٹوں کا وجود اس معاشرے کے سچے لوگوں کو بھی جھوٹا بنا دیتا ہے۔ دنیا میں کونسا ملک یا کونسا شہر ایسا ہے جہاں جھوٹے افراد نہیں ملتے تو کیا ان جھوٹوں کی وجہ سے یہ حکم لگا دینا صحیح ہے کہ اس ملک یا اس شہر کے تمام باشندے جھوٹے ہیں۔ ہر زمانے میں پسح کے ساتھ ساتھ جھوٹ کا سلسلہ برابر لگا چلا آ رہا ہے مگر آج تک جھوٹ کی وجہ سے پسح کو کسی نے نہیں چھوڑا۔ منکرین حدیث کی یہ نثرالی منطق ہے کہ چونکہ جھوٹی احادیث کا وجود پایا جاتا ہے اس لیے سچی اور صحیح احادیث پر بھی اعتماد نہ کیا جائے۔ بعض احادیث کے موضوع اور مبنی بر کذب ہونے سے یہ کہاں لازم آیا کہ کل ذخیرہ حدیث موضوع اور ناقابل اعتبار بن گیا۔ یہ بعض کا حکم کل پر لگانا کونسا اصول ہے؟

در اصل منکرین حدیث کی اس منطق کی بنیاد اس غلط مفروضے پر ہے کہ احادیث کے ذخیروں میں صحیح و غیر صحیح احادیث باہم اس طرح خلط ملط ہیں کہ ان میں امتیاز دشوار ہے۔ یہ بات بالکل خلاف واقعہ ہے بحقیقت یہ ہے کہ جس وقت سچے جعلی اور موضوع احادیث کا سلسلہ شروع ہوا اسی وقت سے محدثین اور ائمہ مجتہدین نے اپنی تمام کوششیں اس بات پر مرکوز رکھیں کہ موضوعات کا یہ ذخیرہ کس راہ سے بھی احادیث کے معتبر اور قابل اعتماد ذخیروں میں نہوذ نہ کر پائے۔ حضرات محدثین نے صحیح اور غیر صحیح کو ایک دوسرے سے تمیز کرنے کے لیے باقاعدہ قواعد و ضوابط بنائے، جھوٹے اور سچے راویوں کی پہچان کے لیے علم اسماء الرجال ایجاد کیا، کھرے کھوٹے میں تمیز کے لیے علم جرح و تعدیل مدون کیا

پھر ایک ایک حدیث کو جانچا اور ایک ایک راوی کو پرکھا موضوعات کو الگ کر دیا اور معتبرات کو علیحدہ نکال لیا۔ ہر روایت کی سند متعین کی اور ہر راوی کا نام پتہ اور حال سب کچھ منضبط کر دیا۔

حضرات محدثین نے حدیث کی صحت اور تنقید کا معیار بھی بتلایا اور موضوعات پر باقاعدہ کتابیں بھی لکھیں انہوں نے ایک ایک واضح حدیث کا پتہ لگا کر اس کا نام رجال کی کتابوں میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ثبت کر دیا ایک ایک جھوٹی اور موضوع حدیث کا کھوج لگا کر احادیث موضوعہ کے مجموعے مرتب کر دئے جن میں خوب واضح طور پر یہ بتلایا کہ یہ حدیثیں جعلی ہیں ان کو کوئی اصل حدیث نہ سمجھے جس حدیث پر بھی کلام کیا اولاً اس کی سند بتلائی پھر اس کے راویوں کے صدق و کذب اور ان کے ثقہ و غیر ثقہ ہونے نیز ان کے حافظے کی قوت و ضعف پر بحث کر کے نتائج مرتب کیے پھر کسی حدیث پر کوئی حکم لگایا بے دلیل کوئی حکم نہیں لگایا اگر کسی حدیث کے موضوع اور غیر موضوع ہونے میں علمائے حدیث کا اختلاف ہوا تو وہ تمام اختلاف بھی من و عن بیان کر دیتا کہ ہر کوئی خود دیکھ لے پرکھ لے اور کھرا کھوٹا الگ کر لے۔ اس قدر تنقیحات کے بعد بھی اگر کوئی یہ کہتا ہے کہ صحیح و غیر صحیح احادیث آپس میں خلط ملط ہیں تو اس پر اس کے سوا کیا کہا جاسکتا ہے کہ وہ روزِ روشن میں سورج کے وجود سے انکاری ہے۔

منکرین حدیث نے بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کو بھی عام مصلحین عالم کے اقوال کی طرح سمجھ لیا ہے کہ جس نے چاہا ان کی طرف منسوب کر کے کوئی بات کہہ دی اور لوگوں نے محض ان کے نام کی نسبت کے رعب میں آکر اسے قبول کر لیا کسی نے ان کی صحت و عدم صحت کی تحقیق کی ضرورت ہی نہ سمجھی بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات عام مصلحین عالم کے اقوال کی طرح نہ تھے کہ ان کا تعلق محض چند مبنی براخلاق فصائح سے ہو یا وہ فلسفہ حیات انسانی کے چند علمی نکات تک محدود ہوں جن کے بارے میں ہر کوئی جانتا ہے کہ ان کے قائل کی طرف نسبت اگر درست نہ بھی ہو تو نفسِ مضمون پر اور اس سے مستنبط نتائج میں کافی فرق نہیں پڑتا اور

اسی لیے ان کے بارے میں تحقیق و تفتیش کی رحمت بھی کوئی نہیں اٹھاتا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کا معاملہ بالکل جدا ہے وہاں تو آپ کے ایک ایک ارشاد پر ایک ایک اسلامی قانون کی بنیاد رکھی جا رہی تھی آپ کے ایک ایک فعل کو نظیر بنا کر شریعت اسلامی کی عمارت کی تعمیر میں ایک ایک اینٹ نسب کی جا رہی تھی۔ آپ کی سنت کو دین اسلام کے بنیادی ماخذ کی حیثیت حاصل تھی۔ آپ کی طرف کسی معمول سے معمولی بات کی غلط نسبت اسلامی قوانین کے پورے ڈھلچنے پر اثر انداز ہو سکتی تھی۔ بھلا ایسی صورت میں یہ خیال کرنا کسی طرح بھی درست مانتا جاسکتا ہے کہ واضعین حدیث جھوٹی احادیث وضع کرتے رہے اور محدثین بغیر کسی تحقیق کے انہیں اپنے مجموعوں میں شامل کرتے چلے گئے۔

محدثین نے قبول حدیث کے لیے جو اصول ابتدا ہی سے بالاجماع مقرر کر دیے تھے ان کی موجودگی میں یہ تصور بھی نہیں کیا جاسکتا کہ کسی جھوٹ نے مجموعہ ہائے احادیث میں اس طرح راہ پالی ہو کہ محدثین اس کی نشان دہی کرنے سے تاصر رہ گئے ہوں۔  
**نقد رواۃ حدیث** | روایان حدیث پر نقد و حرج فن حدیث کا ایک عظیم باب ہے اس کے ذریعے علمائے حدیث نے احادیث صحیحہ و سقیمہ کو باہم ممیز و ممتاز کرنے کا ایسا عظیم الشان کام انجام دیا کہ تاریخ انسانی اس کی مثال پیش کرنے سے تاصر ہے محدثین نے اس سلسلے میں ہمد و سعی کا کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہ کیا انہوں نے تمام روایان حدیث کو جانچا پرکھا ان کی حیات ان کی سیرت حتیٰ کہ انکی عادات تک کا مطالعہ کیا۔ انہوں نے ان کے تمام ظاہری و باطنی امور کا بخوبی جائزہ لیا اس راہ میں انہیں نہ کسی کی ملامت کا خوف دامنیگر ہوا نہ کسی لالچ نے ان کا راستہ روکا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نسبت کیے جانے والے جھوٹ کے قبول کرنے کا تو خیر سوال ہی کیا محدثین نے تو یہاں تک کیا کہ جس راوی کو کسی ایک حدیث میں انہوں نے دروغ گوئی کا ترکیب پایا اس راوی کی باقی احادیث کو بھی انہوں نے مردود قرار دے دیا۔ یہی نہیں محدثین نے اس شخص کی حدیث بھی قبول کرنے سے انکار کر دیا جس کا حدیث

رسول کی روایت میں تو جھوٹ ثابت نہ ہو لیکن دیگر باتوں میں وہ جھوٹ بولنے کا عادی ہو بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر محدثین نے تو احتیاط کی انتہا کر دی اس سے زیادہ احتیاط عقل تصور کرنے سے تاصر ہے انہوں نے ایک اصول کی حیثیت سے یہ طے کر دیا کہ جس شخص نے اپنی پوری زندگی میں ایک مرتبہ بھی دروغ گوئی کا ارتکاب کیا ہو اس کی حدیث قبول نہ کی جائے بھلا کوئی حد ہے احتیاط کی! فلسفہ تاریخ کا ایک مسئلہ مسئلہ ہے کہ جھوٹے کی ہر بات کا جھوٹا ہونا ضروری نہیں عربی میں بھی ایک مقولہ ہے الکذب قد یصدق (جھوٹا بھی کبھی سچ بول دیتا ہے) مگر محدثین کی احتیاط کا عالم ملاحظہ کیجئے کہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے یہ قاعدہ مقرر کر دیا کہ جس شخص کا مدت العمر میں ایک مرتبہ بھی جھوٹ ثابت ہو جائے اس کی کوئی روایت معتبر نہیں۔

اس بات سے بچنے کے لیے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کوئی غلط بات کہیں حدیث کا درجہ حاصل نہ کرے محدثین نے یہاں تک اہتمام کیا کہ اس روای کی روایت بھی قبول کرنے سے انکار کر دیا جس کے بارے میں یہ گمان ہی پیدا ہو گیا کہ شاید بھوٹے سے یا کسی غلطی کی بنا پر یا کم نہی و بد فہمی کے نتیجے میں وہ روایت کی صحت کو برقرار نہ رکھ سکا ہو۔ چنانچہ بالا جماع سلسلہ سند کے ہر راوی کے لیے انہوں نے یہ اصول قرار دے دیا کہ حدیث اس راوی کی قبول کی جائیگی جو :-

- (۱) صحیح الفہم ہو، غبی بد عقل اور بد فہم نہ ہو یعنی جو حدیث کے سمجھنے میں غلطی نہ کرتا ہو۔
- (۲) صحیح الحافظ ہو یعنی جس پر نسیان اور وہم کا غلبہ نہ ہو۔
- (۳) محتاط ہو روایت میں سہل انکاری سے کام نہ لیتا ہو۔

اور تو اور محدثین نے اس راوی کی روایت کو بھی قابل قبول نہیں سمجھا جو فاسق و فاجر اور بدکار ہو حالانکہ ہر بدکردار شخص کا جھوٹا ہونا ضروری نہیں لیکن چونکہ بدکردار شخص کے بارے میں احتمال موجود ہے کہ فسق و فجور کی بنا پر اس کی نگاہ میں حدیث رسول کی روایت میں احتیاط کی اہمیت جس قدر کہ لازم ہے نہ رہی ہو اس لیے اس کی روایت کو بھی معتبر نہیں جانا اور یہ شرط لگادی کہ روایت اس راوی کی قبول کی جائے جو ثقہ اور متقی

ہو نیز محروفت ہو مجہول نہ ہو یعنی اہل علم اور اہل تقویٰ اس کے نام، نسب کردار اور اس کے علم، حفظ اور ثقاہت سے واقف ہوں اور ان کی نظر میں اس کی رفتار و گفتار اس کے حال احوال اور اس کا عام کردار قابل اعتراض نہ ہو۔

اس کے ساتھ ہی محدثین نے روافض کی مرویات کو بھی مردود قرار دے دیا اس لیے کہ روافض وضع حدیث میں پیش پیش تھے بلکہ پس یہ ہے کہ اولین واضح ہی یہ لوگ تھے انہوں نے حضرت علی اور اہل بیت کے فضائل و مناقب پر مشتمل بکثرت حدیثیں وضع کی تھیں چنانچہ محدثین نے یہ اصول بنا دیا کہ روافض کی روایت قبول نہ کی جائے اگرچہ علمائے حدیث نے بعض ایسے شیعہ راویوں کی روایات قبول کی ہیں جو صدق و امانت میں معروف تھے اور ثقیہ کے قائل نہ تھے لیکن محدثین کسی شیعہ راوی کی روایت اس صورت میں بالکل قبول نہیں کرتے جب وہ اپنے مخصوص مسلک کی تائید و حمایت میں کوئی حدیث روایت کر رہا ہو یا اس کا تعلق کسی ایسے گروہ سے ہو جو جھوٹ کو حلال سمجھتا ہے۔ یہی طرز عمل محدثین کا دیگر مبتدعین کے بارے میں بھی ہے کسی ایسے بدعتی کی روایت جو اپنے مسلک کا داعی ہو ان کے نزدیک قابل قبول نہیں۔

وضع حدیث کے اسباب و وجوہ میں سے ایک سبب چونکہ زندقہ بھی تھا، زندقہ سے مراد یہ ہے کہ اسلام کو ایک دین و مذہب کے اعتبار سے بہ نظر کراہت و تحارت دیکھا جائے۔ گروہ زندقہ نے دین حنیف میں بگاڑ پیدا کرنے، عقلا اور مذہب طبقے کی نگاہ میں اس کی وقعت کو کم کرتے اور عوام کے عقائد کو انتہائی پست اور مضحکہ خیز سطح پر لانے کے لیے چونکہ بہت سی حدیثیں وضع کر ڈالی تھیں اس لیے محدثین کو اگر کسی راوی کے بارے میں یہ تحقیق ہو گیا کہ اس کا تعلق گروہ زندقہ سے ہے تو اس کی تمام مرویات کو انہوں نے مردود قرار دے دیا۔

غرض ایک طرف اگر واضعین حدیث تھے تو دوسری طرف محدثین کی مقرر کردہ نقد و رادۃ و رجال کی کسوٹی تھی جس نے کھرے اور کھوٹے کو ایک دوسرے سے علیحدہ کرتے ہیں البتہ محیر العقول کا زمانہ انجام دیا کہ علم سیر و سوانح کی تاریخ میں اسکی نظیر نہیں ملتی۔

**تفنیق متن حدیث** پھر اسی پر اکتفا نہیں راویوں کی جانچ پڑتال کے ساتھ ساتھ محدثین نے متن حدیث میں بھی ایسے علامات کی نشان دہی کر دی

جن سے صاف معلوم ہو جائے کہ کونسی حدیث موضوع ہے اور کونسی نہیں۔ چنانچہ اسوۂ اہل میں سے کوئی امر اگر کسی حدیث میں پایا جائے تو علمائے حدیث کا فیصلہ یہ ہے کہ وہ موضوع ہے۔

(۱) جو حدیث قرآن کی عبارت النص کے خلاف ہو اور قابل تاویل نہ ہو۔

(۲) جو حدیث کسی سنت منواترہ کے خلاف ہو اور اس میں تاویل کی گنجائش نہ ہو۔

(۳) جو حدیث قرآن و سنت سے ماخوذ قواً عامہ کے صریحاً خلاف ہو

(۴) جو حدیث اجماع قطعی یعنی اجماع صحابہ و تابعین کے خلاف ہو اور کسی طرح اس کی توجیہ و تاویل نہ کی جاسکتی ہو۔

(۵) جو حدیث عہد رسالت کے مروت تاریخی حقائق کے خلاف ہو۔

(۶) جو حدیث کسی معمولی کام کے صلے میں مبالغہ آمیز اجر و ثواب کا پتہ دیتی ہو یا اس میں معمولی کام کے مرتکب ہونے پر شدید عذاب کی وعید کا ذکر ہو۔

(۷) جو حدیث کسی ایسے واقعے پر مشتمل ہو جو بہت سے لوگوں کے سامنے وقوع پذیر ہوا ہو اور اس بنا پر اس کا متقاضی ہو کہ بکثرت لوگ اس کو روایت کریں مگر بایں ہمہ صرف ایک ہی راوی اسے روایت کرے۔ یا اس واقعے میں شریک ہونے والے اس کے خلاف اس قدر کثرت سے روایت کریں کہ عقلاً ان کا جھوٹ پر اتفاق کر لینا ممکن ہو۔

(۸) جو حدیث کسی ایسے مضمون پر مشتمل ہو جس کو عقل بدایتاً رد کرتی ہے لیکن اس میں ہر کہ و مہ کی عقل معیار نہیں بلکہ علماء و ماہرین فن حدیث اس کو خلاف عقل قرار دیں۔ محاذ را عرب سے نادائق اور حدیث کے علوم سے بے بہرہ افراد کی رے اس باب میں قطعاً کوئی وزن نہیں رکھتی۔

(۹) جو حدیث ایسے علوم متعارفہ کے مخالف ہو کہ جن کے اصول

مشاہدوں اور بے شمار تجربوں کے بعد قائم کیے گئے ہوں اور ان سے ہمیشہ ایک ہی جیسے ایسے نتیجے برآمد ہوتے ہوں جن میں غلطی کا امکان نہیں ہوتا۔

(۱۰) جو حدیث ایسے مضمون کی حامل ہو جس کا جاننا تمام مکلفین پر فرض ہو اور نہ جاننے کے لیے کوئی عذر بھی نہ ہو مگر بایں ہمہ اس کا زواہت کرنے والا سوائے اس کے اور کوئی نہ ہو۔

(۱۱) جو حدیث ایسے رکیک اور گھٹیا الفاظ پر مشتمل ہو جن کا صدور کسی عام فصیح و بلیغ شخص کی ذات سے متوقع نہ ہو چہ جائیکہ سیدنا نقیہ بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک سے ان کا صدور ہوا لہذا یہ وہاں ہوتا ہے جہاں اس امر کی صراحت کی گئی ہو کہ یہ الفاظ آپؐ نے فرمائے ہیں۔

(۱۲) جو حدیث فساد معنی کی حامل ہو یعنی جس میں ایسا مضمون بیان کیا گیا ہو جو عقلی بدیہیات کی مخالفت ہو اور اس میں تاویل کی گنجائش نہ ہو مثلاً ایسی حدیث جو حکم و اخلاق کے قواعد عامہ کے منافی ہو یا ایسی حدیث جو شہرت و فساد کی موجب ہو۔

(۱۳) جو حدیث خود اپنے راوی کے اقرار کے بموجب موضوع ہو۔

اب منکرین حدیث بتلائیں کہ ان اساسی و اصولی قواعد و ضوابط کے بعد جو محدثین نے متن حدیث کی چھان پٹ، اور با پنج پڑناں کے لیے وضع کیے کیا کوئی امکان اس بات کا رہ جاتا ہے کہ صحیح و غیر صحیح احادیث باہم اس طرح خلط ملط ہو گئی ہوں کہ ان میں باہم امتیاز کرنا دشوار ہو۔ حق یہ ہے کہ نقد رواۃ و رجال کی ان کڑی شرائط کی موجودگی میں جن کا محض ساخا کہ ہم ابھی اوپر پیش کر آئے ہیں اور متن حدیث سے متعلق ان تذکرہ بالا تصریحات و تنقیحات کے ہوتے ہوئے موضوع احادیث کی کثرت جتنی موجود ہے اس سے دو گنی اور چار گنی بھی ہوتی تو کسی اندیشے اور خطرے کی بات نہ ہوتی۔

**خدا داد صلاحت** | علاوہ ازیں اس ضمن میں یہ حقیقت بھی پیش نظر رہنا ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کی حفاظت کے لیے محدثین کو ایک خاص

توفیق و فراست عطا فرمایا تھا جس کے ذریعے ان کو حدیث صحیح اور حدیث موضوع کا فرق بدیہی طور پر نظر آ جاتا تھا۔ حضرات محدثین حدیث کو سنتے ہی بغیر سند کے دیکھے ہوئے سمجھ جاتے تھے کہ یہ ارشاد نبوی ہے یا نہیں چنانچہ انہوں نے اپنی اس خدا داد صلاحت سے



بھی تحقیق و تنقیح حدیث میں خوب خوب کام لیا بسا اوقات ایسا ہوتا کہ محدثین کسی حدیث کو سنتے ہی اس لیے رد کر دیتے کہ ان کی فنی مہارت و بصیرت اس کو قبول کرنے سے انکار ہی ہے۔ محدثین کے یہاں ہمیں اس قسم کے کلمات کی جو بہتات ملتی ہے کہ ”اس حدیث پر تائید کی چھائی ہوئی ہے“ یا ”اس حدیث کو دل تسلیم نہیں کرتا“ یا ”اس حدیث کا متن تائید ہے“ یا ”اس حدیث سے جی مطمئن نہیں“ وغیرہ کچھ تو اس کا سبب ہی ہے کہ کلمات نبویہ کی دن رات مذاکرہ و مزاوت کی وجہ سے کلام نبوی میں غیر بنی کے کلام کی آمیزش کو پہچان لینا ان حضرات کا مزاج بن کر رہ گیا تھا۔ اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں عام زندگی میں ہمیں اس کی مثالیں بہت مل جاتی ہیں۔ شاعری کا ذوق رکھنے والوں کے ساتھ بیٹھ کر دیکھئے وہ شعر سنتے ہی بتا دیں گے کہ یہ کس استاد شاعر کا شعر ہے اگرچہ انہوں نے وہ شعر اس سے پہلے کبھی سنا بھی نہ ہو اس پہچان کی آپ وجہ پوچھیں گے تو وہ یہی بتائیں گے کہ اس شعر بہ فلاں استاد کا رنگ غالب ہے۔ کسی استاد شاعر کے کلام میں دوسرے کسی کلام کی آمیزش کر کے ذرا کسی ایک شخص کو سنا کر دیکھئے جو کم از کم سخن دانوں کی فہرست میں آتا ہو اور صاحب ذوق ہو وہ اس آمیزش کو فوراً پہچان لے گا۔ سبب اس کا بھی وہی ہے کہ اساتذہ کا کلام لگاتار پڑھتے پڑھتے ان کے کلام کا رنگ اس کے مزاج میں رچ بس گیا ہے۔ اسی قسم کا معاملہ فقہاء اور فتویٰ کا کام کرنے والوں کے ساتھ ہے کیونکہ دن رات ان کا واسطہ ائمہ مجتہدین کے اقوال سے ہی رہتا ہے اس لیے وہ طرز کلام ہی سے پہچان لیتے ہیں کہ یہ امام ابو حنیفہ کا قول ہے یا امام شافعی کا یا امام مالک سے کسی اور امام کا۔ یہ تو علمی جواہر پاروں کی بات ہے جو اپنے منہ سے خود لولتے محسوس ہوتے ہیں لوگ پیتر کے بے زبان جواہرات کو ایک نظر دیکھتے ہی پہچان لیتے ہیں کہ کھرا اور اصلی کونسا اور کھوٹا اور نقلی کونسا لہذا محدثین کے بارے میں یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ وہ حدیث کو سنتے ہی بغیر سند دیکھے ہوئے پکار اٹھتے تھے کہ یہ ارشاد نبوی ہے یا نہیں۔

البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ جس طرح شعرا کا کلام پہچاننے کے لیے سخن دان ہونا شرط ہے اور ائمہ کے اقوال میں باہم تمیز کے لیے فقیہ ہونا ضروری ہے یا جس طرح

جو اہرات کی پہچان صرف جوہری ہی کر سکتا ہے اسی طرح احادیث میں کھرا کھوٹا الگ کرنے کے لیے محدث ہونا شرط لازم ہے۔ ہر کس ونا کس اپنے اوپر قیاس کر کے یہ نہیں کہہ سکتا کہ جس طرح ہمیں حدیث صحیح اور حدیث موضوع میں باہم کوئی فرق نظر نہیں آتا اسی طرح محدثین کے لیے بھی یہ باور نہیں کیا جاسکتا کہ وہ موضوع حدیث کو سنتے ہی پہچان لیتے تھے۔ محدثین کرام کا تو معاملہ ہی جُدا ہے، ارشادات نبوی کی دن رات مذاکرت و مزاہلت کے علاوہ نصرت الہیہ بھی ان کے شامل حال تھی۔ اللہ تعالیٰ نے ان سے اپنے دین کی حفاظت کا کام لینا تھا اس لیے ان کو اپنی موبہبت خاصہ سے ایسا خاص فہم عطا فرمادیا تھا کہ وہ اس سے حق اور باطل، ہدایت و ضلالت اور جھوٹ اور سچ میں باسانی تمیز کر لیتے تھے۔ ان کے قلوب حدیث کے لیے آئینہ کا کام دیتے تھے جس میں ارشادات نبوی کے نور کا خود بخود انعکاس ہو جاتا تھا۔ حضرت ربیع بن خیثمہ تابعی فرمایا کرتے تھے :-

<p>صحیح حدیث میں دن کی روشنی کی طرح ایک خاص قسم کی روشنی ہوتی ہے جو پہچانی جاتی ہے اور (موضوع حدیث میں) رات کی تاریکی کی طرح ایک خاص قسم کی تاریکی ہوتی ہے جو ناگہان غور ہو جاتی ہے۔</p>	<p>إِنَّ لِلْحَدِيثِ ضَوْءً كَضَوْءِ النَّهَارِ لَيُحِزُّ وَظَلْمَةً كَظَلْمَةِ الْيَلِّ تَسْكُو (معرفة علوم الحديث، للحاكم وقواعد التحديث للشيخ ابو الحسن حنبل دمشق ۱۳۸ مطبوعه دمشق)۔</p>
--	--

دراصل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام میں ایک خاص عظمت اور جلال ہوتا ہے جو کسی دوسرے کے کلام میں نہیں ہوتا یہ عظمت و جلال محدثین کے گوشت پوست میں پہنچ بس جاتا ہے جس کی بنا پر حدیث صحیح کے الفاظ بلا واسطہ ان کے دل پر جا کر لگتے ہیں۔ قواعد التحديث ہی میں شیخ ابوالحسن حنبلی دمشقی نے خود اپنا ایک واقعہ بیان کیا ہے فرماتے ہیں نے ایک بزرگ کو دیکھا کہ جب کوئی حدیث سنتے تو سنتے ہی بتلا دیتے کہ یہ حدیث صحیح ہے یا موضوع بعد میں تحقیق کرتے تو پتہ لگتا کہ محدثین نے بھی ایسا ہی لکھا ہے ان بزرگ سے دریافت کیا گیا کہ آپ کو یہ کیسے معلوم ہو جاتا ہے کہ فلاں حدیث صحیح ہے اور فلاں موضوع تو انہوں نے جواب دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام میں ایک خاص عظمت اور جلال ہوتا ہے جو دوسرے کے کلام میں نہیں ہوتا اور اسی طرح صحابہ کرام کا کلام دوسروں

کے کلام سے ممتاز ہوتا ہے۔ حافظ ابن قیم سے کسی نے سوال کیا کہ کیا یہ ممکن ہے کہ سند دیکھے بغیر حدیث موضوع کا علم ہو جائے انہوں نے جواب دیا سند کو دیکھے بغیر رہی شخص حدیث کو پہچان سکتا ہے کہ جس کے گوشت پوست میں حدیث سرایت کر چکی ہو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق و عادات اور اوامر و نواہی اور آپ کے محبوبات و مرضیات ہر وقت اس کی نظروں کے سامنے ہوں صرف ایسا ہی شخص حدیث کو سنتے ہی بغیر سند کے دیکھے ہوئے سمجھ جاتا ہے کہ یہ ارشاد نبوی ہے یا نہیں۔

فرون اولیٰ کے محدثین کی تو خیر بات ہی جدا ہے ان کے تو گوشت پوست تک میں واقعی علم حدیث رچ بس گیا تھا آج بھی جو شخص بشرطیکہ عربی زبان پر اسے پورا عبور حاصل تھا حدیث کی اکثر کتابوں کا یا کم از کم صحیحین کا گہری نظر سے مطالعہ کرے گا وہ اس قابل ہو جائے گا کہ نبی کے کلام کو غیر نبی کے کلام سے الگ پہچان لے گا دراصل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی ایک خاص زبان اور اپنا ایک مخصوص طرز بیان ہے جو آپ کی تمام صحیح احادیث میں بالکل یکساں نیت اور یک رنگی کے ساتھ نظر آتا ہے۔ آپ کے کلام میں آپ کی شخصیت بولتی ہوئی محسوس ہوتی ہے اس میں آپ کا بلند منصب مقام جھلکتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ آپ کا انداز تکلم فقروں کی بناوٹ الفاظ کا انتخاب اور طرز بیان سب کچھ ایسی انفرادیت کا حامل ہے کہ کوئی دوسرا اس کی نقل کر ہی نہیں سکتا چنانچہ آپ کی احادیث سے گہرا شعف رکھنے والا صحیح حدیث کو سنتے ہی کہہ اٹھے گا کہ یہ بات محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کوئی دوسرا نہیں کہہ سکتا اسی طرح غیر صحیح حدیث کے بارے میں سند کو دیکھے بغیر فیصلہ دے دیگا کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان نہیں ہے حتیٰ کہ صحیح احادیث میں روایت باللفظ اور روایت بالمعنی کا فرق اسے صاف محسوس ہو جائے گا کیونکہ جہاں راوی نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بات کو اپنے الفاظ میں بیان کیا ہے وہاں آپ کے مخصوص طرز بیان سے واقفیت رکھنے والا فوراً پہچان لے گا کہ یہ خیال اور بیان تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا ہے لیکن زبان آپ کی نہیں ہے۔

ہر حال اول تو حدیث کی سند و واسطے متن کی جانچ پرکھ کے لیے محدثین کے

مرتب کردہ قواعد و ضوابط اس پر مستزاد محدثین کا خدا واد نور فہم و فراست ان دونوں نے مل کر اس کا امکان ہی سرے سے باقی نہ رہنے دیا کہ احادیث میں کسی بھی طور سے صحیح و غیر صحیح اور معتبر و غیر معتبر کے درمیان کوئی اشتباہ و التباس باقی رہ جائے۔

**محدثین کی مساعی کے ثمرات** اللہ تعالیٰ محدثین کرام کی ارواح طیبہ کو ہزار ہا ہزار رحمتوں سے نوازے، یہ انہی کی بدولت ہے

کہ ایک ایک واضح حدیث کا نام آج ہمیں معلوم ہے، کوئی حدیث ایسی نہیں جو موضوع ہو اور ہمارے علم میں آئے سے رہ گئی ہو ہم جانتے ہیں کہ سلیمان بن عمرو الغنی، دیمب العاص، حسین بن علوان، ابوالبحرہ، اسحق بن یحییٰ، ابوداؤد نخعی، ابولیسر احمد بن محمد الفقیہ الموزنی، دہب بن حفص، محمد بن سعید، ابوسعید دامتہی اور محمد بن قاسم الطالقانی یہ سب مشہور و واضع حدیث تھے، ہم احمد جرباری، ابن عکاشہ کرمانی اور ابن تیمم قرطابی جیسے واضعین حدیث کے ناموں سے بھی بخوبی واقف ہیں، ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ عباسی دور کے زنادقہ میں سے عبد الکریم بن ابی الحواری، بیان بن سحمان ہمدی اور محمد بن سعید مصلوب مشہور و واضع تھے۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ ابن یحییٰ مدنی، واقفی، مقاتل بن سلیمان خراسانی، محمد بن مجہد شامی، ترمذی، تریب کے لیے حدیثیں وضع کیا کرتے تھے اور واضعین حدیث کے بارے میں ہمارا یہ سارا علم رہین منت ہے محدثین کرام کی اس سعی و جہد کا جو انہوں نے صحیح و غیر صحیح احادیث کو باہم ملتس ہونے سے بچانے کے لیے انجام دیں۔ محدثین کرام نے صرف و ضائع و بدلین کے ناموں کا ہی انکشاف کرنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ وہ ہمیں ان تمام موضوعات کی بھی اطلاع دے گئے جو ان لوگوں کی ذہنی کاوشوں کا نتیجہ تھیں چنانچہ حدیث کا کوئی طالب علم ایسا نہ ہوگا جو موضوع احادیث کے مشہور مجموعوں الموضوعات لابن جوزی

۱۔ تجدید السلین - ۲۔ ابن خلکان -

۳۔ السنۃ و مکاتبتہا فی التشریح الاسلامی از ذاکر مطلقہ باعی -

۴۔ فتح المغیث -

موضوعات ابن عبدالبر، موضوعات علی تلمیسی اور موضوعات شوقانی کے ناموں سے واقف نہ ہو۔ محدثین کرام نے اس کے علاوہ ان کتابوں کی نشان دہی بھی کر دی ہو۔ نو موضوعات سے پرہیز مثلاً مہندس بصری، ادجیون و دعایتہ، کتاب القضاء علیات اور کتاب الحروف وغیرہ۔ ان تمام معلومات کی موجودگی میں کوئی عقل سے عاری ہی ہوگا جو یہ کہے گا کہ صحیح و غیر صحیح احادیث باہم اس طرح خلط ملط ہیں کہ ان میں امتیاز دشوار ہے۔

غرض موضوع احادیث کی موجودگی کی بنیاد پر منکرین حدیث کا احادیث نبوی کے پورے ذخیرے کو ناقابل اعتبار ٹھہرانا ایک ایسی زالی منطق ہے جو عقل کے کسی بھی معیار پر پوری نہیں اترتی۔ منکرین حدیث کا منشا تو یہ ہے کہ وضع حدیث کے ہمارے حدیث کی حیثیت کو مشکوک بنا دیا جائے لیکن حقیقت یہ ہے کہ وضع حدیث خود بڑی زبردست دلیل ہے حیثیت حدیث کی اس لیے کہ اگر حدیث حجت نہ ہوتی تو وضع حدیث کی ضرورت ہی کیوں پیش آتی۔ وضائین و کذابین اپنے دل سے گھڑی ہوئی باتوں کو حدیث کا نام اسی لیے تو دیتے تھے کہ وہ حدیث کے نام پر قبول کر لی جائیں یوں تو ان کی بات کوئی بھی قبول نہ کرتا مگر لوگوں کے درمیان حدیث کی حیثیت چونکہ مسلم تھی اس لیے وضائین خیال کرتے تھے کہ ہم حدیث کا نام لیں گے تو ہماری بات بھی حجت کے طور پر تسلیم کر لی جائے گی۔ نقل اسی سکے کی گھڑی جاتی ہے جو بازار میں چلتا ہو جس سکے کو بازار میں کوئی قبول ہی نہ کرتا ہو بھلا اس کی نقل بنانے سے کسی کو کیا نائدہ۔ حدیث کا سکہ بازارِ علم میں چلتا تھا تو موضوع احادیث کے نقلی سکے گھڑے جادے تھے مگر جہاں نقلی سکے گھڑنے والے موجود تھے وہاں ایسے ماہر صراف بھی موجود تھے جو جعلی اور اصلی سکوں کی خوب پہچان رکھتے تھے انہوں نے نہ صرف جعلی سکے بنانے والوں کے نام کشت ازبام کر دئے بلکہ ان کے بنائے ہوئے تمام جعلی سکے بھی الگ کر کے رکھ دئے اور آئندہ آنے والوں کے لیے

اس سلسلے میں تمام ضروری معلومات مہیا کر گئے تاکہ کسی بھی مرحلے پر یہ جعلی اور نقلی سکے دوبارہ رواج نہ پاسکیں۔ غرض موضوع احادیث کی موجودگی ذخیرہ احادیث کو مشکوک بنانے کے بجائے اس کے اور زیادہ محفوظ ہونے کا ثبوت مہیا کرتی ہے نیز اس کو و قیع تر بنانے کا موجب ہے۔

**وضع حدیث اور عہد رسالت** | اس سلسلے میں یہ کہنا بھی قطعاً خلاف واقعہ ہے کہ جھوٹی احادیث کا سلسلہ عہد رسالت ہی میں شروع ہو گیا تھا اس کا تو مطلب یہ ہوا کہ صحابہ کرام کی وہ جماعت جس نے اللہ اور اس کے رسول کی خاطر اپنی جانیں قربان کیں، اپنے احوال بے دریغ منشاء کیے، اپنے اعزہ و آماز کو چھوڑا اور اپنے وطن تک کو خیر باد کہہ دیا وہی جماعت اللہ اور اس کے رسول سے بے وفائی کے کام میں اس قدر آگے نکلی گئی تھی کہ جھوٹ گھڑ گھر کر اللہ اور اس کے رسول کی طرف منسوب کرنے لگی تھی؟ بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کسی غلط بات کی نسبت کرنا دراصل اللہ ہی پر جھوٹ باندھنے کے مترادف ہے اور صحابہ کرام سے زیادہ اس حقیقت سے اور کون واقف ہوگا۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے جس سے انکار ممکن نہیں کہ صحابہ کرام دینی احکام کے بید حریص، شریعت کی حفاظت میں انتہائی مستعد اور تبلیغ اسلام کے حذر و جرأت رکھتے تھے انہیں ہر تکلیف اور ہر مصیبت گوارا تھی مگر یہ گوارا نہ تھا کہ دین اسلام کو معمولی سا بھی کوئی نقصان پہنچے ان کے بارے میں یہ تصور تک نہیں کیا جاسکتا کہ وہ از خود دین کو اس حد تک نقصان پہنچانے پر تلی گئے تھے کہ سنت نبوی میں جسے وہ خود دین کی بنیاد تصور کرتے تھے جھوٹ کی آمیزش کر کر کے اسے مشکوک اور کمزور بنانے کا کام انجام دے رہے تھے۔

بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ صحابہ کے لیے حکیم خداوندی کا درجہ رکھتا تھا جس قسم کے ایمان و یقین کی دولت سے صحابہ مالا مال تھے اس کے ہوتے ہوئے بھلا یہ توقع کیسے کی جاسکتی ہے کہ وہ بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کوئی غلط بات منسوب کر سکتے تھے خصوصاً جبکہ وہ بکثرت بار بار زبان نبوی سے

ایسے شخص کے لیے جہنم کی وعید سن چکے تھے، میرا اشارہ اس مشہور حدیث کی طرف ہے جس کے الفاظ ہیں :

مَنْ كَذَبَ عَلَىٰ مُتَعَدٍّ فَلْيَتَبَوَّأْ | جس نے مجھ پر قصداً جھوٹ باندھا ہے چاہیے  
مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ | کہ اپنا ٹھکانہ آگ میں تیار کر لے۔

یہ روایت جملہ کتب حدیث میں موجود ہے جتنے صحابہ سے یہ حدیث مروی ہے مشکل ہی سے چند احادیث اس قدر کثیر التعداد صحابہ سے مروی ہوں گی بعض علمائے حدیث نے اس حدیث کو متواتر قرار دیا ہے تقریباً ستر صحابہ نے اس کو بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے بعض نے اس سے زیادہ راویوں کا دعویٰ کیا ہے۔ بہر حال راویوں کی یہ کثرت اس بات کی دلیل ہے کہ خود بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس بات کو صحابہ کے اذہان میں راسخ کر دینا چاہتے تھے کہ میری طرف غلط بات کی نسبت اللہ کی ناراضگی کو دعوت دینے کے مترادف ہے جس کا لازمی نتیجہ جہنم ہے۔ جہنم کی وعید شاید آج کے مسلمان کے لیے اتنی اہمیت کی حامل نہ ہو لیکن صحابہ کے لیے جہنم کی وعید کوئی معمولی بات نہ تھی یہی وجہ تھی کہ صحابہ کا عالم یہ تھا کہ حدیث سنانے وقت کانپ کانپ اٹھتے اور اس خوف سے کہ کہیں کوئی غلط بات بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب نہ ہو جائے حدیث کے الفاظ دوہرا کر فوراً کہتے اس سے کم یا اس سے زیادہ یا اسکے مشابہ غرض بغیر یہی طور پر یہ نہ کہتے کہ آپ کی کہی ہوئی حدیث کے الفاظ بعینہ یہی ہیں کبھی حدیث سنا کر کہتے او کھا قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا جیسا بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہو (بعض صحابہ کا یہ دستور تھا کہ کوئی حدیث سنانے سے قبل متذکرہ بالا مَنْ كَذَبَ عَلَىٰ والی حدیث ایک ضرور دوہراتے تاکہ متعلقہ وعید ذہن میں ایک بار پھر تازہ ہو جائے اور لا پرواہی سے بھی کسی غلط بات کی نسبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نہ ہو جائے۔ امام احمد بن حنبل اپنی مسند میں راوی ہیں کہ ذیفرہ حدیث کے سب سے بڑے راوی حضرت ابو ہریرہ کا تو یہ دوامی قاعدہ بن گیا تھا کہ

جس وقت اپنی حدیث ثانی شروع کرتے تو کہتے  
فرمایا رسول اللہ صادق و مصدوق ابوالقاسم صلی  
اللہ علیہ وسلم نے جس نے مجھ پر قصداً جھوٹ باندھا  
اسے چاہیے کہ وہ اپنا ٹھکانہ آگ میں بنالے ۔

يَبْدَأُ بِحَدِيثِهِ بَانَ يَقُولُ قَالَ رَسُولُ  
اللَّهِ الصَّادِقُ الْمَصْدُوقُ ابُو الْقَاسِمِ  
صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ كَذِبٍ عَلَى مَتَعَمَلًا  
فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ ۔

حضرت علی فرمایا کرتے تھے مجھے یہ گوارا ہے کہ مجھ پر آسمان پھٹ پرٹے یہ نسبت اس کے  
کہ میں آپ کی طرف اس بات کا انتساب کروں جو آپ نے نہیں کی ۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ  
سے خاصی تعداد میں احادیث مروی ہیں لیکن معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں کو پھر بھی آپ سے کمی  
روایت کی تسکایت تھی کیونکہ آپ فرمایا کرتے تھے :

بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کو میں کثرت  
سے جو بیان نہیں کرتا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ  
مَنْ تَعَدَّدَ دَالَ رَوَايَتِمْ مَجْهُوٌّ كَوَاسٍ نَحْوَهُ رَوَيْتِي هِيَ ۔

إِنِّي لَيَمْنَعُنِي أَنْ أُحَدِّثَ حَدِيثًا  
كَثِيرًا أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ  
وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ تَعَدَّدَ عَلَى كَذِبَائِي

(طبرانی)

ظاہر ہے روایت کی کثرت میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کو اسی بات کا اندیشہ تھا کہ کہیں بنی کریم  
صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کوئی غلط بات منسوب نہ ہو جائے اسی طرح حضرت زبیر رضی اللہ عنہ  
کے بارے میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ ان کے بیٹے حضرت عبد اللہ نے ان سے پوچھا کہ جس  
طرح فلاں فلاں صحابی بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں کثرت سے روایت کرتے ہیں آپ  
کو میں نے اس طرح کبھی روایت کرتے نہیں سنا حضرت زبیر نے جواب میں فرمایا :

آگاہ رہوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے  
جدا نہیں ہوا لیکن (بات یہ ہے کہ) میں نے آپ  
کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جو شخص مجھ پر جھوٹ باندھ  
اسے چاہیے کہ اپنا ٹھکانہ آگ میں تیار کر لے ۔

أَمَّا إِنِّي لَمْ أَفَارِقْهُ وَلَكِنْ  
مَعَهُ يَقُولُ مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ  
فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ  
(بخاری کتاب العلم)



گویا وہی خوفِ بوا بھی حضرت انس سے روایت ہوا حضرت زبیر کو بھی کثرتِ روایت سے روکے ہوئے تھا بعض صحابہ نے اپنی کبر سنی کے زمانے میں صرف اس لیے روایت کرنا ترک کر دیا تھا کہ کہیں بڑھاپے کی وجہ سے کوئی سہونہ ہو جائے لوگ ان سے روایت کی درخواست کرتے تو فرماتے :

<p>ہم بوڑھے ہو گئے اور تھوڑے گئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر کے حدیث بیان کرنا بڑا سخت معاملہ ہے۔</p>	<p>كَبُرْنَا وَلَيْسَنَا بِالْحَدِيثِ عَنْهُ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَشَدِيدٍ (ابن ماجہ)</p>
--	---

غرض جن حضرات کا روایت حدیث میں احتیاط کا یہ عالم ہوا ان کے بارے میں کوئی کیسے یقین کرے کہ وہ اپنی طرف سے جھوٹ گھڑ گھڑ کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرنے کے قبیح ترین کام میں مشغول تھے کوئی عقل سے عاری ہی ہو گا جو صحابہ کے بارے میں اس قسم کا گمان کرے گا۔

**عجیب استدلال** | حیرت ہوتی ہے منکرین حدیث کے طرزِ استدلال پر انہوں نے اپنے حق میں اسی من کذب عنی متعمداً والی حدیث سے دلیل پکڑی ہے یعنی جو حدیث اس بات کی دلیل تھی کہ صحابہ کرام نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کسی غلط بات کے انتساب کی جزأت ہی نہیں کر سکتے تھے اسی حاشیہ کو انہوں نے اپنے اس دعوے کی دلیل بنایا کہ صحابہ معاذ اللہ جھوٹی حدیثیں بیان کیا کرتے تھے۔ منکرین حدیث کا کہنا یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک پر یہ متذکرہ بالا حدیث بار بار آتی ہی اسی لیے تھی کہ آپ کی طرف غلط باتوں کا انتساب ہونے لگا تھا۔ اگر آپ کی طرف منسوب کر کے غلط باتیں بیان نہ کی جا رہی ہوتیں تو آپ کو یہ کہنے کی ضرورت ہی پیش نہ آتی کہ جو شخص جان بوجھ کر میری طرف جھوٹ کی نسبت کرے گا وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنا لے۔ آپ کو بار بار یہ وعید سنانے کی ضرورت پیش آتا منکرین حدیث کے نزدیک دلیل ہے اس بات کی کہ آپ کی طرف جھوٹ کا انتساب ہونے لگا تھا۔ اپنی اس دلیل کی تائید میں وہ عہد رسالت کا ایک واقعہ بھی نقل کرتے ہیں ہم اس واقعے کی اصلیت تو بعد میں واضح کریں گے، ہمیں اسی سے

پہلے دراصل یہ دیکھنا چاہیے کہ یہ من کذب علیٰ والی حدیث بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کس کس سیاق و سباق کے ساتھ روایت کی گئی ہے۔ اگر منکرین حدیث کا استدلال درست ہے تو اس حدیث کو لازماً ایسے ہی سیاق و سباق کیساتھ روایت ہوتا چاہیے جس سے معلوم ہو کہ بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کوئی ایسا جھوٹ آیا جو آپ کی طرف نسبت کر دیا گیا تھا اس کی تردید کرنے ہوئے آپ نے ایسے دروغ بانوں کے لیے جہنم کی وعید سنائی اور اگر سیاق و سباق اس سے مختلف ہو تو پھر منکرین حدیث کا استدلال یقیناً بے بنیاد ٹھہرے گا۔

**مختلف مرویات کا جائزہ** | جیسا کہ ہم نے ابھی اوپر ذکر کیا یوں تو یہ جھوٹ کی نسبت والی حدیث مستشرقین سے زیادہ صحابہ کرام سے مرئی ہے مگر اس

حدیث کے مشہور راویوں میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص حضرت ابو ہریرہ حضرت ابوسعید خدری حضرت علی بن ابی طالب حضرت انس بن مالک حضرت میسرہ بن شعبہ حضرت عبداللہ بن مسعود حضرت جابر بن عبداللہ حضرت ابو قتادہ اور حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہم اجمعین کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔

آئیے ان سب حضرات کی مرویات کا جائزہ لیں حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص کی روایت امام بخاری نے کتاب الانبیاء میں نقل کی ہے۔ اس روایت کے الفاظ یہ ہیں:

<p>بني كريم صلى الله عليه وسلم نے فرمایا میری بات دوسروں تک پہنچا دو خواہ وہ ایک ہی آیت ہو اور بنی اسرائیل کے واقعات (اگر تم چاہو تو) بیان کرو اس میں کوئی حرج نہیں اور جس نے مجھ پر قصداً جھوٹ بولا اسے چاہیے کہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنا لے۔</p>	<p>أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ بَلِّغُوا عَنِّي وَلَوْ آيَةً وَحَدَّثُوا عَنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ وَلَا حَوَجَّ وَمَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَدًّا فَلْيَسْتَبِقُوا مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ۔ (بخاری کتاب الانبیاء باب ما ذکر عن بنی اسرائیل)۔</p>
--	--

اس روایت کا سباق صاف بتلا رہا ہے کہ زیر بحث دروغ بانی سے متعلق حدیث بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت ارشاد فرمائی جب آپ لوگوں کو اپنی احادیث دوسروں تک پہنچانے کی تلقین فرما رہے تھے گویا آپ تبلیغ احادیث کی تلقین کرتے وقت مخاطب کو یہ

ذہن نشین کرانا چاہتے تھے کہ دیکھنا یہ کام بڑی ذمہ داری کا ہے اس میں اگر ذرا سی بے احتیاطی سے کسی غلط بات کی نسبت میری طرف ہو گئی تو بجائے ثواب کے اللہ عذاب نہ کما بیٹھتا۔

حضرت ابو ہریرہ کی روایت کو امام بخاری کتاب العلم میں لائے ہیں۔ اس کے الفاظ

اس طرح ہیں :

تَسْمَعُوا بِأُسَى وَلَا تَكْتُمُوا بِكُنْهِي  
وَمَنْ رَأَى فِي الْمَنَامِ فَقَدْ رَأَى  
فَإِنَّ الشَّيْطَانَ لَا يَتَمَثَّلُ فِي  
صُورَتِي وَمَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَدًّا فَلْيَتَوَّأ  
مَقْعِدُهُ مِنَ النَّارِ (بخاری کتاب العلم باب  
أَنَّمَنْ كَذَبَ عَلَيَّ النَّبِيِّ)۔

میرے نام پر نام رکھ لو مگر میری کینت (پرکنت) نہ رکھو جس نے مجھے خواب میں دیکھا اس نے یقیناً مجھے دیکھ لیا اس لیے کہ شیطان میری صورت اختیار نہیں کر سکتا اور جو شخص قصداً مجھ پر جھوٹ باندھ تو اسے چاہیے کہ اپنا ٹھکانہ آگ میں بنالے۔

اس روایت میں بھی کوئی ایسی بات نہیں جس سے یہ گمان کیا جاسکے کہ آپ کی جانب کسی دروغ کی نسبت کا کوئی واقعہ پیش آیا تھا جس سے متاثر ہو کر آپ کو جہنم کی یہ حند کرہ و عید سنانی پڑی تھی بلکہ اس حدیث کے الفاظ صحت بتلا رہے ہیں کہ اس سے مقصود جھوٹ کی نسبت سے استرازہ کو جو کہ بنانا ہے یعنی کوئی شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا نام لے کر اگر جھوٹی خبر اب تک بھی بیان کرے گا تو وہ بھی گویا اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنائے گا۔

اس دروغ کی نسبت والی حدیث کے تیسرے مشہور راوی حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ ہیں۔ ان کی روایت کو ہم امام مسلم سے نقل کرتے ہیں، امام مسلم نے اسے کتاب الزہد والرفاق میں بیان کیا ہے یہ پوری روایت اس طرح پر ہے :

لَا تَكْتُمُوا عَنِّيْ وَمَنْ كَتَبَ عَنِّيْ  
غَيْرَ الْقُرْآنِ فَلَيْمَّةٌ وَحَدَّثُوا عَنِّيْ  
وَلَا حَرَجَ وَمَنْ كَذَبَ عَلَيَّ قَالَ هَامُ  
أَحْسِبُهُ قَالَ مُتَعَدًّا فَلْيَتَوَّأ مَقْعِدَهُ

میرا کلام مت لکھو اور جس نے مجھ سے سن کر قرآن کے علاوہ کچھ لکھا ہے وہ اسے شاد سے البتہ میری احادیث (حافظے سے) بیان کرو اس میں کوئی حرج نہیں اور جو مجھ پر جھوٹ باندھے حرام (درمیان کے

من النار (مسلم کتاب الزہد باب | ایک راوی کا کہنا ہے میرا خیال ہے آپؐ نے فرمایا  
تثبت فی الحدیث)۔ | قصداً جھوٹ باندھے وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنا۔

اس روایت کے بارے میں اس تصریح کی تو ضرورت نہیں کہ یہ کتاب حدیث سے مماثلت کا حکم ابتدا میں تھا بعد میں کتابت کی اجازت دے دی گئی تھی اس پر تفصیلی بحث اس کتاب کے پہلے حصے میں کتابت حدیث اور صحابہ کے عنوان کے تحت دے دی گئی ہے وہاں مراجعت کی جا سکتی ہے بہر حال اس وقت تو ہمیں یہ عرض کرنا ہے کہ حضرت ابو سعید خدریؓ کی اس روایت میں جھوٹ کی نسبت کا ذکر جس حوالے سے آیا ہے اس کا منشاء حفظ حدیث پر زور دینا ہے اس تاکید کے ساتھ کہ احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑے اور یاد کی ہوئی حدیث روایت کرتے وقت اس بات کا خیال رہے کہ کوئی غلط بات نہ کہیم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب نہ ہو جائے۔ اس روایت میں بھی جھوٹ کی نسبت سے متعلق کسی واقعے کے وقوع میں آنے کا کوئی اشارہ ناک موجود نہیں۔

حضرت علی بن ابی طالب کی روایت ہم تمدنی سے لیتے ہیں۔ اس روایت کے

الفاظ یہ ہیں :

لَا تَذِیْبُوا عَلٰی فَاِنَّهُ مِّنْ كَذِبٍ عَلٰی | مجھ پر جھوٹ نہ باندھو اس لیے کہ میں نے حق پر  
یَلِجُ النَّارَ (ترمذی کتاب العلم باب فی تعظیم | جھوٹ باندھا وہ دوزخ میں داخل ہوگا۔  
الکذب علی رسول اللہ)۔

ظاہر ہے اس روایت میں بھی کوئی ایسا اشارہ موجود نہیں جس سے منکرین حدیث کے موقف کی تائید ہو سکے۔ اسی طرح حضرت انس بن مالک، حضرت مغیرہ بن شعبہ، حضرت سمرہ بن جندب، حضرت عبداللہ بن مسعود اور حضرت بایز بن عبد اللہ کی روایات کا بھی یہی حال ہے ان حضرات کی روایات کے الفاظ بھی بالکل واضح ہیں اور ہر ایسے حوالے سے خالی ہیں جو کسی طبعی منکرین حدیث کے موقف کے حق میں جتنا ہو۔ حضرت انس بن مالک کی روایت یہ ہے :

مِنْ كَذِبٍ عَلٰی حَسِبْتُ اَنَّهُ قَالَ | جو شخص مجھ پر جھوٹ باندھے میرا گمان ہے آپؐ  
نے قصداً (کا لفظ بھی) فرمایا

متعدداً فليتبوا مقعده من النار | وہ اپنا ٹھکانہ آگ میں بنا لے۔  
(ترمذی کتاب العلم باب فی تعظیم الکذب)۔

حضرت میسر بن شعبہ اور حضرت سمرہ بن جندب اس حدیث کی روایت میں متشدد اللفظ ہیں ان کی روایت کے الفاظ یہ ہیں :

من حدث عني حديثاً وهو يراني | جو شخص مجھ سے کوئی حدیث روایت کرے یہ  
انه كاذب فهو احد الكاذبين | جانتے بوجھتے کہ وہ جھوٹ ہے تو وہ جھوٹوں  
(ترمذی کتاب العلم باب فی تعظیم الکذب)۔ | میں کا ایک جھوٹا ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود اور حضرت جابر بن عبداللہ بھی اس حدیث کی روایت میں متشدد اللفظ ہیں ان دونوں نے اسے صریحاً ذیل الفاظ میں روایت کیا ہے :

من كذب عليّ متعدداً فليتبوا | جس شخص نے جان بوجھ کر مجھ پر جھوٹ باندھا وہ  
مقعده من النار (ترمذی کتاب العلم | اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنا لے۔  
باب فی تعظیم الکذب)۔

ان پانچوں حضرات کی روایتوں میں بھی قارئین نے دیکھ لیا کوئی ایسا قرینہ موجود نہیں جس سے یہ اشارہ ملتا ہو کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حدیث ایسے موقع پر ارشاد فرمائی جب آپ ﷺ علم میں کوئی ایسا واقعہ لیا گیا جس میں کسی نے کسی غلط بات کی نسبت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب کر دی تھی اور آپ ﷺ اس کی روک تھام کے لیے یہ جہنم کی وعید لوگوں کو سننا رہے تھے۔ اب اس حدیث کے قایل ذکر راویوں میں صرف حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ کی روایت رہ گئی ہے وہ بھی ملاحظہ ہو۔ حضرت ابوقتادہ کی روایت ہے :

سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول على هذا المنبر إياكم وكثرة الحديث عني فمن قال عليّ فليقتل سقاً | میں نے اسی منبر پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ تم مجھ سے بہت زیادہ حدیث روایت کرنے سے پرہیز کرو مجھ سے جو شخص بھی روایت کرے اسے چاہیے کہ حق اور

پسج کے اور جو شخص عجب پر وہ بات باندھے  
جو میں نے نہیں کہی تو وہ اپنا ٹھکانہ جہنم  
میں بنائے۔

اَوْ صَدَقًا وَمَنْ تَقَوَّلَ عَلٰی مَا لَمْ  
اَقْلُ فَلْيَتَّبِعْهُ مَقْعَدُهُ مِنَ النَّارِ  
(ابن ماجہ - باب التغلیظ فی تعدد الکذب  
علی رسول اللہ -)

یہ روایت تو اپنے مفہوم میں بالکل ہی واضح ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کثرت روایت سے پرہیز  
کرنے کی تاکید فرما رہے ہیں اور اس ممانعت کی توجیہ کے طور پر مخاطب کو یہ ذہن نشین کرانا  
چاہتے ہیں کہ کثرت روایت کی صورت میں ممکن ہے کہ کوئی غلط بات میری طرف منسوب ہو  
جلے اور راوی کے لیے جہنم کی آگ کا سبب بن جائے۔

اس سلسلے کی ایک اور قابل ذکر روایت وہ ہے جس کو امام ابو جعفر طحاوی نے مشکل الآثار  
میں اپنی متصل سند کے ساتھ نقل کیا ہے۔ اس روایت کا ما حاصل یہ ہے کہ کسی مجلس میں ایک  
صاحب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر کے ایک حدیث بیان کی، حضرت  
مالک بن عبادہ رضی اللہ عنہ بھی اس مجلس میں موجود تھے انہوں نے سن کر فرمایا کہ حجۃ الوداع کے  
موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم لوگوں سے یہ عہد لیا تھا کہ

تم پر لازم ہے کہ تم قرآن کو تھامے رہو تم غفریب  
ایسے لوگوں کے پاس واپس کیے جاؤ گے جو چاہیں گے  
کہ میری حدیث ان سے بیان کی جائے لہذا جس کسی  
نے میری بات کو سمجھ لیا ہے اور یاد کر لیا ہے اسے چاہیے  
کہ حدیث بیان کرے اور (یاد رکھو) جو شخص تصداً  
میری طرف جھوٹ منسوب کرے گا وہ اپنا ٹھکانہ یا  
(فرمایا) اپنا گھر جہنم میں بنائے۔

علیکم بالقرآن وَاِتَّكَمَ سَتْرَیْکُمْ  
اِلٰی قَوْمٍ یَّشْتَمُوْنَ الْحَدِیْثَ عَنِّیْ فَمَنْ  
عَقِلَ شَیْئًا فَلْیَحْذَرْهُ وَمَنْ اَفْتَرٰی  
عَلٰی فَلْیَتَّبِعْهُ اَوْ مَقْعَدًا فِی  
جَهَنَّمَ۔ (مشکل الآثار جلد ۱ ص ۱۶۱)۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس حقیقت سے بخوبی آگاہ تھے کہ غفریب اسلام اطراف و اکناف عالم  
میں پھیلے گا اور مختلف اقوام کے لوگ جو حق و باطل اسلام میں داخل ہوں گے اور آپ کی صحبت کے  
شرف سے محروم ہونے کی بنا پر آپ کے ارشادات سننے کے بہت زیادہ شائق ہوں گے ایسی صورت

میں ممکن ہے کثرت روایت کی بنا پر احتیاط کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جائے اس لیے صحابہ کو آپؐ نے متنبہ کر دیا کہ دیکھنا روایت حدیث میں احتیاط سے کام لینا اگر میری حدیث خوب یاد ہو تو ضرور روایت کرنا اگر کوئی شک ہو تو روایت سے احتراز ہی کرنا لہذا یہ ہو کوئی غلط بات میری طرف منسوب ہو جائے۔ اس روایت کے بارے میں بھی کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ حدیث آپؐ نے اس وقت ارشاد فرمائی جب کسی نے آپؐ پر جھوٹ باندھا تھا۔

غرض اس من کذب علیؑ والی حدیث سے متعلق جتنی بھی قابل ذکر روایتیں ہیں ان میں سے کسی ایک روایت میں بھی کوئی ایسا قرینہ موجود نہیں جس کی بنیاد پر منکرین حدیث کا یہ استدلال درست سمجھا جاسکے کہ یہ جھوٹ کی نسبت والی حدیث ارشاد فرمانے کی ضرورت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو پیش ہی اس لیے آئی تھی کہ آپؐ کی طرف آپؐ کے عہد ہی میں جھوٹ کی نسبت ہونے لگی تھی اس کے بالمقابل تمام قابل ذکر روایتیں اس بات کی شاہد ہیں کہ مذکورہ زیر بحث حدیث یا تو آپؐ نے اس وقت ارشاد فرمائی جب اپنی احادیث دوسروں تک پہنچانے کا آپؐ نے صحابہ کو حکم دیا یا اس وقت ارشاد فرمائی جب کثرت روایت کی صورت میں احتیاط کا پہلو مد نظر رکھنے کی آپؐ نے تلقین فرمائی۔

**کذب علیؑ البنی سے متعلق ایک واقعہ** | منکرین حدیث اپنے استدلال کی تائید میں عہد رسالت کا جو واقعہ پیش کیا کرتے ہیں مناسب

معلوم ہوتا ہے کہ اس کی بھی اصل حقیقت تاریکین کے سامنے لے آئی جائے تاکہ اصل صورت حال کو سمجھنے میں کسی قسم کا کوئی اشتباہ باقی نہ رہے۔ یہ واقعہ امام طحاوی نے شکل آثار میں حضرت بریدہؓ سے اور طبرانی نے الاوسط میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص سے روایت کیا ہے اسی واقعے کا لب لباب یہ ہے کہ جاہلیت کے زمانے میں ایک شخص مضافات مدینہ کے ایک قبیلے کی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا تھا مگر لڑکی والوں نے انکار کر دیا تھا ہجرت کے بعد ابتدائی زمانے میں ہی وہ شخص ایک حملہ پہنچے ہوئے اس قبیلے میں پہنچا اور جا کر اس نے لڑکی والوں سے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے حکم دیا ہے کہ فلاں معاملے میں اپنا فیصلہ صادر کروں (یہاں طبرانی کے الفاظ ہیں کہ رسول اللہ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں جس گھر میں جا ہوں چلا

جاؤں) گھر والوں نے اسے بٹھایا اور بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے حقیقت حال دریافت کی آپ نے فرمایا ”دشمن خدا سے بھوٹ بولا پھر آپ نے ایک آدمی کو حکم دیا (طبرانی نے یہاں حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کے نام لیے ہیں) کہ جاؤ اگر اسے زندہ پاؤ تو قتل کر دو اور اگر مردہ پاؤ تو اس کی لاش جلاؤ اور وہ آدمی وہاں پہنچا تو پستہ چلا کہ مجرم سانپ کے ڈسنے سے مر چکا ہے چنانچہ حکم نبوی کے مطابق اس کی لاش جلا ڈالی گئی وہ آدمی واپس خدمت نبوی میں حاضر ہوا تو آپ نے فرمایا ”جس نے مجھ پر جھوٹ باندھا وہ اپنا ٹھکانہ آگ میں بنائے۔“

اس واقعے کے بارے میں ہیں جنکرین حدیث سے سب سے پہلے یہ پوچھنا ہے کہ پوسٹ ذیقرہ حدیث سے تمام صحیح احادیث کو چھوڑ کر ان کی نظر انہی دو روایتوں پر کیوں پڑی جن کی سند بھی ضعیف ہے اور متن بھی منکر ہے کہاں تو منکرین حدیث کا یہ موقف کہ موضوع احادیث کی موجودگی کی بنا پر صحیح احادیث بھی مشکوک ہو گئیں اور قابل حجت نہیں رہیں اور کہاں یہ حال کہ ان روایات کو حجت کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے جن میں موضوع ہونے کی علامات بہت نمایاں ہیں آخر اس دورنگی کی کیا توجیہ ہے۔ ایک طرف منکرین حدیث محدثین پر الزام لگاتے ہیں کہ وہ روایت کی چھان پھٹک ہی میں لگے رہے درایت کی طرف کوئی توجہ نہیں دی اور دوسری طرف اپنی مطلب برآری کے لیے ایسی روایت سے دلیل پکڑتے ہیں جس کا متن ایک عامی آدمی بھی دیکھتے ہی کہہ اُٹھے گا کہ منکر ہے بھلا بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ آپ مردوں کو جلانے کا حکم صادر کریں؟

متن کے منکر ہونے کے علاوہ ان دونوں روایتوں کی تو سند بھی ضعیف ہے ان کے راویوں میں سے بعض راوی ایسے ہیں جن کی روایت قبول نہیں کی جاتی یہی وجہ ہے کہ امام بخاری نے اس قصہ کو موضوع اور خود ساختہ کہا ہے۔ نیز مشہور محدث عبداللہ بن عدی نے اس واقعہ کو اپنی کتاب ”الکامل فی معرفۃ الضعفاء والمتروکین“ میں لیا ہے جو خود دلیل ہے اس واقعے کے راویوں کے ضعیف اور متروک الروایت ہونے کی۔



علامہ انبیا ان دونوں روایتوں کو اگر صحیح بھی فرض کر لیا جائے تو ان سے زیادہ سے زیادہ جو کچھ ثابت ہوتا ہے وہ صرف اتنا ہے کہ ایک دینیوی کام کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ایک ایسے جھوٹ کی نسبت کی گئی تھی جو صرف دروغ گو کی ذات تک محدود تھا۔ ان روایتوں سے یہ کسی طرح ثابت نہیں ہوتا کہ دین کے کسی معاملے سے متعلق کوئی حدیث گھڑ کر عام مسلمانوں کے سامنے اسے حدیث رسول کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہو۔ کہاں ایک خالصتاً دینیوی معاملے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا جھوٹا حوالہ دے کر کسی شخص کا صرف اپنی ذات کو قائدہ ہو چانے کی کوشش کرنا اور کہاں دینی معاملات میں وضع حدیث کا ارتکاب کر کے پورے دین میں رخنہ اندازی کا موجب بننا ان دونوں باتوں کو ایک دوسرے پر قیاس کر کے یہ حکم ہرگز نہیں لگایا جاسکتا کہ عہد رسالت ہی میں وضع حدیث کا آغاز ہو گیا تھا۔ مزید برآں ان دونوں روایتوں میں جو واقعہ بیان کیا گیا ہے وہ اپنی نوعیت کا ایک ہی واقعہ ہے دوسرا کوئی واقعہ منکرین حدیث بھی اس ضمن میں پیش نہیں کر سکے صرف اس ایک واقعے کی بنیاد پر یہ کلیہ قائم کر لینا کہاں کا انصاف ہے کہ عہد رسالت ہی میں موضوع احادیث گھڑی جاتے لگی تھیں۔

منکرین حدیث نے اتنا بھی نہ سوچا کہ دونوں روایتوں میں اس شخص کا نام نہیں بتایا گیا جس نے یہ جھوٹ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کیا تھا اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ جھوٹ بولنے والا کوئی مجہول اور غیر معروف شخص تھا۔ ایک مجہول اور غیر معروف شخص کے ایک جھوٹ کی بنا پر صحابہ کی پوری جماعت کی صداقت کو آخر کس دلیل سے مشکوک ٹھہرایا جاسکتا ہے؟ عہد رسالت میں وضع حدیث کے آغاز کا دعویٰ کرنا صحابہ کرام کی صداقت کو مشکوک ٹھہرانا ہے جو بلاشبہ آسمان پر خاک ڈالنے کے مترادف ہے اس لیے کہ صحابہ کرام کی عدالت علی الاطلاق سے صرف وہی انکار کر سکتا ہے جو عقل کی نعمت سے محروم ہو یا جس نے انکار حق پر کمر باندھ رکھی ہو۔ غرض منکرین حدیث کے پاس اپنے اس دعوے کی کوئی دلیل نہیں کہ وضع حدیث کا آغاز عہد رسالت ہی میں ہو گیا تھا۔ اب رہا یہ سوال کہ پھر وضع حدیث کا

آغاز ہوا کب؟ تو اس کی اصل حقیقت بھی سن لیجئے۔

**وضع حدیث کا اصل نقطہ آغاز** | وضع حدیث کی داغ بیل دراصل اس وقت پڑی جب حضرت عثمان کی شہادت کے بعد

حضرت علی اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما کے درمیان اختلافات نے سراٹھایا اور سپاہیوں کی سازش کے نتیجے میں ان کے باہمی اختلافات کو حرب و پیکار کی صورت دے دی گئی۔ جس کا انجام یہ ہوا کہ اہل اسلام چھوٹے چھوٹے فرقوں اور گروہوں میں بٹ گئے۔ اس تفرقہ بازی کا سب سے زیادہ افسوسناک پہلو یہ تھا کہ سیاسی اختلافات کو دینی رنگ دے دیا گیا اور سنت نبوی کو سیاسی اغراض اور داخلی انقسامات کے لیے آلہ کار کے طور پر استعمال کیا جانے لگا۔ بعض فرقے اپنے افکار و آراء کی تائید میں حدیثیں گھڑنے لگے اولین عنوان جس کو وضع حدیث کی آماجگاہ قرار دیا گیا فضائل اشخاص و رجال تھا لوگوں نے اپنے ائمہ اور قائدین کے فضائل و مناقب پر مشتمل حدیثیں وضع کرنا شروع کیں۔ مشہور شیعہ عالم ابن ابی الحدید شرح نہج البلاغۃ میں لکھتے ہیں:

”نوب جان لیجئے کہ فضائل و مناقب پر مشتمل احادیث میں

اصل جھوٹ شیعہ کی جانب سے آیا ہے“ (شرح نہج البلاغۃ جلد ۲ ص ۱۳۸)

معلوم ہوا کہ وضع حدیث کی ابتدا کرنے والے شیعہ تھے۔ ان لوگوں نے جس طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ اور اہل بیت کے فضائل و مناقب کے بارے میں حدیثیں وضع کی تھیں اسی طرح صحابہ خصوصاً صحابہ کبار اور شیخین جناب ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کے بے بنیاد معائب و مثالب پر مشتمل حدیثیں بھی وضع کر ڈالی تھیں اس قسم کی موضوعات کے بارے میں ابن ابی الحدید ہی رقم طراز ہے:

”شیعہ جن ناپسندہ اور گھناؤنے اور کھلم کھلا کرتے ہیں ہماری

اصحاب (شیعہ) کے نزدیک ان کی کوئی اصل و اساس نہیں

محدثین نے نہ اس کو رعایت کیا ہے اور نہ اس کو پہچانتے ہیں یہ

ایک ایسی بات ہے کہ شیعہ اس کی نقل و روایت میں منفر د ہیں“

(شرح نہج البلاغۃ جلد ۱ ص ۱۳۵)

شیعہ نے فی الحقیقت اپنے جذبات و احساسات کی تسکین کی خاطر اس کی کوئی پرواہ نہ کی کہ وہ بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جھوٹ منسوب کرنے کے سنگین جرم کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ شیعہ کی اس جہالت کو دراصل اس پس منظر میں دیکھنا چاہیے کہ یہ لوگ فارسی الاصل تھے بنظائر تو یہ اسلام کے دائرے میں آگئے تھے مگر اپنے وطنی و آبائی مذاہب کے اثرات کو قلب ذہن سے نکال باہر کرنا ان کے بس کا روگ نہ تھا۔ یہ لوگ بدستور بت پرستانہ لہجہ میں گرفتار تھے بنا بریں بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ باندھنا ان کے نزدیک کوئی بڑی بات نہ تھی اس سے ان کے دلوں میں پورے شیعہ جذبات کو تسکین ملتی تھی۔

اس کے علاوہ یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ یہ لوگ مشہور یہودی عبداللہ بن سبا کی جیسے کامیوں کا شکار ہو گئے تھے۔ عبداللہ بن سبا نے اسلام کے شیرازے کو درہم برہم کرنے کے لیے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق تشیع کا لبادہ اوڑھ رکھا تھا اس کے پیروکاروں میں اکثریت تو ان لوگوں کی تھی جو اس کے مخصوص مشن سے پوری طرح واقف تھے اور وہ خود بھی اسلام کو پھلتے پھولتے دیکھنا پسند نہ کرتے تھے مگر کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو لاعلمی میں اس کے دام فریب میں پھنس گئے تھے۔ سبائیوں کا صرف ایک ہی مقصود تھا اور وہ یہ کہ صحابیت کی قوت کو جس قدر بھی کمزور کیا جاسکے کیا جائے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ عرب کے دس لاکھ مربع میل پر پھیلے ہوئے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زندگی میں جس اقتدار کے حاصل کرنے میں اسلام کامیاب ہوا تھا یا پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بعد چند ہی سالوں میں اسلام نے جو روئے زمین کی سب سے بڑی سیاسی طاقت کی حیثیت اختیار کر لی تھی تو یہ سب کچھ اسی صحابیت کی قوت کے بل بوتے پر ہوا تھا۔ اپنے اس مقصود کو کامیابی سے ہم کنار کرنے کے لیے ان سبائیوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف سازشوں کا حال پھانے اور صحابہ کرام کو باہم لڑانے میں جو کردار ادا کیا وہ تو اپنی جگہ ایک الگ داستان ہے ہی اس کے ساتھ ہی انہوں نے صحابہ کو بدنام کرنے کی بھی ایک منظم تحریک چلائی اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ چند گنے چنے صحابیوں کو چھوڑ کر صحابہ کی پوری جماعت نہ اسلام ہی کی دوست تھی اور نہ پیغمبر اسلام صلی اللہ

علیہ وسلم ہی سے اس جماعت کو اخلاص و عقیدت کا کوئی تعلق تھا لیکن ظاہر ہے یہ بالکل خلاف واقعہ بات ثابت کرنا کوئی آسان کام نہ تھا یہ تو ایسا ہی تھا جیسے دن کی پوری روشنی میں یہ باور کرانے کی کوشش کی جائے کہ سورج غروب ہو چکا ہے اور رات آگئی ہے اس کے لیے سبائیوں نے ہی ایک تدبیر کارگردیکھی کہ جھوٹے کا ایسا دھواں اٹھایا جائے اور اس کے ذریعے سے ایسی تاریکی پھیلادی جائے کہ بتائی سکتے ہوئے بھی دیکھنے والوں کو دن کی روشنی، رات کی تاریکی کی طرح دکھائی دینے لگے چنانچہ صحابہ کبار کے بارے میں عموماً اور شیخین حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے متعلق خصوصاً مختلف قسم کے مناقب و مناقب گھڑ گھڑ کر بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے سے بیان کیے جانے لگے دوسری طرف اپنے آپ کو مسلمان اور اسلام دوست ثابت کرنے کے لیے ان محدود سے چند صحابہ کے فضائل و مناقب اپنی طرف سے وضع کر کے حدیث نبوی کے طور پر پیش کیے جانے لگے جن کو ان سادہ ذہن رکھنے والے سبائیوں نے پہلے ہی ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت صحابہ کی پوری جماعت سے علیحدہ کر لیا تھا۔

حافظ ابن حجر نے لسان المیزان میں اس بے بنیاد الزام کا ذکر کرتے ہوئے کہ حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما نے بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ کی منشا کے خلاف مسند خلافت سنبھال لی تھی اور صحابہ کی عمومیت ان دونوں کے ساتھ ہو گئی تھی، اس امر کی بطور خاص تصریح کی ہے کہ یہ بے بنیاد الزام سب سے پہلے عبداللہ بن سبا کی زبان پر گزرا تھا حافظ ابن حجر کے الفاظ ہیں :

كَانَ عَبْدُ اللَّهِ بْنُ سَبَا أَوَّلَ مَنْ أَظْهَرَ ذَلِكَ (لسان المیزان جلد ۳ ص ۱۹) | عبداللہ بن سبا ہی سب سے پہلا آدمی ہے جس نے اس (بے بنیاد خیال) کا اظہار کیا۔

اس کے ساتھ ہی عامر شعبی کے حوالے سے حافظ ابن حجر نے اس بات کی بھی تصریح کی کہ سب سے پہلا آدمی جس نے بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جھوٹ کی نسبت کی وہ بھی ہی عبداللہ بن سبا ہی تھا۔ عامر شعبی کے اس دعوے کو حافظ ابن حجر نے ان الفاظ میں نقل کیا ہے :

اَقُولُ مَنْ كَذَبَ عَمْدًا لِلَّهِ بَن | سب سے پہلے میں نے جھوٹ لولا (جھوٹی حدیث  
سب (لسان المیزان جلد ۳ صفحہ ۲۸۹) بنائی) وہ عبد اللہ بن سبا ہی تھا۔

عامر شعبی کے اس قول کو مشہور شیعہ عالم ابن ابی الحدید کے اس قول کے ساتھ ملا کر  
پڑھیں جس کا بھی ہم اوپر حوالہ دے آئے ہیں اور جس میں انہوں نے کہا ہے کہ نفعانی و مناب  
پر مشتمل اصل جھوٹ شیعہ کی جانب سے آیا ہے آپ اسی نتیجہ پر پہنچیں گے کہ شیعہ ہی  
وہ لوگ ہیں جنہوں نے عبد اللہ بن سبا کی دوسرے کاریوں کے زیر اثر نیز اپنے مخصوص پوشیدہ  
جذبات و احساسات کی تسکین کی خاطر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جھوٹ منسوب کرنے  
کی ابتداء کی۔

اس لحاظ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ وضع حدیث کی ابتداء خلافت راشدہ کے آخری  
دو تین سالوں میں ہوئی یعنی تقریباً ۳۰ھ سے ۳۳ھ تک کے درمیانی زمانے میں۔  
اس کا مطلب یہ ہوا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال فرما جانے کے تقریباً تیس سال  
بعد اس فتنہ کا ظہور ہوا۔

اور اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ یہ وہ | وضع حدیث کے سد باب میں  
زمانہ ہے جب پہلے پہل احادیث نبوی کے  
راویوں کے بارے میں چھان بین کی جانے لگی اور  
صحابہ کی احتیاطی تدابیر

استاد حدیث کے سلسلے کی ابتدا ہوئی۔ اس سے پہلے صحابہ ایک دوسرے کو نبی کریم صلی اللہ  
علیہ وسلم کی احادیث سنتے سنا تے اور قطعاً اس تصدیق کی ضرورت محسوس نہ کرتے کہ یہ  
حدیث سنانے والے نے از خود زبان نبوی سے سنی ہے یا کسی دوسرے صحابی سے سن کر روایت  
کی ہے مگر جب وضع حدیث کا ظہور و شیوع ہوا تو ضرورت محسوس کی جانے لگی کہ اس وقت تک  
کوئی حدیث قبول نہ کی جائے جب تک اس کے راوی کی ثقاہت و عدالت کا یقین نہ ہو  
جائے قبل ازیں صحابہ کے باہم اعتماد کا یہ عالم تھا کہ جب کسی دوسرے صحابی سے کوئی  
حدیث سنتے تو بلا جھجک اس کو نہ صرف قبول کر لیتے بلکہ آگے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف  
منسوب کر کے اس طرح روایت کرتے جیسے بذات خود انہوں نے وہ حدیث زبان نبوی سے

سُنی ہو۔ ذخیرہ احادیث میں مراسیل صحابہ کا وجود اس کا مُنہ بولتا ثبوت ہے۔ اس کے علاوہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کا وہ قول بھی اس پر شاہد ہے جس کو امام حاکم نے اپنی مستدرک میں نقل کیا ہے، ایک مرتبہ حضرت انسؓ ایک حدیث بیان کر رہے تھے کہ سننے والوں میں سے کسی نے پوچھا کہ کیا آپ نے یہ حدیث خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے سنی ہے حضرت انسؓ نے جواب میں فرمایا :

<p>ہم تم سے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں بیان کیا کرتے ہیں وہ سب ہم نے خود ہی آپؐ سے نہیں سنی بلکہ ہم میں سے بعضوں نے بعض سے بھی سنا ہے۔</p>	<p>مَا كُنَّا مَا نَحْتَدِثُكُمْ بِهِ مِمَّنَّا لَا مِنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَلَكِنْ كَانَ يَحْدُثُ بَعْضُنَا بَعْضًا (مستدرک للحاکم)</p>
---	--

<p>ہم لوگ باہم ایک دوسرے کو (جھوٹ سے) مہتمم نہیں کیا کرتے تھے۔</p>	<p>كَثَرًا لَأَنْتَهُمْ بَعْضُنَا بَعْضًا۔ (طبقات ابن سعد جلد ۱، ص ۱۳)</p>
--	--

غرض جب تک وضع حدیث کا آغاز نہ ہوا تھا صحابہ نے کبھی اس بات کی پرواہ نہ کی تھی کہ راوی کے حالات کی چھان بین کی جائے مگر چونکہ اس فتنے نے سراٹھایا صحابہ نے بھی اس بات کا اہتمام کرنا شروع کر دیا کہ کوئی حدیث صرف اس لیے قبول نہ کری جائے کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب ہے بلکہ قبول کرنے سے پہلے اس بات کا پورا اطمینان کر لیا جائے کہ جو کچھ روایت کیا جا رہا ہے اس کا انتساب آپؐ کی طرف صحیح اور درست طبع پر ہوا ہے یا نہیں۔ امام ابن سیرین نے اس حقیقت کا اظہار ان الفاظ میں فرمایا ہے :

<p>(پہلے لوگ) اسناد حدیث دریافت نہیں کیا کرتے تھے لیکن فتنہ پیا ہو جانے کے بعد لوگ یہ لکھنے لگے کہ ہمیں راویوں کے نام بتاؤ پھر غور و غوض کے بعد اہل سنت کی روایت قبول کر لی جاتی اور اہل</p>	<p>لَمْ يَكُونُوا يَسْتَلُونِ عَنِ الْأَسْنَادِ فَلَمَّا وَقَعَتِ الْفِتْنَةُ قَالُوا اسْمُؤُنَا رِجَالُكُمْ فَيَنْظُرُ إِلَى أَهْلِ السُّنَّةِ فَيُؤَخِّرُ حَدِيثَهُمْ وَيَنْظُرُ إِلَى</p>
--	--

أَهْلُ الْبِدْعِ فَلَا يُؤْخَذُ حَدِيثُهُمْ  
(مقدمہ صحیح مسلم باب ۴)

بدعت کی حدیث رو کر دی جاتی تھی۔

وضیح حدیث کا فتنہ ظہور میں آنے کے بعد قبول حدیث میں صحابہ کی احتیاط کا کیا عالم ہو گیا تھا اس کا اندازہ اس واقعے سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے جس کو امام مسلم نے مقدمہ مسلم میں مجاہد سے نقل لیا ہے کہ ایک بار بشیر بن عبد اللہ بن عباس کی خدمت میں حاضر ہو کر حدیثیں بیان کرنے لگے ان کا خیال تھا کہ وہ ان حدیثوں کو خاص توجہ سے سنیں گے مگر ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب انہوں نے دیکھا کہ حضرت عبد اللہ ابن عباس نے نہ ان کی باتوں کی طرف کوئی دھیان دیا نہ نظر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا آخر متعجبانہ کہنے لگے کہ اے ابن عباس میں تو آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں سناتا رہا ہوں اور آپ توجہ تک نہیں دے رہے یہ کیا معاملہ ہے۔ حضرت عبد اللہ ابن عباس نے جواب میں فرمایا:

ایک وہ وقت تھا کہ جب ہم کسی کو یہ کہتے سننے کہ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو فوراً ہماری نظریں بے ساختہ اس کی طرف اٹھ جایا کرتیں اور ہم اپنے کانوں کو اس کی (باتوں کی) طرف لگا دیتے مگر جب لوگ ہر سرکش و غیر سرکش (آؤنٹ) پر سوار ہونے لگے (یعنی جھوٹ سچ کی تیز جاتی رہی) تو ہم نے بھی صرف ان حدیثوں کو لینا اختیار کر لیا جن کو ہم پہنچاتے ہیں۔

إِنَّا كُنَّا مَوْرَةً إِذَا سَمِعْنَا رَجُلًا  
يَقُولُ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ  
عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ابْتَدِرْهُ أَبْصَارُنَا  
وَأَصْغَيْنَا إِلَيْهِ بِأَذَانِنَا فَلَمَّا  
لَكِبَ النَّاسُ الصَّعْبَةَ وَاللِّذْلُولَ  
لَمْ نَأْخُذْ مِنَ النَّاسِ إِلَّا مَا نَعَرَفُ  
(مقدمہ صحیح مسلم باب ۳)

بشیر بن کعب عدوی جیسا کہ معلوم ہے بصرے کے رہنے والے تھے حضرت عبد اللہ ابن عباس سے یہ مکالمہ لیا لگتا ہے کہ اس زمانے میں نبوا ہے جب حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی جانب سے حضرت عبد اللہ ابن عباس بصرہ کے حاکم تھے اور یہ وہی زمانہ ہے جب وضع حدیث کا فتنہ جنم لے چکا تھا۔ قبول حدیث میں صحابہ کرام کی اس احتیاط کا حال بیان کرنے سے ہمارا مقصود یہی واضح کرنا ہے کہ وضع حدیث کے ظہور و شیوع کے ساتھ ہی صحابہ کی طرف سے اس بات کا

اہتمام شروع ہو گیا تھا کہ صحیح و غیر صحیح احادیث آپس میں غلط ملط نہ ہو جائیں۔ "سرکش" وغیرہ سرکش اڈنٹوں پر سواری "یہ عرب کا ایک محاورہ ہے مراد اس سے حضرت عبداللہ ابن عباس کی یہی تھی کہ روایت حدیث میں جھوٹ اور سیخ کی تمیز ہی جاتی رہی تو ہم بھی قبول حدیث میں سخت احتیاط برتنے لگے امام مسلم کی ایک اور روایت میں جس کو انہوں نے طائیس سے لیا ہے حضرت عبداللہ ابن عباس نے یہی بات زیادہ صریح انداز میں کہی ہے۔ آپ نے فرمایا:

ہم لوگ اس زمانے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں بیان کرتے تھے جب آپ پر کوئی جھوٹ نہیں باندھتا تھا مگر جب لوگ ہر سرکش و غیر سرکش (اڈنٹ) پر سوار ہونے لگے یعنی جب جھوٹ سیخ کی تمیز جاتی رہی تو ہم آپ کی طرف منسوب کر کے حدیثیں بیان کرنا ہی چھوڑ دیا۔

إِنَّا كُنَّا نَحَدِّثُ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ  
صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذْ لَمْ يَكُنْ  
يَكْذِبُ عَلَيْهِ فَلَمَّا كَبَتِ النَّاسُ  
الصَّعْبَ وَالذَّوْلَ تَرَكَنَا  
الْحَدِيثَ عَنْهُ (مقدمہ صحیح مسلم باب النہی

عن الروایۃ من الضعفاء)۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جھوٹ کی نہایت سے بچنے کے لیے اور وضع حدیث کے نفع کو بے اثر بنانے کے لیے یہ احتیاط کی انتہائی حد تھی کہ حضرت عبداللہ ابن عباس نے حدیث روایت کرنا ہی ترک کر دیا تھا اور صرف حضرت عبداللہ ابن عباس ہی نہیں معلوم کیا ہوتا ہے دیگر صحابہ نے بھی یہی طریقہ اپنا لیا تھا کیونکہ حضرت ابن عباس نے بجملے صیغہ واحد کے جمع کا صیغہ ترک استعمال فرمایا ہے۔

غرض وضع حدیث کا نفع عمد رسالت کے بہت عرصے بعد خلافت راشدہ کے بالکل آخری سالوں میں رونما ہوا مگر اس کے ظہور کے ساتھ ہی صحابہ پوری طرح مستعد ہو گئے اور اس بات کا پورا پورا خیال رکھا کہ کسی راستے سے بھی کوئی غلط بات اس طوع پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب نہ ہو جائے کہ اسے صحیح احادیث سے ممتاز نہ کیا جاسکے خود حضرت علی کم اللہ وجہہ بھی جن کے فضائل و مناقب پر بکثرت حدیثیں گھڑی جا رہی تھیں اس باب میں ہر امکانی کوشش کو بروئے کار لانے میں انتہائی مستعد تھے۔ سبائی جس قسم کی بے سرو پا باتیں خود آپ کی طرف منسوب کر کے پھیلا رہے تھے جب کبھی بھی ان میں سے کوئی بات آپ تک



پہنچتی آپ منبر پر پہنچ کر فوراً اس کی تردید برسرعام فرماتے اور ایسے لوگوں علی الاعلان اپنی بولادت کا اعلان فرماتے حافظ ابن حجر لسان المیزان میں نقل کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اطلاع ملی کہ چند آدمی جن میں عبداللہ بن سبا بھی شامل تھا کسی مقام پر یہ تذکرہ کر رہے تھے کہ حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کے بارے میں حضرت علی کے خیالات اچھے نہیں ہیں۔ یہ سنتے ہی حضرت علیؑ ایک خاص کیفیت کے انداز میں عبداللہ بن سبا کے بارے میں فرمانے لگے :

میرا اس کالے گدھے سے کیا واسطہ اللہ کا پناہ  
جو میں ان دونوں (ابو بکر و عمر) کے بارے میں بجز  
اچھی بات کچھ اور کہوں۔

مَالِي وَلِهَذَا الْخَبِيثِ الْأَسْوَدُ مَعَاذَ  
اللَّهِ أَنْ أَقُولَ لَهَذَا إِلَّا الْخَسَفَ  
الْجَمِيلَ (لسان المیزان جلد ۳)

ایک مرتبہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے خود عبداللہ بن سبا کو اپنے پاس بلا کر پیسے تو بہت کچھ سمجھایا بگھایا کہ وہ اپنی دروغ گوئیوں سے توبہ کرے مگر جب اس پر کوئی اثر نہ دیکھا تو اس کے منہ پر فرمایا کہ قیامت سے پہلے جن تیس دجالوں کے پیدا ہونے کی خبر دی گئی ہے ان میں سے ایک تو بھی ہے۔

سمانی جب اپنی دروغ بانیوں سے کسی طرح باز نہ آئے اور ہر طرح کی تادیب کا ردیائوں کے باوجود جھوٹی حدیثیں گھر گھر پھیلانے میں مصروف رہے تو بالآخر حضرت علی نے مجبور ہو کر ان لوگوں کو آگ میں جھونک دینے کا حکم صادر کر دیا اور حافظ ابن حجر کا بیان ہے کہ  
قَدْ أَحْرَقَهُمُ عَلِيٌّ خَلَاْفَتُهُ  
(لسان المیزان منہج ۲۹)۔  
(حضرت علی نے ان لوگوں کو اپنی خلافت میں جلا دیا۔)

اس احتیاطی تدبیر کے علاوہ حضرت علی نے وضع حدیث کے نفع کی سرکوبی کے لیے ایک بڑا کام یہ کیا کہ تفصیل روایت یعنی حدیثیں بہت کم روایت کرنے کا طریقہ جو اب تک

آپ نے اپنے پیشرو خلفائے راشدین کے طرز پر اختیار کیا ہوا تھا ایک بحث ترک کر دیا اور روایتوں کی اشاعت میں تکثیر کا طریقہ اپنایا۔ ظاہر ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق معلومات کے اس قیمتی ذخیرے کے مقابلے میں جو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے چشم دید مشاہدات و سموعات پر مشتمل تھا ان بے سرو پا باتوں کی بھلا کیا وقعت باقی رہ سکتی تھی جو سبائی مختلف ذرائع سے پھیلاتے پھرتے تھے۔ سبائی موضوعات سے عام لوگوں کی توجہ ہٹانے اور اسے بے وقعت بنانے کی اس تدبیر سے ہمتراور کوئی تدبیر ہو ہی نہیں سکتی تھی جو حضرت علی نے اختیار کی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ سے متعلق جو معلومات بھی آپ کے پاس تھیں ان کی وسیع پیمانے پر اشاعت شروع کر دی۔

اس کے علاوہ خود قبول حدیث میں اس قدر احتیاط سے کام لینے لگے کہ جب بھی کوئی شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی حدیث آپ کے سامنے بیان کرتا تو اس وقت تک اسے قبول نہ کرتے جب تک راوی سے اس پر قسم نہ لے لیتے۔

قبول حدیث میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی جانب سے قسم کی اس شرط کے بارے میں اور روایتوں کی اشاعت میں تکثیر کا طریقہ اپنانے سے متعلق تفصیلی بحث ہم نے اسی کتاب کے پہلے حصے میں ”حفاظت حدیث اور خلفائے راشدین“ کے عنوان کے تحت بیان کی ہے قارئین مراجعت فرمائیں۔

بہر حال ہمیں بتلانا یہ تھا کہ وضع حدیث کا نکتہ تقریباً ۳۰۰ھ ہجری اور ۳۰۰ھ ہجری کے درمیانی عرصے میں رونما ہوا اولین وضع حدیث سبائی اور شیعہ تھے مگر وضع حدیث کے آغاز کے ساتھ ساتھ ہی صحیح و غیر صحیح احادیث کے درمیان امتیاز قائم رکھنے کی کوششوں کی ابتدا بھی ہو گئی جو بعد میں چل کر مستقل ایک فن کی شکل اختیار کر گئی۔

اب ہمیں وضع حدیث سے متعلق امام بخاری کی چھ لاکھ حدیثوں کی اصل حقیقت منکرین حدیث کے اعتراض کے

سلسلے میں ان کی صرف اس آخری بات کا جواب دینا ہے کہ امام بخاری کے زمانے میں چھ لاکھ حدیثیں رائج تھیں جن میں سے امام صاحب نے صرف نو ہزار کو صحیح احادیث کی حیثیت سے منتخب کیا تھا۔

ہم یہ تو نہیں سمجھتے کہ منکرین حدیث علم حدیث سے اس قدر بے برہ ہوں گے کہ اتنا بھی نہ جانتے ہوں کہ حدیثوں کی یہ چھ لاکھ کی تعداد طرق و اسانید کے لحاظ سے بھٹی یا اپنے متون کے اعتبار سے اور نہ ہی ہم تاریخ حدیث سے انہیں اتنا نا بلد خیال کرتے ہیں کہ وہ اس غلط فہمی میں پڑے ہوئے ہوں کہ جو حدیثیں امام بخاری نے منتخب کی ہیں بس وہی صحیح ہیں اور باقی تمام روایات غیر صحیح ہیں البتہ اتنا ضرور جانتے ہیں کہ منکرین حدیث چونکہ علمی دیانت کا قطعاً کوئی پاس نہیں کرتے اس لیے وہ حقیقت حال سے بخوبی واقف ہونے کے باوجود عام سادہ لوح ناواقف مسلمانوں کو یہی تاثر دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ اول تو چھ لاکھ جتنی کثیر تعداد میں احادیث کا موجود ہونا محل تعجب ہے چھ لاکھ میں سے نو ہزار کے انتخاب کا مطلب یہ ہوا کہ چھ لاکھ احادیث میں سے بس وہ نو ہزار تو امام بخاری کی نظر میں صحیح تھیں جو انہوں نے اپنی تصحیح میں لیں اور باقی پانچ لاکھ اکیانوے ہزار احادیث کو امام بخاری جعلی اور جھوٹی تصور کرتے تھے اسی لیے انہوں نے ان سب کو اپنی تصحیح میں نہیں لیا۔

دراصل یہ دونوں باتیں ہی خلافت واقعہ ہیں نہ اپنے الگ الگ مفہوم اور علیحدہ علیحدہ موضوع کے اعتبار سے احادیث کی تعداد چھ لاکھ ہے اور نہ یہ دعویٰ درست ہے کہ جو حدیثیں امام بخاری نے اپنی تصحیح میں لی ہیں ان کی نظر میں بس وہی صحیح تھیں باقی تمام احادیث کہ وہ جعلی اور جھوٹی خیال کرتے تھے۔

حقیقت اصل یہ ہے کہ محدثین نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کو متون کے اعتبار سے نہیں بلکہ ان کے طریقوں اور ان کی سندوں کے اعتبار سے گنتے تھے مثلاً نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی قول یا فعل یا آپ سے متعلق کوئی واقعہ اگر ایک سند سے روایت ہوا ہے تو محدثین کے نزدیک وہ ایک حدیث ہے لیکن وہی قول یا فعل یا آپ سے

متعلق وہی واقعہ ایک سند کے بجائے متعدد سندوں سے روایت ہوا ہے تو محدثین اس کو ایک حدیث کے بجائے متعدد احادیث شمار کریں گے دراصل صحابہ سے احادیث اخذ کرنے والوں کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ ایک ہی روایت کو جن صحابیوں سے ممکن ہو سب سنا جائے چونکہ راویوں کی تعداد میں اختلاف کے ساتھ ساتھ روایت اپنی طبیعت میں بلند ہوتی جاتی تھی اس لیے ہر راوی اپنی روایتوں میں قوت پیدا کرنے کے لیے زیادہ سے زیادہ راویوں کی تلاش میں رہتا تھا شروع شروع میں تو یہ سلسلہ مختصر ہی رہا مگر مروجہ زمانہ کے ساتھ ساتھ راویوں کی تعداد بڑھتی چلی گئی تا آنکہ امام بخاری کے زمانہ تک بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک ایک قول ایک ایک فعل اور آپ کی زندگی کا ایک ایک واقعہ بکثرت بہت سی سندوں سے روایت ہونے لگا اور اس طرح احادیث کی تعداد بڑھتی چلی گئی اور جیسا کہ اسی کتاب کے پہلے حصے میں ہم کہیں لکھ آئے ہیں کہ متون کے اعتبار سے صحیح احادیث کی تعداد دس ہزار کے لگ بھگ ہے اور اگر صحیح کے ساتھ دیگر تمام قسم کی احادیث بھی جمع کر لی جائیں تب بھی تمام حدیثوں کی تعداد بشمول موضوع احادیث پچاس ہزار سے زیادہ نہیں ہے تو یہ چند ہزار احادیث کی تعداد بکثرت مختلف راویوں سے روایت ہونے کی بنا پر لاکھوں تک پہنچ گئی۔

اس اعتبار سے یہ بات تو بالکل صحیح ہے کہ امام بخاری کے زمانہ میں چھ لاکھ حدیثیں رائج تھیں بلکہ چھ لاکھ ہی نہیں اس سے بھی کچھ زیادہ ہی تھیں مگر یہ شمار تعدد طرق کی بنا پر تھا یعنی بکثرت راویوں سے مروی ہونے کی بنا پر تھا احادیث کے مفہوم مضمون کے اعتبار سے نہ تھا۔ ذرا اندازہ کیجئے بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا مشہور ارشاد انما الاعمال بالنیات اپنے مضمون کے اعتبار سے تو صرف ایک ہی حدیث ہے مگر چونکہ اس کے راویوں کی تعداد سات سو سے بھی متجاوز ہے اس لیے محدثین اس کو ایک حدیث نہیں بلکہ سات سو حدیثیں شمار کرتے ہیں۔

اس کے علاوہ حدیثوں کی تعداد کا تعین کرتے وقت اس حقیقت کو بھی ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ امام بخاری کے دور تک حدیث کے لفظ کے اطلاق میں اس قدر

توسیع اور کشادگی آگئی تھی کہ صحابہ کرام کے اقوال و فتاویٰ نیز تابعین و تبع تابعین تک کے ملفوظات کو اصطلاحاً حدیث میں شامل سمجھا جانے لگا تھا احادیث کے شمار کا لاکھوں کے عدد تک پہنچنا کچھ اس بنا پر بھی تھا۔

اس حقیقت کو سمجھ لینے کے بعد اب اس بات کو سمجھئے کہ احادیث کے انتخاب میں امام بخاری کا طریقہ کیا تھا۔ امام بخاری کا طریقہ یہ تھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی قول کوئی فعل یا آپ سے متعلق کوئی واقعہ جتنی سندوں کے ذریعے ان تک پہنچتا تھا ان میں سے جو جو سندان کی شرائط صحت پر پوری اترتی تھیں ان تمام

سندوں سے امام بخاری اس روایت کو لے لیتے تھے اور جو سندیں ان کے معیار پر پوری نہ اترتیں ان کو چھوڑ دیتے لیکن اس کے ساتھ ہی امام بخاری نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ جو حدیثیں انہوں نے منتخب کی ہیں بس وہی صحیح ہیں باقی تمام روایات غیر صحیح ہیں بلکہ وہ تو اس کے بالعکس بالتصریح یہ کہتے ہیں کہ میں نے بہت سی صحیح احادیث خوف طوالت کی وجہ سے چھوڑ دی ہیں۔ تہذیب النووی میں امام بخاری کا یہ قول موجود ہے کہ ”میں نے اپنی کتاب میں کوئی ایسی حدیث داخل نہیں کی ہے جو صحیح نہ ہو مگر بہت سی صحیح حدیثیں صرف اس لیے چھوڑ دی ہیں کہ کہیں کتاب طویل نہ ہو جائے“ جب مولف خود یہ کہہ رہا ہے کہ میری کتاب نے تمام صحیح احادیث کا احاطہ نہیں کیا تو بھلا کسی دوسرے کو یہ کہنے کا حق کیسے پہنچتا ہے کہ مولف کی کتاب نے تمام صحیح احادیث کا احاطہ کر لیا ہے باقی جو کچھ ہے وہ غیر صحیح ہے بلکہ امام بخاری نے تو اپنے ایک اور قول میں جس کو محدث حازمی نے اپنی تصنیف ”شروط الائمة الخمسة“ میں نقل کیا ہے اس بات کی بھی تصریح کی ہے کہ جو صحیح حدیثیں میں نے چھوڑ دی ہیں وہ ان صحیح حدیثوں سے تعداد میں زیادہ ہیں جو میں نے اپنی کتاب میں لی ہیں۔ اب بتلائیے ایک طرف منکرین حدیث کا یہ دعویٰ ہے کہ صحیح بخاری کے علاوہ جتنی احادیث ہیں وہ امام

بخاری کی نظر میں غیر صحیح ہیں دوسری طرف صحیح بخاری کے خود مؤلف کا کہنا ہے کہ میری تالیف میں ساری صحیح احادیث جمع نہیں ہو سکیں جتنی صحیح احادیث میں نے اپنی تالیف میں جمع کی ہیں اس سے زیادہ صحیح احادیث میں نے طوالت کے خوف سے چھوڑ بھی دی ہیں ہر صاحب عقل خود فیصلہ کر سکتا ہے کسی کی بات ماننے کے قابل ہے اور کس کی رد کر دینے کے قابل۔ صحیح بخاری کے مؤلف امام بخاری کی یا نرم گدوں پر بیٹھ کر حدیث کا انکار کرنے والوں کی؟ اس حقیقت کا ثبوت کہ امام بخاری نے اپنی صحیح میں تمام صحیح احادیث کو جمع کرنے کا التزام نہیں کیا امام بخاری کے اس قول سے بھی ملتا ہے جس کو محمد ابن حمدویہ نے روایت کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ میں نے امام محمد بن اسماعیل بخاری کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ ”مجھے ایک لاکھ صحیح حدیثیں یاد ہیں“ اس قول کا مطلب یہ ہوا کہ ایک لاکھ صحیح احادیث میں سے آپ نے صرف نو ہزار کو اپنی صحیح میں لیا ہے باقی ایک نوے ہزار صحیح احادیث ایسی ہیں جن کو امام بخاری نے اپنی صحیح میں اس لیے نہیں لیا کہ کہیں کتاب طویل نہ ہو جائے۔ اس موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے منکرین حدیث ناواقف حال لوگوں کو ایک او، بخالفہ بھی دیا کرتے ہیں وہ اپنے موقف کے حق میں دلائل بیان کرتے ہوئے ایسا انداز اختیار کرتے ہیں جس سے متبادر یہ ہوتا ہے کہ علم حدیث میں صحیح کا لفظ سچی حدیث کے معنی میں مستعمل ہے گویا صحیح کے ماسوا جتنی حدیثیں ہیں وہ سب جھوٹی شمار ہوتی ہیں حالانکہ یہ بالکل غلط ہے علم حدیث کی اصطلاح میں ”صحیح“ سے مراد وہ حدیث ہے جس کی سند میں صحت کی مخصوص قسم کی شرائط پائی جاتی ہوں اس سے کم تر درجے کی سندوں کے لیے یعنی ان سندوں کے لیے جو ثقہ اور تاویل اعتماد تو ہوتی ہیں مگر اتنی اعلیٰ درجے کی نہیں ہوتیں محدثین ”صحیح“ کے لفظ کے بجائے دوسرے مختلف الفاظ مثلاً صحیح لغیرہ حسن لذاتہ اور حسن لغیرہ وغیرہ استعمال کرتے ہیں اس لیے علم حدیث میں جہاں کہیں ”حدیث صحیح“ کی اصطلاح استعمال ہوئی ہے اس سے یہ سمجھنا بالکل غلط ہے کہ حدیث صحیح

کے سوا باقی جتنی حدیثیں ہیں وہ سب جھوٹی ہیں۔

ہر حال اب تک کی گفتگو سے تاریں پر واضح ہو گیا ہو گا کہ وضع حدیث سے متعلق جتنی بھی باتیں منکرین حدیث کی جانب سے کہی گئی ہیں سب بے بنیاد ہیں۔ ابتداء میں منکرین حدیث کے جن چند اعتراضات کا ہم نے حوالہ دیا تھا ان میں ترتیب کے لحاظ سے سب سے پہلا نمبر وضع حدیث سے متعلق اعتراض ہی کا تھا جس پر اب تک ہم گفتگو کرتے رہے۔ اب ہم ان کے دوسرے اعتراضات کا جائزہ لیتے ہیں۔

۲۔ **خلاف عقل و درایت**  
روایات کی اصل حقیقت

دوسرے نمبر پر جس اعتراض کا ہم نے اوپر ابتداء ذکر کیا ہے وہ خلاف عقل و درایت روایات سے متعلق ہے منکرین حدیث کا کہنا یہ ہے کہ بعض احادیث خلاف عقل و درایت ہیں اس کے باوجود محدثین کے یہاں انہیں صحت کا درجہ حاصل ہے حالانکہ یہ ناممکن ہے کہ اللہ کا رسول کوئی ایسی بات کہے جو عقل اور درایت کے معیار پر پوری نہ اترتی ہو اپنے اس دعوے کی تائید میں وہ چند ایسی احادیث بھی پیش کرتے ہیں جو انہیں خلاف عقل نظر آتی ہیں۔

اس سلسلے میں منکرین حدیث کی بنیادی غلطی یہ ہے کہ وہ احادیث بنو یہ کو ای تراویں تو لیتے ہیں جس میں عام غیر بنی انسانوں کے اقوال و اخبار کو کولا جاتا ہے دراصل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا منصب و مقام ان لوگوں کی نظر میں ہے ہی ایک عام انسان کا ان کے نزدیک اللہ کے رسول کے کلام میں نہ توحی کی کوئی خصوصیت پائی جاتی ہے اور نہ قرآن کے علاوہ کسی اور صورت میں اس پر غیبی امور منکشف ہوتے ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ اللہ کے رسول میں سوائے اس کے کہ اس پر قرآن کا نزول ہوا ہے کوئی اور ایسی غیر معمولی بات سرے سے پائی ہی نہیں جاتی جو اسے عام بنی نوع انسان سے ممتاز کر دے۔ اس بنیادی غلطی کے نتیجے میں منکرین حدیث نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کو پرکھنے کے لیے وہی مقیاس و معیار مقرر کرتے ہیں جو عوام الناس کی باتوں کو پرکھنے کے لیے عام طور پر محروم خیال کیا جاتا ہے۔ منکرین حدیث کی ساری غلط

فہمیاں دُور ہو سکتی ہیں اگر وہ اُصولی طوع پر اس حقیقت کو تسلیم کر لیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے فرستادہ اور جوامح الکلم کے حامل تھے، آپ کی روحانی بلندی ملازمت اعلیٰ کے ساتھ نلی ہوئی تھی جس کی وجہ سے آپ کے ہر قول اور ہر فعل سے نور و حکمت اور علم و معرفت کے سورتے پھوٹتے تھے اور آپ ان غیبی اسرار سے آگاہ تھے جن سے کوئی دوسرا بشر آگاہ نہیں ہے۔

اس اُصولی حقیقت کو تسلیم کر لینے کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی بھی حدیث کسی بھی صورت میں خلافتِ عقل و درایت نظر نہ آئے گی اس لیے کہ عقلاً یہ عین ممکن ہے کہ آپ ملازمت اعلیٰ سے براہِ راست رابطہ رکھنے کی بنا پر کوئی ایسی بات ارشاد فرمائیں جو ایک مخصوص زمانے کے لوگوں کے لیے بالائے فہم و ادراک ہو مگر وہی ارشاد آنے والے اس دور کے عین مطابق ہو جب انسانی فہم و ادراک تہ ترقی کی نئی منازل طے کر لی ہوں۔ اسی طرح عقلاً اس بات کا بھی امکان ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے وحی الہی کی بنیاد پر کسی ایسے علمی معجزے کی خبر دی ہو جو ابھی ظہور میں نہیں آیا اور اس لیے ہماری محدود عقل اس کو سمجھنے سے قاصر ہو نیز اس میں بھی کوئی عقلی استحالہ درپیش نہیں کہ غیبی اسرار پر مطلع ہونے کی بنا پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کسی ایسی حقیقت کی طرف اشارہ فرما دیں جو آج کے معلوم و معروف حقائق سے ہم آہنگ نہ ہو لیکن آگے چل کر اس حقیقت پر سے پردہ اٹھ جائے اور کھلی آنکھوں سب کچھ مشاہدہ ہو جائے۔

یہ تو ایک اُصولی بات تھی لیکن جہاں تک امر واقعہ کا تعلق ہے کوئی بھی صحیح فہم و عقل منتقل ہے ہی نہیں اتنی بات تو معترضین بھی مانیں گے کہ خلافتِ عقل وہ چیز ہو ا کرتی ہے جس سے کوئی محال لازم آئے تو پورے ذخیرہ حدیث میں پوری تحقیق و جستجو کے بعد بھی کوئی ایک صحیح حدیث بھی خواہ وہ صحت کے پچلے درجے ہی کی کیوں نہ ہو ایسی نہیں ملے گی جس سے کوئی محال لازم آتا ہو البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ حدیث کی جانچ پرکھ کے لیے عقل کی سلطنت ایک شرط لازم کی حیثیت رکھتی ہے وہ عقل جو رلیض اور بیمار نہ ہو جو نفسانی ظلمتوں اور عاصیانہ خواہشوں سے آلودہ نہ ہو اور وہ عقل جو حق کی مثلاًشی ہو کسی تعصب کا شکار



نہ ہو حدیث کی جاچ پر رکھ کے لیے ایسی ہی عقل کی ضرورت ہے۔ مریض اور بیمار عقل یا وہ عقل جو کسی تعصب کے زیر اثر ہو حدیث کی جاچ پر رکھ کی صلاحیتوں سے محروم ہوتی ہے اسی لیے کہ وہ مخصوص جذبات و احساسات سے مغلوب ہوتی ہے نتیجتاً اپنے نظریات و افکار کی بنیاد ایسے شکوک و شبہات پر رکھتی ہے جو کوتاہی فکر و نظر اور غفلت پر مبنی ہوتے ہیں ایسی عقل شتر یے مہار کی طرح ہوتی ہے ایسی عقل کو نقد حدیث کی اجازت دے دینے کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم نے خود اس بات کا سامان مہیا کر دیا کہ سنت صحیحہ کے لیے سرے سے کوئی مضبوط اساس ہی باقی نہ رہے۔

علاوہ ازیں ہر کہ و مہ کی عقل کو نقد حدیث کے لیے حکم ٹھہرانا یوں بھی خود خلاف عقل ہے کون نہیں جانتا کہ مختلف اشخاص کے اعتبار سے عقل کے درجات بھی مختلف و متعدد ہوتے ہیں بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک چیز کو ایک شخص درست اور صحیح سمجھتا ہے جبکہ اسی چیز کو دوسرا شخص غلط اور غیر صحیح خیال کرتا ہے عین ممکن ہے کہ ایک چیز ایک شخص کی سمجھ سے بالاتر ہو مگر دوسرے شخص کے لیے وہی چیز اس کے فہم و ادراک کے بہت قریب نظر آتی ہو یہی وجہ ہے کہ تمام امور میں رائے وہی و قیح خیال کی جاتی ہے جو متعلقہ امور کے ماہرین کی جانب سے دی گئی ہو اس لیے کہ وہ ان امور کے مالہ اور ماعلیہ سے بخوبی واقف ہوتے ہیں۔ نقد حدیث کا بھی بالکل یہی معاملہ ہے اس کے لیے بھی اگر یہ ماہرین حدیث ہی کی رائے کو وقعت حاصل ہے تاہم محترمین اگر ماہرانہ صلاحیتوں سے محروم ہوں تو کم از کم ان سے ہمارا اتنا مطالعہ تو کسی طرح بھی بے جا نہیں کہ وہ اپنے ادیان کو نفسانی ظلمتوں اور نجاستوں سے پاک کر کے نیز اپنی آنکھوں پر سے تعصب کی عینک اتار کر احادیث نبوی میں غور کریں انشاء اللہ ان کو کوئی ایک حدیث بھی خلاف عقل و درایت نظر نہ آئے گی۔

نقد حدیث کے لیے عقل کے اصل معیار پر اس اصولی گفتگو کے بعد اب ہم

نمونے کے طور پر چند ایسی روایات کا جائزہ لیں گے جو عقل کے عین مطابق ہونے کے باوجود منکرین حدیث کو خلاف عقل و درایت نظر آتی ہیں تاکہ یہ بات کھلی کر سامنے آجائے کہ معتزہ میں کاذبہن کس انداز سے سوچتا ہے اور اصل حقیقت کیا ہے قارئین انشاء اللہ خود دیکھ لیں گے کہ خلاف عقل احادیث نبوی نہیں بلکہ وہ منفی سوچ ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی احادیث کے بارے میں منکرین حدیث نے اپنائی ہوئی ہے۔

**سورج کی سجدہ ریزی** | مثال کے طور پر پہلی حدیث وہ ہے جس کو امام بخاری نے کتاب بدو الخلق میں باب صفت الشمس القمر میں حضرت ابوذر سے روایت کیا ہے اور جس میں سورج کا عرش کے نیچے سجدہ کرنا اور دوبارہ طلوع ہونے کی اجازت مانگنا مذکور ہے۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں :

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سورج غروب ہوا تو حضرت ابوذر سے فرمایا جانتے ہو سورج کہاں جاتا ہے میں نے کہا اللہ اور اس کا رسول زیادہ جانتے ہیں آپ نے فرمایا وہ جاتا ہے اور عرش کے نیچے سجدہ کرتا ہے پھر (طلوع ہونے کی) اجازت مانگتا ہے اور اسے اجازت دے دی جاتی ہے اور غنقریب وہ وقت آئے گا کہ وہ سجدہ کرے گا مگر قبول نہ ہوگا اور اجازت مانگے گا مگر اسے اجازت نہ ملے گی اسے حکم ہوگا کہ پلٹ جائے جہاں سے آیا ہے اور پھر وہ مغرب سے طلوع ہوگا اور یہی مطلب ہے اللہ کے اسی قول کا کہ آفتاب اپنے مستقر پر چلتا رہتا ہے یہ اندازہ باندھا ہوا ہے زبردستی اور علم دانے کا۔

قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا بِي ذَرِّحِينَ غَرَبَتِ الشَّمْسُ تَدْرِي أَيْنَ تَذْهَبُ قُلْتُ اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَعْلَمُ قَالَ فَإِنَّهَا تَذْهَبُ حَتَّى تَسْجُدَ تَحْتَ الْعَرْشِ فَتَسْأَلُ فَيُؤْذَنُ لَهَا وَتَبْشِكُ أَنْ تَسْجُدَ فَلَا يَقْبَلُ مِنْهَا وَتَسْأَلُ فَلَا يُعْذَنُ لَهَا يَقَالُ لَهَا ارْجِعِي مِنْ حَيْثُ جِئْتِ فَتَطْلُعُ مِنْ مَغْرِبِهَا فَذَلِكَ قَوْلُهُ تَعَالَى وَالشَّمْسُ تَجْرِي لِمُسْتَقَرٍّ لَهَا ذَلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ -

(بخاری کتاب بدو الخلق باب صفت الشمس والقمر)

اس حدیث میں منکرین حدیث کو جو باتیں خلاف عقل نظر آتی ہیں وہ مختصراً کچھ اس طرح ہیں کہ  
(۱) سورج بھلا سجدہ کس طرح کر سکتا ہے سورج کا سجدہ میں گہرے پڑنا کسی طرح عقل میں آئے  
والی بات نہیں۔

(۲) اس حدیث میں طلوع و غروب کو سورج کی گردش کا نتیجہ بتلایا گیا ہے حالانکہ آج ایک  
سکول کا طالب علم بھی جانتا ہے کہ طلوع و غروب سورج کی گردش کا نہیں زمین کی گردش  
کا نتیجہ ہے۔

(۳) سورج کا مغرب سے طلوع ہونا بھی سراسر خلاف عقل ہے۔

اب ہم ایک ایک کر کے ان تینوں شبہات کا جواب دیتے ہیں جہاں تک سورج کے  
سجدے میں گہرے پڑنے کا تعلق ہے تو حیرت ہے منکرین حدیث کی بیماری عقل اتنی سی بات نہ  
سمجھ سکی کہ سورج کا سجدہ وہ سجدہ نہیں ہے جو زمین پر سڑنیک کر کیا جاتا ہے بلکہ وہ سجدہ  
ہے جو اظہار عبودیت کے لیے اس کائنات کا ذرہ ذرہ ہمہ وقت اپنے رب کے سامنے کرتے  
رہنے پر مجبور ہے قرآن زمین و آسمان کی ہر چیز کو اللہ کے آگے سجدہ ریز قرار دیتا  
ہے مثلاً قرآن کہتا ہے **وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَن فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَكَرْهًا**  
**وَدُلًّا لَّهُمْ بِالْغُدُوِّ وَالْاَصَالِ** (جو آسمان میں ہیں اور جو زمین میں ہیں پارس و ناپا چا اللہ ہی کو سجدہ  
کرتے ہیں اور صبح و شام ان کے سامنے) (بھی اسی کو سجدہ کرتے ہیں) (الرعد - ۱۵) یا اسی طرح ایک  
مقام پر قرآن کریم ستاروں اور درختوں کے بارے میں کہتا ہے کہ وہ اللہ کے سامنے  
سرسجود ہیں چنانچہ سورہ رحمن میں ہے **وَالْبُخَّيْمَ وَالشَّجَرِ يَسْجُدَانِ** (بخم و شجر اسی کے سامنے  
سجدہ ریز ہیں - الرحمن - ۶) تو اب کیا قرآنی آیات کے بارے میں بھی یہی کہا جائے گا کہ  
چونکہ فلاں فلاں آیت میں خلاف عقل مضمون بیان ہوا ہے جس کا صدر اللہ سے ممکن  
نہیں اس لیے اس قسم کی تمام آیات معاذ اللہ موضوع اور ناقابل اعتبار ہیں۔ منکرین  
حدیث جو اپنے آپ کو اہل قرآن کہتے ہیں ذرا بتلائیں کہ متذکرہ بالا قسم کی آیات  
قرآنی ہیں سجدے سے کونسا سجدہ مراد ہے۔ جو مراد وہ ان آیات کی بیان کریں گے  
وہی مراد ہماری جانب سے محمولہ بالا حدیث نبوی کے بارے میں سمجھ لیجئے ظاہر ہے اس

قسم کی آیات قرآنی میں سجدے سے مراد سجدہ تسخیری ہے یعنی کلیتہً امر رب کا تابع ہونا بس یہی سجدہ تسخیری بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ تسجد تحت العرش سے بھی مراد ہے۔ بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے مخاطب کو بتلانا یہ چاہتے ہیں کہ سورج ہر آن اللہ تعالیٰ کے حکم کا تابع ہے اس کا طلوع بھی اللہ ہی کے حکم سے ہوتا ہے اور اس کا غروب بھی یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ چونکہ سورج کا مغرب ایک نہیں ہے بلکہ قرآن کی رو سے بہت سے مغرب ہیں جیسے قرآن کہتا ہے بَوَّاتِ الْمَشَارِقِ وَالْمَغَارِبِ (مشرقوں اور مغربوں کے مالک کی قسم۔ الماعارج۔ ۹۰) اور سورج ہر آن ایک خطہ زمین میں غروب اور ہر آن دوسرے خطے میں طلوع ہوتا رہتا ہے تو بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث میں سجدہ ریز نہ ہو کر طلوع و غروب کی اجازت مانگنے کا مطلب یہ ہے کہ سورج ہر آن اور ہر لمحہ امر الہی کا تابع ہے۔

رہا منکرین حدیث کا دوسرا شبہ کہ اس حدیث میں طلوع و غروب کو سورج کی گردش کا نتیجہ سمجھا گیا ہے جبکہ سائنسی تحقیق بتلاتی ہے کہ طلوع و غروب زمین کی گردش کا نتیجہ ہے تو اس سلسلے میں پہلی بات تو یہ ہے کہ سائنسی تحقیقات کو جن کا ہمیشہ بدلنے رہنا تجربے سے ثابت ہو چکا ہے قرآنی آیات یا احادیث نبوی کے لیے معیار بھڑانا خود خلاف عقل ہے عین ممکن ہے کہ جو سائنس آج سورج کو ساکن اور زمین کو متحرک قرار دیتی ہے کل اس کی تحقیق بدل جائے اور وہ زمین کو ساکن اور سورج کو متحرک قرار دینا شروع کر دے چنانچہ اس رخ پر سائنس نے سوچنا شروع کر بھی دیا ہے تو اول تو یہ معیار ہی غلط ہے۔ دوسری بات اس سلسلے میں یہ ہے کہ اتنی بات تو معتبر نہیں کہ بھی تسلیم ہے کہ بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم طبیعیات یا کیمیا کے مسائل نبی نوح انسان کو سکھانے کے لیے نہیں آئے تھے بلکہ عرفان حقیقت بخشہ اور فکر و عمل کی اصلاح کرنے کے لیے تشریف لائے تھے آپؐ نے زمین یا سورج کا ذکر کیا ہے تو یہ بتلانے کے لیے نہیں کیا کہ ان میں سے کون متحرک ہے اور کون ساکن بلکہ یہ سمجھانے کے لیے کیا ہے کہ زمین اور سورج دونوں کا مالک و خالق صرف ایک ذات ہے جس کا نام اللہ ہے

اب اس حقیقت کی تعلیم دینے کے لیے عقل کیا کہتی ہے بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس علم اشیاء سے مدد لینا چاہیے تھی جو آپ کے زمانے میں موجود تھا یا اس کو چھوڑ کر ہزار ڈیڑھ ہزار سال بعد کے علم اشیاء کو اس حقیقت کی تعلیم کا ذریعہ بنانا چاہیے تھا ظاہر ہے عقل کا فیصلہ ہی ہوگا کہ اپنے ہی زمانے کے علم اشیاء سے کام لیتا حکمت تبلیغ کے عین مطابق ہے اگر بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان محتاج کو ذریعہ تعلیم بناتے جو صدیوں بعد انسان کے علم میں آنے والے تھے تو آپ کی تعلیم آپ کے عہد کے لوگوں میں مقبول تو کیا ہوتی سمجھ ہی میں نہ آتی لوگ اصل تعلیم کو چھوڑ کر اس بحث میں پڑ جاتے کہ آخر وہ کونسی دنیا ہے جس کی ایسی عجیب غریب باتیں آپ سنا رہے ہیں۔ ذرا سوچئے تو سہی اگر زیر بحث حدیث کا مضمون اب سے ڈیڑھ ہزار برس پہلے اس انداز سے بیان کیا جاتا کہ منصف والا طلوع و غروب کا سبب سورج کے بجائے زمین کی حرکت کو سمجھتا تو آج کی دنیا کی نظریں تو بے شک وہ ایک علمی معجزہ ہوتا مگر خود آپ کے زمانے کے لوگوں کے بارے میں محترضین کا کیا خیال ہے۔ وہ اس علمی معجزے کے بارے میں کیا رائے قائم کرتے؟ اور پھر اس علمی معجزے کے معجزے کی بھول بھلیوں میں پھنس جانے کی بنا پر وہ مضمون ان کے دل و دماغ میں کہاں تک اترتا جو فی الحقیقت سمجھنا مقصود تھا؟ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کوئی ایک شخص بھی شاید بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تبلیغ سے متاثر ہو کر نہ دیتا اور جب آپ کے زمانے کے لوگ ہی ایسے علمی معجزوں کی بدولت ایمان لاتے سے محروم رہ جاتے تو یہ علمی معجزے بعد کی نسوں تک پہنچتے ہی کیا کہ ان سے داد وصول کرتے۔ غرض حکمت تبلیغ اسی طرز عمل کی متقاضی تھی جو آپ نے اختیار فرمایا کہ اپنے زمانے کے لوگوں کے علم و فہم کے مطابق ان سے کلام کیا اور جن محتاج کو آپ لوگوں کے ذہن نشین کرانا چاہتے تھے ان کی تفہیم کے لیے ان معلومات سے کام نہیں لیا جو صدیوں بعد ظہور میں آئیں۔

یہی سورج کے مغرب سے طلوع ہونے کی بات تو اس میں تعجب کی کونسی بات ہے جو ذات اس سورج کی خالق ہے اسی کو تھامے ہوئے ہے اور جو ذات زمین کو ایک منضبط گردش میں رکھے ہوئے ہے وہی ذات اس پر بھی قادر ہے کہ اس سارے نظام کو المطا

چلا دے اور سورج مشرق کے بجائے مغرب سے نکلتا ہوا نظر آئے سائبسی نقطہ نظر سے بھی اس امر کا امکان موجود ہے کہ دنیا کا تانوں جذب و کشش یکایک ایک پلٹ نکلتے اور تمام سیارے موجودہ رفتار کے مقابلے میں بالکل الٹ رفتار سے چلتا شروع کر دیں طبیعیات اور ہیئت کے موجودہ قوانین کو کوئی بھی اٹل نہیں مانتا ان قوانین میں تغیر واقع ہونے یا بالکل اس کے درہم برہم ہو جانے کے امکانات کی موجودگی کا ہر کوئی قائل ہے لہذا عین ممکن ہے کہ سورج کے طلوع و غروب کا موجودہ تانوں یکایک بدل جائے اور سورج مشرق کے بجائے مغرب سے طلوع ہو۔

**سردی و گرمی اور**  
**دونخ کی دو پھونکیں**  
دوسری ایسی ہی ایک اور حدیث جو منکرین حدیث کو خلاف عقل نظر آتی ہے وہ ہے جس کو امام بخاری نے کتاب مواقیات الصلوٰۃ میں حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے اس کا متن ملاحظہ فرمائیے:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب گرمی کا زور ہو تو نماز ٹھنڈی کر کے (یعنی ٹھنڈے وقت میں) پڑھو کیونکہ گرمی کی شدت جہنم کی پھونک سے ہے جہنم نے اپنے رب سے شکایت کی اور کہا اے رب میرے ایک حصہ نے دوسرے حصے کو کھا لیا ہے۔ اللہ نے اسے دوسرے سانس لینے کی اجازت دیدی ایک سانس کی جارہے ہیں اور ایک سانس کی گرمی کے موسم میں اور وہ (گرمی کا سانس) اس سخت گرمی جیسا ہے جو تم محسوس کرتے ہو اور وہ (سردی کا سانس) اس سخت سردی جیسا ہوتا ہے جو تم محسوس کرتے ہو۔

عن ابی ہریرۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم اِنَّہٗ قَالَ رَاۡذَا اَشْتَدَّ الْحَرُّ فَاَبْرَدُوا بِالصَّلٰوةِ لَآِنَّ شِدَّةَ الْحَرِّ مِنْ قَبْلِ جَهَنَّمَ فَاَشْتَدَّتِ النَّارُ اِلٰی رِبِّهَا فَقَالَتْ يَا رَبِّ اَکُلْ بَعْضُیْ بَعْضًا فَاُذِنْ لَهَا بِتَفْسِیْهِیْ نَفْسٍ فِی الشِّتَاءِ وَنَفْسٍ فِی الصَّیْفِ وَهَیْئًا مَّا تَجِدُوْنَ مِنْ الْحَرِّ وَهَیْئًا مَّا تَجِدُوْنَ مِنْ الزَّمْهِوْرِ

(بخاری کتاب مواقیات الصلوٰۃ باب ابطروا بالنہر)

منکرین حدیث کہتے ہیں کہ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ گرمی کی شدت جہنم کی پھونک کی

وجہ سے ہوتی ہے نیز سردی اور گرمی کے موسم جہنم کی دو پھونکوں کے سبب سے آتے ہیں حالانکہ یہ سراسر غلط ہے مومنینوں کا تغیر زمین کی مداری گردش اور سورج کے قریب بعد کی بنا پر ہے۔

اس حدیث کے بارے میں بھی بنیادی بات یہی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصود ایک عالم طبعیات کی حیثیت سے موسمی تغیرات کی وجہ بیان فرمانا نہیں ہے بلکہ آپ ایک نبی کی حیثیت سے گرمی کی تکلیف محسوس کرنے والوں کو جہنم کا تصور دلانا چاہتے ہیں۔ دوپہر کے وقت صحرائی عرب کی گرمی کا جو حال ہوتا ہوگا باسانی اندازہ کیا جاسکتا ہے ایسی گرمی میں ظہر کی نماز کے لیے نکلنا واقعی بڑا شاق گذرتا ہوگا چنانچہ مسند امام احمد میں حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے منقول بھی ہے کہ لم یکن یصلوا شدا علی اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منھا (اس ظہر کی نماز سے بڑھ کر کوئی نماز اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر شاق نہ تھی) اس پس منظر میں آپ دیکھئے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ فرمایا اس سے آپ کا مقصود دوزخ سے ڈرانا اور ان کاموں سے روکنا تھا جو انسان کو دوزخ کی طرف لے جاتے والے ہیں۔ آپ کا یہ ارشاد قرآن کریم کے اس ارشاد سے ملتا جلتا ہے جو غزوہ تبوک کے موقع پر ان لوگوں کے لیے جو گرمی سے گھبرا کر ہمساد پر نکلنے سے جی چمرا رہے تھے فرمایا گیا تھا کہ **وَقَالُوا لَا تَنْصُرُوا فِی الْحَرِّ قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ اَشَدَّ حَرًّا** (انہوں نے کہا کہ اس گرمی میں دہماد کے لیے، نہ نکلو (اے نبی) ان سے کہہ دیجئے کہ جہنم کی آگ اس گرمی سے زیادہ گرم ہے۔ توبہ - ۸۱) جس طرح قرآن دنیا کی گرمی کا جہنم کی گرمی سے مقابلہ اس لیے کر رہا ہے کہ پس منظر میں وہ لوگ ہیں جو گرمی سے گھبرا کر ہمساد پر جانے سے ہچکچا رہے ہیں اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی دنیا کی شدید گرمی اور شدید سردی کو دوزخ کی محض دو پھونکوں کے برابر اس لیے بتا رہے ہیں کہ پس منظر میں وہ لوگ موجود ہیں جو جاڑے میں صبح کی اور گرمی میں ظہر کی نماز کے لیے گھروں سے نکلنا شاق سمجھ رہے ہیں۔

**فَإِنْ شِدَّةَ الْحَرِّ مِنْ فَيْحِ جَهَنَّمَ كَمَنْ سَبَّ نَبِيَّ كَرِيمٍ** صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد لازماً یہی نہیں ہے کہ دنیا میں گرمی جہنم کی پھونک کی وجہ سے ہوتی ہے بلکہ اس سے آپ کی مراد

یہ بھی ہو سکتی ہے کہ وہ جہنم کی پھونک کی قسم یا جنس سے ہے اس لیے کہ عربی زبان میں لفظ مونث بیان جنس کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ اسی طرح گرمی اور سردی کے موسموں کے بارے میں آپ کے الفاظ یہ نہیں ہیں کہ یہ دونوں موسم جہنم کی دو پھونکوں کے سبب سے آتے ہیں بلکہ آپ کا کہنا ہے کہ اللہ نے دوزخ کو دو سالنوں کی اجازت دی ایک سال سردی کے موسم میں اور ایک سال گرمی کے موسم میں اور یہ جو تم گرمی سردی محسوس کرتے ہو اس کو دوزخ کے انی دو سالنوں پر قیاس کر لو۔ غرض جس شخص نے بھی قرآن اور سیرت نبوی میں کچھ بھی غور کیا ہو گا وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی متذکرہ حدیث سن کر بلا تامل کہ اُٹھے گا کہ اس میں آپ نے طببیات کے کسی مسئلہ کو نہیں بلکہ جہنم کی شدت گرمی کو ذہن نشین کرانا چاہا ہے۔

**گرگٹ کی پھونکیں** | ایک اور حدیث ملاحظہ فرمائیے جس کا مضمون منکرین حدیث کو خلاف عقل نظر آتا ہے حضرت ام شریک رضی اللہ عنہا

سے روایت ہے کہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے گرگٹ کو مارنے کا حکم دیا اور ارشاد فرمایا کہ وہ حضرت ابراہیم پر آگ پھونکتا تھا۔

أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ  
أَمَرَ بِقَتْلِ الْوَزْغِ وَقَالَ كَانَ يَنْفُخُهُ  
عَلَى إِبْرَاهِيمَ عَلَيْهِ السَّلَامُ  
(بخاری کتاب الانبیاء باب قول اللہ تعالیٰ -  
وَاتَّخَذَ اللَّهُ إِبْرَاهِيمَ خَلِيلًا)

اس حدیث کے بارے میں منکرین حدیث کو عقلی استحالہ یہ درپیش ہے کہ آخر ایک گرگٹ کی پھونکوں میں آگ بھڑکاتے کی طاقت کہاں سے آگئی اور پھر ایک گرگٹ کے بدلے میں گرگٹوں کی ساری نسل کو سزا دینا کہاں کا انصاف ہے؟

منکرین حدیث اس حدیث پر اعتراض کرنے سے پہلے اگر ان احادیث پر بھی نظر ڈال لیتے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے و نواغ یعنی گرگٹ کو



فَوَاسِقُ یعنی موزی جانوروں میں سے قرار دیا ہے تو ان کو محولہ بالا حدیث میں کوئی عقلی استحالہ پیش نہ آتا اور بات بخوبی سمجھ میں آجاتی۔ دراصل بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے چند جانوروں کو فواسق (موزی) قرار دے کر یہ فرمایا تھا کہ انہیں حرم میں اور حالت احرام میں مار دینے کی بھی اجازت ہے ان میں پھٹو باؤلا کتا اور چوہا وغیرہ شامل ہیں اور بعض دوسری روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے گرگٹ کو بھی موزی قرار دیا تھا اب اس حقیقت کو ذہن میں رکھتے ہوئے محولہ بالا حدیث کے مفہوم میں غور و فکر سے اس حدیث کا یہ مطلب نہیں ہے کہ گرگٹ کی پوری نسل کو اس لیے مار ڈالا جائے کہ اس کے ایک فرد نے حضرت ابراہیم پر آگ بھڑکانی تھی بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ایک موزی جانور ہے اور اس کو دوسرے موزی جانوروں کی طرح انسان سے دشمنی ہے چنانچہ اس کی انسان دشمنی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ سارے جانوروں میں سے یہی ایک جانور تھا کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈالا گیا تو اس نے اس آگ کو پھونکنے کی کوشش کی۔ یہی یہ بات کہ گرگٹ کی پھونک میں آگ بھڑکانے کی طاقت کہاں سے آگئی تو حدیث میں یہ کہا ہی کب گیا ہے کہ وہ آگ گرگٹ کی پھونکوں سے بھڑک اٹھی تھی حدیث میں تو صرف گرگٹ کی انسان دشمنی کی مثال دیتے ہوئے کہا گیا ہے کہ اس کی یہ دشمنی اس حد تک بڑھی ہوئی ہے کہ یہ حضرت ابراہیم پر آگ بھڑکانے کی کوشش کرتا رہا اگرچہ اس کو شمش کا کوئی فائدہ نہ تھا لیکن اس جانور نے اپنی انسان دشمنی کے اظہار میں کوئی کسر اٹھانہ رکھی۔

۱۔ ہر حال منکرین حدیث کی طرف سے پیش کی جاتی والی اس قسم کی تمام احادیث کا احاطہ کرتا ہمارا مقصود نہیں ہے ہم صرف یہ دکھلانا چاہتے تھے کہ اصل خرابی اس انداز فکر میں ہے جو احادیث نبوی کے بارے میں منکرین حدیث نے اختیار کر رکھا ہے ورنہ کوئی ایک صحیح حدیث بھی ایسی نہیں ہے جو عقل کے معیار پر پوری نہ اترتی ہو۔

## ۳۔ احادیث نبوی اور عریاں مضامین

منکرین حدیث کا تیسرا اعتراض ان احادیث کے بارے میں ہے جو بقول ان کے عریاں مضامین پر مشتمل ہیں ان کا کہنا ہے کہ بعض احادیث تو ایسے مضامین پر مشتمل ہیں

جو اخلاقی لحاظ سے محبوب خیال کیے جاتے ہیں جبکہ بعض احادیث ایسی ہیں جن میں بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی ازواج مطہرات کے درمیان خالصتاً ازدواجی تعلقات کا ذکر کیا گیا ہے اور وہ بھی اکثر و بیشتر خود ازواج مطہرات کی ذہانی۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ ازواج مطہرات آپ کی زندگی کے ایسے معاملات بھی لوگوں کو بتلا دیں اور بتلانے میں کوئی شرم محسوس نہ کریں جن کو عام طور پر میان بیوی کے سوا دوسرا کوئی نہیں جانتا اور نہ کسی دوسرے کو اس پر مطلع کرنا کوئی شکار کرتا ہے۔

احادیث نبوی پر اس قسم کے تمام اعتراضات دراصل نتیجہ ہیں اس ضمن میں چند بنیادی باتوں کو نظر انداز کر دینے کا۔ اس قسم کے شبہات کو دل میں جگہ دینے سے پہلے اگر درج ذیل چند امور کو ذہن نشین کر لیا جائے تو احادیث کے بارے میں کوئی غلط فہمی باقی نہ رہے اور اچھی طرح یہ بات سمجھ میں آجائے کہ یہ مضامین جو بظاہر عریاں اور محبوب نظر آتے ہیں انسانی زندگی کی صحیح تعلیم و تربیت کے لیے ان کا بیان کیا جانا کس قدر ضروری تھا۔

## چند بنیادی باتیں | اس سلسلے میں سب سے پہلی بات جو ذہن نشین کیے جانے کے لائق ہے یہ ہے کہ بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک

ایسی قوم میں مبعوث ہوئے تھے جو تہذیب و تمدن کے بالکل ابتدائی درجے میں تھی آپ کے ذمے صرف یہی کام نہیں تھا کہ ان کے عقائد درست کریں بلکہ آپ کے ذمے یہ کام بھی تھا کہ انہیں انسان بنائیں ان کی زندگی کو سنواریں انہیں شائستہ اخلاق سکھائیں اور انہیں پاکیزہ معاشرت، مہذب تمدن اور نیک معاملات کی تعلیم دیں۔ یہ مقصد ظاہر ہے محض وعظ و تلقین اور چند نہیانی ہدایات کے ذریعے پورا نہیں ہو سکتا تھا اس کے لیے ضرورت تھی کہ بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خود اپنی زندگی کو ان کے سامنے

انسانیت کا ایک مکمل نمونہ بنا کر پیش کریں اور ان کو پورا موقع دیں کہ وہ اس نمونے کا ایک ایک پہلو خوب اچھی طرح دیکھیں اور اپنی زندگیوں کو اس کے مطابق ڈھالیں۔

دوسری بنیادی بات جو اس سلسلے میں ذہن میں رکھنی ضروری ہے یہ ہے کہ انسان کی داخلی زندگی کے چند گوشے ایسے ہیں کہ انسان کی جسمانی طہارت و نظافت کا بیشتر مدار انہی گوشوں کے درست ہونے پر ہے۔ لیکن اس کے باوجود دوسری قوتوں کے درمیان ان گوشوں کی تعلیم و تربیت کے بارے میں کوئی ہدایات صرف اس لیے نہیں ملتی کہ ان کے بارے میں شرم کا ایک بے جا احساس ہمیشہ ان کے اذہان میں موجود رہا ہے اسلام کا ہم پر یہ احسان ہے کہ اس نے ان گوشوں کے بارے میں بھی ہمیں ہدایات دیں اور ان کے متعلق قواعد و ضوابط بتا کر ہمیں غلطیوں سے بچایا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس خاص شعبہ زندگی کی تعلیم و تربیت میں کوئی کسر اٹھانا نہ رکھی آپ جن قوم میں مبعوث ہوئے تھے اس خاص شعبہ زندگی میں اُس قوم کے لوگ ابتدائی ضابطوں تک سے ناواقف تھے بالخصوص تعلقات مرد و زن سے منسلک معاملات میں ان لوگوں کی ناشائستگی، ناپاکی اور بے حیائی اس درجہ بڑھی ہوئی تھی کہ ذکر سے بھی گھبن آتی ہے اس قوم کے لوگوں کا آپ نے نہ صرف تنزیہ نفوس کیا بلکہ ان کو طہارت جسم و لباس کے طریقے بھی سکھائے ان میں پاکیزگی کا نفیس ذوق پیدا کیا ان کو نجاست اور طہارت کی تمیز عطا کی زندگی بسر کرنے کے گندے لھناؤ سے اور ناشائستہ طریقوں کو موقوف کر کے اپنے قول اور عمل سے ان کے مردوں اور ان کی عورتوں کو صفائی، نفاست اور نظافت کے آداب کا بخور بنایا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے طہارت، استنجا اور غسل وغیرہ کے مسائل نیز ایسے ہی دوسرے مسائل ان لوگوں کو نہ صرف زبان سے سمجھائے بلکہ خود اپنی خالصتاً نجی زندگی کو ایک حد تک ان کے سامنے بے پردہ کر دیا تاکہ جو کچھ لوگ نہ پوچھیں یا نہ پوچھ سکیں یا جو باتیں آپ کو نہ بان سے بتانے کا موقع نہ ملے وہ لوگوں کو آپ کا طرز زندگی دیکھنے سے معلوم ہو جائیں۔

اس سلسلے کی تیسری بنیادی بات یہ ہے کہ صحابہ کرام نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو

ایک مثالی انسان سمجھتے تھے اس لیے وہ ہمہ وقت اس ٹوہ میں رہتے تھے کہ زندگی کے ہر کام کے بارے میں انہیں یہ معلوم ہو جائے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا طرز عمل کیا تھا وہ چیزیں جو محض گمان کی بنیاد پر یا ہود و نصاریٰ کے زیر اثر حرام، مکروہ اور ناپسندیدہ خیال کی جاتی تھیں ان کے متعلق صرف یہ سن کر صحابہ کا اطمینان نہیں ہوتا تھا کہ شریعت میں وہ جائز ہیں، حکم جواز کے باوجود ان کے دلوں میں یہ شک باقی رہ جاتا تھا کہ شاید ان میں کوئی کراہت کا عنصر موجود ہو جب تک وہ یہ زبان لیتے تھے کہ فلاں فلاں کام میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طرز عمل کیا تھا اس وقت تک ان کے دلوں سے کراہت کا خیال نہیں نکلتا تھا یہ بھی ایک اہم وجہ تھی جس کے پیش نظر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی خالصتاً خانگی زندگی کو ایک حد تک بے نقاب کرنا ضروری خیال فرمایا۔

**نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا زبردست ایثار** | ان تین بنیادی باتوں کو ذہن میں رکھئے اور احادیث بنوی کے مضامین پر عربی اور غیر اخلاقی ہونے کا الزام لگانے سے پہلے اسی حقیقت پر غور کیجئے کہ اہل تین وجوہ کے پیش نظر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ کیسا زبردست ایثار تھا کہ آپ نے اپنی زندگی کے ہر شعبے کو قوم کی تعلیم کے لیے پبلک بنا دیا اپنی کسی چیز کو بھی پرائیویٹ نہ رکھا حتیٰ کہ ان معاملات کو بھی نہ چھپایا جنہیں دُنیا میں کوئی شخص دوسروں کے سامنے ظاہر کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا آپ نے لوگوں کو اذن عام دے دیا کہ آؤ ہر حال میں میری زندگی کے ایک ایک پہلو کو دیکھو اور زندگی کے ہر معاملے میں مجھ پر نظر رکھو کہ میں کیا طرز عمل اختیار کرتا ہوں آپ نے امت کے ایک ایک فرد کو اس بات کی کھلی اجازت دیدی کہ رفتار میں گفتار میں نشست و برخاست میں سونے اور جاگنے میں عبادات و معاملات میں حتیٰ کہ اپنی بیویوں اور اپنی اولاد کے ساتھ تہاؤ میں غرض ہر چیز میں ہر وقت اور ہر حال میں ہر کوئی آپ کے ایک ایک عمل کو اپنی آنکھوں سے دیکھے، دیکھنے والوں سے سنے اور جاننے والوں سے پوچھے یا خود آپ سے دریافت کرے اور اپنی زندگی کو اسی طرز پر ڈھالنے کی کوشش کرے۔ آپ نے اپنی ازواج مطہرات

کو بھی عام اجازت دے دی کہ غلوٰت میں آپ کا جو طرز عمل دیکھیں اس سے  
 عورتوں اور مردوں کو سب کو آگاہ کر دیں تاکہ لوگوں کی صرف ظاہری زندگی ہی نہیں  
 باطنی اور مخفی زندگی بھی تہذیب و شائستگی اور طہارت و نفاہت کے زبرد سے آرا  
 ہو جائے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے بعض پہلوؤں کا علم چونکہ ازواج  
 مطہرات کے علاوہ اند کسی ذریعے سے ممکن نہ تھا اس لیے اللہ تعالیٰ نے بھی اس ذریعہ  
 تعلیم میں آسانی پیدا کرنے کے لیے آپ کی ازواج مطہرات کو تمام مسلمانوں کے لیے حقیقی  
 ماؤں کی سی حیثیت دے دی تھی اور ان کو افراد امت پر ہمیشہ ہمیش کے لیے حرام کر دیا  
 تھا تاکہ مائیں اپنے بیٹوں سے کھل کر بات کریں اور ان کے روحانی باپ کی حرکات و  
 سکنات میں سے ہر ہر چیز کو ان کے سامنے تقلید و پیروی کی خاطر محدود حلال و حرام  
 سے واقفیت کے پیش نظر اور پاک و ناپاک میں تمیز کے لیے بیان کرتی رہیں اور اسی  
 طرح بیٹے بھی تاکہ اپنی ماؤں کی خدمت میں حاضر ہو کر بلا جھجک زندگی کے مخفی سے مخفی  
 تر گوشوں کے متعلق رہنمائی حاصل کر سکیں اور بائین میں ان مسائل پر گفتگو کرتے  
 ہوئے کسی قسم کے ناپاک جذبے کی دخل اندازی کا خطرہ ہی باقی نہ رہے۔

وہ تمام احادیث جو منکرین حدیث کو عریاں مضامین پر مشتمل نظر آتی ہیں وہ سب  
 کی سب وہ احادیث ہیں جن میں جنابت، جنس و نفاس، پاک و ناپاک، تعلقات مرد و زن  
 سے منسلک مسائل اور ایسے ہی دیگر امور کی نسبت انسان کے طرز عمل کی تفصیلات  
 بیان کی گئی ہیں ان احادیث کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات اور دیگر  
 صحابہ و صحابیات کی زبان سے سن کر منکرین حدیث کا ہمارا ذہن اس طرف تو گویا کہ  
 ان احادیث کے مضامین عریاں خلاف حیا اور غیر اخلاقی ہیں لیکن یہ نہ سوچا کہ اگر یہ  
 احادیث نہ ہوتیں تو انسانی زندگی کے کیسے کیسے اہم معاملات سے متعلق مسائل سے ہم  
 لاعلم رہ جاتے۔ یہ انہی احادیث کی بدولت تو ہے کہ نہ صرف اہل عرب بلکہ دنیا کے  
 کروڑوں مسلمانوں کی نجی مخفی زندگی صفائی جسم طہارت لیاں اور پاکیزگی اطوار نیز  
 صنفی معاملات میں شائستگی و نفاہت کے ایک عام ضابطہ کی پابند ہو گئی۔ ان مسائل

کو اگر محض شخصی ذوق اور انفرادی تمیز پر چھوڑ دیا جاتا تو ہم میں اکثر افراد کا حال اپنی زندگی کے محض شعبوں میں جانوروں سے کچھ بھی مختلف نہ ہوتا۔ آج کی دنیا کی بزمِ خود متمدن غیر مسلم قوموں کا حال کس کو نہیں معلوم کھانے کے بعد منہ کی صفائی سے ناواقف رنج حاجت کے بعد جسم کی طہارت سے نابلد، بخلات و طہارت کے تصور سے بے نیاز اور صنفی جذبات کی تسکین میں گھناؤنے اور گندے طریقوں کے عادی، ان میں اور جانوروں میں کوئی بھی تو فرق نہیں بلکہ قسراں کے الفاظ میں اولئک کالانعام بل هم اضل۔ یہ اعادہ بیش نہ ہونیں تو بلاشبہ ہمارا بھی یہی حال ہوتا۔

حق یہ ہے کہ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک بہت بڑا ایثار تھا کہ طبعاً انتہا درجے کے شرمیلے اور حیادار ہونے کے باوجود افراد امت کی تعلیم کے لیے حیا کے پردے کو اٹھا دیا اور ہر قسم کے معاملات میں اپنی روحانی اولاد کو جن میں بیٹے اور بیٹیاں سب شامل تھے خود ہدایات دیں ان کو اجازت دی کہ جو چاہیں اور ان کو اس کا موقع دیا کہ جہاں تک آپ کے اندرونی حالات سے وہ واقف ہو سکتے ہوں واقف ہوں خود بھی معلوم کریں اور دوسروں کو بھی بتائیں کہ ایک پاکیزہ مہذب اور شائستہ زندگی کیسی ہوتی ہے فی الحقیقت کیا زبردست ایثار ہے جس ذات پاک کی حیا کا یہ عالم تھا کہ اس کی شریک زندگی تک کو عمر بھر کبھی اسے برہنہ دیکھنے کا اتفاق نہ ہوا حتیٰ کہ جس نے کبھی تنہائی میں بھی برہنہ ہونے کو پسند نہ کیا اس نے محض اپنی امت کو صفائی اور شائستگی کی تعلیم دینے کے لیے اپنی بیویوں کو کھلی اجازت دے دی کہ اس کی نجی زندگی کے محض سے محض واقعات تک کو لوگوں کے سامنے بیان کر دیں۔

متذکرہ بالا امور کو اچھی طرح سمجھ لیتے کے بعد اگرچہ

**چند مرویات کا جائزہ** | منکرین حدیث کے زیر بحث اعتراض میں کوئی وزن نہیں رہتا تاہم تمام حجت کے طور پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ وہ احادیث جو اس ضمن میں محترضین کا تختہ مشق بنی ہیں ان میں سے چند احادیث کا نمونے کے طور پر تجزیہ کر کے یہ دکھا دیا جائے کہ اس قسم کی تمام احادیث دراصل ان مسائل پر مشتمل ہیں جو انسانی

زندگی کے مخفی شعبوں سے تعلق رکھتے ہیں اور جن کا انسان کے علم میں آنا اس کی اپنی صحیح تعلیم و تربیت کے لیے از بس ضروری ہے۔

اس سلسلے کی جتنی احادیث منکرین حدیث کی جانب سے اپنے موقف کی تائید میں پیش کی جاتی ہیں ان کو راویوں کے لحاظ سے دو قسموں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے ایک وہ احادیث جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات سے مروی ہیں دوسرے وہ احادیث جو ازواج مطہرات کے علاوہ دیگر صحابہ و صحابیات سے مروی ہیں ہم ان دونوں قسموں میں سے ہر ایک قسم کی چارہ پانچ احادیث کا نمونہ کے طور پر تجزیہ کریں گے صرف یہ دکھانے کے لیے کہ منکرین حدیث کی سوچ کس قدر منفی اثرات کی حامل ہے۔

اولاً ہم ازواج مطہرات کی روایات کا جائزہ لیتے ہیں۔ چنانچہ درج ذیل چند احادیث ملاحظہ فرمائیے:

حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی کسی بیوی کا بوسہ لیا پھر نماز کے لیے نکلے اور وضو نہیں کیا۔

(۱) عَنْ عَائِشَةَ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَبَّلَ بَعْضَ نِسَائِهِ ثُمَّ خَرَجَ إِلَى الصَّلَاةِ وَلَمْ يَتَوَضَّأْ (ترمذی الملبدة باب ترك الوضوء من القبلة)۔

ابو بکر بن حفص نے بیان کیا کہ میں نے ابو سلمہ کو کہتے ہوئے سنا کہ میں اور حضرت عائشہ کے بھائی حضرت عائشہ کے پاس آئے اور ان سے ان کے بھائی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غسل کا حال پوچھا تو انہوں نے تقریباً ایک صاع پانی منگایا پھر انہوں نے غسل کیا اور اپنے سر پر پانی بہا یا اس حال میں کہ ہمارے اور ان کے درمیان پردہ عائل تھا۔

(۲) حَدَّثَنِي أَبُو بَكْرِ بْنُ حَفْصٍ قَالَ سَمِعْتُ أَبَا سَلَمَةَ يَقُولُ وَخَلْتُ أَنَا وَأَخُو عَائِشَةَ عَلَى عَائِشَةَ فَسَالَهَا عَنْهُ عَنْ غَسْلِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَدَعَتْ بَارِئًا نَحْوَ مَنْ صَبَّاحَ فَأَغْتَسَلْتُ وَأَنَا ضُتُّ عَلَى رَأْسِهَا وَبَيْنَنَا وَبَيْنَهَا حِجَابٌ۔ (بخاری - الفضل باب بالصباح ونحوه)

حضرت ام سلمہؓ سے روایت ہے کہ ام سلمہؓ  
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر  
ہوئیں اور عرض کیا یا رسول اللہ اللہ تعالیٰ  
حق بات سے نہیں شرماتا کیا عورت پر غسل واجب  
ہے جب اسے اختلام ہو؟ رسول اللہ صلی اللہ  
علیہ وسلم نے فرمایا ہاں جبکہ وہ پانی (منی)  
دیکھے حضرت ام سلمہؓ نے عرض کیا اے اللہ  
کے رسول کیا عورت کو بھی اختلام ہوتا ہے  
آپؐ نے فرمایا تیرے ہاتھوں کو میٹھے اختلام  
نہیں ہوتا تو پھر کچھ عورت کے مشابہ کیونکر  
ہوتا ہے۔

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ میں اور  
نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک ہی برتن سے نہاتے  
تھے اور ہم دونوں جنبی ہوتے تھے اور آپؐ  
مجھے حیض کی حالت میں ازراہ اندھنے کا حکم  
دیتے تھے پھر مجھ سے اختلام کرتے تھے  
اور آپؐ اعتکاف کی حالت میں اپنا سر  
(مسجد سے باہر) میری طرف نکال دیتے تھے  
اور میں بحالت حیض اسے دھوتی تھی۔

(۳) عَنْ أُمِّ سَلَمَةَ قَالَتْ جَاءَتْ  
أُمَّ سَلِيمٍ إِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ  
عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَتْ يَا رَسُولَ  
اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ عَزَّ وَجَلَّ لَا يَسْتَحِبُّ  
مَنْ الْعَقَّ فَمَهْلٌ عَلَى الْمَرْأَةِ مَنْ  
غَسَلَ إِذَا احْتَلَمَتْ فَقَالَ رَسُولُ  
اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ  
نَعَمْ إِذَا لَأَتِ الْمَاءَ فَقَالَتْ أُمُّ  
سَلَمَةَ يَا رَسُولَ اللَّهِ وَتَحْتَلِمُ  
الْمَرْأَةُ فَقَالَ تَرَبَّتْ يَدَايَ فَبِمَ  
يُشَبَّهَا وَلِدَهَا۔

(المسألة باب وجوب الغسل على المرأة)

(۴) عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كُنْتُ أَرْتَحِلُ  
أَنَا وَالنَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ  
مِنْ رَأْنَاءٍ وَاحِدٍ كِلَانَا جَنْبٍ  
وَكَانَ يَأْمُرُنِي فَأَقْرِفُنِي بِشَيْءٍ يَنْبَغِي  
وَأَنَا حَالِضٌ وَكَانَ يُخْرِجُ  
رَأْسَهُ إِلَيَّ وَهُوَ مَعْتَكِفٌ  
فَأَغْسِلُهُ وَأَنَا حَالِضٌ  
(بخاری کتاب الحیض باب مباشرة الحائض)



(۵) عن عائشة قالت كنت اشرب  
 وأنا خالض في الماء وأنا وليه النبي  
 صلى الله عليه وسلم فيضع  
 فاه على موضع في فيشرب  
 والعرق وأنا خالض  
 ثم أنا وليه النبي صلى الله عليه  
 وسلم فيضع فاه على موضع في  
 مسلم كتاب الطهارة باب جواز غسل الخالض  
 (اسی ذریعہ)۔

حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ میں  
 زبردستی سے، پانی پیتی تھی اور پھر اسے  
 نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب برعادت ہی  
 آپ اسی جگہ منہ رکھتے جہاں میں نے رکھ کر  
 پیا تھا حالانکہ میں حیض سے ہوتی تھی اور  
 اسی طرح میں حیض کی حالت میں ہڈی پر سے  
 گوشت کھاتی تھی اور پھر اسے نبی کریم صلی اللہ  
 علیہ وسلم کودے دیتی تھی اور آپ اس جگہ منہ  
 رکھتے جہاں میں نے رکھا تھا۔

یہ پانچوں احادیث نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات حضرت عائشہ  
 اور حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہما سے مروی ہیں ان میں سے ہر ایک میں کوئی نہ کوئی ایسا مسئلہ  
 بیان ہوا ہے جو یا تو انسانی زندگی کے معنی شعبوں سے تعلق رکھتا ہے یا اس کا تعلق جسمانی  
 طہارت و نفاست سے ہے۔ یہ مسائل محترضین کے لیے کوئی اہمیت رکھتے ہوں یا نہ  
 رکھتے ہوں مگر جن لوگوں کو اپنی زندگی احکام خداوندی کے مطابق گزارنی ہے ان کو تو بہر حال  
 یہ معلوم کرنے کی ضرورت ہے کہ زندگی کے ان معنی گوشوں کو رضائے الہی کے مطابق کیسے  
 درست رکھا جاسکتا ہے۔ انسانی زندگی کے بعض معنی گوشوں کا ذکر مگر میں حدیث کا  
 ذہن ان مخصوص گوشوں کی کیفیت و ماہیت کی طرف توجہ دلا گیا اور اسی لیے ان کے الفاظ  
 میں سے انہیں عربیاتی جھانکتی نظر آنے لگی مگر ان کا ذہن اس طرف متوجہ نہ ہو سکا کہ اگر  
 یہ ذکر نہ ہوتا تو انسانی زندگی کے یہ معنی گوشے اصلاح سے محروم رہ جاتے۔ ان کی  
 زبان پر یہ اعتراض تو فوراً آگیا کہ ایسی خالصتاً نجی نوعیت کی باتوں پر ازواج مطہرات  
 کی یوں بے جا کاد گفتگو توقع کے خلاف ہے مگر ان کے دماغ میں اتنی بات نہ آسکی  
 کہ یہ گفتگو ماؤں اور بیٹیوں کے درمیان ہے اور اس کا تعلق ایسے مسائل سے  
 ہے جن کا علم بیٹیوں کو اپنی ماؤں کے ذریعے کے علاوہ اور کسی ذریعے سے ہو ہی

نہیں سکتا تھا۔

چلئے جانے دیجئے معکرمین حدیث کو ان کے حال پر چھوڑ دینے آئے ہم  
فرداً فرداً ان پانچوں احادیث کا جائزہ لیتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ ان میں کیسے  
کیسے اہم مسائل کا حل بیان ہوا ہے۔

**یوسہ ناقض وضو نہیں** | پہلی حدیث حضرت عائشہ سے مروی ہے اس

صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک عمل کی خبر دی ہے اور بتلایا ہے کہ آپؐ نے اپنی کسی  
زوجہ مطہرہ کا بحالت وضو یوسہ لیا اور اس کے بعد بغیر وضو کیے نماز پڑھی۔ نبی کریم  
صلی اللہ علیہ وسلم کے اس عمل کی اطلاع دینے سے حضرت عائشہؓ کا مقصود یہ  
بتلانا ہے کہ یوسہ بجائے خود وضو توڑنے والی چیز نہیں ہے۔ دراصل بعض لوگ  
محض یوسہ لینے کو ناقض وضو سمجھنے لگے تھے ان کا خیال تھا کہ اس سے اگر وضو  
ٹوٹتا نہیں ہے تو کم از کم طہارت میں فرق ضرور آجاتا ہے۔ حضرت عائشہؓ کو ان کا  
شک دور کرنے کے لیے جتنی کراہ بالا عمل نبویؐ کی خبر دینا پڑی تاکہ ثابت ہو جائے  
کہ چونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود یوسہ لینے کے بعد بغیر وضو کیے نماز پڑھی ہے  
اس لیے یوسہ ناقض وضو نہیں ہے۔

**غسل کے لیے کتنا پانی کافی ہے** | دوسری حدیث بھی حضرت عائشہؓ ہی  
سے متعلق ہے اس میں ذکر ہے کہ غسل کے

متعلق استفسار پر حضرت عائشہؓ نے پانی منگوا کر اور پردہ لٹکا کر حضرت ابوسلمہؓ اور  
اپنے بھائی کی موجودگی میں غسل فرمایا۔ اس حدیث کے بارے میں سب سے پہلے  
یہ فرقیاحت ضروری ہے کہ اس حدیث کے راوی حضرت ابوسلمہؓ حضرت عائشہؓ  
رضی اللہ عنہا کے رضاعی بھانجے تھے جنہیں حضرت ام کلثوم بنت ابی بکر صدیق رضی  
اللہ عنہا نے دودھ پلایا تھا اس لحاظ سے اس حدیث میں مذکور وہ دونوں شخص جنکے ساتھ  
حضرت عائشہؓ نے پردہ لٹکا کر غسل فرمایا آپ کے محرم ہی تھے ان میں سے غیر محرم

کوئی نہ تھا۔ اس وضاحت کی ضرورت اس لیے محسوس ہوئی کہ منکرینِ حدیث حقیقت حال سے ناواقف لوگوں کے سامنے اس حدیث پر تبصرہ کچھ ایسے انداز سے کرتے ہیں جس سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ حضرت ابوسلمہؒ کوئی غیر شخص تھے اس کے علاوہ پھر ایک زیادتی یہ کرتے ہیں کہ روایت میں تو صرف ”جواب“ یعنی پردے کا ذکر ہے مگر ان لوگوں کے تبصرے سے ظاہر یہ ہوتا ہے کہ گویا پردہ بائیک تھا چنانچہ کہتے ہیں کہ اگر پردہ بائیک نہ ہوتا تو حضرت عائشہؓ نہاتی ہوئی غلط آئینوں اور اس طرح غسل کے عمل کا جو مظاہرہ کرنا مقصود تھا وہ پورا نہ ہوتا حالانکہ اگر انہیں اس مسئلے کا علم ہوتا جو اس وقت ہمیشہ تھا اور جس کی تحقیق کے لیے یہ دونوں اصحاب اپنی خالہ اور بہن کے پاس گئے تھے تو انہیں یہ سوچنے کی ضرورت ہی پیش نہ آتی کہ پردہ بائیک ہونا چاہیے تھا۔

در اصل صحابہ کے درمیان بحث یہ چھڑ گئی تھی کہ غسل کے لیے کتنا پانی کافی ہو سکتا ہے۔ بعض صحابہ کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہ روایت پہنچی تھی کہ آپ ایک صاع بھر پانی سے غسل کر لیتے تھے جبکہ اتنے پانی کو لوگ غسل کے لیے کافی سمجھتے تھے غلط فہم کی بنیاد فی الحقیقت یہ تھی کہ وہ غسل جنابت اور غسل نہضت صفائی بدن کا فرق نہیں سمجھ رہے تھے۔ حضرت عائشہؓ نے مستفسرین کو مسئلے کی زورت سمجھانے کے لیے اپنے اور ان کے درمیان ایک پردہ ڈالا جس سے بہت ان کا سر اور چہرہ ان دونوں حضرات کو نظر آتا تھا پھر ایک صاع بھر پانی ملکا کر اپنے اوپر بہایا۔ اس طریقہ سے حضرت عائشہؓ مستفسرین کو دو باتیں سمجھانا چاہتی تھیں ایک یہ کہ غسل جنابت کے لیے صرف جسم پر پانی بہانا کافی ہے در سگریہ کہ اس مقصد کے لیے صاع بھر پانی کفایت کرتا ہے۔

**عورتوں سے مخصوص ایک شرعی حکم** تیسری حدیث حضرت ام سلمہؓ سے مروی ہے یہ عروج عورتوں کو ایک اہم شرعی حکم سے واقفیت مہیا کرتی ہے مسئلہ جس سے ایک عرب خاتون کو سابقہ ہمیشہ آگیا تھا یہ تھا کہ اگر ایک عورت اسی طرح کا خواب دیکھے صیام طوہر بالغ مرد

دیکھا کرتے ہیں تو وہ کیا کرے اسے پاک ہونے کے لیے مردوں کی طرح غسل کرنے کی ضرورت ہے یا نہیں؟ چونکہ یہ صورت عورتوں کو بہت کم پیش آتی ہے اس لیے عورتیں اس کے شرعی حکم سے ناواقف تھیں۔ چنانچہ وہ خاتون مسئلہ پوچھنے آئیں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں یہ بتا کر کہ عورت کو بھی مرد ہی کی طرح غسل کرنا چاہیے نہ صرف ان کو بلکہ تمام عورتوں کو ایک ضروری تعلیم دے دی اب بتلایا جائے کہ اس میں کونسی بات اخلاقی لحاظ سے محبوب تھی کیا ان عرب خاتون کا مسئلہ پوچھنا کوئی عیب کی بات تھی؟ کیا انہیں مسئلہ پوچھنے کے بجائے شرم کا لحاظ کرتے ہوئے جو کچھ ان کی اپنی سمجھ میں آتا وہی کر لینا چاہیے تھا۔ ہماری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ معترفین کو اس میں کونسی بات غیر اخلاقی نظر آتی ہے۔

جنابت اور حیض کے بارے | جو تھی اور پانچویں احادیث میں جو مضمون حضرت عائشہؓ کی زبانی بیان ہوا ہے اس کی اصل میں قدیم تعصبات کا اثر الہ | حقیقت سمجھنے کے لیے اس پس منظر کا ہانا

ضروری ہے جو ان احادیث کو روایت کرتے وقت حضرت عائشہؓ کے پیش نظر تھا۔ دراصل جنابت اور حیض کی حالت میں انسان کے ناپاک ہونے کا تصور شریعت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی طرح قدیم شریعتوں میں بھی تھا لیکن قدیم شریعتوں میں یہودی اجاز اور عیسائی راہبوں کی مبالغہ آرائیوں نے اس تصور کو حد اعتدال سے اس قدر بڑھا دیا تھا کہ وہ جنابت اور حیض کی حالت میں انسان کے وجود ہی کو ناپاک خیال کرنے لگے تھے۔ ان کے زیر اثر اہل جہان و مدینہ میں بھی یہ تصور حد مبالغہ کو پہنچ گیا تھا خصوصاً عائشہ عورت کے ساتھ تو رہنا سمنا بھی گناہ خیال کیا جانے لگا تھا چنانچہ روایات میں آتا ہے کہ جب عورت کو حیض آتا تھا تو یہودی اس کے ساتھ کھانا پینا اور اس کے ساتھ رہنا سمنا چھوڑ دیتے تھے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف

لائے تو آپؐ نے بتایا کہ اس حالت میں صرف فعل مباشرت ناجائز ہے اس کے علاوہ میل جول بہن سہن کھانا پینا غرض ہر قسم کی معاشرت عائضہ عودت کے ساتھ اسی طرح رہتی ہے جیسی اس کے پاک ہونے کی حالت میں ہوتی ہے۔ اس کے بعد اگرچہ اس سلسلے میں بنیادی غلط فہمی رفع ہو گئی تھی تاہم قدیم تعصبات کے زیر اثر ایک مدت تک لوگ یہ سمجھتے رہے کہ جنابت اور حیض کی حالت میں انسان کا وجود کچھ نہ کچھ تو گذارتہا ہی ہے اس لیے اس حالت میں اس کا ہاتھ جس چیز کو لگ جائے وہ بھی کم از کم مکروہ تو ضرور ہو جاتی ہوگی۔

یہ تھا وہ پس منظر جس میں زیر بحث دونوں حدیث اور اسی قسم کی دوسری احادیث روایت ہوئی ہیں۔ مذکورہ بالا مبالغہ آمیز تصورات کو اعتدال پر لانے کے لیے ازواج مطہرات کو یہ بتانا پڑا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خود اسی حالت میں کوئی اجتناب نہیں فرماتے تھے آپؐ کے نزدیک عائضہ یا جنینی عورت کے ہاتھ لگانے سے جب پانی جیسی سیال اور تر چیز گندی نہیں ہوتی تھی تو کسی برتن یا کپڑے وغیرہ کے گندے ہو جانے کا تو سوال ہی کیا۔ بلکہ پانچویں حدیث میں تو یہ بتلایا گیا کہ عائضہ عورت کا ہاتھ تو ہاتھ ہے منہ بھی لگ جائے تو کوئی چیز گندی نہیں ہوتی۔ نیز اس قسم کی احادیث میں یہ بھی واضح کیا گیا کہ عائضہ بیوی کے ساتھ اس کا شوہر صرف مباشرت کا مخصوص فعل نہیں کر سکتا باقی ہر قسم کا اختلاط جائز ہے۔ اب در سوچئے اگر ازواج مطہرات نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ان افعال پر ہمیں مطلع نہ کیا ہوتا تو قدیم تعصبات کے زیر اثر ہمیں اپنی خانگی زندگی میں کیسی کیسی مشکلات سے سابقہ پیش آتا۔

ازواج مطہرات کی مرویات کے بعد اب ہم چند ایسی احادیث کا جائزہ لیتے ہیں جو دوسرے راویوں سے روایت ہوئی ہیں۔ مثلاً

(راوی) کہتے ہیں کہ میں نے حضرت جابر بن عبد اللہؓ کو کہتے سنا ہے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں ایک

(۱) قال سمعت جابر بن عبد اللہ يقول كنا نستمتع

مٹھی چھوڑا روں یا ایک مٹھی آٹے کے عوض چند روز کے لیے متو کر لیا کرتے تھے یہاں تک کہ حضرت عمرؓ نے ہمیں منع کیا۔

(حضرت سُبْرَةُ الْجَحَنِّي) روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں متو کرنے کی اجازت دی تو میں اور ایک اور شخص بنی عامر کی ایک عورت کے پاس گئے عورت نوجوان اور دراز گردن تھی سو ہم نے اپنے آپکو اس پر پیش کیا وہ بولی کیا دو گے میں نے کہا میری چادر حاضر ہے میرا ساتھی بولا میری بھی چادر حاضر ہے اور میرے ساتھی کی چادر میری چادر سے اچھی تھی مگر میں اس سے جوان زیادہ ہر تھا عورت جب میرے ساتھی کی چادر دیکھتی تو وہ اسے پسند آتی اور جب مجھے دیکھتی تو میں اسے پسند آتا پھر وہ بولی کہ تو اور تیری چادر مجھے کافی ہے پھر میں اسکے پاس تین دن رہا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان فرما دیا کہ اگر کسی کے پاس یہ میعاد نکاح والی عورتیں ہوں تو وہ انہیں آزاد کر دے۔

بالقبضة من التمر والدقيق  
الأيام على عهد رسول الله  
صلى الله عليه وسلم وأبي  
بكر حتى نفى عنه عمر  
(مسلم کتاب النکاح باب نکاح المتعة)  
(۲) قال أذن لنا رسول الله صلى  
الله عليه وسلم بالمتعة فأنطلقت  
أنا ورجل إلى امرأة من  
بنی عامر كانها بكرة حبيطة  
فعرضنا عليها أنفسنا فقالت  
ما أعطني فقلت ردائي وقال  
صاحبی ردائي وكان قد دار صاحبی  
اجود من ردائي وكنت أشب  
منه فإذا انظرت إلى رداء  
صاحبی أعجبها وإذا انظرت  
إلى أعجبها ثم قالت أنت  
ورداك يكفيني فمكثت  
معه ثلاثاً ثم إن رسول  
الله صلى الله عليه وسلم قال  
من كان عنده شيء من  
هذه النار التي يتمتع فليخل  
سبيلها۔

(مسلم کتاب النکاح باب نکاح المتعة)

(۳) أَخْبَرَنِي عَطَاءٌ قَالَ سَمِعْتُ  
جَابِرَ بْنَ عَبْدِ اللَّهِ رَضِيَ اللَّهُ  
عَنْهُمَا فِي نَاسٍ مَعِيَ قَالَ أَهْلَلْنَا  
أَصْحَابَ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ  
بِالْحَجِّ خَالصًا وَحَدَّثَ قَالَ عَطَاءُ  
قَالَ جَابِرٌ فَقَدِمَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ  
عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَبَّحَ رَابِعَةٍ مَضَتْ  
مِنْ ذِي الْحِجَّةِ فَأَمَرْنَا أَنْ نَحْلَلَ  
قَالَ عَطَاءُ قَالَ أَهْلُوا وَاصْبُوا النِّسَاءَ  
قَالَ عَطَاءُ وَلَمْ يَعِزْ عَلَيْهِمْ  
وَلَكِنْ أَهْلَيْنَ لَهُمْ فَقُلْنَا لِمَا لَمْ  
يَكُنْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ عُرْفَةِ الْإِخْشَاقِ  
أَمَرْنَا أَنْ نَقْضِيَ إِلَى نِسَاءِ نَافِثَاتِنَا  
عُرْفَةَ تَقَطُّرَ مَذَاكِينِنَا الْمُنَى.. (المش)

(مسلم کتاب الحج باب بیان وجوب الاقوام)

عطاء روایت کرتے ہیں کہ میں نے چند اشخاص  
کے ساتھ حضرت جابر بن عبد اللہ سے سنا فرمایا  
ہم سب اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے صرت  
حج کا احرام باندھا عطا بیان کرتے ہیں کہ حضرت  
جابر نے فرمایا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جو تھی ذی الحج  
کی صبح کو آئے اور ہمیں حکم دیا کہ احرام کھول دالیں  
عطا کہتے ہیں کہ آپ نے فرمایا احرام کھول دالو  
اللہ (اپنی) بیویوں کے پاس جاؤ عطا بیان کرتے  
ہیں کہ یہ حکم ان پر وجوب کے طور پر نہ تھا بلکہ  
جواز کی حدود میں تھا پس ہم کہہ رہے تھے کہ صرت  
پانچ دن تو عرفات پہنچنے میں رہ گئے ہیں اسباب  
نے ہمیں اپنی بیویوں کے پاس جانے کیلئے کہہ دیا  
(گویا) ہم عرفات اس طرح پہنچیں کہ ہمارے  
اعضائے رئیسہ سے تقاطر متی ہو رہا ہو.....  
الی آخر الحدیث -

حقیقت حال کی وضاحت کے لیے یہ تین احادیث ہی کافی ہیں۔ پہلی دو حدیثیں مشہور  
کے ذکر پر مشتمل ہیں جبکہ تیسری حدیث حج کے بعض احکام سے متعلق ہے۔ جو کوئی بھی تعصب سے  
بالا تر ہو کر ان احادیث کے مضامین میں غور کرے گا اس کا ذہن "تستمتع" یا "یتمتع" یا  
"اصیبوا النساء" جیسے الفاظ سے جماع کے مخصوص عمل کی کیفیت کی طرف منتقل ہونے کے  
بجائے ان مسائل کے جو انہ و عدم جو انہ پر غور کرنے میں مصروف ہو جائے گا جو ان الفاظ  
کے ذکر کا اصل مقصد ہیں مگر کیا کیا جائے منکرین حدیث کی عقل سقیم کا کہ وہ اس قسم کی  
احادیث میں اصل مقصود تلاش کرنے کی صلاحیت ہی سے محروم ہے۔

**متعہ کے مختلف پہلو** | پہلی دو حدیثوں پر اعتراض کرنے سے پہلے اگر منکرین حدیث یہ ماننے کی کوشش کرتے کہ متعہ کی حقیقت کیا ہے اور اس کے بارے میں صحابہ کے کہنے کو نہی بات تحقیق طلب تھی جس کی وضاحت کے لیے صحابہ کو یہ روایات نقل کرنا پڑیں تو شاید ان کا ذہن عربانیت کی طرف منتقل نہ ہوتا اور وہ حقیقت سال کو پا لیتے۔

بات دراصل یہ ہے کہ اسلام سے قبل زمانہ جاہلیت میں نکاح کے جو طریقہ رائج تھے ان میں ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ کسی عورت کو کچھ معاوضہ دے کر ایک خاص مدت کے لیے اس سے نکاح کر لیا جاتا تھا ایسے نکاح کو نکاح متعہ کہا جاتا تھا۔ جیسا کہ اہل علم جانتے ہیں بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا قاعدہ یہ تھا کہ جب تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی چیز کی نہی کا حکم نہیں مل جاتا تھا اس چیز کے بارے میں پہلے سے رائج شدہ طریقے کو آپ منوع نہ فرماتے تھے بلکہ یا تو اس پر سکوت فرماتے یا بوقت ضرورت اس کی اجازت بھی دے دیتے تھے چنانچہ اپنی اسی عادت کے مطابق متعہ کے بارے میں بھی بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ابتداءً اس کے رواج پر سکوت فرمایا مگر بعد میں کسی جنگ یا سفر کے موقع پر اگر لوگوں نے شدت سے اس کی ضرورت ظاہر کی تو اس کی اجازت بھی دے دی کیونکہ اس وقت تک اس کی نہی کا حکم نازل نہ ہوا تھا پھر جب حکم نہی نازل ہو گیا تو آپ نے اس کو قطعاً ممنوع قرار دے دیا لیکن متعہ کی ممانعت کا یہ حکم تمام لوگوں تک نہ پہنچ سکا جس کی بنا پر بعد میں بھی کچھ لوگ نادانفہیت کی بنا پر متعہ کرتے رہے آخر کار حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دور میں اس حکم کی عام اشاعت کی اور پوری قوم کے ساتھ اس رواج کو بند کیا جب تک یہ رواج پوری طرح بند نہ ہو گیا صحابہ کے سامنے متعدد سوالات تحقیق طلب رہے مثلاً یہ کہ بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی متعہ کی اجازت صراحتاً بھی دی تھی یا محض سکوت کے طریقے پر ہی آپ عمل پیرا رہے؟ اور اگر اجازت دی تھی تو کس کس موقع پر؟ نیز یہ کہ آپ نے اسے بعد میں ممنوع قرار دیا ہے یا نہیں؟ اگر دیا ہے تو اس کی عام ممانعت آپ نے کب فرمائی؟ اور کن الفاظ میں اس کام سے روکا؟



یہ اور اسی طرح کے متعدد سوالات تھے جن کی تحقیق مقصود تھی چنانچہ صحابہ میں سے جس جس کے پاس اس مسئلے سے متعلق کوئی علم تھا اس نے دوسروں کے سامنے بیان کیا یہی وجہ ہے کہ یہ محمولہ بالا دو حدیثیں ہی نہیں اور بھی متعدد احادیث اسی قسم کے مضامین کی حامل مختلف کتب حدیث میں آپ کو ملیں گی جن سے اس متعہ کے مسئلے کے مختلف پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے اب انہی زیر بحث دونوں حدیثوں کو لے لیجئے پہلی حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکر کے عہد تک متعہ کے جواز کے بارے میں کچھ غلط فہمیاں لوگوں کے ذہنوں میں موجود تھیں تا آنکہ حضرت عمرؓ نے اپنے عہد میں ان تمام غلط فہمیوں کا ازالہ فرمایا اور متعہ کے عدم جواز سے متعلق حکم بنوی کو عام روانہ دیا۔ اسی طرح دوسری حدیث سے متعہ کے ایک اور پہلو پر روشنی پڑتی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ بعض مواقع پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے متعہ کی صریح اجازت بھی دی تھی تاہم بعد میں اس کی قطعی ممانعت بھی فرمادی تھی۔ یہی حال اس قسم کے مضامین پر مشتمل دیگر تمام احادیث کا ہے کہ ان سے اس مسئلے سے متعلق کسی نہ کسی پہلو کی وضاحت ہوتی ہے۔ اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ اگر صحابہ یہ احادیث روایت نہ کرتے تو متعہ کے بارے میں متذکرہ بالا تحقیق طلب مسائل کیسے حل ہوتے نیز بعد میں آنے والے فقہاء اور اسلامی قانون کی تدوین کرنے والے آخر کس بنیاد پر متعہ کے جواز و عدم جواز کا فیصلہ کرتے۔

تیسری حدیث حضرت عابرہ کی روایت کردہ ان متعدد احادیث میں سے ایک ہے جن میں انہوں نے احرام سے تعلق رکھنے والے چند قواعد کا تذکرہ کیا ہے۔ اس

## حج و عمرہ سے متعلق ایک غلط فہمی کا ازالہ

حدیث میں جو واقعہ بیان ہوا ہے اس کا پس منظر دراصل یہ تھا کہ گذشتہ رسوم مالوفہ کی بنا پر بعض لوگوں کے دلوں میں یہ غلط خیال بیٹھا ہوا تھا کہ ایام حج میں عمرہ نہیں ادا کیا جاسکتا اس غلط خیال کو دور کرنے کے لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر ہر ذی الحجہ کو طواف وسعی سے فارغ ہو کر لوگوں کو حکم دیا کہ جو لوگ اپنے

ساتھ قربانی کا جانور نہیں لائے وہ احرام کھول دیں چونکہ آپ ایام جاہلیت کے اثرات کو بیخ دین سے اکھاڑ بھینکنا چاہتے تھے اس لیے ساتھ ہی آپؐ نے یہ بھی فرمایا کہ احرام کھول کر تم اپنی بیویوں کے پاس جاؤ اس سے مقصود صرف اتنا تھا کہ احرام کی تمام پابندیوں کا دفع ہو جانا متحقق ہو جائے اور لوگوں کے ذہن میں کوئی شک باقی نہ رہے مگر اس کے باوجود بھی بعض لوگ احرام کھولتے ہوئے ہتھکے اور آپس میں تعجب کا اظہار کرتے ہوئے کہنے لگے کہ کیا ہم اس حالت میں عرفہ کی طرف روانہ ہوں گے کہ ہم بہر احرام کی کوئی پابندی نہ ہوتی کہ ہمیں اپنی بیویوں سے تمتع ہونے کی بھی کھلی چھٹی ہو اسی استعجاب کو انہوں نے تقطرمذا کیوننا المنی کے الفاظ سے تعبیر کیا بعض لوگوں کے اسی مذہب پر نبی کریم صلی علیہ وسلم نے وہ فقرہ ارشاد فرمایا تھا جو اسی روایت میں آگے چل کر آتا ہے کہ میں تم سے زیادہ خدا سے ڈرنے والا ہوں اگر میرے ساتھ قربانی کے جانور نہ ہوتے تو میں بھی تمہارے ساتھ ہی احرام کھول دیتا۔

یہ واقعہ بعد میں حضرت جابرؓ کو اس لیے سنانا پڑا کہ بعد میں بھی بعض لوگوں کو یہ شک باقی رہ گیا تھا کہ جو شخص احرام باندھ کر حج سے پہلے مکہ پہنچا ہو وہ آیا طوات و سعی کرنے کے بعد حلال ہو سکتا ہے یا نہیں اور آیا اس کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ حج کا زمانہ آنے پر حرم ہی سے احرام کا آغاز کرے اس شک کو دور کرنے کے لیے حضرت جابرؓ نے یہ حدیث سنائی تھی۔

اب تک کی گفتگو سے قارئین کو اندازہ ہو گیا ہو گا کہ وہ تمام احادیث جن کا ہم نے ابھی تفصیل سے جائزہ لیا ہے وہ سب کی سب انسانی زندگی کے بعض انتہائی اہم مسائل سے متعلق ضروری علم مہیا کرتی ہیں اگر کوئی اس علم سے آنکھیں بند کر کے ان احادیث کو صرف اپنے اعتراضات کا تحقیر مشق بناتا ہے تو اپنی عقل کے سقیم و بیمار ہونے کا خود ثبوت مہیا کرتا ہے احادیث کے مرتبہ و مقام میں کوئی فرق نہیں آتا یہ چند احادیث ہم نے نمونے کے طور پر پیش کر دی ہیں انہی پر ان تمام احادیث کو قیاس کر لیا جائے جو ان احادیث کے علاوہ منکرین حدیث کی جانب سے اس ضمن میں پیش کی

جاتی ہیں۔

۴۔ خلاف علم و تجربہ روایات | اب اس کے بعد ہم منکرین حدیث کے پوچھتے اعتراض کی طرف توجہ کرتے ہیں۔

ان کا ایک اعتراض یہ ہے کہ صحیح احادیث کے ذخیرے میں بعض روایات ایسے دعاوی پر مشتمل ہیں جو تجربے کی کسوٹی پر پورے نہیں اترتے اور ظاہر ہے نبی کے دعاوی کبھی غلط نہیں ہوتے بنا بریں یہی سمجھا جائے گا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ان تمام دعاوی کی نسبت غلط ہے۔

اس اعتراض کے پیچھے بھی منکرین حدیث کی وہی منفی سوچ کلام کر رہی ہے جب تک وہ اس حقیقت کو اصولی طور پر تسلیم نہیں کر لیتے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے فرستادہ ہونے کی بنا پر ان غیبی اسرار سے آگاہ تھے جن سے کوئی دوسرا بشر آگاہ نہیں ہے اور جب تک وہ یہ نہیں مان لیتے کہ ملائکہ اعلیٰ سے ہمہ وقت رابطہ حاصل ہونے کی بنا پر آپ کا ہر قول اور ہر فعل نور و حکمت اور علم و معرفت سے معمور ہوتا تھا اس وقت تک ان کو قدم قدم پر اسی طرح ٹھوکریں لگتی رہیں گی۔

اول تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی صحیح حدیث ایسی ہے ہی نہیں جو علم و تجربے کے معیار پر پوری نہ اترتی ہوتا ہم بالفرض اگر کوئی ایسی حدیث ہو بھی جو اب تک کے معروضات علم اور آج تک کے معلوم تجربے کے خلاف ہو تو کیا یہ ممکن نہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی ایسی بات کی خبر دی ہو جو موجودہ زمانے میں رائج علوم و معارف سے تو ہم آہنگ نہ ہو لیکن آئندہ زمانوں میں انسانی دسترس کی حدود میں آنے والے علم و آگاہی کے ذرائع اس کی تصدیق کرتے ہوں۔ مثلاً یہ عین ممکن ہے کہ آپ نے فلسفہ حیات انسانی سے متعلق کوئی ایسی بات ارشاد فرمائی ہو جو آج کے دور میں لوگوں کی سمجھ سے باہر ہو مگر وہی فلسفیانہ ارشاد اس دور کے عین مطابق ہو جب فلسفیانہ نقطہ عمل پر پہنچ جائے گا۔ غرض اگر کسی زمانے میں لوگوں پر کسی ارشاد رسول کی حکمت و مصلحت واضح نہ ہو سکے تو اس سے یہ نتیجہ نکالنا بالکل غلط ہے کہ وہ حدیث ہی موضوع ہے۔

**سوسال بعد دنیا کا خاتمہ** | بہر حال منکرین حدیث اگر اپنی سوچ کا رخ درست کر لیں تو خود اس بات کا اقرار کرتے نظر آئیں گے کہ

کوئی ایک بھی صحیح حدیث ایسی نہیں جو انسانی علم و تجربے کے خلاف ہو۔ ان کی جانب سے جتنی بھی روایات اس سلسلے میں پیش کی جاتی ہیں اگر ذرا بھی بہ نظر غور ان کا جائزہ لیا جائے تو کوئی ایک حدیث بھی ایسی نہیں رہتی جس پر خلافت علم و تجربہ ہونے کا اعتراض صادق آسکے۔ مثال کے طور پر ان کی طرف سے پیش کی جانے والی اسی روایت کو لے لیجئے جس میں ذکر ہے کہ سوسال کے بعد زمین پر کوئی جاندار زندہ نہیں رہے گا۔ یہ روایت دراصل اس حدیث کا ایک جزو ہے جس کو امام بخاری نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے کتاب العلم میں نقل کیا ہے۔ پوری حدیث اس طرح ہے :

(حضرت عبداللہ بن عمر نے) بیان کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اخیر عمر میں ہم کو غشا کی نماز پڑھائی جب سلام پھیرا تو کھڑے ہوئے اور فرمایا کیا تم نے اس رات کو دیکھا (اسے یاد کھنا) اب سویرے کے بعد جتنے لوگ اس وقت زمین پر ہیں ان میں سے کوئی (زندہ) نہیں رہے گا۔

قَالَ صَلَّى بِنَا النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْعِشَاءَ فِي آخِرِ حَيَاتِهِ فَلَمَّا سَلَّمَ قَامَ فَقَالَ أَرَأَيْتُمْ لَيْلَتَكُمْ هَذَا فَإِنْ رَأَسَ مَائَةِ سَنَةٍ مِنْهَا لَا يَبْقَى مِنْهُ أَحَدٌ يَخْضَعُ لِرَأْسِ أَحَدٍ

(بخاری - العلم باب السمر في العلم)

منکرین حدیث نے اس حدیث کا مطلب یہ سمجھا ہے کہ دنیا سوسال کے بعد ختم ہو جائے گی اور پھر اسی بنیاد پر اسے موضوع ٹھہرایا ہے کہ یہ تاریخی حقائق اور جس و مشاہدے کے خلاف ہے۔

اس حدیث پر تبصرہ کرنے سے پہلے نہیں منکرین حدیث سے یہ پوچھنا ہے کہ امام بخاری نے اس روایت کو کتاب الصلوٰۃ میں بھی لیا ہے کیا وجہ ہے اس کو اختیار کرنے کے بجائے منکرین حدیث کی نظر انتخاب اسی کتاب العلم والی روایت پر کیوں پڑی کیا یہ حقیقت نہیں کہ کتاب الصلوٰۃ والی روایت انہوں نے صرف اس لیے نہیں لی کہ اس میں

ان کے اعتراض کا جواب موجود تھا۔ اس روایت میں چونکہ ”الیوم“ کا لفظ اس ارشاد نبوی کا صحیح مفہوم متعین کر دیتا تھا جس کے بعد متذکرہ بالا اعتراض کی کوئی گنجائش ہی باقی نہیں رہ جاتی تھی اس لیے منکرین حدیث کا فائدہ اسی میں تھا کہ اس روایت سے صرف نظر کر لیا جائے۔

در اصل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا مطلب یہ تھا کہ اس وقت جبکہ میں یہ الفاظ کہہ رہا ہوں دنیا میں جتنے لوگ ہیں سو سال کے اندر اندر سب مر جائیں گے یہ مطلب ہرگز نہ تھا کہ سو سال کے بعد دنیا ہی ختم ہو جائے گی۔ اگرچہ کتاب العلم والی روایت میں بھی ”لیلتکم هذا“ کے الفاظ اسی مفہوم پر دلالت کرتے ہیں تاہم کتاب الصلوٰۃ والی روایت تو اس مفہوم کی تفسیر میں بالکل ہی صریح ہے۔ اس حدیث کے الفاظ ملاحظہ فرمائیے :

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہا تمہارے اس رات کو دیکھا اب سے سو برس کے بعد جتنے لوگ آج پشت زمین پر ہیں ان میں سے کوئی باقی نہیں رہے گا۔

فَقَالَ أَوَإِيَّتُمْ لِيَلْتَكُم هَذِهِ فَإِنْ دَأْسُ مِائَةِ سَنَةٍ مِنْهَا لَا يَبْقَى مِنْ هَؤُلَاءِ يَوْمَ عَلَى ظَهْرٍ لَارِضٍ

(بخاری۔ الصلوٰۃ باب ذکر العشاء والعتمة)

اس ارشاد سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصود اس بات پر متنبہ کرنا تھا کہ تمہاری عمریں پہلی امتوں کے مقابلے میں بہت کم ہیں لہذا عبادت کی زیادہ سے زیادہ کوشش کرنی چاہیے۔ نیز اس کے ساتھ ہی ان الفاظ میں مجزا طور پر ایک پیش گوئی بھی موجود تھی کہ پوری ایک صدی گزرنے پر موجودہ لوگوں میں سے کوئی بھی زندہ نہیں رہے گا چنانچہ یہ پیش گوئی پوری بھی ہوئی صحابہ میں سے جس کی موت سب کے بعد واقع ہوئی وہ حضرت ابوطیفیل عامر بن دائلہؓ تھے جنہوں نے سنہ ہجری میں وفات پائی جبکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد سنہ ہجری کا واقعہ ہے اس طرح اس ارشاد کے دن سے لیکر آخری صحابی حضرت ابوطیفیل کی وفات تک پورے سو سال بنتے ہیں۔

یہ بات کہ یہ کیسے پتہ لگا کہ آپؐ نے یہ سلسلہ ہجری میں ارشاد فرمایا تھا تو اول تو کتاب العلم والی روایت میں فی آخر حیاتہ کے الفاظ خود اس پر دلالت ہیں دوسرہ حدیث جو امام مسلم نے حضرت جابرؓ سے روایت کی ہے اس میں یہ صراحت موجود ہے کہ یہ ارشاد بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال سے ایک مہینہ پہلے کا واقعہ ہے اور یہ معلوم ہے کہ بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ماہ ربیع الاول سلسلہ ہجری میں ہوا ہے۔

منکرین حدیث کی علمی دیانت ملاحظہ ہوا انہوں نے اس سلسلے میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی وضاحت کو بھی درخور اعتناء سمجھا۔ دراصل خود صحابہ کے زمانے میں بھی بعض لوگوں کو بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا صحیح مطلب سمجھنے میں دھوکہ لگ گیا تھا ان کے ذہن میں صرف صدی کا مفہوم باقی رہ گیا انہوں نے آپؐ کے الفاظ آج جو زمین کی پشت پر زندہ ہے کی طرف توجہ نہ دی اور اس غلط فہمی میں پڑ گئے کہ ساری دنیا ہی سو سال بعد ختم ہو جائے گی۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے ایک موقع پر ایسے لوگوں کو سمجھایا اور متذکرہ الفاظ کی طرف توجہ دلاتے ہوئے آپؐ کے اس ارشاد کا اصل مقصود واضح کیا۔ حضرت ابن عمرؓ کی یہ وضاحت امام مسلم نے کتاب فضائل الصحابہ میں نقل کی ہے۔ اس وضاحت کے الفاظ ہیں :

<p>لوگوں کو سو سال والی احادیث کے بارے میں بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کا مطلب سمجھنے میں غلطی لگ گئی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو یہ کہا تھا کہ جو انسان زمین کی پشت پر آج کے دن موجود ہیں ان میں سے کوئی باقی نہیں رہے گا اور مراد یہ تھی کہ اس صدی کے آخر تک (یہ موجودہ نسل) ختم ہو جائے گی۔</p>	<p>فَوَلَّ النَّاسَ فِي مَقَالَةٍ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثَلَاثَةً فِيهَا يَتَخَدُّونَ مِنْ هَذِهِ الْأَحَادِيثِ عَنْ مِائَةِ سَنَةٍ رَأَيْنَا قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَبْقَى مِمَّنْ هُوَ الْيَوْمَ عَلَى ظَهْرِ الْأَرْضِ أَحَدٌ يَرِيدُ بِذَلِكَ أَنْ يَنْخُصَّ ذَلِكَ الْقَوْمَ (مسلم کتاب فضائل الصحابہ بیان معنی قولہ علی رأس مائة).</p>
---	--

حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما کی اس وضاحت سے آنکھیں بند کر لینا اندر دے دے  
جانا کہ زیر بحث حدیث تاریخی حقائق کے خلاف ہے منکرین حدیث کی علمی بددیانتی تو سب  
ہی خوفِ خدا سے ان لوگوں کے عاری ہونے کی دلیل بھی ہے۔

غرض کتنی عجیب بات ہے جو حدیث بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک عظیم مجزے  
پر مشتمل تھی منکرین حدیث کا تختہ مشق بن کر موضوعِ ادب تاریخی حقائق کے خلاف قرار پائی۔  
علا بریں عقل و دانش بیاہ گریست۔

**عجودہ کجور کی تاثیر** | اسی طرح ایک اور حدیث جو منکرین حدیث کا تختہ مشق بنی ہے  
وہ ہے جس کو امام بخاری نے کتاب الطب میں حضرت سعد بن  
ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے اس کو بھی دیکھ لیجئے۔ بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم  
کا ارشاد ہے:

جس نے ہر روز علی الصبح عجودہ نامی کجور پکھلی  
اس پر اس رات تک نہ ہراندھا وہ شفا نازد  
ہرگز ایک دوسری روایت میں سات کجور مل  
(کے الفاظ) ہیں۔

من اصطبغ کلَّ یوم قموات  
عجودۃ لَّمْ یضُرَّ سَمٌّ وَلَا سِجَرٌ  
ذَٰلِكَ الْیَوْمَ اِلَى الْلَیْلِ وَقَالَ غِبْرَةُ

سبع قموات -  
(بخاری۔ الطب باب الداء بالجودة)

منکرین حدیث کی عجودہ نامی کجور کی اس تاثیر سے انکار ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ طب جدید نے  
اس مخصوص کجور میں کوئی ایسی تاثیر یا خاصیت نہیں پائی جو نہ ہر یا جانور کے ملنے میں مفید ہوتی ہو  
اس لیے معلوم ہوتا ہے یہ حدیث صحیح نہیں ہے۔

عجودہ نامی کجور کے بارے میں طب جدید کیا رائے رکھتا ہے کیا نہیں اس سے تو ہم بعد  
میں بحث کریں گے پہلے ہمیں یہ بتایا جائے کہ کیا طب جدید نے دُنیا کے تمام ماکولات و مشروبات  
نہایتِ اندمیرہ ہلت کی خاصیات کا احاطہ کر لیا ہے یا دوسری صورت میں طب جدید نے  
کہیں یہ دعویٰ کیا ہے کہ اس نے عجودہ کی تمام تاثیرات اور تمام خاصیات معلوم کر لی ہیں اگر  
ایسا کوئی دعویٰ طب کی دُنیا میں موجود نہیں تو پھر یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ عجودہ میں نفلان تاثیر

سرسے سے موجود ہی نہیں ہے اگر عجوہ میں ابھی تک جادو اور نہ ہر کے لیے مفید خواص کا سراغ نہیں لگایا جاسکا تو کیا یہ ممکن نہیں کہ مستقبل میں جب اس کجور پر باقاعدہ طبی تحقیق کی جائے تو بہت سے ایسے نئے خواص کا پستہ پچلے جو مفید نہ ہر یا مفید سحر ہوں۔ علاوہ ازیں مختصر ہی دیر کے لیے مرض کر لیجئے کہ طب جدید نے عجوہ نامی کجور پر پوسٹی طبی تحقیق کے بعد یہ فیصلہ دے دیا ہے کہ اس میں متذکرہ تاثرات میں سے کوئی تاثر موجود نہیں ہے تو اس کے بعد بھی یہ امکان پھر بھی باقی رہے گا کہ آئندہ طب کا علم مزید ترقی کرے اور تخیل و تجزیہ کا کرنی ایسا نیا طریقہ دریافت ہو جائے جس کی مدد سے عجوہ کی کچھ مزید تاثرات و خاصیات کا انکشاف ہو کیا کوئی شخص یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ طب کا علم اپنی آخری حد کو پہنچ گیا ہے اور اب اس پر مزید کسی اضافے کا کوئی امکان نہیں۔

یہ تو تھی ایک اصولی بات رہا عجوہ کے بارے میں طب جدید کی رائے کا معاملہ تو یہ کہتا سرے سے یہ ہی غلط کہ طب جدید نے اس مخصوص کجور میں کوئی ایسی تاثر یا خاصیت نہیں پائی جو نہ ہر یا جادو کے علاج میں مفید ہوتی ہو اس لیے کہ طب جدید میں یہ امر ایک طے شدہ حقیقت کے طور پر تسلیم کیا گیا ہے کہ عجوہ غذا بخش اور یلین موہ ہوتی ہے یہ کجور جسم میں حرارت کے ساتھ ساتھ فرحت اور نشاط پیدا کرتی ہے نتیجتاً اس کو اگر نہار منہ کھانا معمول بنالیا جائے تو جس مادے سے معدہ میں کیرے بنتے ہیں وہ کمزور پڑ جاتا ہے اور کیرے مرجاتے ہیں اور اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ اندرونی امراض کے پیدا ہونے کی بڑی وجہ انتڑیوں میں بدبو اور کیروں کا پیدا ہو جانا ہی ہے جب یہ معاملہ بڑھ جاتا ہے تو جسم میں نہ ہر پیدا ہو جاتا ہے جو بالآخر جان لیوا ثابت ہوتا ہے بنا بریں حدیث میں جو یہ ارشاد ہوا ہے کہ عجوہ نہ ہر یلے اثرات کو ختم کر دیتی ہے معلوم ہوا کہ بالکل درست ہے۔

اسی طرح عجوہ سے جادو کے اثرات کا زائل ہو جانا بھی کوئی ایسی بات نہیں جو بعید از عقل و قیاس ہو۔ اس حقیقت سے تو کسی کو بھی انکار نہیں کہ جادو ایک نفسیاتی مرض ہے طب جدید نے بھی اس کو تسلیم کر لیا ہے کہ تخیلات و توہمات بعض امراض میں بڑا اہم پارٹ



ادا کرتے ہیں تو نفسیاتی مرض ہونے کی بنا پر ظاہر ہے ہادو کا علاج بھی نفسیاتی ہی ہونا چاہیے۔ اب ذرا تجزیہ کیجئے جب ایک سحر زدہ شخص عجوبہ کے ان پہلوؤں پر غور کرے گا کہ یہ جسم انسانی کو حرارت بخشتی ہے فرحت و نشاط بہم پہنچاتی ہے بدن کو تقویت دیتی ہے کیرڈن کو مارتی اور فضلات کے تعفن کو دور کرتی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جب وہ اس حقیقت میں غور کرے گا کہ عجوبہ کجور کو اللہ کے رسول نے جس کی بات ہمیشہ قطعی اور حتمی ہوتی ہے جادو کے مرض کے لیے مفید بتایا ہے تو نفسیاتی طور پر اس کے اندر قوتِ مدافعت بڑھ چکی جو جادو کے اثر اس میں مؤثر نہ ہوگی۔

**کھمب کی خاصیت** | طب ہی کی بنیاد پر منکرینِ حدیث نے اس حدیث کو بھی اپنی تنقید کا نشانہ بنایا ہے جس میں ذکر ہے کہ کھمب (جس

کو سانپ کی چھتری بھی کہا جاتا ہے اور جو برسات کے زمانے میں عموماً کوڑے کرکٹ کے ڈھیر پر انہوداگ آتی ہے) کا پانی آنکھ کے لیے باعثِ شفا ہے۔ اس حدیث کا متن یہ ہے:

الْكَمْبُ مِنَ الْمِنْ وَ مَا رَ هَا شِفَا  
لِلْعَيْنِ۔

کھمب (یا سانپ کی چھتری) ترنجبین (کی قسم) سے ہے اور اس کا پانی آنکھ کے لیے باعثِ شفا ہے۔

وغاری کتاب الطب باب المن شفا للعين۔

اس حدیث پر بھی منکرینِ حدیث کو یہی اعتراض ہے کہ یہ طبی تحقیق کے خلاف ہے اس لیے صحیح نہیں ہے۔

اس حدیث کے بارے میں بھی اول تو اصولی بات وہی ہے کہ آج اگر انسان کی تحقیق میں کھمب کی یہ تاثیر نہیں آئی جو حوالہ بالا حدیث میں بیان ہوئی ہے تو اس کا امکان ختم تو نہیں ہوا کہ کل انسانی تحقیق میں اس تاثیر کا وجود ثابت ہو جائے دوسرے ہیں حیرت اس بات پر ہے کہ منکرینِ حدیث ایک طرف تو اخبارِ احاد کے پورے کے پورے فہرے کو صرف اس بنیاد پر بے کار اور ناقابلِ اعتماد ٹھہراتے ہیں کہ ان سے علمِ طبی حاصل ہوتا ہے جو کہ فی الحقیقت یقین ہی کی ایک قسم ہے دوسری طرف محض انذارِ علماء اور تخیلوں پر اس قدر اعتماد کرتے ہیں کہ ان کو احادیثِ نبوی کے صحیح و غیر صحیح ہونے کا معیار

قرار دیتے ہیں۔ کسی چیز کی کوئی خاصیت جو اطباء بیان کرتے ہیں وہ سب ان کے اندازے اندہ تخمینے ہی تو ہوتے ہیں۔ ان اندازوں اور تخمینوں کی بنیاد پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کو جو وحی و برہان پر مبنی ہونے کی وجہ سے یقیناً قطعی اور حتمی ہیں مشکوک اور غلط قرار دینا کہاں کی دانش مندی ہے۔ آج اگر ایک حدیث اس لیے قابل قبول نہیں کہ وہ طب کی تحقیق کے خلاف ہے تو کل اگر طب کی تحقیق اس کے حق میں ہو گئی تو یقیناً وہ قابل قبول بن جائے گی اس کا مطلب یہ ہوا کہ طب کی بات تو قابل قبول ہے جو ایک عام انسان سے زیادہ کچھ نہیں مگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بات قابل قبول نہیں جو محضر ضیق کے نزدیک بھی اللہ کے رسول ہیں اس چہ بوالعجبی است

علاوہ ازیں یہ کہنا ہی غلط ہے کہ کھمب میں وہ تاثیر نہیں پائی جاتی جو حدیث میں بیان ہوئی ہے اس لیے کہ البوسہل مسیحی اور ابو علی سینا جیسے مسلم و مشہور اطباء کی تحقیق تو یہ ہے کہ کھمب کا پانی بصارت کو تیز کرتا ہے نیز اگر اس کو سردی کے طور پر استعمال کیا جائے تو اس سے ظلمت بصر دور ہوتی ہے اور دکھتی آنکھ ٹھیک ہو جاتی ہے۔ حافظ ابن قیم نے زاد المعاد میں ان دونوں اطباء کی اس تحقیق کو زیر بحث حدیث کی صداقت پر گفتگو کرتے ہوئے دلیل کے طور پر بیان کیا ہے۔ انہوں نے مشہور طبیب غافقی کا بھی حوالہ دیا ہے وہ کہتے ہیں کہ اس طبیب کی مفردات میں لکھا ہے کہ اگر کھمب کے پانی کو مشہور دوا اٹمد کے پانی میں گوندھ کر سردی کے طور پر استعمال کیا جائے تو اس سے آنکھ کی پلکوں کو تقویت پہنچتی ہے اور قوت بصارت میں اضافہ ہوتا ہے۔

کیا یہ تمام مشاہیر اطباء منکرین حدیث کے نزدیک ناقابل اعتماد ہیں؟ اگر جواب اثبات میں ہے تو براہ کرم ہمیں بتایا جائے وہ کونسے اطباء ہیں جن کو منکرین حدیث کے یہاں اعتماد کا درجہ حاصل ہے پھر اس کے ساتھ ہی یہ بھی بتایا جائے کہ کیا ان کے معتمد اطباء نے روئے زمین پر پیدا ہونے والی ہر کھمب کا تجربہ و تجزیہ کر لیا ہے اور

اس کی سب سے پہلی تحقیق مکمل کر لی ہے خصوصاً اسی طرز و انداز کی کتب پر جو عہد رسالت میں سرزمین حجاز میں پائی جاتی تھی کیا انہوں نے کوئی تجربہ کیا؟ اور سب سے پہلے کہ اور بنیادی بات یہ کہ کیا ان اطباء کی ریسے میں طب اپنے نقطہ کمال کو پہنچ گیا ہے کہ اب جو چیز بھی اس کی تحقیق میں نہیں آئی یا اس کے خلاف ثابت ہوئی وہ مردود قرار دے دی جائے۔

بات کچھ بھی نہیں منکرین حدیث کے پیش نظر صرف اعتراض کرنا ہے اسی مقصد کو ذہن میں رکھ کر وہ کتب حدیث کو کنگھانا شروع کرتے ہیں اور جہاں جہاں کوئی بات انہیں اپنے مطلب کی نظر آتی ہے بلا تحقیق و تنقیح اور بغیر کچھ سوچے سمجھے اس کی بنیاد پر احادیث بنوی پر اعتراضات وارد کرتے چلے جاتے ہیں خواہ بعد ان میں سے کوئی بھی اعتراض ثابت نہ ہو سکے وقتی طور پر نادانقت حال لوگوں کو دھوکہ دینے میں تو وہ کچھ نہ کچھ کامیاب ہو ہی جاتے ہیں اور یہی ان کا مصلح نظر ہے۔

**۵۔ باہم متعارض روایات** | اب آئیے منکرین حدیث کے اس اعتراض کی طرف

گنا ہے کہ اکثر صحیح احادیث باہم متعارض ہیں اور یہ قاعدہ مسلمہ ہے کہ متعارض اشیاء ساقط الاعتبار ہوتی ہیں لہذا احادیث بھی باہم متعارض ہونے کی بنا پر ساقط الاعتبار قرار پائیں۔

یہ اعتراض بھی دراصل معتز ضیق کی کم علمی کا غماز ہے۔ منکرین حدیث کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ کتب حدیث کا متقابل مطالعہ انہیں حاصل نہیں وہ احادیث کے بارے میں جو فیصلہ کرتے ہیں اپنے محدود مطالعے کی بنیاد پر کرتے ہیں اگر یہ بات نہ ہوتی تو وہ یہ کبھی نہ کہتے کہ اکثر احادیث باہم متعارض ہیں۔ جن لوگوں کی احادیث کے پورے ذخیرے پر نظر ہے وہ جانتے ہیں کہ احادیث کے درمیان اتفاق بہت زیادہ اور اختلاف بہت کم ہے مثلاً احادیث صفات و فضائل میں کوئی تعارض نہیں احادیث اختلاف و تفاق میں بھی کہیں تعارض نظر نہیں آتا اسی طرح احادیث معجزات تعارض سے

پاک ہیں نیز احوال جہنم کے متعلق جو احادیث وارد ہوئی ہیں ان میں بھی نہ انوے فی صد احادیث ایسی ہیں جن میں کوئی تعارض نہیں پایا جاتا۔ لے دے کے وہ احادیث رد جاتی ہیں جو یا تو بعض واقعات پر مشتمل ہیں اور یا پھر ان کا تعلق احکام سے ہے۔

جہاں تک احادیث واقعات کا تعلق ہے تو ان میں اگرچہ ایک بہت ہی تلیل تعداد ایسی حدیثوں کی ضرورت ملتی ہے جو باہم متعارض تو نہیں البتہ باہم مختلف دکھائی دیتی ہیں لیکن ان کا باہمی تعارض و اختلاف بھی صرف ظاہر نظر میں ہی محسوس ہوتا ہے غور و فکر کے بعد اور احادیث نبوی کے تقابلی مطالعے کے بعد اکثر و بیشتر وہ رفع ہو جاتا ہے دراصل ہوتا یہ ہے کہ یا تو مختلف راویوں نے ایک ہی بات یا واقعے کو مختلف الفاظ میں بیان کیا ہوتا ہے جو بظاہر باہم متعارض و مختلف نظر آتے لگتا ہے حالانکہ معانی کے لحاظ سے ان کے درمیان کوئی تعارض و اختلاف نہیں ہوتا یا پھر مختلف راویوں نے ایک ہی واقعے یا تقریر کے مختلف اجزاء بیان کیے ہوئے ہیں یا واقعے سمجھتا ہے ان کے بیانوں میں اختلاف ہے جبکہ احادیث کے ذخیرے سے واقف اس واقعے کے تمام اجزاء کو یکجا کر کے ان کے باہمی تطابق کو پالیتا ہے۔

..بھی حال احادیث احکام کا ہے جو احادیث باہم متعارض نظر آتی ہیں وہ اس قدر کم ہیں کہ غیر متعارض احادیث کی نسبت وہ شاید ایک فی صد بھی نہیں۔ ان میں سے بھی اکثر کا حال یہ ہے کہ ذرا غور و فکر سے کام لیا جائے اور تحقیق و جستجو کی جائے تو تعارض رفع ہو جاتا ہے ان احادیث کے ساتھ بھی صورت حال یہ ہے کہ یا تو یہ ہوتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف مواقع پر مختلف طریقوں سے عمل فرمایا ہوتا ہے اور جس راوی نے جو طریقہ مشاہدہ کیا اسے روایت کر دیا یا پھر یہ ہوتا ہے کہ احادیث میں باہم تقدم و تاخر زمانی موجود ہوتا ہے۔ جن لوگوں کو علوم حدیث پر عبور حاصل ہے وہ اس تقدم و تاخر زمانی کو معلوم کر لیتے ہیں اور اس کی بنیاد پر پہلی حدیث کو منسوخ اور بعد والی حدیث کو ناسخ قرار دیتے ہیں۔

احادیث احکام کا مطالعہ کرتے وقت یہ حقیقت بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ بہت

سے اعمال و افعال کی تشریح و تفصیل نہیں ہوتی بلکہ بتدریج ہوتی ہے مثلاً نماز ابتدا میں دو رکعت فرض ہوتی بعد میں رکعات کی تعداد چار ہو گئی یا مثلاً ابتداء اسلام میں صرف دہ ہی وقت صبح اور عصر کی نماز فرض تھی بعد میں پانچ نمازیں فرض ہوئیں تو احکام پر مشتمل احادیث کے معاملے میں اس تدریج کے عمل کا لحاظ رکھنا بھی بہت ضروری ہے۔ اس تدریج کے عمل سے پیدا ہونے والے اختلاف کو تعارض یا تناقض کا درجہ دینا غلط ہوگا۔

غرض ایسی احادیث جن کا باہمی تعارض و اختلاف رفع کرنا مشکل ہو تعداد میں اتنی قلیل ہیں کہ ان کو غیر متعارض و غیر مختلف احادیث سے وہ نسبت بھی نہیں جو ایک کے عدد کو ہزار کے عدد سے ہوتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اس قدر اقل قلیل احادیث متعارضہ کی بنیاد پر پورے ذخیرہ حدیث کو غیر معتبر قرار دینا کہاں کی دانشمندی ہے۔ احادیث نبویہ کسی ایک ناقابل تقسیم کل کا نام تو ہے نہیں کہ اس کا ایک جز و ساقط ہو تو کل کے کل کا ساقط ہونا لازم آگیا ہر حدیث اپنے اپنے مقام پر اپنی ایک منفرد حیثیت کی حامل ہے اور ہر ایک اپنی جداگانہ سند کے ساتھ روایت ہوتی ہے بنا بریں دو چار روایات کیا دو چار سو روایات بھی ساقط ہو جائیں تو بقیہ ہزاروں روایات کا سقوط لازم نہیں آسکتا۔ اول تو ایسی روایات کے بارے میں جن کا باہمی تعارض و اختلاف رفع کرنا مشکل ہو درست اور صحیح طریقہ عمل یہ ہے کہ راجح اور احوط پر عمل کیا جائے لیکن اگر ترک ہی کرنا منظور ہے تو ظاہر ہے صرف انہی روایات کو ترک کیا جائے گا جو یا ہم متعارض ہوں گی ان کی وجہ سے غیر متعارض روایات کو ترک کرنے والا پاگلی اور احمق ہی کہلائے گا۔

۶۔ روایت بالمعنی | اس کے بعد نمبر ہے منکرین حدیث کے اس اعتراض کا کہ اکثر احادیث کی روایت بالمعنی ہے یعنی بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اکثر ارشادات کے مفہوم و مضامین کو راوی نے اپنے الفاظ میں بیان کیا ہے چنانچہ ان کے خیال میں جب آپ کے الفاظ ہی محفوظ نہیں تو مفہوم و

معنا میں کے بارے میں کیسے یہ یقین کر لیا جائے کہ وہ یہ تمام و کمال ہم تک پہنچ گئے ہیں۔

اس اعتراض کا اندازہ بتلا رہا ہے جیسے معترضین کے نزدیک احادیث نبوی کا جس قدر ذخیرہ ہے وہ سب کا سب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال پر مشتمل ہے حالانکہ ہر کوئی جانتا ہے کہ حدیث فقط اقوال نبوی ہی کا نام نہیں بلکہ آپ کے افعال اور آپ کے سامنے پیش آنے والے حالات و واقعات کو بھی حدیث ہی کہتے ہیں۔ اگرچہ یہ بات منکرین حدیث بھی بخوبی جانتے ہیں لیکن حقائق کو چھپا کر اپنے مطلب کی بات نکالنا ان کی عادت ہو گئی ہے۔ ہر حال اتنی بات واضح ہے کہ مندرکہ بالا اعتراض صرف ان احادیث تک محدود ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال پر مشتمل ہیں اس لیے کہ صرف اقوال ہی کے بارے میں یہ سوال کیا جاسکتا ہے کہ ان کی روایت بالمعنی کیوں ہے باللفظ کیوں نہیں جہاں تک آپ کے افعال اور آپ کے سامنے پیش آنے والے حالات اور واقعات کا تعلق ہے تو ظاہر ہے ان کے باللفظ روایت ہونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کسی کے منہ سے نکلنے والے کلمات تو باللفظ نقل کیے جاسکتے ہیں لیکن کسی کی ذات سے صادر ہونے والے افعال یا کسی کی ذات سے تعلق رکھنے والے احوال الفاظ یا کلمات تو نہیں ہیں کہ انہیں باللفظ نقل کیا جاسکے ان کو تو نقل کرنے والا ہر راوی اپنے ہی الفاظ میں نقل کرے گا اگرچہ بنیادی مفہوم ہر ایک کیساں رہے گا۔

اب روایت بالمعنی کا اعتراض چونکہ اقوال نبوی تک ہی محدود رہ گیا ہے اس لیے سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ منکرین حدیث کو وہ تمام احادیث تسلیم کر لینی چاہئیں جن کا تعلق افعال و احوال نبوی سے ہے اور یہ سب جانتے ہیں کہ ذخیرہ احادیث کا اکثر حصہ افعال و احوال نبوی پر ہی مشتمل ہے اقوال نبوی پر مشتمل حصہ اس کے مقابل میں بہت قلیل ہے اس طرح حدیث کا ایک بہت ہی قلیل حصہ ایسا ہے جو اب محل نظر رہ گیا ہے۔ اس قلیل حصے میں سے بھی بہت سے اقوال نبوی ایسے ہوں گے جو افعال و احوال نبوی سے

مطابقت رکھتے ہوں۔ گے ان کو تسلیم کر لینے میں بھی منکرین حدیث کو کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیئے اس لیے کہ تسلیم شدہ حصے سے ان کا مطابقت رکھنا ثبوت ہے اس بات کا کہ روایت بالمعنی کے طریقے سے جو نقصان انہیں پہنچنے کا احتمال تھا وہ اس سے محفوظ رہے ہیں۔ اس کے بعد جو بہت ہی قلیل حصہ اقوال بنوی کا بچے گا اس میں سے ان احادیث کو بھی علیحدہ کر لیجئے جو وارد و اذکار اور ادبیہ مسنونہ پر مشتمل ہیں ایسی احادیث کے بارے میں بلا خوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ وہ سب کی سب روایت باللفظ ہیں اس لیے کہ امت مسلمہ کے درمیان ایسی احادیث نسل در نسل ایک ہی جیسے الفاظ کے ساتھ نقل ہوتی چلی آ رہی ہیں۔ اسی طرح اذان، تشہد، اقامت اور احادیث اخلاق نیز احادیث قدسیہ اور احادیث بوامع الکلم یہ سب کی سب احادیث بھی تقریباً باللفظ روایت ہوئی ہیں اس قسم کی تمام احادیث پر بھی منکرین حدیث کا اعتراض صادق نہیں آتا اس لیے ان کو بھی قبول کر لینے میں انہیں کوئی سائل نہیں ہوتا چاہیئے۔ اس کے بعد اقوال بنوی کا بقیہ حصہ رہ ہی کتنا جتنا ہے جس پر روایت بالمعنی کا اعتراض وارد ہوتا ہو۔

بہر حال منکرین حدیث کے نزدیک اگر حفاظت حدیث میں شبہ روایت بالمعنی ہی کی بنا پر تھا تو یہ شبہ صرف اس اتنے ہی حصہ تک محدود رہنا چاہیئے جتنا حصہ روایت بالمعنی کے طریقے سے غیر محفوظ ثابت ہے اور وہ ہم ابھی تبلا چکے ہیں کہ انتہائی قلیل ہے مگر تاریہن کو یہ سن کر شاید تعجب ہوگا کہ اس اقل قلیل حصہ حدیث کے مشتبہ و مشکوک ہونے کی بنیاد پر منکرین حدیث پورے کے پورے ذخیرہ حدیث کو مشتبہ و مشکوک قرار دیتے ہیں حتیٰ کہ وہ حصہ بھی جو روایت باللفظ کے طریقے سے ثابت ہے۔ کتنی عجیب بات ہے ہم اب تک تو یہ سنتے آئے تھے کہ اکثر کی بنیاد پر کل کا حکم ثابت ہوتا ہے منکرین حدیث نے اس کلیہ کو اپنے مخصوص مقاصد کے پیش نظر الٹ دیا۔ ہے ان کے یہاں اب اقل قلیل کی بنیاد پر کل کا حکم ثابت ہونے لگا۔ ہے۔ ہم تو جب جانیں جب منکرین حدیث اپنے دنیاوی کام و بار بھی اسی کلیہ کے مطابق انجام دینے لگیں اور آج ہی سے سب پہلا کام یہ کریں کہ

کھانا کھانا بالکل چھوڑ دیں کیونکہ کھانا کھانے سے کبھی کبھی بدستھی بھی ہو جاتی ہے اور قلیل کی بنیاد پر کل کے حکم کا اثبات ایک اصول کے طور پر تسلیم کر لیا گیا ہے۔

مزے کی بات تو یہ ہے کہ روایت بالمعنی کے طریقے پر منقول یہ اقل قلیل حصہ حدیث بھی فی الحقیقت مشتبہ نہ رہتا اس لیے کہ محدثین کے یہاں روایت بالمعنی وہی مقبول ہے جس کا راوی الفاظ کے مدلول و مفہوم اور معانی و مقاصد کو خوب سمجھتا ہو اور یہ بھی خوب جانتا ہو کہ اگر اس لفظ کے بجائے دوسرا لفظ رکھ دیا جائے تو مفہوم میں کتنا تغیر ہو جائے گا جو راوی ان صلاحتوں سے بہرہ ور نہیں اس کی روایت بالمعنی محدثین کے نزدیک بالاتفاق مقبول نہیں۔

روایت بالمعنی کے سلسلے میں یہ حقیقت بھی ذہن میں رہنی چاہیے کہ احادیث نبوی کے اولین راوی صحابہ کرام اعلیٰ درجے کے قوی الحافظ نہونے کے علاوہ بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاج شناس بھی تھے نیز آپ کی مراد میں کسی تغیر و تبدل اور آپ کے کلام میں ادنیٰ تحریف کو اپنے لیے اشتقاق و تبدل خیال کرتے تھے ایسے راویوں نے بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام کے مقصود کو اگر اپنے الفاظ میں بیان کیا بھی ہے تو کیسے یہ تصور کر لیا جائے کہ ان سے کوتاہی ہو گئی اور مقصود و مراد نبوی میں تغیر و تبدل آ گیا ہو گا۔

روایت بالمعنی کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جو بات کہی جا سکتی ہے وہ صرف اتنی ہے کہ روایت باللفظ کے مقابلے میں روایت بالمعنی وثاقت اور طمانیت کے لحاظ سے کم درجہ رکھتی ہے اور اس سے کسی کو انکار بھی نہیں تھا۔ نئے اسلام بالاتفاق اس کے قائل ہیں۔

اب تک ہم منکرین حدیث کے چھ اعتراضات کا جواب دے چکے ہیں۔ اوپر ساتویں نمبر پر جس اعتراض کا ہم نے حوالہ دیا ہے اس کا تعلق

۷۔ حضرت ابو ہریرہؓ اور صحابہ کی تنقید

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی ذات سے ہے۔ منکرین حدیث کا کہنا یہ ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ کو خود صحابہ کے درمیان قابل اعتماد تصور نہیں کیا جاتا تھا چنانچہ بعض صحابہ نے



ان پر تنقید کی ہے اور ان کی صداقت بیانی پر شک و شبہ کا اظہار کیا ہے پھر اسی بنیاد پر وہ کہتے ہیں کہ احادیث نبوی کا ایک کثیر حصہ چونکہ حضرت ابو ہریرہؓ ہی سے مروی ہے اس لیے وہ سارا کا سارا ناقابل اعتماد ہے۔

اس اعتراض کی اصل حقیقت پر کلام کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس امر کی وضاحت کر دی جائے کہ صحابہ کے درمیان جو بھی علمی نزاع و اختلافات ہیں مختلف کتابوں میں کہیں کہیں نظر آتا ہے اس کی حقیقت تبادلاً انکار و نظریات سے زیادہ کچھ نہ تھی۔ دراصل بات یہ ہے کہ فہم و ادراک اور قوت استنباط کے اعتبار سے سب صحابہ یکساں نہ تھے بعض اوقات ایسا ہوتا کہ خاص حالات کے پیش نظر بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کسی صحابی سے کوئی معاملہ کرتے اور وہ اسے عام حکم سمجھ کر لوگوں کے سامنے بیان کر دیتا اس سے صحابہ کے مابین علمی بحث کا آغاز ہو جاتا اور نزدیک ذنا تبید کا سلسلہ شروع ہو جاتا تا آنکہ حق واضح ہو جاتا اور حق واضح ہوتے ہی یکایک وہ علمی بحث اپنے انجام کو پہنچ جاتی اور ہر فریق حق کے سامنے سر تسلیم خم کر دیتا۔ حق واضح ہونے سے پہلے جس قدر بھی تردید ارت ایک دوسرے کے لیے برادر کھی جاتیں ان کا یہ مطلب ہرگز نہ ہوتا کہ وہ ایک دوسرے کی صداقت بیانی کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھ رہے ہیں بلکہ ہوتا یہ تھا کہ مثلاً ایک صحابی کوئی حدیث روایت کرتا اور دوسرا صحابی اس روایت کو منسوخ یا مخصوص یا مقید تصور کرتا یا ایک صحابی روایت کرتا اور دوسرا سمجھتا کہ بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد کسی خاص شخص سے متعلق ہے اور مخصوص حالات کے نتیجے میں صادر ہوا ہے۔ یا مثلاً ایک صحابی کسی حدیث کو ایک طریقے سے بیان کرتا اور دوسرا اسے اس سے مختلف انداز میں نقل کرتا۔ اس قسم کی تمام صورتوں میں حق واضح ہونے تک ایک صحابی دوسرے صحابی کے بارے میں مختلف خیالات کا اظہار کرتا مثلاً یہ کہ اسے وہم ہوا ہے یا یہ کہ وہ بھول گیا ہے یا اس سے کوئی فرد گذشت ہوئی ہے۔ اب اس قسم کے یا اسی سے ملتے جلتے جس قدر بھی اقوال و آثار منقول ہیں ناواقف حال یا تعصب مغلوب حضرات ان کے بارے میں جو چاہیں رائے زنی کرتے رہیں ان کی حقیقت صرف اس قدر ہے کہ صحابہ فہم حدیث کی خاطر ایک دوسرے سے تبادلاً انکار کرتے

تھے تاکہ حق کھل کر سامنے آجائے۔

بس اسی پر حضرت ابو ہریرہؓ اور دیگر صحابہ کے معاملے کو قیاس کر لیجئے۔ حضرت ابو ہریرہؓ اور دیگر صحابہ کے مابین جو علمی تنازعات کا ذکر ہمیں مختلف کتب میں ملتا ہے اس کی حقیقت بس اتنی ہی ہے کہ وہ محض ایک علمی تبادلاًً افکار تھا جو فہم و ادراکِ حدیث کی خاطر صحابہ اور حضرت ابو ہریرہؓ کے درمیان وقتاً فوقتاً ہوا اس کو حضرت ابو ہریرہؓ کی تردید و تکذیب پر محمول کرنا سراسر کم علمی اور حماقت ہے۔

اس سلسلے میں سب سے بڑی سوچنے کی بات یہ ہے کہ صحابہ اگر حضرت ابو ہریرہؓ کی روایات کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھتے ہوتے تو وہ ان کو اس بات کی اجازت کیونکر دے سکتے تھے کہ وہ کھلم کھلا بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث و روایت کرنے کا سلسلہ جاری رکھیں۔ ذرا خیال تو کیجئے حضرت نازق اعظم رضی اللہ عنہ جیسا جری اور بے باک حق پرست کیا کسی ایسے شخص کو جس کی روایات صحابہ کے درمیان شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھی جائے ہی ہوں روایت حدیث کی اجازت دے سکتا تھا یا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا جیسی فقیہہ و عالم ام المؤمنین کیا اس صورتِ حال کو خاموشی سے برداشت کر سکتی تھیں کہ ایک آدمی جو احادیث نبوی کے بارے میں تاہلِ اعتماد متصور نہیں ہوتا دن رات کثیر احادیث روایت کرتا رہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ کے زمانے میں بہت سے صحابہ بعیدِ حیات تھے اور صحابہ کی دینی غیرت سے کون واقف نہیں حدیث میں غلطی کرنے والے کے بارے میں وہ چشم پوشی سے کام لیں اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا ان سب کے سامنے اگر حضرت ابو ہریرہؓ روایت حدیث کا مشغلہ جاری رکھے ہوئے ہیں اور اس انداز سے رکھے ہوئے ہیں کہ صحابہ میں سب سے زیادہ روایت کرنے والے شمار کیے جاتے ہیں تو یہ بتنِ بزرگ ہے اس بات کا کہ صحابہ کے درمیان حضرت ابو ہریرہؓ کو روایت حدیث میں مستند خیال کیا جاتا تھا۔

حضرت ابو ہریرہؓ صحابہ کی نظر میں | علاوہ انہی صحابہ کے درمیان اگر حضرت ابو ہریرہؓ کو اعتماد کا درجہ حاصل نہ تھا جیسا کہ منکرین حدیث کا دعویٰ ہے تو صحابہ کے ان اقوال و آثار کے بارے میں وہ کیا

کہیں گے جو حضرت ابو ہریرہؓ کی مدح و ستائش میں وارد ہوئے ہیں مثال کے طور پر حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے ایک موقع پر حضرت ابو ہریرہؓ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا :

<p>یا ابا ہریرۃ اَنْتَ كُنْتَ اَلرَّسُولَ لِرَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاَحْفَظْنَا لِحَدِيثِهِ - (ترمذی - المناقب) -</p>	<p>اس ابو ہریرہؓ آپ ہم سے زیادہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر رہنے والے اور ہم سے زیادہ احادیث کو یاد رکھنے والے ہو -</p>
---	---

ایک مرتبہ ایک شخص نے حضرت طلحہ بن عبید اللہ کے سامنے حضرت ابو ہریرہؓ کی کثرت روایت پر تعجب کا اظہار کیا تو حضرت طلحہ بن عبید اللہ نے فرمایا :

<p>أَمَا أَنِّي يَكُونُ سَمْعُ مَنْ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَالِمَ نَسْمَعُ عَنْهُ (ترمذی - المناقب) -</p>	<p>اس میں شک نہیں کہ (ابو ہریرہؓ نے) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے وہ کچھ سننا ہے جو ہم نے نہیں سنا -</p>
---	---

اسی قسم کا ایک قول حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے بھی منقول ہے کسی نے ان کو حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت بیان کرتے سنا تو تعجب سے پوچھا کہ آپ تو خود صحابی ہیں اسی کے باوجود حضرت ابو ہریرہؓ کی روایتیں نقل کرتے ہیں آپ نے جواب میں فرمایا :

<p>أَنَّ أَبَا هُرَيْرَةَ قَدْ سَمِعَ مَالِمَ نَسْمَعُ وَإِنِّي إِن أَحَدَثَ عَنْهُ أَحَبُّ إِلَيَّ مِنْ أَنْ أُحَدِّثَ عَنْ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِعَنِّي مَالِمَ أَسْمَعُهُ مِنْهُ - (البدایۃ والنہایۃ ج ۸)</p>	<p>ابو ہریرہؓ نے وہ کچھ سننا ہے جو ہم نے نہیں سنا اور مجھے یہ بات زیادہ پسند ہے کہ میں ابو ہریرہؓ سے روایت کروں بہ نسبت اس کے کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے (بلا واسطہ) روایت کروں یعنی وہ کچھ جو میں نے آپ سے خود نہیں سنا -</p>
--	--

حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے کسی نے کوئی مسئلہ دریافت کیا تو آپ نے فرمایا

وعلیک ابا حریرة یعنی تہیں چاہیئے کہ تم یہ سوال ابو ہریرہ سے کرو پھر ان کی نصیحت کا ذکر کرتے ہوئے ان کی اس دعا کا ذکر کیا جس پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آمین کہا تھا اور جو کبھی نرا موش نہ ہونے والے علم سے متعلق تھی۔ حافظ ابن حجر عسقلانی نے تہذیب التہذیب میں یہ سارا واقعہ نقل کیا ہے۔ اسی واقعے میں یہ بھی ذکر ہے کہ جب حضرت ابو ہریرہ کی تعلیم کرتے ہوئے بعض دیگر صحابہ نے بھی ایسی ہی دعا درخواست کی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

دوسری لڑکائی پر سبقت لے گیا۔

لَسَبَّكُم بِهَا الْغَلَامُ الدَّوْسِيُّ

(تہذیب التہذیب جلد ۱۱ ص ۲۶۶)

غرض حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی مدح دستائش میں صحابہ کرام کی یہ تمام اقوال اس بات کا ثبوت ہیں کہ صورت حال اس کے بالکل برعکس ہے جس کا منکرین حدیث کو دعوئے ہے۔ اور یہ تو ہم نے صرف چند اقوال نقل کیے ہیں ورنہ اسی قسم کے مضامین کے حامل ارد بھی بہت سے اقوال اس ثبوت میں پیش کیے جاسکتے ہیں کہ حضرت ابو ہریرہ صحابہ کرام کے نزدیک نہ صرف قابل اعتماد بلکہ دوسروں سے زیادہ قابل اعتماد دوسروں سے زیادہ احادیث نبوی کو یاد رکھنے والے اور دوسروں سے زیادہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر رہ کر کسب علوم و برکات میں سبقت لے جاتے والے خیال کیے جاتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ ابو ہریرہ کو ہم سے بڑھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت و رفاقت کا شرف حاصل تھا اور وہ ہم سے بڑے حافظ حدیث تھے۔ اسی طرح حضرت ابی بن کعبؓ حضرت ابو ہریرہ کے بارے میں فرمایا کرتے کہ ابو ہریرہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسی باتیں بھی پوچھنے کی جرأت کر لیتے جو ہم نہیں کر سکتے تھے۔

## منکرین حدیث کا استدلال | حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ پر اعتراض کرنے کے لیے منکرین حدیث خود حضرت ابوہریرہ

ہی کے ایک قول سے دلیل پکڑتے ہیں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابوہریرہ کے اس قول پر تفصیلی گفتگو کی جائے تاکہ اصل حقیقت سامنے آجائے۔ حضرت ابوہریرہ کا یہ قول وہ ہے جس کو امام مسلم نے حضرت اعرج سے روایت کیا ہے وہ بیان کرتے ہیں:

سَمِعْتُ أَبَا هُرَيْرَةَ يَقُولُ إِنَّكُمْ تَزْعُمُونَ أَنَّ أَبَا هُرَيْرَةَ يَكْثُرُ الْحَدِيثَ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاللَّهُ الْوَعْدُ كُنْتُ رَجُلًا مُسْكِنًا أَخَذَ مِنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَى مِلٍّ بَطْنِي وَكَانَتْ أَلْهَاجِرُونَ يَشْغَلُهُمُ الصَّفَقُ بِالْأَسْوَاقِ وَكَانَتْ الْأَنْصَارُ يَشْغَلُهُمُ الْقِيَامُ عَلَى أَمْوَالِهِمْ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ يَبْسُطْ ثَوْبَهُ فَلَنْ يَنْسِيَ شَيْئًا سَمِعَهُ مَتَى فَبَسَطْتُ ثَوْبِي حَتَّى قَضَيْتُ حَدِيثَهُ ثُمَّ ضَمَمْتُهُ الْخُفَّ فَالْأَسَيْتُ شَيْئًا سَمِعْتُهُ مِنْهُ - (مسلم - فضائل العجايز)

میں نے ابوہریرہ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ تم سمجھتے ہو کہ ابوہریرہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بہت احادیث بیان کرتا ہے بخدا میں تو ایک مسکین شخص تھا اور صرت اپنا پیٹ بھر کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کرنے کے سوا میرا کوئی کام نہ تھا اور ماہاجرین کو بازار کے کاروبار سے فرصت نہ تھی جبکہ انصار اپنے اموال کی دیکھ بھال میں مصروف رہتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص اپنا کپڑا بچھا دے وہ مجھ سے جو بات سنے گا وہ بھولے گا میں سو میں نے اپنا کپڑا بچھا دیا یہاں تک کہ آپ حدیث بیان کر چکے پھر میں نے اس کپڑے کو اپنے سینے سے لگا لیا چنانچہ (پھر) میں نے جو بات بھی آپ سے سنی کبھی نہیں بھولا۔

منکرین حدیث اس حدیث سے دلیل پکڑتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس میں حضرت ابوہریرہ کا

خود اپنا اعتراف موجود ہے کہ صحابہ کثرت مرویات کی بنا پر ان کی روایت کردہ احادیث کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور ان پر تنقید کیا کرتے تھے۔

**بدگمانی نہیں اظہار تعجب** | ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ اس حدیث میں کوئی بات ایسی ہے جس سے یہ بات اخذ کی جاسکتی ہو کہ حضرت ابوہریرہ

کی مرویات کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ متذکرہ بالا حدیث میں حضرت ابوہریرہ کی کثرت روایت پر اظہار تعجب ضرور کیا گیا ہے مگر اظہار تعجب سے شک و شبہ کا اظہار کیلئے لازم آیا بعض اوقات ایک شخص جس کی صداقت بیانی پر پورا اعتماد ہوتا ہے کوئی عجیب واقعہ بیان کرتا ہے یا اس کی ذات سے کسی عجیب عمل کا صدور ہوتا ہے اور آپ اس پر حیرت و تعجب کا اظہار کرتے ہیں تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوتا کہ آپ اس کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھ

رہے ہیں یا اس کو جھٹلارہے ہیں بخلات اس کے اظہار حیرت سے آپ کا مقصود یہ ہوتا ہے کہ وہ امر واقعہ کی اصل حقیقت بیان کر کے آپ کے تعجب کا ازالہ کرے۔ بالکل یہی معاملہ حضرت ابوہریرہ کے ساتھ بھی پیش آیا۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ حضرت ابوہریرہ متاخر الاسلام ہونے کے باوجود دیگر صحابہ کے مقابلے میں زیادہ حدیثیں روایت کیا کرتے تھے صحابہ کے درمیان سب سے بڑے حافظ حدیث تھے۔ وہ سمندر کی سی روانی کے

ساتھ جب حدیثوں پر حدیثیں بیان کیے چلے جاتے تو اس سے بعض ان تابعین کے دلوں میں جو حضرت ابوہریرہ کے ذاتی حالات سے واقف نہ تھے یا بعض ان صحابہ کے ذہنوں میں جو مدینہ سے دور بود و باش رکھتے تھے اس تعجب کا پیدا ہونا فطری امر تھا کہ آخر آپ دوسرے صحابہ کے مقابلے میں اس قدر احادیث کے محفوظ کرنے والے کیسے بن گئے۔ یہی تعجب ایک سوال بن کر کبھی کبھی ان کی زبانوں پر بھی آجاتا مگر جب حضرت ابوہریرہ حقیقت حال واضح فرماتے تو سب کے دل مطمئن ہو جاتے۔

حضرت ابوہریرہ کو دوسرے صحابہ کے مقابلے میں اس قدر کثیر احادیث کیلئے محفوظ ہو گئی تھیں اس کی وجہ حضرت ابوہریرہؓ نے اسی متذکرہ بالا حدیث میں خود بیان کر دی ہیں اس کی وجہ دو تھیں ایک یہ کہ حضرت ابوہریرہ ہمہ وقت بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت

میں حاضر رہتے تھے دو سکر یہ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا کی برکت سے جو کچھ ایک مرتبہ آپ یاد کر لیتے کبھی نہ بھولتے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سنہ ہجری میں ایمان لائے اور پہلے دن سے لے کر آپ کے وصال تک ایک دن کے لیے بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے آستانے سے جدا نہ ہوئے ہر وقت آپ کے ساتھ رہے۔ جہاں بھی آپ تشریف لے جاتے ابو ہریرہ ساتھ ہوتے، کئی کئی دن کھانے کو نہ ملتا مگر ابو ہریرہ کو یہ گوارا نہ ہوتا کہ حفظ حدیث کا مشغلہ چھوڑ کر دنیا کے کسی کاروبار میں لگ جائیں ان کے مقابلے میں دو سکر صحابہ کو خدمت نبوی میں عاضری کے ساتھ ساتھ دنیوی مشاغل کے لیے بھی وقت نکالنا پڑتا تھا جیسا کہ حضرت ابو ہریرہ نے خود بتایا مہاجرین بے چارے بانہاروں میں کاروبار تجارت میں مصروف رہتے اور انصار کو اپنے ہانگات اور اپنے اموال کی دیکھ بھال کی طرف توجہ دینی پڑتی۔ اس طرح حضرت ابو ہریرہ نے چار سال کے عرصے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے وہ کچھ حاصل کر لیا جو دو سکر نہ کر سکے۔ پھر اس پر مزید یہ ہوا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی احادیث کے حفظ میں ان کا شغف دیکھ کر معجزانہ انداز میں ان کی قوتِ حافظہ کی تقویت کا ایسا سامان کر دیا کہ جو یاد کیا کبھی نہیں سے محو نہ ہوا۔ چار در کا قصہ اوپر کی حدیث میں بھی بیان ہوا ہے دیگر کئی روایات میں بھی آیا ہے، جن میں سے بعض میں ذکر ہے کہ حضرت ابو ہریرہ نے خود ضعفِ حافظہ کی شکایت کی تھی جس پر اس چار در والے طریقے سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو فیضیاب فرمایا۔

عرض خدمت نبوی میں ہمہ وقت عاضری اور دُعائے نبوی کی برکت سے غیر معمولی قوتِ حافظہ ان دونوں باتوں نے مل کر حضرت ابو ہریرہ کو حفظ حدیث اور کثرتِ روایت کے محافل میں دوسرے لوگوں سے ممتاز بنا دیا۔

**کثرتِ روایت کا ایک اور سبب** | حضرت ابو ہریرہ کی کثرتِ روایت کا ایک اور سبب بھی تھا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے

وصال کے بعد خلافتِ راشدہ کے عرصہ میں جب صحابہ کی کثیر تعداد اِدھر اُدھر مختلف بلاد و اِصا میں پھیل گئی تو حضرت ابو ہریرہ نے غموس کیا کہ احادیث کا جو ذخیرہ ان کے

پاس امانت ہے اسے ہر سال میں امت مسلمہ کے جتنے افراد تک وہ پہنچا سکیں پہنچا دیں کہیں ایسا نہ ہو کہ آخری گھڑی آگھڑی ہو اور بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل کیا ہوا یہ کثیر علم ان کے سینے میں مخفی ان کے ساتھ ہی چلا جائے اور کتمانِ علم کا الزام ان کے سر رہ جائے چنانچہ بعض مواقع پر اپنے اس فکر و احساس کا اظہار کرتے ہوئے فرماتے اگر قرآن کی یہ آیت نہ ہوتی تو میں کبھی کوئی حدیث بیان نہ کرتا پھر سورہ بقرہ کی وہ آیت تلاوت فرماتے جس میں کتمانِ علم پر اللہ کی لعنت کا ذکر ہے۔

غرض جن لوگوں کو حضرت ابو ہریرہ کے شغف حدیث کا حال معلوم نہ ہوتا تھا وہ ان کی کثرتِ روایت کو دیکھ کر تعجب میں پڑ جاتے تھے اور اپنی حیرت و استعجاب کو دور کرنے کے لیے حضرت ابو ہریرہؓ سے مختلف سوالات کرنے لگتے تھے اسی حیرت و استعجاب کو دور کرنے کے لیے حضرت ابو ہریرہؓ اس حقیقت کا اظہار فرماتے جس کا ذکر زیر بحث حدیث یا اسی قسم کی دوسری احادیث میں ہمیں ملتا ہے۔

**ایک اور حقیقت** | زیر بحث حدیث سے ایک اور حقیقت کی طرف بھی اشارہ ملتا ہے معلوم ایسا ہوتا ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ کی کثرتِ روایت پر حیرت و استعجاب کا اظہار بھی مشاہیر صحابہ میں سے کسی کی جانب سے نہ تھا بلکہ اس کا اظہار کرنے والے وہ لوگ تھے جو نہ تو چیدہ و برگزیدہ صحابہ کی صف میں شامل تھے اور نہ ان کو اسلام میں سبقت کرنے اور عرصہ مدید تک بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے قریب ترین صحابیوں کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا تھا بلکہ اگر یہ کہا جائے تو شاید غلط نہ ہوگا کہ حضرت ابو ہریرہؓ کی کثرتِ روایت پر حیرت و تعجب کا اظہار کرنے والوں میں سرے سے کوئی صحابی تھا ہی نہیں حضرت ابو ہریرہؓ کے الفاظ پر غور کیجئے وہ مسترضین کی تردید کرتے ہوئے کہتے ہیں ”اور مہاجرین کو بازار کے کاروبار سے فرصت نہ تھی جبکہ انصار اپنے اموال کی دیکھ بھال میں مصروف رہتے تھے“ معلوم ہوا حضرت ابو ہریرہؓ کے مخاطبین میں مہاجرین



انصار میں سے کوئی شامل نہ تھا اگر کوئی شامل ہوتا تو حضرت ابو ہریرہؓ کا خطاب ان الفاظ میں ہوتا "تم لوگ تجارت و زراعت کے کاموں میں مصروف رہتے تھے یہ غائب کے صیغے سے مہاجرین و انصار کا ذکر دلیل ہے اس بات کی کہ حضرت ابو ہریرہؓ کی کثرت روایت پر تعجب کا اظہار کرنے والے مہاجرین و انصار کے علاوہ کچھ لوگ تھے۔

ہمارے اس خیال کی تائید میں وہ روایت اور بھی زیادہ صریح ہے جس کو امام مسلم نے ہی حضرت سعید بن مسیب سے روایت کیا ہے۔ اس روایت میں محترضین کا قول ان الفاظ میں نقل ہوا ہے :

لوگ کہتے ہیں کہ مہاجرین و انصار کو کیا ہوا  
وہ ابو ہریرہ کی طرح حدیثیں بیان نہیں  
کرتے۔

وَقَوْلُهُمْ مَا بَالُ الْمُهَاجِرِينَ وَ  
الْأَنْصَارِ لَا يَتَحَدَّثُونَ مِثْلَ  
أَحَادِيثِهِمْ -  
(مسلم فضائل الصحابة)

غور کرنے کی بات ہے اگر اعتراض کرتے والے مہاجرین و انصار میں سے کوئی ہوتے تو ان کا قول لازماً ان الفاظ میں نقل ہوتا ما بالنا لا نتحدث مثل احادیثہ (ہمیں کیا ہوا ہم ابو ہریرہ کی طرح حدیثیں روایت نہیں کرتے) اسی طرح جو اب میں حضرت ابو ہریرہؓ یہ نہ کہتے کہ "میرے انصاری بھائی اپنی زمینوں کی دیکھ بھال میں لگے رہتے اور میرے مہاجر بھائی بازار کے معاملات میں مصروف ہوتے" بلکہ سیدھے سادے طریقے سے کہتے کہ تم زمینوں کی دیکھ بھال میں یا تم بازار کے معاملات میں مصروف رہتے تھے۔

غرض اس قسم کی جتنی روایات بھی مسلم یا بخاری میں ہیں ان کے الفاظ اسی حقیقت کی نشان دہی کرتے ہیں کہ حضرت ابو ہریرہؓ کی کثرت روایت پر حیرت و استعجاب کا اظہار کرنے والے صحابہ کے علاوہ کوئی ایسے لوگ تھے جو حضرت ابو ہریرہؓ کے شغف حدیث اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کے خصوصی تعلق سے کما حقہ واقف نہ تھے۔ ہم نے حضرت ابو ہریرہؓ کے سیر و سوانح کو خوب خوب کنگھا لکھا آثار و حدیث میں بڑی تلاش و جستجو سے کام لیا کہ کسی ایک ہی ایسے صحابی کا نام مل جائے جس نے

حضرت ابو ہریرہؓ کو کثرت روایت کی بنا پر مطعون کیا ہو لیکن کوئی ایک روایت بھی ہمیں ایسی نہیں مل سکی۔ حضرت ابو ہریرہؓ پر تنقید کرنے والوں میں مشاہیر صحابہ میں سے اگر کوئی ہوتا تو تاریخ کے اوراق میں یہ بات ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ثبت ہو جاتی۔ جس طرح صحابہ کی دوسری رد و قدر کا ذکر ہمیں کتب تاریخ میں ملتا ہے اس کا ذکر بھی ضرور ملتا۔

ہم منکرین حدیث کے ممنون ہوں گے اگر وہ کوئی ایک ہی ایسی صحیح تاریخی شہادت پیش کر دیں جس سے یہ ثابت ہوتا ہو کہ کسی معروف صحابی نے حضرت ابو ہریرہؓ کو انکی کثرت روایت پر مطعون کیا ہو یا کسی صحابی نے حضرت ابو ہریرہؓ کی طرف کذب بیانی کی نسبت کی ہو اور ان کو حدیثیں روایت کرنے یا دوسروں کو ان کی مرویات سننے سے روکا ہو۔ ہمیں یقین ہے وہ کوئی ایسی شہادت پیش نہیں کر سکیں گے۔

اس ضمن میں کوئی تاریخی ثبوت تو خیر منکرین حدیث قیامت تک پیش نہیں کر سکیں گے البتہ انہوں نے اپنی عادت کے مطابق حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کی ایک روایت کے بعض الفاظ کو توڑنے مروڑنے کی کوشش کی ہے اور اس سے اپنے مطلب کی بات نکالنی چاہی ہے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس روایت کا بھی جائزہ لے لیا جائے۔ امام مسلم نے اسے کتاب المساقات والمزائمت میں روایت کیا ہے۔ روایت کے الفاظ ہیں:

<p>حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کتوں کے مار ڈالنے کا حکم فرمایا مگر شکار کا کتا یا بکریوں کا کتا اور جانوروں کی حفاظت کا کتا حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے دریافت کیا گیا کہ حضرت ابو ہریرہؓ تو</p>	<p>عن ابن عمر رضی اللہ عنہ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَمَرَ بِقَتْلِ الْكِلَابِ إِلَّا كَلْبَ صَيْدٍ أَوْ كَلْبَ غَنَمٍ أَوْ مَاشِيَةٍ فَقَالَ لَا بِنَ عَمْرٍو رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا أَنَّ أَبَا هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ يَقُولُ أَرَى كَلْبَ</p>
--	---

کھیت کا کتا بھی (متشغف) کہتے ہیں حضرت  
ابن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا حضرت ابو ہریرہ  
کے پاس کھیت بھی ہے۔

زرع فقال ابن عمر رضی اللہ  
تعالیٰ عنہما ان لا یجب  
هريرة زرعاً۔  
مسلم کتاب المساقات والمزارعة باب الامر  
بقول الکلاب۔

اس حدیث کے الفاظ "ان لا یجب هريرة زرعاً" کے مفہوم کو منکرین حدیث اس معنی  
میں لیتے ہیں کہ حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کی جانب سے یہ ایک لطیف طنز ہے حضرت  
ابو ہریرہؓ پر یعنی دراصل حضرت ابن عمرؓ کا کہنا یہ چاہتے ہیں کہ چونکہ حضرت ابو ہریرہؓ  
کے پاس کھیتی بھی ہے اس لیے یہ کھیتی کے کتے کا استثنا انہوں نے معاذ اللہ اپنی طرف  
سے بڑھالیا ہے۔

اگرچہ اکثر شارحین حدیث نے حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کے اس قول پر روشنی  
ڈالی ہے اور بتایا ہے کہ ان الفاظ سے حضرت ابن عمرؓ کا مقصود کیا تھا ہم اس پر بھی  
ابھی گفتگو کریں گے مگر اس سے پہلے ہم منکرین حدیث سے پوچھنا یہ چاہتے ہیں کہ یہ کھیتی  
کا کتا کے الفاظ روایت کرنے میں کیا حضرت ابو ہریرہؓ منفرد ہیں اگر وہ منفرد ہوں  
اور دیگر کسی صحابی سے یہ الفاظ مروی نہ ہوں تو پھر منکرین حدیث کا یہ قول کسی درجے  
میں قابل غور ہو سکتا ہے کہ اس سے حضرت ابن عمرؓ کی مراد حضرت ابو ہریرہؓ کو کذب بیانی  
سے متم کرنا تھا لیکن اگر صورت حال اس سے مختلف ہو اور یہ الفاظ دوسرے صحابہ  
نے بھی روایت کیے ہوں تو پھر منکرین حدیث کا یہ قول کسی درجے میں بھی قابل قبول نہ  
ہوگا۔ اب سنئے وہ روایت جس میں کھیتی کے لیے کتا پالنے کی اجازت کا ذکر ہے کس کس صحابی  
سے مروی و منقول ہے امام بخاری نے اسے حضرت سفیان بن ابی زہیرؓ سے روایت کیا ہے  
مسلم میں یہ روایت حضرت عبداللہ بن عمرؓ حضرت شعبہؓ اور حضرت سفیان بن ابی زہیرؓ سے

روایت ہوئی ہے ترمذی کتاب الصيد میں حضرت ابو ہریرہ کی روایت کے ساتھ ساتھ حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت عبداللہ بن مغفل کی روایات میں بھی کھیتی کے لیے کتا پالنے کی یہ اجازت صریحاً مذکور ہے۔ اب بتلائیے جب اس روایت میں حضرت ابو ہریرہ منفرد نہیں بلکہ دیگر متعدد صحابہ نے بھی اسے روایت کیا ہے تو پھر کیسے یہ کہا جاسکتا ہے کہ چونکہ حضرت ابو ہریرہ کے پاس کھیتی بھی تھی اس لیے انہوں نے اپنی طرف سے حدیث کے الفاظ میں کھیتی کے کتے کی اجازت کا اضافہ کر لیا تھا اور حضرت ابو ہریرہؓ کے اسی فعل پر طنز کرنے کے لیے حضرت عبداللہ بن عمر نے یہ کہا تھا کہ ”ابو ہریرہ کے پاس کھیتی بھی ہے۔“

اب دیکھنا یہ ہے کہ پھر آخر ان الفاظ سے حضرت ابن عمر کا مقصود کیا تھا۔ شارحین حدیث نے اس سلسلہ میں جو وضاحت کی ہے ہمیں افسوس ہے کہ منکرین حدیث نے اس کی طرف قطعاً کوئی توجہ نہیں دی بلکہ ہم اگر یہ کہیں تو بالکل درست ہوگا کہ عامۃ الناس کو دھوکہ میں رکھنے کے لیے انہوں نے جان بوجھ کر اس وضاحت کو چھپانے کی کوشش کی ہے۔ حافظ بن حجر نے فتح الباری میں حضرت ابن عمر کے ان الفاظ پر تبصرہ کرتے ہوئے پہلے یہ بیان کیا ہے کہ ان الفاظ سے مقصود حضرت ابو ہریرہ کی تصدیق ہے پھر لکھا ہے کہ رواۃ حدیث میں سے سفیان بن ابی نہیر اور عبداللہ بن مغفل نے حضرت ابو ہریرہ کی تائید کی ہے۔ اسی طرح امام نووی شارح صحیح مسلم ان الفاظ پر گفتگو کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس سے حضرت عبداللہ ابن عمر کا مقصود نہ ابو ہریرہ کی روایت کی تحقیر ہے اور نہ اس کے بارے میں شک و شبہ کا اظہار۔ بخلاف اس کے ان کا مقصد یہ جتلانا ہے کہ چونکہ حضرت ابو ہریرہ زمین اور کھیتوں کے مالک بھی تھے اس لیے انہوں نے اس کھیتی کے کتے کی اجازت کے الفاظ حدیث یاد رکھنے کا زیادہ اہتمام کیا اس لیے کہ یہ قاعدہ ہے جو شخص جس کام سے زیادہ شغف رکھتا ہے اس کام کے متعلق احکام دوسروں سے بڑھ کر یاد رکھتا ہے اور اس کے لیے وہ بلیغ اہتمام کرتا ہے جو دوسرے نہیں کرتے۔

شراحین حدیث کی اس تعبیر کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کی ایک روایت ایسی بھی ہے جس میں انہوں نے خود کھیتی کے کتے کی اجازت نقل کی ہے اس روایت کو امام مسلم نے کتاب المساقات والمزارعہ میں بروایت ابوالحکم بیان کیا ہے۔ اگر حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کھیتی کے کتے کی اجازت کو حدیث ابوہریرہؓ میں اضافہ آور فرماتے تو خود اس اجازت کو کیوں روایت کرتے معلوم ایسا ہوتا ہے کہ انہوں نے جب حضرت ابوہریرہؓ سے یہ الفاظ سنے تو یا تو ان پر اعتماد کامل کی بنا پر یا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے تحقیق کر لینے کے بعد خود بھی وہ الفاظ روایت کرنے لگے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کو خود کسی وقت یہ یاد کیا ہو کہ میں نے آپؐ سے یہ الفاظ سنے تھے اور پھر ان کو بیان کرنا شروع کر دیا ہو بہر حال وجہ کچھ بھی ہو یہ حقیقت ہے کہ حضرت ابن عمرؓ نے یہ الفاظ خود بھی روایت کیے ہیں اور یہ ثبوت ہے اس بات کا کہ انہیں ابوہریرہؓ کے ان الفاظ کی روایت پر قطعاً کوئی شک نہ تھا۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ منکرین حدیث کا یہ اعتراض بھی قطعاً بے بنیاد ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ کو صحابہ کے درمیان اقتدا کا درجہ حاصل نہ تھا۔

۸- امام ابو حنیفہؒ پر حدیث سے بے نیازی کا الزام

اب منکرین حدیث کا صرف آخری اعتراض باقی رہ گیا ہے اس اعتراض کا لب لباب یہ ہے کہ امام ابو حنیفہؒ نے صرف سترہ یا اٹھارہ

حدیثوں کو اس قابل سمجھا ہے کہ ان پر اعتماد کیا جائے ہی وجہ ہے کہ جتنے بھی احکام و مسائل فقہی کا انہوں نے استنباط کیا ہے ان کے لیے صرف سترہ یا اٹھارہ حدیثوں کو بنیاد بنایا ہے ورنہ ان کے مستنبط تمام مسائل کا مدار قرآن پر ہے۔ انہوں نے علی حقائق کی روشنی میں قیاس کی بنیاد پر قانون کے اصول اور نظریات مرتب کیے ہیں۔ حضرت امام ابو حنیفہؒ کا یہ طرز عمل جہاں اس بات کا ثبوت ہے کہ حدیث کا تمام تر ذخیرہ سوائے محدود سے چند حدیثوں کے ناقابل اعتماد ہے وہاں اس طرز عمل میں ہمارے لیے یہ دلیل بھی ہے کہ قرآن کی تعبیر حدیث کی مدد کے بغیر موجود الوقت حالات کی روشنی میں

کی جا سکتی ہے۔

**امام ابو حنیفہ کا سرمایہ حدیث** | یہ اعتراض ہی دراصل ایک غلط مفروضے پر مبنی ہے یہ بات کہ امام ابو حنیفہ نے استنباط

مسائل میں صرف سترہ یا اٹھارہ حدیثوں پر اعتماد کیا ہے ایک مفروضے سے زیادہ کچھ نہیں۔ امام ابو حنیفہ نے اگرچہ دیگر محدثین کی طرح حدیث نبوی کی تدریس کے لیے کوئی حلقہ درس قائم نہیں کیا اور نہ ہی امام مالک کی طرح حدیث کی کوئی کتاب مرتب کی تاہم آپ کے تلامذہ نے آپ کی روایت کردہ احادیث کو کتب وسانید میں جمع کیا ہے ان کتب وسانید کی تعداد سترہ کے قریب ہے۔ ان میں سے امام ابو حنیفہ کے سب سے بڑے شاگرد امام ابو یوسف کی مرتب کردہ کتاب الآثار تو آج بھی شائع شدہ حالت میں مل جاتی ہے اس کی کتاب میں ہی ایک ہزار سے زیادہ احادیث امام ابو حنیفہ کی روایت کردہ موجود ہیں اس کے علاوہ روایات ابی حنیفہ پر مشتمل کتب میں سے مشہور ترین کتب حسب ذیل ہیں:

- (۱) کتاب الآثار المرفوعہ از امام محمد بن حسن
- (۲) الآثار المرفوعہ والموقوفہ از امام محمد بن حسن
- (۳) مسند امام حسن بن زیاد اللؤلؤی
- (۴) مسند حمّام بن امام ابی حنیفہ

ان کے علاوہ مسند ابی حنیفہ کے نام سے اور بھی متعدد علماء نے کئی کتابیں مرتب کیں ان علماء میں امام وہبی، امام نجاری، حارثی، ابن المنظر، محمد بن جعفر، ابو نعیم اصبہانی، قاضی ابوبکر انصاری، ابن ابی العوام اور ابن خردلجی کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان تمام مسانید کو بعد میں قاضی القضاۃ ابوالمؤید محمد بن محمود خوارزمی المتوفی ۶۶۵ھ نے ایک ضخیم کتاب میں یکجا کر دیا اور اسے جامع مسانید الامام الاعظم کے نام سے موسوم کیا۔ یہ کتاب فقہی ابواب پر مرتب ہوئی ہے اور ہر کتاب کو اس میں حذف کر دیا گیا ہے۔ اسے دائرۃ المعارف حیدرآباد نے دو جلدوں میں شائع کیا ہے۔ حذکرہ مسانید کے علاوہ تعلیق بغدادی، دارقطنی، ابن شاہین اور ابن عقدہ جیسے نامور علماء نے حدیث کی مرتب کردہ

مختلف "مسند ابی حنیفہ" کا ذکر بھی کتابوں میں ملتا ہے۔ حطیب بغدادی نے جب دمشق کا سفر اختیار کیا تو دارقطنی اور ابن شاہین کی مرتب کردہ "مسند ابی حنیفہ" ان کے ہمراہ تھیں علاوہ انہیں ان کی اپنی تالیف "مسند ابی حنیفہ" بھی ان کے پاس موجود تھی۔ اسی طرح ابن عثمدہ کی مسند کے بارے میں علامہ بدر الدین عینی نے اپنی تاریخ کبیر میں ذکر کیا ہے کہ اس میں ایک ہزار سے زیادہ روایات موجود تھیں۔ امام ابو حنیفہ کے ایک اور شاگرد رشید امام زعفرانے بھی ایک کتاب "آثار" کے نام سے مرتب کی تھی اس میں بکثرت روایات امام ابو حنیفہ کی تھیں۔ اس کا ذکر حاکم نے اپنی کتاب "معرفۃ علوم الحدیث" میں کیا ہے۔

سوال یہ ہے کہ اگر امام ابو حنیفہ کے نزدیک صرف سترہ یا اٹھارہ حدیثیں قابل اعتماد تھیں تو پھر یہ ہزاروں کی تعداد میں وہ کونسی احادیث روایت کرتے رہے۔ ان احادیث کو رد صحیح اور قابل اعتماد سمجھتے ہی تھے تو روایت کرتے تھے۔ علم حدیث میں امام ابو حنیفہ کے شیوخ کی تعداد جن سے انہوں نے روایات لی ہیں چار ہزار تک پہنچتی ہے امام ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں آپ کو ثقہ اور حافظ حدیث کے لقب سے یاد کیا ہے آخر یہ سب کچھ کیا ہے؟ یہ سب کچھ ثبوت ہے اس بات کا کہ منکرین حدیث نے جس دعوے پر اپنے اعتراض کی بنیاد رکھی ہے وہ ایک خلاف واقعہ فسانے اور غلط مفروضے سے زیادہ کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔

منکرین حدیث جو بات کہتے ہیں اس کا کسی معتبر کتاب میں نہیں کوئی ذکر نہیں ملتا صرف ابن خلدون نے اس کو ذکر کیا ہے لیکن ایک تو اس کی کوئی سند نہیں بتائی دوسرے اس کی عبارت مبہم و مجمل ہے اس عبارت سے مفہوم یہ ہوتا ہے کہ امام ابو حنیفہ کی روایات کی تعداد ہی اتنی ہے حالانکہ ان مسانید کی موجودگی میں جن کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے کوئی عقل سے عاری ہی ہوگا جو اس بات کو درست جانے لگا۔

## استنباط کا مبنیٰ احادیث | اب رہی یہ بات کہ اگر بکثرت احادیث امام ابو حنیفہ کے نزدیک صحیح تھیں تو انہوں نے مسائل و احکام

فقہی کے استنباط کے لیے صرف سترہ یا اٹھارہ حدیثوں پر کیوں اکتفا کیا تو یہ بات بھی پہلی بات کی طرح قطعاً غلط خلاف واقعہ اور مبنیٰ بر کذب ہے کوئی شخص فقہ حنفی کی معتبر کتابوں میں سے اگر صرف امام طحاوی کی شرح معانی الآثار، ابو بکر جصاص کی احکام القرآن اور امام سرخسی کی المبسوط ہی دیکھ لے تو اسے کبھی یہ غلط فہمی لاحق نہ ہو کہ امام ابو حنیفہ نے حدیث بے نیاز ہو کر صرف تیس اور قسائن پر اپنے مسائل فقہی کے استنباط کی بنیاد رکھی تھی۔ شارح فامرس سید مرتضیٰ زبیدی نے ایک کتاب ”الذمیر المہینفہ فی ادلتہ ابی حنیفہ“ کے نام سے مرتب کی ہے اسی ایک کتاب کو دیکھ لیا جائے تو منکرین حدیث کا جھوٹ پوری طرح عیاں ہو جاتا ہے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ سب موافق و مخالف اس پر متفق ہیں کہ امام ابو حنیفہ ایک مجتہد امام تھے مجتہد کی لازمی شرائط میں سے کون نہیں جانتا کہ ایک یہ شرط بھی ہے کہ وہ احادیث احکام پر جاری ہوا وہ یہ بھی سب کو معلوم ہے کہ لسی احادیث ہزاروں کی تعداد میں ہیں لیکن حابلہ کا قول بھی اگر لیا جائے تو احادیث احکام کی تعداد کئی سو سے تو متجاوز ہے ہی پھر یہ کیسے مان لیا جائے کہ ایک ایسا شخص منہ اجتہاد پر فائز ہو جاتا اور امت مسلمہ اس کو مجتہد تسلیم کر لیتی جو صرف سترہ یا اٹھارہ احادیث کو مدار احکام بتائے ہوئے تھا۔ کیا یہ بات سمجھ میں آنے والی ہے کہ ایک ایسا شخص جس کا سرمایہ حدیث صرف سترہ یا اٹھارہ روایات ہوں مسلمانوں کے ایک ایسے عظیم امام کا درجہ حاصل کر لے جس کا فقہی مسلک تمام دیگر فقہی مذاہب و مذاہب سے وسیع تر شمار کیا جائے اور کائنات ارضی کے لاکھوں مسلمان جس کے حلقہ بدماں ہوں۔ یہی نہیں بلکہ آنے والے زمانوں میں جس کے اجتہاد و فقہ پر ائمہ دین اعتماد کرتے اور اسے نقل و روایت کرتے چلے آئے ہوں۔

امام ابو حنیفہ سے جو مسائل مروی ہیں ان کی کم از کم تعداد تو اسی ہزار بتائی جاتی ہے بعض روایات کے مطابق ان کی تعداد لاکھوں تک پہنچتی ہے اس حقیقت کو ذہن میں رکھیے اور ذرا اس بات پر غور کیجئے کہ محدث ابن ابی شیبہ نے اپنی کتاب ”مصنف“ میں



ایک باب باندھا ہے جس میں وہ مسائل گنائے ہیں جن میں امام ابو حنیفہ نے بقول ان کے احادیث صحیحہ کی خلاف ورزی کی ہے ان کی کل تعداد ایک سو پچیس ہے اگرچہ احادیث صحیحہ کی خلاف ورزی کے اس قول میں علمائے فقہ کو کلام ہے اور انہوں نے تفصیل سے اس کی اصل حقیقت بھی واضح کی ہے تاہم تھوڑی دیر کے لیے اس قول کو درست بھی تسلیم کر لیا جائے تو اس کا مطلب یہ نکلے گا کہ ایک سو پچیس کے علاوہ باقی تمام مسائل یعنی تقریباً بیاسی ہزار سے زائد مسائل جو امام ابو حنیفہ سے منقول ہیں وہ سب کے سب احادیث صحیحہ کے موافق ہیں قطع نظر اس کے کہ ان کے بارے میں کوئی حدیث صریحاً مروی ہو یا نہ ہو۔ اگر ان سب مسائل کی بنیادینے والی احادیث کو تلاش کیا جائے گا تو اس کا لازمی نتیجہ یہی نکلے گا کہ امام ابو حنیفہ کے یہاں سینکڑوں بلکہ ہزاروں احادیث کا وجود ثابت ہو جائیگا۔

غرض یہ خیال بھی قطعاً غلط ہے کہ امام ابو حنیفہ نے حدیث سے بے نیاز ہو کر صرف قیاس اور قرآن پر اپنے مسائل فقہی کی بنیاد رکھی۔ حدیث سے استناد کے معاملے میں امام ابو حنیفہ کا جو مسلک تھا اسے خود انہی کے الفاظ میں سنئے :

### امام صاحب کا مسلک

”جو بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہو وہ سرائیکھوں پر میرے ماں باپ آپ پر خدا ہوں ہم آپ کی مخالفت نہیں کر سکتے جو بات صحابہ سے منقول ہو ہم اس میں سے اپنا پسندیدہ قول چن لیتے ہیں اور جو بات صحابہ کے علاوہ دوسروں سے منقول ہو تو ہم بھی آدمی ہیں اور وہ بھی آدمی ہیں۔“ (میزان شرفانی جلد ۱ ص ۷۱)

اسی سے ملتا جلتا مگر ذرا تفصیل کے ساتھ امام ابو حنیفہ کا ایک اور قول خطیب نے تاریخ بغداد میں نقل کیا ہے۔ امام ابو حنیفہ فرماتے ہیں :

”مجھے جب کوئی حکم خدا کی کتاب میں مل جاتا ہے تو میں اسی کو تمام لیتا ہوں اور جب اس میں نہیں ملتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور آپ کے ان صحیح آثار کو لیتا ہوں جو ثقہ لوگوں کے ہاں ثقہ لوگوں کے واسطے سے معروف ہیں پھر جب نہ کتاب اللہ میں حکم ملتا ہے نہ سنت رسول اللہ میں تو میں اصحاب رسول کے قول (اجماع صحابہ) کی

یہ بروی کرتا ہوں اور ان کے اختلافات کی صورت میں جس صحابی کا قول چاہتا ہوں قبول کرتا ہوں اور جس کا چاہتا ہوں چھوڑ دیتا ہوں مگر ان سب کے قول سے باہر جا کر کسی کا قول نہیں لیتا۔ رہے دوسرے لوگ تو جس طرح اجتہاد کا حق انہیں ہے مجھے بھی ہے۔

(تاریخ بغداد جلد ۱۲ ص ۲۹۸)

ایک مرتبہ خلیفہ منصور نے بعض لوگوں کے اکسائے پر امام ابو حنیفہ کو لکھا کہ میں نے سنا ہے آپ قیاس کو حدیث پر ترجیح دیتے ہیں۔ جواب میں امام صاحب نے لکھا:

امیرا مومنین آپ تک جو بات پہنچی ہے وہ صحیح نہیں ہے میں سب سے پہلے کتاب اللہ پر عمل کرتا ہوں پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت پر پھر ابو بکر و عمر اور عثمان و علی رضی اللہ عنہم اجمعین کے فیصلوں پر پھر باقی صحابہ کے فیصلوں پر البتہ جب صحابہ میں اختلاف ہو تو پھر قیاس کرتا ہوں۔ (میزان شرف جلد ۱ ص ۶۲)

یہ اور اسی طرح کے دیگر متعدد اقوال ہیں جن میں امام صاحب کے اپنے الفاظ میں وہ مسلک ہمارے سامنے آتا ہے جو حدیث سے استناد کے معاملے میں امام ابو حنیفہ نے اختیار کیا ہوا تھا کسی کے کلام کی کوئی تعبیر وہی درست اور صحیح سمجھی جاتی ہے جو منکمل نے خود بتلائی ہو ان اقوال کی موجودگی میں جو شخص یہ کہتا ہے کہ امام ابو حنیفہ حدیث سے بے نیاز ہو کر مسائل فقہی کا محض قیاس کی بنیاد پر استنباط کیا کرتے تھے وہ امام صاحب پر افترا پرداز کر رہا ہے۔ ایک مرتبہ جب امام ابو حنیفہ کے سامنے کسی کا لگایا ہوا یہ الزام نقل کیا گیا کہ آپ قیاس کو نص پر ترجیح دیتے ہیں تو اس پر آپ نے فرمایا:

جو شخص یہ کہتا ہے کہ ہم قیاس کو نص پر ترجیح دیتے ہیں وہ بخدا جھوٹ کہتا ہے اور افترا پردازی سے کام لیتا ہے نص کی موجودگی میں قیاس کی ضرورت ہی کیا ہے۔

(میزان شرف جلد ۱ ص ۶۱)

حقیقت یہ ہے کہ امام ابو حنیفہ حدیث کے مقابلے میں قیاس کو ہرگز ترجیح نہیں دیتے تھے۔ یہاں تک کہ ان کے یہاں ایسی مثالیں بھی موجود ہیں کہ انہوں نے ضعیف احادیث تک قیاس کے مقابلے میں قابل ترجیح سمجھا ہے مثال کے طور پر حالت سفر میں بنیذ کے ساتھ وضو کرنے کی

اجازت پر مشتمل حدیث کو محدثین نے ضعیف قرار دیا ہے لیکن امام صاحب نے اس حدیث کو قیاس پر ترجیح دی ہے اسی طرح جب چور دس درہم سے کم چرائے تو امام ابو حنیفہ کے نزدیک اس کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا حالانکہ اس کے بارے میں وارد شدہ حدیث محدثین کے نزدیک ضعیف ہے۔ امام ابن قیم اعلام الموقعین میں لکھتے ہیں:

”اصحاب ابی حنیفہ کا اس امر پر اجماع منعقد ہو چکا ہے کہ امام صاحب کے نزدیک

ضعیف حدیث قیاس و رائے سے افضل ہے۔“ (اعلام الموقعین)

غرض اب تک کی گفتگو سے یہ بات واضح ہو گئی کہ منکرین حدیث کی نہ یہ بات صحیح ہے کہ امام ابو حنیفہ نے مسائل فقہی کے استنباط کے لیے صرف سترہ یا اٹھارہ حدیثوں پر اعتماد کیا ہے اور نہ ان کی یہ بات ہی درست ہے کہ امام صاحب حدیث سے بے نیاز ہو کر محض قیاس اور قرآن پر اپنے مسائل کا مدار رکھتے تھے اس طرح امام ابو حنیفہ کے بارے میں انکا

سارا اعتراض ہی بے بنیاد ہے۔ ساتھ ہی الحمد للہ منکرین حدیث کے ان تمام اعتراضات کا جواب مکمل ہو جاتا ہے جن کا زیر نظر عنوان کی ابتدا کرتے وقت ہم نے حوالہ دیا تھا اور اسی کے ساتھ ہی الحمد للہ یہ کتاب اپنے اختتام کو پہنچتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس تحریر کو مصنف ناشرین اور قاریین سب کے لیے ہدایت کا ذریعہ اور ذخیرہ آخرت بنائے۔ آمین و آخر دعوانا ان

الحمد للہ رب العالمین

محمد رفیع الدانی

۳ مارچ ۱۹۷۹ء عیسوی

۴ ربیع الثانی ۱۳۹۹ء ہجری

# مصادر و ماخذ

کنز العمال شیخ علی متقی بریلان پوری  
مطبوعہ حیدرآباد دکن  
الادب المفرد للبخاری مطبوعہ قاہرہ مصر  
معالم السنن للخطابی مطبوعہ حلب  
صحیح ابن حبان  
مشکل الآثار امام طحاوی مطبوعہ حیدرآباد دکن  
صحیفہ ہمام ابن منبہ مرتبہ ڈاکٹر حمید اللہ  
طبع حیدرآباد دکن  
مجمع الزوائد للذہبی مطبوعہ قاہرہ  
کتاب العلل امام ترمذی  
فتح الباری ابن حجر عسقلانی مطبوعہ مصر  
عمدة القاری علامہ عینی مطبوعہ قاہرہ مصر  
شرح مسلم امام نووی طبع قاہرہ  
مشوٰی شرح مؤطا شاہ ولی اللہ محدث دہلوی  
مطبوعہ مکتبہ مکرّمہ  
تذکرۃ الموضوعات محمد بن طاہر المقدسی  
طبع مصر ۱۳۲۳ھ  
معرفۃ علوم الحدیث ہمام طبع قاہرہ  
المواقعات امام شافعی طبع تونس ۱۳۰۲ھ  
تلخیص ابن جوزی

القرآن الکریم  
تفسیر قرطبی  
تفسیر لمبری مطبوعہ مصر  
تفسیر معارف القرآن مفتی محمد شفیع طبع کراچی  
الاتقان فی علوم القرآن للسیوطی  
مطبوعہ سمیع اکیڈمی پاکستان  
احکام القرآن ابوبکر حصّاص  
الاحکام فی اصول الاحکام لابن حزم  
طبع قاہرہ ۱۳۴۵ھ  
صحیح بخاری  
صحیح مسلم  
جامع ترمذی  
سنن ابوداؤد  
سنن نسائی  
سنن ابن ماجہ  
سنن دارمی  
مؤطا امام مالک  
مسند امام احمد بن حنبل  
مشکوٰۃ المصابیح للخطیب  
مستدرک حاکم مطبوعہ حیدرآباد دکن

صید الخواطر ابن جوزی

تہذیب النویدی

شر و طلائعہ الخمسہ للحامی طبع قاہرہ

المیزان للشعرانی طبع قاہرہ

المحدث اغا صیل رامہری

زاد المعاد ابن قیم مطبوعہ مصر

تاویل مختلف الحدیث ابن قیم طبع قاہرہ

الرسالة للإمام الشافعی طبع اول ۱۳۵۸

فتح المغیث امام سخاوی طبع قاہرہ ۱۳۵۵

تہذیب تہذیب حافظ ابن حجر عسقلانی طبع جدید آبادی

۱۳۲۵

اعلام الموفین ابن قیم طبع ۱۳۷۳

توجیہ النظر شرح ظاہر البحر انری طبع مصر ۱۳۲۸

تقیید العلم خطیب بغدادی طبع دمشق ۱۹۴۹

جامع بیان العلم ابن عبد البر مطبوعہ مصر

السنہ قبل التدوین محمد عجاج الخطیب طبع مصر

الرسالة المستطرفہ للکافی کارخانہ کتب کراچی

قواعد التحدیث شیخ ابوالحسن عینی طبع دمشق ۱۳۵۲

علوم الحدیث و مصطلحہ ڈاکٹر جمعی صاوی طبع دمشق ۱۳۷۹

السنہ و مکاتبتہ فی التشریح الاسلامی ڈاکٹر مصطفیٰ

جیمت حدیث مولانا محمد ادریس کاندھلوی طبع لاہور

ترجمان السنہ مولانا بدر عالم طبع کراچی

تدوین حدیث مولانا مناظر احسن گیلانی طبع کراچی

ترجمان القرآن منصب سالت نمبر مولانا ابوالاعلیٰ مودودی

طبع لاہور

تقییمات مولانا ابوالاعلیٰ مودودی طبع لاہور

تاریخ الحدیث مولانا عبد الصمد عارم طبع لاہور

تشریح پنج البلاء ابن ابی الحدید طبع مصر

انالہ اعجاز شاد ولی اللہ محدث دہلوی طبع کراچی

تذکرۃ الحفاظ للذہبی مطبوعہ دمشق

تدریب الراوی للیسوطی مکتبہ قاہرہ مصر ۱۳۷۹

اسد الغابہ فی معرفۃ الصحابہ ابن اثیر جزوی طبع قاہرہ ۱۲۸۹

الاصابہ فی تمیز الصحابہ حافظ ابن حجر مطبوعہ مصر

طبقات ابن سعد مطبوعہ بیروت

لسان المیزان حافظ ابن حجر مطبوعہ جدید آباد دکن

البدایۃ النہایۃ ابن کثیر مطبوعہ السعادیہ قاہرہ ۱۳۵۱

وفیات الایمان ابن خلکان مطبوعہ المہینۃ مصر

سیرت ابن ہشام مطبوعہ مصر

کشف الظنون حاجی خلیفہ طبع مصر ۱۲۷۷

انساب الاشراف علامہ بلاذری

الکامل فی تاریخ ابن اثیر جزوی مطبوعہ مصر

جامع السیر ابن حزم

تاریخ الکبیر امام بخاری مطبوعہ جدید آباد دکن

معجم صغیر اوسط کبیر طبرانی - تاریخ طبری مطبوعہ مصر

تاریخ بغداد خطیب بغدادی مطبوعہ مصر ۱۳۴۹

تاریخ دمشق حافظ ابن عساکر